برفیلی بُلندیاں

مُستنصر حُسین تارڑ

''فیری میڈو اور نلتر پکھورا ٹریک''

پہلا سفر

لاہور	''مرغانِ چمن کا سرسری تعارف اور کچھ نئے پرندے''	11
گلگت	''سنہری چوغہ، ننگی تلوار اور قراقرم کی رات میں رقص''	17
تاتو	''تاتو کی سرد رات میں بارش میں بھیگتی مرغیاں''	23
بشام	''بشام ۔ برسین ۔ بامیان اور رائے کوٹ پُل''	26
فنتوری	''ہائے اللہ جی میں کیا کروں... شل مکھی کا دیدار....	32
"	سو چہروں والی نانگا پربت کی برہنگی....''	
فیری میڈو	''فیری میڈو مجھ سے شکایت کرتا ہے، مجھے کیوں بیان کر دیا...تارڑ پتھر 92ء''	42
"	''چھوٹا فیری میڈو بھی گمشدہ....''	48
"	''فیری میڈو کے جنگل کے جھرنوں اور درختوں کی سمفنی ....اور شام ہو رہی تھی''	51
بیال کیمپ	''بیال کیمپ بھی برباد....لیکن نانگا پربت اب بھی حکمران تھی''	57
فیری میڈو	''الاؤ بجھا تو نانگا پربت کے برف مینڈک ۔ سانپ ۔ محلات اور ملکائیں فیری میڈو میں اترنے لگے''	61
گلگت	''تلوار ہے کہ نہیں؟''	66
گلگت	''بدلتا ہے رنگ گدا کیسے کیسے''	67

وادیٔ ہلتر	''لیڈر کی تقریر اور پورٹر سامان اٹھانے سے انکاری ہو جاتے ہیں''	71
ہلتر	''ٹریک کا پہلا قدم.....بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے آزاد ہو کر مصر سے نکلتے ہیں''	76
ہلتر نالہ	''دریائے برالدو کے چھوٹے بھائی کے وحشی پانیوں میں ڈوبتا ابھرتا ایک متروک شدہ اداکار.....اور ایک بکری!''	81
ہلتر جھیلیں	''ہلتر جھیلیں جو ہر جھیلیں اور میری شان میں گدھے کا راگ درباری..''	86
"	''ہلتر جھیلیں..شیشے کا ایک شہر...آبی جادوگری کے گل رنگ انار..... ایک طلسم ہوش رُبا....''	93
"	''شیشۂ آب پر ایک کنکر..ایک پتہ اور ایک رنگین مچھلی''	98
"	''رنگوں کے فریب..نظر کے دھوکے..پانیوں نے مجھے بے ایمان کر دیا''	102
دو جھیلیں	''نیلاہٹ کے دو جزیرے دکھائی دیتے ہیں.....اور یہ عشق کیا چیز ہے''	110
ٹریک	''ایک گوجر بستی اور پہاڑوں کے سرکس کے بازی گر''	115
"	''تین سیاہ پوش نالے اور پھر یاکوں کے غول ڈھلوان پر ہمارے اوپر گرتے آ رہے ہیں''	118
لوئر شاہجی	''ہمہ یاراں..ایسی بلندی..ایسی برفیں اور ایسی چراگاہ..لوئر شاہجی.. سبحان اللہ''	126
شاہجی پیک	''شاہجی پیک کی تین چوٹیوں سے اُترتی برف کا آبشار ایک ایوالانچ''	139
اپر شاہجی	''کوہ قاف کے میدان میں چرتے کھلونا گھوڑے...گھاس کے بلند تخت''	143
"	''گدھے ہمارے بھائی ہیں اور تین بندر اور یاک جنہیں ایک ہیئر کٹ کا شدید ضرورت تھی''	151
کہیں بلند پہاڑوں میں	''کہیں بلند پہاڑوں میں.....رسول حمزہ توف مر چکا ہے''	156
ہلتر بیس کیمپ	''درّہ ہلتر کے بیس کیمپ سے دھواں اُٹھ رہا تھا''	161
"	''گوشے میں پہاڑوں کے مجھے آرام بہت ہے''	165
"	''کیسی برفباری ہوگی.....ویسی جیسی کہ ہوتی ہے.....اور مدینہ شاہجی..''	172
درّہ ہلتر	''درّہ ہلتر اور گلیشیئر کے پار ایک مجبوری برفباری''	178

ہلتر گلیشیئر	''برف کا ایک بگولا.....ایک واوروالا...جس کی نیلی برفوں کے کنویں میں میرے ابا جی کی آنکھیں مجھے دیکھتی ہیں''	187
کروئی بخت	''سرخ پتھر...کروئی بخت...اور گھاس پر بچھا ایک اور تخت''	193
"	''برچ کے سفید جنگل.....ایک روسٹ بکرا.....اور کوہ نوردی کی شب آخر''	197
"	''برچ کے سفید جنگلوں میں ایک سویر...جو دھند میں غرق تھی''	204
کروئی بخت جنگل	''جنگل کے پار ایک اور جنگل اور پیاس بھرا ایک خشک صحرا''	208
صحرا	''پیاس کے صحرا میں ایک آبشاری شالیمار''	214
وادیٔ اشکومن	''وادیٔ اشکومن میں اُترتے ہیں اور سفر تمام کرتے ہیں''	218

"ہوشے سے درّہ گندوگورو کے بیس کیمپ تک اور لیلیٰ پیک"

دوسرا سفر

مقام	عنوان	صفحہ
ایک چٹان	"چٹان پر ایک لڑکی...کچھ نہ بن سکو تو گھاس بن جاؤ"	225
لاہور	"وطن جس میں موسم، بلندیاں اور چند چہرے ٹھہرے ہوئے تھے...واپسی!"	229
لاہور	"روانگی کا دن"...ڈرائیور نعیم حکیم اور کلر کہار میں بریک ڈاؤن"	233
بشام	"بشام کی شام، برسین کی سویر اور چلاس کا انصاف"	241
رائے کوٹ	"رائے کوٹ جہاں دل رُکتا ہے...شکور سے ملاقات"	247
گلگت	"چناران میں رحمت نبی کا نزول اور محبت کے شگوفے"	249
سکردو روڈ	"کوہِ فراموش کی سفید سستی..."	251
سکردو	"کوہ مشابرم کی بجائے درّہ گندوگورو میں کیمپ جائیں گے"	254
سکردو	"سکردو بے وفا ہو جاتا ہے اور چلو چلو خپلو چلو"	262
خپلو	"جگت کبیر اور میرا بائی خپلو کے موٹل میں"	266
خپلو	"وہ ڈاکخانہ جہاں سے میرے لیے ایک خط پوسٹ ہوا تھا"	270
لاہور	"باقی رہ گئے چھ...واپسی"	274
مچلو	"مچلو میں دل مچلو مچلو...چھیڑ خوبانیوں سے چلی جائے اسدؔ"	276
تلس	"وادی تلس جو مچلو کی چھوٹی بہن تھی"	284
کاندے	"کاندے گاؤں جسے سیلاب بہا لے گیا...ٹوٹا ہوا ٹیل"	286
ہوشے روڈ	"مولا جٹ کی جیپ میں...کنیداس کا چٹانی گاؤں"	290

مقام	عنوان	صفحہ
ہوشے گاؤں	"ہوشے کی گلیوں میں اُندلس کے اجنبی"	296
لاہور	"تختِ لاہور کی گلیاں....اور باقی رہ گئے پانچ"	301
مسافت	"وادی ہوشے...چھنگر پیک اور ٹریک کا پہلا دن"	304
شائی چو	"شائی چو کا خیمہ شہر...ندیاں اور صنوبر کے ٹھگنے درخت"	315
شائی چو	"مجراان شائی چو...بابا فلاکت زدہ اور رقص کرتے حسن صاحب"	325
گندوگورو گاؤں	"شائی چو سے آگے جہاں اور بھی ہیں"	335
مسافت	"کچھ دیر بعد ممّی آ گئی...اور مجھے پار لے گئی"	340
گندوگورو گلیشیئر	"موت چٹانوں کی صورت ہمارے سروں پر معلق تھی"	345
زل سنگ پا	"زل سنگ پا....پھولوں کا کھیت جہاں کوئی پھول نہ تھا"	354
لاہور	"لاہور کی بھیڑ میں....باقی رہ گئے پانچ"	356
زل سنگ پا	"پانچ گلیشیئر....میرا خیمہ اور 13600 فٹ بلند سرد رات"	358
"	"خپلو کا بلتی تگتی...اور اُجڑا ہوا پھولوں کا کھیت"	365
لیلیٰ پیک	"برف کے صحراؤں میں بھٹکتی ایک لیلیٰ"	371
گندوگورو گلیشیئر	"میں لیلیٰ کے عشق میں....گھوڑا ہو گیا"	376
مسافت	"گونگے شاہ و مجھے ہسپاں لے جا رہا ہے یا ہسپانیہ"	384
ہسپاں	"درّہ گندوگورو کے دامن میں چار خیمے...گلی باسٹرڈز..."	390
"	"ہسپاں کی شام....پکوڑے اور لیلیٰ او لیلیٰ"	397
"	"ہسپاں کی رات....اور لیلیٰ پر ستارے گرتے تھے"	406
لاہور	"لاہور کی سویر....اور باقی رہ گیا ایک...میں!"	409
ہسپاں	"گندوگورو کے میراثی....ہائے اوئے"	411
"	"پندرہ ہزار فٹ بلند برفانی کارواں سرائے سے کُوچ"	415
شائی چو	"پہاڑوں کی رات میں بھٹکتے اندھے فقیر"	419
ہوشے	"وادی ہوشے پر بچھا گندم کی بالیوں کا تخت"	428
کنیداس	"چٹان پر ایک لڑکی....اب وہاں نہیں تھی"	435
گھر	"میں کیا جانوں میں کون ہوں....دروازہ کھولو"	438

پہلا سفر

"مُرغانِ چمن کا سرسری تعارف اور کچھ نئے پرندے"

یہ سفر اس لائق تو نہیں کہ اسے لکھا جائے...

دراصل کے ٹو کہانی، نانگا پربت، یاک سرائے اور سنولیک کے بعد کوئی بھی سفر.. پہاڑوں کا سفر اس لائق نہیں لگتا کہ اُسے لکھا جائے..

لیکن اس سفر کے کچھ کردار ایسے ہیں جنہیں لکھا جانا چاہیے..

یہ کردار ایسے ہیں کہ اگر انہیں میں نے نہ لکھا تو یہ بدروحیں بن کر میرے خوابوں میں آئیں گے۔ رات کو غسل خانے کی بتی جلانے سے پہلے وہاں موجود ہوں گے اور "ہم آگئے ہم آگئے" کے قہقہے لگاتے میری روح فنا کر دیں گے.. پریشان کریں گے.. مجھے ڈرائیں گے..

تو میں ان کرداروں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ یہ میرے خوابوں میں آئیں.. رات کو میرے غسل خانے میں اُدھم مچائیں اور میری زندگی اجیرن کر دیں۔

صرف اس لیے میں اس سفر کو بھی لکھنا چاہتا ہوں.. اگرچہ یہ اس لائق نہیں کہ اسے لکھا جائے..

چونکہ اس سفری داستان میں چمن اتنا اہم نہیں جتنے کہ اس میں چہکنے والے پنچھی، پرند اور پکھیرو... اس لیے مناسب رہے گا اگر ان طیور.. ان مرغانِ چمن کا سرسری تعارف کروا دیا جائے.. جیسا کہ ڈرامہ نگار سکرپٹ کے آغاز میں مرکزی کرداروں کی خصلتیں اور عادتیں مختصراً بیان کر دیتا ہے تاکہ پروڈیوسر کو کاسٹنگ میں آسانی ہو کہ کونسا اداکار کس رول کے لیے موزوں رہے گا..

ان میں کچھ قدیمی پنچھی ہیں جو متعدد کوہ نوردیوں میں میرا ساتھ دے چکے ہیں اور

میرے پڑھنے والے اُن سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں.. اور کچھ پرندے نئے نویلے ہیں جو پہلی بار چمن میں چہکے ہیں۔

پرانے اور کھانگڑ پنچھیوں میں میاں فرزند علی ہیں جو پرندے کو پرندہ اور گھڑے کو گھرا کہتے ہیں۔ اندرون بھاٹی گیٹ کے قدیمی مکین ہیں اس لیے انہیں باہر کی ہوا نہیں لگی۔ چنانچہ ان کی لاہوری وضع داری اور یاڑوں پر قربان ہونے کی خصلت نہیں بدلی.. اسی لیے دنیاداری کے ناپ تول کے ماہر نہیں۔ ناچے پتھروں اور ناچنے والیوں کو پرکھنا جانتے ہیں.. انہی کے بارے میں اولڈ از گولڈ کا محاورہ گھرا گیا تھا.. معاف کیجیے گا گھڑا گیا تھا..

دو نمبر پکھیرو شاہد صاحب ہیں جو ناپ تول کے شدید ماہر ہیں۔ ہمیشہ ہمیں چکرانے کے چکر میں رہتے ہیں' لیکن ہم جیسے کائیاں گاہکوں کو جُل نہیں دے سکتے.. ہم لیڈر رہوں نہ ہوں اُن کی ڈپٹی لیڈری پکی ہے اور یہ اعزاز انہوں نے بقلم خود اپنے آپ کو عطا کر رکھا ہے.. پورٹروں اور ہوٹل والوں سے مذاکرات کے ماہر ہیں اور اتنے تواتر سے اور دھیمے دھیمے بولتے چلے جاتے ہیں کہ پورٹروں اور ہوٹل والوں کو نیند آنے لگتی ہے اور وہ ایک اونگھ میں ہماری شرائط مان جاتے ہیں.. اکثر جہاں مجھے بات کرنی ہوتی ہے، وہ مجھے دھکیل کر آگے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں "میں ڈپٹی لیڈر ہوں مجھ سے بات کریں، لیڈر کا مقام تو بہت بلند ہے اور بلندی پر زیادہ دیر قیام کرنے کے باعث انہیں زکام ہے، گلا بیٹھا ہوا ہے بات نہیں کر سکتے.. یوں بھی عمر رسیدہ ہیں اور تھوڑے سے بوکھلائے ہوئے ہیں.." مہم کے اخراجات کا حساب کتاب ہمیشہ اُن کے ذمے ہوتا ہے اور وہ یہ حساب کرتے ہوئے ہمہ وقت اپنے جاسوس ہیٹ پر ہاتھ پھیرتے یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے نیچے جو سر ہے اُس پر شاید اب کچھ بال اُگ آئے ہوں.. سیاہ چشمہ اُتارتے چڑھاتے اخراجات کی نوٹ بک پر تادیر غور کرتے ہیں اور اکثر کسی نہ کسی ممبر کو یہ کہہ کر ناراض کر لیتے ہیں کہ چوہدری صاحب آپ نے فلاں کھانے کے دوران ایک کی بجائے دو بوتلیں پی تھیں، براہ مہربانی فالتو بوتل کے پیسے فوراً ادا کر دیجیے.. بجٹ خراب ہو رہا ہے..

پھر ایک نازک اندام حسن والے محض حسن صاحب ہیں.. اپنی بیوی کے تذکرے پر فوراً کھل جاتے ہیں جب کہ ہم لوگ فوراً مرجھا جاتے ہیں.. ایک بار کرنل محمد خان نے میری حوصلہ افزائی کی خاطر.. جیسے ایک بچے کی حوصلہ افزائی کی خاطر اُسے کہہ دیا جائے کہ جب تو بڑا ہوگا تو یقیناً راج ہنس بن جائے گا ایسے کرنل ڈیئر نے لکھا کہ وہ شہر، وہ گاؤں کس کام کے جہاں کم از کم ایک

مستنصر حسین تارڑ نہ ہو.. ویراں شود آں شہر کہ بے خانہ ندارد.. تو میں حسن صاحب کی حوصلہ افزائی کی خاطر نہیں بلکہ تہہ دل سے اُن کی طبیعت کی سادگی اور ریشمی خصلت سے متاثر ہو کر یہ کہوں گا کہ وہ کوہ نوردیاں، وہ سفر کس کام کے جن میں کم از کم ایک حسن ہمراہ نہ ہو... ویراں شود آں شہر کہ یک حسن نہ دارد..

اس سفر میں پرنس سلیم بھی ہمارے ساتھ تھا.. یہ سچ مچ تو پرنس نہیں تھا محض نام کا فائدہ اٹھا رہا تھا.. جیسے ہمارے کالج کی کینٹین کا ٹھیکیدار چنگیز محمود اپنے نام کی وجہ سے دنیا بھر کے منگولوں کو اپنی رعایا سمجھتا تھا.. سلیم شکل سے ایسا ولن لگتا ہے جو ہیرو کی خلوتوں میں رنگ میں بھنگ ڈال دیتا ہے.. اگرچہ اُس نے میرے ساتھ جانے کا ارادہ تو کے ٹو کہانی کے زمانے میں باندھا تھا لیکن پھر چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر اُس نے یہ بندھا ہوا ارادہ کھول دیا.. اور اب اتنے برسوں بعد جب اُس نے پھر سے یہ ارادہ باندھا تو ہم نے خصوصی بندوبست کیا اور اُسکے بندھے ہوئے ارادے کی گانٹھ کو دوستی کے پانی سے بھگو کر ایسا پکا پیڈا کر دیا کہ وہ چاہے بھی تو اسے کھول نہ سکے.. یہ طریقہ پرانے زمانے میں دولہن کے ازار بند کی گانٹھ پر آزمایا جاتا تھا.. پرنس سلیم نے نہایت بکھری ہوئی واہیات نوعیت کی مونچھیں پالی ہوئی ہیں اور جب مسکراتا ہے تو اپنے ناہموار دانتوں کے باعث بگڑی بچی کا بڑا معلوم پڑتا ہے.. لیکن پرنس چارمنگ ایسا ہے کہ کسی بھی نور جہاں کو ملنے پر اُسے کبوتر نہیں تھماتا کہ ان کا خیال رکھنا بلکہ اپنا فون نمبر تھما دیتا ہے کہ کر لینا.. لاہوریوں کی خاص حس مزاح کا حامل ہے اور اس کے اکثر لطیفے ایسے ہوتے ہیں کہ اُن پر حاملہ ہونے کا گمان ہوتا ہے..

آپ چہار تحفہ ملتان یعنی.. گرد، گرما، گدا اور گورستان سے تو واقف ہوں گے.. پہلے تو صرف گدا ہوا کرتا تھا جو ہمارا قدیمی ساتھی تھا' لیکن اس بار اس کے ساتھ گرد بھی چلا آیا.. اسے ہم گرد آمیز بھی کہہ سکتے ہیں.. گرد آمیز کا تعلق ملتان کی ایک قدیم اور بااثر گرد آمیز فیملی سے ہے.. باتوں میں ملتان کے رسیلے آموں جیسی مٹھاس رکھتا ہے۔ آپ اس مٹھاس سے اتنے تر جاتے ہیں حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ قہقہہ بے مثال لگاتے ہیں اور یقیناً جب وہ اپنے آم کے باغوں میں یہ حرکت کرتا ہوگا تو درختوں پر بیٹھے معصوم طوطے لڑھک کر گر جاتے ہوں گے.. شاید ان میں سے ایک آدھ جاں بحق بھی ہو جاتا ہو.. فوٹو گرافی میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ گھر کے اندر ایک سٹوڈیو بنا رکھا ہے جس میں کل جہان سے درآمد کردہ آلات تصویر کشی، پس منظر کے منقش پردہ جات، روشنی جات، اور چھتریاں وغیرہ پائے جاتے ہیں.. بیش قیمت کیمرہ جات کا مالک ہے اور ان کے ساتھ وہی

سلوک کرتا ہے جو مالک غلاموں کے ساتھ کرتے ہیں.. جب اپنے تھیلے میں سے کیمرہ برآمد کر کے اس کے آگے ایک لمبا سا زوم لینز فٹ کرتا ہے تو کیمرہ فی الفور نفش ہو جاتا ہے بلکہ ایک چھوٹے موٹے ایٹمی ہتھیار کا روپ اختیار کر لیتا ہے.. ایک ملتان یاترا کے دوران گدا نے اس سے ملاقات کروائی اور اس نے نہایت خوش اسلوبی سے ایک پرتکلف کھانا کھلا کر اس خواہش کا اظہار کیا کہ سائیں ہمیں ساتھ لے چلو.. گردحت سے اور شکل سے ناز و نعم میں پلا ہوا.. کچھ زیادہ پلا ہوا ایسا بچہ لگتا تھا جس نے عمر بھر گھر سے باہر قدم نہ رکھا ہو.. چنانچہ میں نے پوچھا کہ سائیں کیوں ساتھ لے چلوں تو بولا.. سائیں ہم فیری میڈو کو شوٹ کریں گے.. اور واقعی انہوں نے فیری میڈو کو ایسا شوٹ کیا کہ وہ ابھی تک اپنے زخم چاٹتا ہے..

ان پانچ تحائف کے سوا تین ایسے تحفے بھی ہمارے ہمراہ تھے کہ ہم بے شک اس رب کا شکر ادا کر سکتے تھے جس نے ہماری گائے بنائی تھی' لیکن انہیں بنانے پر ہم اس کا شکر ادا کرنے میں قدرے جھجکتے تھے.. کہ یہ بنائے ہیں؟..

تحفہ نمبر ایک.. عمران بابر.. تقریباً دو برس پیشتر کسی حوالے سے میری سٹڈی میں وارد ہوا.. نیکر پہنے اور اُسے ہمہ وقت ٹٹولتا ہوا کہ اس کے نیچے کچھ ہے بھی یا کہ نہیں.. عینک پہنے اور داڑھی پہنے جسے وہ ہمہ وقت شاید جوؤں کے تعاقب میں کھجلاتا جا رہا تھا.. میری سٹڈی میں آیا" سر جی میں کالج کے زمانے سے آپ کے سفرنامے پڑھتا آیا ہوں.. برباد ہو چکا ہوں.. ذرا یہ دیکھئے.. اُس نے میرے متعدد شمالی سفرنامے تاش کے پتوں کی طرح میرے سامنے پھینک دیئے.. ہر کتاب کے تقریباً ہر صفحے پر نوٹس تھے، سرخ پنسل کے نشان تھے۔ یہ میری آپ سے کمٹمنٹ کے ثبوت ہیں کہ ایک دن میں ان سفرناموں پر مبنی ڈاکومنٹریاں بناؤں گا.. میں دس برس سے تیاری کر رہا ہوں.. آپ اس بار مجھے بھی اپنی ٹیم میں شامل کر لیں.. یقین کیجیے اس میں اتنا مالی فائدہ ہوگا کہ آپ یہ ادب وغیرہ بھول جائیں گے اور اس مختصر سے گھر سے نجات حاصل کر کے کم از کم چار پانچ ایکڑ کا ایک فارم ہاؤس بنا کر اس میں منتقل ہو جائیں گے.. یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تب آپ کے پاس ایک لینڈ کروزر بھی ہوگی اور گیٹ کے باہر.. جس گیٹ کو ابھی ابھی آپ نے اپنا ازار بند اُڑستے ہوئے کھولا تھا وہ نہیں بلکہ فارم ہاؤس کے گیٹ کے باہر مسلح گارڈز بھی ہوں گے.."

میری تو باچھیں کھل گئیں، میری ناآسودہ اور ناممکن خواہشوں کی تکمیل کرنے والا شخص آج میرے سامنے موجود تھا.. میں کب سے ادب اور ٹیلی ویژن کو تیاگ کر ایک پانچ ایکڑ کے فارم

ہاؤس میں مسلح گارڈز کی رفاقت میں زندگی بسر کرنا چاہتا تھا.. اور یہ فرشتہ مجھے یہ سب کچھ آفر کر رہا تھا.. اگرچہ میں فوری طور پر" قبول ہے، قبول ہے" کے نعرے لگانا چاہتا تھا' لیکن پھر میں نے اپنے امیج اور ادبی شہرت کو فوری طور پر داغدار کرنے سے گریز کیا اور اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے نہایت لاپروائی سے کہا" مسٹر عمران بابر.. میں آپ کی آفر پر غور کر سکتا ہوں.. بہرحال میں یہ تو جانتا ہوں کہ میں شمال کا ایک سیلف سٹائلڈ ایکسپرٹ ہوں' لیکن میں آپ کو آپ کی صلاحیتوں کو نہیں جانتا چنانچہ کچھ ثابت کیجیے.."

عمران اپنی نیکر کو ٹٹولتا چلا گیا.. اگلے روز وہ مجھے ایک ایسی وڈیو کیسٹ دے گیا جس میں اس کے کچھ" پروجیکٹ" تھے.. ٹیلی ویژن پر چلنے والے اشتہار، میوزک وڈیوز، فلمیں، ایک ڈاکومنٹری.. جو اس کی کیمرہ کرافٹ اور ہدایت کاری سے وجود میں آئے تھے، میں نے اس کیسٹ کو ملاحظہ کیا تو ان کی تصویر کشی اور روایت سے مکمل سرکشی کی تخلیقی صلاحیت سے اتنا متاثر.. اور پھر فوری طور پر شرمندہ ہوا کہ میں نے ایسے باکمال اور اور یجنل شخص کا امتحان لیا.. اس کی صلاحیتوں پر شک کیا.. چنانچہ جب وہ.. یعنی عمران بابر دو تین روز بعد ایک کھسیائی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اور نیکر ٹٹولتے.. داڑھی کھجلاتے میرے پاس آیا تو اب میں اُس کا مداح ہو چکا تھا اور اس سے درخواست کر رہا تھا کہ عمران پلیز میرے ساتھ چلو.. میری ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ پاکستانی شمال میں جو جادو ہے وہ پوری دنیا کے سر چڑھ کر بولے.. اس میں جو طلسم ہے وہ کیمرے کی آنکھ قید کرے.. اور ایسے کرے جیسے میں اسے دیکھتا ہوں.. ندیدے ٹورسٹ یا ٹورسٹ آپریٹر یا ٹورازم کا محکمہ نہیں کہ یہ ان کے لیے کاروبار ہے۔ ملازمتیں ہیں.. جیسے میں اس حیرت کدے کو دیکھتا ہوں ویسے کیمرہ دیکھے اور دنیا کو دکھائے.. اور تم ہی وہ شخص ہو اگرچہ نیکر پہنتے ہو۔ جو یہ کام کر سکتا ہے.. چنانچہ عمران نے مجھے مائل پا کر بقول اُس کے ایک زرکثیر خرچ کر صرف اس مہم کی خاطر بانگ کانگ اور امریکہ سے خصوصی آلات تصویر کشی امپورٹ کئے.. ایسے مائیک اور لائٹیں درآمد کیں جو بلند پہاڑوں میں کارآمد ہو سکتے تھے اور یوں میرا ساتھی بن گیا.. میں اس کی داڑھی اور نیکر میں پانچ ایکڑ کا ایک فارم ہاؤس اور چند مسلح گارڈز دیکھتا تھا..

جیسے شمر تنہا نہ تھا ایسے عمران بھی تنہا نہ تھا.. اس کے ہمراہ دو بغل بچے تھے جو اپنی قدامت کے باعث اس کی بغل میں نہ آ سکتے تھے اور پھر بھی بغل بچے تھے۔ یہ دونوں بچے اسے گورو مانتے تھے اس کی اطاعت کرتے تھے.. مرشد جانتے تھے اور ہر لمحہ اس کے حکم کے منتظر رہتے تھے۔

ان میں ایک تو کاظمی تھا..

کاظمی ایک فل ٹائم ہنستا ہوا بغل بچہ تھا جو ٹیلی ویژن کے لیے میوزک ہنگامہ یا یہ تو ہے لوّ ی ڈ قسم کے پروگرام پروڈیوس کرتا تھا اور خود بھی تھوڑا سا لوّلی ہو چکا تھا.. لازمی شکل سے میکسیکو کے کسی ڈرگ بیرن کا کارندہ لگتا تھا لیکن نہایت ہونہار بغل بچہ تھا..

ان میں دوسرا طاہر تھا..

اور یہ بہت ہی طاہر تھا کیونکہ زمین سے نکل کر ظاہر ہوتا ہی چلا جاتا تھا.. باسکٹ بال کے ایک کھلاڑی کی مانند طویل قامت.. کانوں میں بالیاں.. مکمل طور پر اُسترا شدہ سر.. یعنی ایک دھر کونا نما منڈ.. جو اتنے لمبے لمبے ڈگ بھرتا تھا کہ دو چار ڈگوں میں ہی فیری میڈو جا پہنچا تھا۔ اتنا کم گو کہ سفر کے پہلے دو تین روز ہر خاص و عام نے اسے گونگا جانا اور اشاروں میں باتیں کیں.. اور اس کے قد و قامت اور جثے کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہم نے اسے ایک گونگے جن کے خطاب سے نوازا تا آنکہ ایک روز اس نے اپنی کم گوئی اور خاموشی کا قفل کھول کر اطلاع کی کہ جناب من میں جن نہیں ہوں، لیکن پھر بھی آپ کے حکم کا تابع ہوں.. آپ سب مجھے اگر سمجھنا چاہتے ہیں تو اپنا پرائیویٹ جن سمجھ لیجیے۔

اور ہم نے سمجھ لیا..

چنانچہ ایک عجیب لایعنی اور محیّر العقول ٹیم تشکیل پا گئی.. یعنی میاں فرزند علی.. شاہد، حسن، پرنس سلیم، گدا اور گرد آمیز.. عمران، کاظمی اور طاہر اور ہم سب کے سب شمال کو جاتے تھے.. اور ہاں، میں بھی!

''سنہری چوغہ، ننگی تلوار اور قراقرم کی رات میں رقص''

''ماموں ذرا ناچیں..''

ماموں بھالو کی طرح ناچنے لگے..

دیوسائی کے ایک بھالو کی طرح ناچنے لگے..

ہم ایک مرتبہ پھر گلگت سے باہر ایک رات میں تھے..

ہنزہ روڈ پر بلند ایک پہاڑی ڈھلوان پر ایک سرد ہوتے شالیمار میں تھے۔ فضل کے ماموں نے ایک مرتبہ پھر مجھے اور میرے چند ساتھیوں کو اپنے پہاڑی گھر میں مدعو کیا تھا اور تختہ بہ تختہ سڑک تک جاتے اپنے شالیمار باغ میں ایک شاہانہ شمالی دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا..

ہم قالینوں پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے.. تازہ سلاد چباتے طرح طرح کے مقامی مشروب نوش کرتے.. نعرہ ہائے تحسین بلند کرتے.. تالیاں بجاتے ماموں کو داد دے رہے تھے..

لیکن ماموں کا رقص واحد آئٹم نہ تھا.. اس سے پیشتر اکرام بیگ ننگی تلوار لہراتا ایک سنہری چوغے میں گھومتا ہمیں اپنے باکمال رقص سے حیران کر چکا تھا۔ حیرانی کے ساتھ تشویش بھی تھی کہ وہ تلوار اس تیزی سے گھماتا ہمارے سروں پر لہراتا تھا کہ ہم فوراً زیرِ لب کلمہ پڑھ لیتے تھے کہ اب وقتِ شہادت آ گیا.. اور ابھی یہ سر تن سے جدا ہو جائے گا.. لیکن پھر پتا چلا کہ بیگ ایسا کاریگر تھا کہ تلوار ہمارے بالوں کو چھوتی گزر جاتی اور واقعی ہمارا ایک بال بھی بیکا نہ ہوتا تھا..

جب صلائے عام کا دور شروع ہوا تو مجھے اعزاز بخشنے کے لیے ایک سینکڑوں برس قدیم

تلے دار چوغہ پہنایا گیا (اور بعد میں اہتمام سے اُتروا لیا گیا کہ کہیں میں اُسے گھر نہ لے جاؤں)..
پھر میرے ہاتھوں میں تلوار تھما دی گئی۔ تلوار خاصی وزنی تھی اور میری کلائی اگر مخنث ہوتی تو اس میں ضرور موچ آ جاتی.... مجھے بھی رقص کرنے کے لیے کہا گیا.. اگرچہ بچپن کی غلط کاریوں میں ایک غلط کاری یہ بھی تھی کہ میں نے انگلستان میں وکٹر سلوسٹر سکول آف ڈانسنگ سے بال روم ڈانسنگ کی ایک مختصر تربیت حاصل کی تھی جس کے نتیجے میں مجھے ایک سرٹیفکیٹ عطا کیا گیا تھا جو اس امر کی گواہی دیتا تھا کہ حامل ہذا والٹز، فوکس ٹراٹ، کوئیک سٹیپ اور ٹینگو وغیرہ بخوبی ناچ سکتا ہے اور اس نے ہماری لیڈی انسٹرکٹر کے پاؤں تربیت کے دوران اتنی مرتبہ کچلے ہیں کہ وہ بے چاری اپاہج ہو چکی ہے.. لیکن یہ تو گئے زمانوں کے قصے تھے، اب عناصر میں اعتدال کہاں تھا.. یوں بھی ایک گوری گوری او باقی چھوری کو بازوؤں میں تھام کر اس کی گرمی اور گداز کو محسوس کرتے والٹز کے سٹیپ لینا اور بات تھی اور ایک سنہری چوغہ زیب تن کر کے تلوار گھماتے رقص کرنا ایک جہانِ دیگر تھا.. چنانچہ میں ایک عمر رسیدہ ڈان کے خوتے کی مانند اس ورزش کے دوران قدرے ہانپ گیا بلکہ اب میرے ساتھی تشویش میں تھے کہ تلوار گھماتے ہوئے میں ذرا بے اختیار ہوتا تھا اور اس بے اختیاری کے دوران میرے ساتھیوں کے سر اڑ سکتے تھے.. اور میں تاریخ عالم میں ایک ایسے ادیب اور کوہ نورد کے طور پر جگہ نہ پانا چاہتا تھا جس نے گلگت میں ایک شب عالمِ بے خودی میں اپنے تمام ساتھیوں کے سر تن سے جدا کر دیے تھے..

چند ایک گھمن گھیریاں کھا کر چکرا کر ہانپتے ہوئے تلوار بمشکل سنبھالتے جب میں نے مزید ورزش سے معذرت کی کہ خوش رہو اہلِ چمن ہم تو سفر کرتے ہیں تو تب فضل نے اپنے سر پہ ہاتھ پھیرا.. یہ دیکھنے کے لیے نہیں کہ وہ میرے رقص کے بعد ابھی تک قائم ہے یا نہیں بلکہ اپنے انگلتے رکتے لہجے میں ماموں جان سے درخواست کرتے اس نے سر پہ ہاتھ پھیرا.. کہ ماموں ذرا ناچیں..

اور ماموں جو بقول ان کے ہنزہ کے نمبرون ڈانسر ہیں.. ناچنے لگے..

عمران اور اس کے دونوں مزید کیل کانٹوں سے لیس.. یعنی کیمرے سنبھالے، لائٹیں، کیبلز اور مائک اور وی سی آر سنبھالے خورد ونوش کے وسیع انتظامات سے قطعی بے پرواہ صرف اپنے کام سے کام رکھتے قراقرم کے دامن میں ایک اوپن ایئر پارٹی کو شوٹ کر رہے تھے..

میں نے جب ہتھیار ڈالے یعنی تلوار ڈالی تو سب سے زیادہ احتجاج عمران نے کیا "سر

یہ آپ کیا کر رہے ہیں.. تھوڑی دیر تو اور ناچیں.."

"اور اپنے ساتھیوں کے سر قلم کر دوں؟"

"ویسے سر.. ان میں ایک دو ساتھی تو ایسے ہیں جن کے سر قلم کرنا جائز ٹھہرتا ہے.. اگر کر دیتے تو میری موج ہو جاتی.. کیا ڈرامہ بنتا.."

"تم ایک کٹھور اور نہایت خود غرض انسان ہو.."

"میں اپنے کام کے لیے ہوں سر.. مجھے اپنے کام سے غرض ہے آپ سے نہیں.. لیکن یقین جانیے میں بنیادی طور پر ایک نہایت حساس شخص ہوں.. مجھے اس لمحے بھی اپنی بیوی یاد آ رہی ہے جو اس وقت جانے کونسے آسمانوں میں پرواز کر رہی ہو گی.. آپ جانتے ہیں ناں کہ وہ ایئر ہوسٹس ہے.."

"میں جانتا ہوں.. لیکن تم ماموں پر دھیان دو، وہ رقص کرتے کرتے نڈھال ہو رہے ہیں.. کیمرہ ان پر مرکوز کرو."

"ویسے سر جی.." عمران آج شب بھی نیکر میں تھا اسے ٹوٹا تھا.. "ابھی تھوڑی دیر پہلے ماموں نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے ایک آبائی صندوق میں ایک نہایت نایاب سینکڑوں برس پرانی منقش تلوار اور ٹوپی ہے.. آپ ان سے کہیں کہ وہ ٹوپی اور تلوار ذرا نکال لائیں میں ان کو شوٹ کرنا چاہتا ہوں.."

"کونسی تلوار.." اکرام بیگ کھیرے کھانے کا شوقین تھا اور ابھی تک تقریباً درجن بھر کھا چکا تھا.. "کونسی تلوار.."

"جو ماموں کے صندوق میں ہے.. سینکڑوں برس قدیم.. ان زمانوں کی جب اہلِ ہنزہ ڈکیت ہوا کرتے تھے اور چین جانے والے قافلوں کو لوٹ لیا کرتے تھے.. ان زمانوں کی نایاب تلوار.."

"کوئی تلوار نہیں ہے.." جب وہ سلاد کے طشت میں سے چُن چُن کر کھیرے کی پھانکیں کھا چکا تو ٹماٹروں کی جانب راغب ہو گیا۔

"ماموں کہتے ہیں بیگ صاحب.." عمران نے مسکرا کر کہا..

"کوئی تلوار نہیں.. نہ صندوق ہے.. نہ ٹوپی ہے.. نہ میں ہوں.. نہ آپ ہیں"

عمران نے براہ راست ماموں سے رجوع کیا "سر پلیز آپ تھوڑی دیر کے لیے وہ

تلوار لے آئیں جو ظاہر ہے آپ کے آباؤ اجداد کی نشانی ہے اور جس پر ابھی تک چینی تاجروں کے خون کے نشان بھی ہوں گے.. تھوڑی دیر کے لیے لے آئیں.. پلیز!''

''لائیں گے.. لیکن ابھی نہیں لائیں گے..'' ماموں نے رقص کرتے ہوئے ایک تخش ٹھمکا لگایا'' ہمارے بزرگوں کا کہنا تھا کہ اجنبی اس تلوار کو دیکھ لیں تو بڑا شگون ہوتا ہے.. وہ قتل ہو جاتے ہیں.. اب بھی آپ اُسے دیکھنا چاہتے ہیں..''

''ہاں ماموں..''

''دکھا دیں گے.. دکھا دیں گے..''

''کیوں فضل..'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا'' تلوار ہے؟''

فضل کندھے ہلا کر.. اپنے رف ٹف چہرے سے مسکرا کر.. نہایت ڈپلومیٹک ہو کر کہنے لگا'' اگر ماموں کہتے ہیں تو ہے.. ماموں ہیں ناں..''

اور ماموں دیوسائی کے ایک بھالو کی طرح ناچ رہے تھے.. ایک رُکتی ہوئی ردھم میں.. تھم تھم کر.. رُک رُک کر.. سٹیریو کے سپیکر میں سے.. جو کہ اس باغ شالیمار کے چار کونوں میں آویزاں تھے.. ان سپیکرز میں سے برآمد ہونے والی ہنسری اور ڈھول کی آزردہ اور اداس تھاپ پر.. ماموں مست ملنگ ہو کر.. ناچتے تھے.. اور عمران اُن کے آگے پیچھے لیتا.. کبھی گھاس پر.. کبھی کسی خوبانی کے پیڑ کی اوٹ میں.. انہیں شوٹ کرتا تھا.. یہیں اس باغ ارم میں.. خوبانی کا ایک ایسا گھنا اور تناور پیڑ تھا.. ایک شاندار شجر تھا جس میں ابھی پچھلے برس شمشال بے مثال کے برس میں سینکڑوں زرد سورج چمکتے تھے..

میں اپنے قالین سے بمشکل اُٹھا.. جب کہ تلوار ہے کہ نہیں کا مکالمہ جاری تھا اور اُٹھ کر روشنیوں کی زد سے پرے جو تاریکی تھی وہاں چلا گیا.. کہ وہیں وہ گھنا شجر تھا۔

اور وہاں پہنچا ہوں تو وہاں کچھ بھی نہ تھا..

نہ وہ شجر تھا اور نہ اس پر طلوع ہوتے ہوئے خوبانیوں کے سینکڑوں سورج.. کچھ تاریک درخت تھے.. جو مجھے نہ جانتے تھے..

وہ سب کچھ کہاں چلا گیا؟

شائد ایسا ہے کہ وہ شاندار شجر محض ''شمشال بے مثال'' کے سفر کے دوران ہی اس ڈھلوان شالیمار کے کناروں پر نمودار ہوا تھا.. صرف اُس ایک شب کے لیے.. ہر نئے سفر پر منظر بدل جاتا ہے..

بار بار دیکھا ہوا منظر.. ہر سفر پر بدل جاتا ہے.. وہ نہیں رہتا جو کہ وہ تھا.. آپ بھی وہ نہیں رہتے جو کہ تھے.. بدل جاتے ہیں..

جیسے دریا کے پانی وہ نہیں رہتے جو کسی ایک پل میں نظروں کے سامنے ہوتے ہیں.. وہ بدلتے رہتے ہیں.. بہاؤ میں رہتے ہیں.. نئے پانی اُترتے رہتے ہیں.. اس لیے جن پانیوں میں آپ قدم رکھتے ہیں وہ بہہ جاتے ہیں اور جب اس دریا میں چند لمحوں کے لیے آپ دوبارہ اپنا قدم رکھتے ہیں تو وہ دریا کوئی اور ہوتا ہے.. بدل چکا ہوتا ہے..

ایسے منظر بھی بدل جاتا ہے۔

ہر سفر میں شجر بدل جاتے ہیں.. گھاس، پتھر، خودرو بوٹے اور پھول بدل جاتے ہیں.. نہ آپ ان کو پہچان سکتے ہیں اور نہ وہ آپ سے شناسائی رکھتے ہیں.. اس لیے اگر آج کی شب.. اس برس.. وہ آفتابوں سے بھرا خوبانی کا درخت مجھے دکھائی نہ دیتا تھا تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہ تھی..

ہر شے بہاؤ میں ہوتی ہے.. بدلتی رہتی ہے..

ایک عمر رسیدہ لیکن ابھی تک پھرتیلی اور چاق و چوبند بیلے رینا کی مانند ماموں تلوار گھماتے ناچتے تھے..

ہم لاہور سے کسی پرائیویٹ ویگن میں سوار اسلام آباد سے براہ راست گلگت تو نہیں آ گئے تھے..

راستے میں رُکے تھے..

بشام میں شیر دریا کے سحر طراز کناروں پر قیام کیا تھا..

شاہد مرزا لاہوری کے شاندار کارپٹ میوزیم میں کچھ دیر کے لیے رُکے تھے جو بشام موٹل کے راستے میں آتا تھا.. اس کے قالینوں پر براجمان ہو کر اپنی تھکن اتاری تھی اور روسٹ چکن اور آلو کے خستہ قتلوں کا سنیک کیا تھا..

مرزا لاہوری ایک پھرتیلا لیکن نہایت سعادت مند لاہوری ہے جو کسی زمانے میں ٹورسٹ گائیڈ ہوا کرتا تھا اور پھر جاپانی زبان سیکھنے کے بعد یہیں بشام میں قالینوں کا ایک شوروم سجائے جاپانی سیاحوں کو اپنی بلکہ ان کی زبان کے دام میں گرفتار کر کے اپنی روزی کماتا تھا.. اور خوب کماتا تھا..

''تارڑ صاحب جب میں جاپانیوں کے ساتھ یکدم جاپانی بولتا ہوں تو وہ غش کھا جاتے ہیں کہ یہ پاکستانی ہے اور جاپانی بولتا ہے.. جب وہ غش کھا جاتے ہیں تو دو ہزار روپے کا لاہوری قالین دس ہزار ڈالر میں بھی خرید لیتے ہیں.. آپ میرے لیے دعا کیجیے.''

ہم راستے میں نہ صرف بشام میں رُکے تھے.. بلکہ حسب روایت برسین کے موٹل میں ناشتہ بھی کیا تھا.. لیکن اس کے بعد بھی تو کہیں رُکے تھے..

گلگت پہنچنے سے پیشتر کسی اور مقام پر بھی رُکے تھے..

اور کیا مقام تھا جہاں رُکے تھے..

کچھ یاد نہیں پڑتا لیکن پھر بھی یاد آتا ہے کہ کہاں رکے تھے..

فیری میڈو میں رُکے تھے..

''تاتو کی سرد رات میں بارش میں بھیگتی مُرغیاں''

تاتو میں بارش ہو رہی تھی۔

تاتو میں ٹپک ٹپک.. بوند بوند.. دھیمی دھیمی بارش ہو رہی تھی..

اور ہمارے خیموں پر گرتی تھی اور ہم ان خیموں میں دُبکے ہوئے تھے کہ ابھی ہمارے بدنوں پر میدانوں کی گرمی کی جھلساہٹ تھی اور ابھی جہاں سے نانگا پربت کی برفیں چند گھنٹوں کی مسافت پر تھیں وہاں خیمہ زن تھے چنانچہ قابل فہم طور پر سرد ہو رہے تھے ٹھٹھر رہے تھے..

میں نے اس سے قبل ایک بار تاتو میں رات کی تھی.. پہلی بار.. تاتو نالے کے پار گاؤں سے باہر سکول کے کمپاؤنڈ میں.. دوسری مرتبہ میں اپنے خاندان کے ہمراہ چلاس سے چلا تھا اور اسی ندی کے پار ہوا تھا جس کے کناروں پر ہمارے خیمے تھے اور اوپر شام ڈھلے فیری میڈو میں جا پہنچا تھا..

لیکن آج مجھے رات ہو گئی تھی..

باہر بوند بوند برستی اگلی سرد بارش تھی اور ایک چھدرے درخت اور ایک ٹپکتی ترپال کے نیچے خالد ندیم پیاز چھیل رہا تھا اور میاں صاحب اُن دو دیسی مرغیوں کو پکانے کی کوشش کر رہے تھے جو داسو میں پکڑی گئی تھیں.. پکڑی یوں گئی تھیں کہ داسو کے دوکاندار نے کہا تھا کہ حلال شدہ مرغیوں کا سٹاک تو ختم ہو گیا ہے البتہ چند مرغیاں جو میری ملکیت ہیں سامنے ایک کھنڈر میں ٹہل رہی ہیں.. وہ مجھ سے پکڑی نہیں جاتیں کہ پاؤں پہ پتھر لگنے سے چوٹ آ گئی ہے.. آپ خود پکڑ لیں تو آپ کی خاطر میں انہیں حلال کر دوں گا.. شاہد اور میاں نے ''آ دا آ دا'' کر کے انہیں گھیرا، پکڑا اور دوکاندار کے حوالے کر دیا.. اس میں کمال میاں صاحب کا تھا.. چونکہ وہ بازار حُسن کی قربت میں رہتے ہیں اس لیے گھیرنے اور دانہ ڈالنے میں ماہر ہیں..

انہی شکار شدہ مرغیوں کو تاتو کی سرد رات میں بارش میں میاں صاحب پکانے اور گلانے کی سعی کرتے تھے.. انہوں نے خود سے تو دیگچی میں پانی نہ ڈالا تھا لیکن اللہ میاں اس میں بارش یوں ٹپکا تا چلا جا رہا تھا کہ مرغیاں باریک شوربے میں ڈوب چکی تھیں..

ہم خود تو خیموں سے باہر نہ آتے تھے، اپنے اپنے سلیپنگ بیگز میں لپٹے ہوئے تھے البتہ وہیں سے میاں اور ندیم کی حوصلہ افزائی کے لیے نعرے بلند کرتے تھے۔ ''میاں صاحب کسی چیز کی ضرورت تو نہیں.. ندیم باہر زیادہ سردی تو نہیں.. اور سنا ئیں کیا حال ہے؟'' اور میاں صاحب نہایت بدتمیزی سے جواب دیتے۔ ''اوئے تمہارے تو.... کو ٹھنڈ ہے اور یہاں باہر ٹھنڈی ٹھنڈ ہے..''

اس پر شاہد نہایت چاپلوسی سے کہتا اپنے سلیپنگ بیگ میں دُبکا ہوا'' میاں صاحب پھر آپ تو ہمارے یار ہیں ناں، یاروں کے لیے قربانی دینا تو بڑے ثواب کا کام ہے..''

''تم باہر آ کر قربانی دے دو.. ثواب کما لو.. آدھی رات کے وقت اس پی پی سردی میں مجھے باورچی بنایا ہوا ہے.. اور یاری کے نام پر بلیک میل کرتے ہو..''

شاہد بالکل چپ..

اتنی دیر میں گرد آمیز کا ایک احتجاج تاتو کی رات میں گونجا' سائیں گیارہ بج گئے ہیں اور ابھی تک ڈنر سرو نہیں ہوا.. دیری کیوں ہو رہی ہے!''

''ہاں.. سائیں گرد آمیز تو شام کو آٹھ بجے کھانا کھانے کے عادی ہیں تو اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے'' گدا نے بھی صدا دی..

ہم سب نے نوٹ کیا تھا کہ سفر کے آغاز میں ہی گدا اور گرد یوں باہم ہوئے تھے کہ بقیہ ٹیم سے سراسر غافل ہو گئے تھے.. اور گدا.. گرد کا یوں تابع ہوا تھا جیسے زر خرید غلام ہو.. اس کے جہیز میں آیا ہو۔

گدا اگرچہ ہمارا قدیمی ساتھی تھا لیکن گرد کی آمد سے وہ یکسر بدل چکا تھا اس کی شکل و شباہت، عادات واطوار سب کچھ بدل چکا تھا.. وہ نہ صرف گرد کا ترجمان ہو چکا تھا سول سپوکس مین ہو چکا تھا.. والی وارث ہو چکا تھا بلکہ ہم سب کو اب حقیر سمجھتا تھا اور ایک خاص تحکم آمیز لہجے میں بات کرتا تھا.. وہ گرد کے ساتھ سُرخیش ہو چکا تھا.. ہم انسانی فطرت کے اس پہلو سے آگاہ نہیں تھے.. اور اس تبدیلی سے ہم سب بے حد دکھی ہوئے لیکن یہ تو محض آغاز تھا.. آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا..

گدا کی اس صدا پر کہ اتنی دیری کیوں ہو رہی ہے.. حیرت انگیز طور پر میاں کی طرف

سے کوئی جواب نہ آیا.. میاں نے یقیناً کچھ نہ کچھ زیرِ لب کہا ہوگا.. کیا کہا ہوگا.. یہ میاں صاحب کی طبیعت جاننے والے جانتے ہیں کہ کیا کہا ہوگا..

تاتو کی سرد رات، بارش، ٹپکتی ترپال کے نیچے مرغی شوربے میں تیرتی ہوئی.. ایک برس کی قید تہذیب کے بعد ویرانے میں آزادی کی پہلی رات.. اپنے خیمے میں.. ہنزو میں..

''بشام، برسین، بامیان اور رائے کوٹ پُل''

ابھی کل کی بات ہے جب ہم لاہور سے چلے تھے.. سیتا اور رام کے بیٹے لہو کے شہر لاہور سے چلے تھے..

رات حسب خصلت بشام میں کی تھی..

عمران نے اپنی ڈاکومنٹری کا آغاز یہیں سے کیا تھا.. کیمرے کو مجھ پر آن پہلی بار کیا تھا۔

بشام موٹل کی بلندی سے مجھے نیچے سندھ کی سلیٹی چادر کی کروٹوں تک لے گیا تھا..

مجھے ایک پتھر پر بٹھا کر شیر دریا کو تکتے ہوئے شوٹ کیا تھا'' تارڑ صاحب آپ سندھ کے پانیوں کے سحر میں مبتلا انہیں دیکھتے چلے جاتے ہیں اور آپ کو اپنے پرانے سفر یاد آتے چلے جاتے ہیں.. آپ نے بولنا کچھ نہیں.. سائیں سندھ میں گزشتہ زندگی کی تصویریں دیکھنی ہیں.. جیسے یہ ایک البم ہو جس کے ورق خود بخود الٹتے پلٹتے جا رہے ہوں''

سندھ کی چادر میں گزشتہ زندگی کے دھاگے بُنے ہوئے تھے.. ان دھاگوں سے تصویریں بنتی تھیں..

ان میں شاہ گوریاں بہتی چلی جاتی تھیں..

کرومبر جھیل کے پانی یوں شامل ہوتے تھے کہ سندھ میں سے اُن کے ملاپ سے ایسی مہک اٹھتی تھی کہ میرے تن بدن کو رنگتی اور مشک آور کرتی تھی..

سنولیک کی تتلیاں بہتی چلی جاتی تھیں..

فیئری میڈو کی برفوں میں سے نکلنے والا سٹرابیری کا پہلا سفید رنگت پھول تیرتا جاتا تھا۔

برجی لاء کے سفید ابھار سندھ کے ستواں پیٹ کے اوپر اُبھرتے تھے....

درکوت گلیشیئر کے لب کھلتے تھے.. اس کے گھاؤ گہرے ہوتے دکھائی دیتے تھے..

کیا کیا نہ اس سندھ سائیں کی کروٹوں میں دکھائی دیتا تھا.. لیکن میں چپ تھا.. مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں نے بولنا نہیں.. محض خواب دیکھنے ہیں.. ان کا اظہار نہیں کرنا.. شیر دریا کی موجوں کو تکتے اپنے پچھلے سفروں کو یاد کرنا ہے.. آنکھوں سے اور چہرے سے.. اور میں نے ایسا ہی کیا..

اگر رات حسب خصلت بشام میں ہوئی تو اگلی سویر ہم نے ناشتہ حسب عادت شاہراہ ریشم سے بلند ہو کر کھائیوں میں پاگل ہوتے.. پاگلوں کی مانند منہ سے جھاگ نکالتے، اباسین پر معلق برسین کے موٹل میں کیا.. اور اس موٹل کی ویران اور تنہا بلندی نے ایک مرتبہ پھر مجھے اداسی اور کسک سے دوچار کیا.. اس کے کسی ایک کمرے میں بھی نہ بھی میری اداسی اور کسک اختتام کو پہنچ سکتی تھی.. کسی عشق خاص کی موجودگی میں فیصلہ ہو سکتا تھا کہ یہ سب دوری کی نارسائی ہے یا قربت کا ملی ڈوزر اسے ملیا میٹ کر سکتا ہے.. عجیب نام تھا برسین.. جو ایک چارے کا نام بھی ہے.. اور یہ ایک شہر کا نام بھی ہو سکتا ہے.. برزین..

بشام سے چلے ہیں تو داسو میں جا رکے ہیں، مرغیاں پکڑنے کے لیے..

داسو کے پُل پر جتنے بھی خوش نظر اور عمدہ جمال کے چینی شیروں کے معصوم مجسمے تھے ان میں سے بیشتر بت شکنوں کے جذبۂ ایمانی کے نتیجے میں ٹوٹ چکے ہیں.. اُن کے دھڑ باقی ہیں اور چہرے ایمان کی قربان گاہ پر نچھاور ہو چکے ہیں۔

یہ گویا ایک ٹریلر تھا..

ایک فل لینگتھ فلم کا جو ایک برس بعد پوری دنیا کو دکھائی جانی تھی..

ہزاروں برسوں سے موجود.. دنیا کے سب سے بلند.. ایک عظیم چٹان میں سے تراشے ہوئے بامیان کے بدھ مجسمے.. جنہیں بت شکن محمود غزنوی نے بھی متروک ہو چکے عقیدے اور خدا کے طور پر ہاتھ نہیں لگایا تھا اُن پر برادران طالبان نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر.. راکٹوں.. اینٹی ایئر کرافٹ گنوں اور بارود کے ڈھیروں سے حملہ کر دیا.. بے شک افغانستان کی نصف آبادی بھوک سے مر رہی تھی.. بچے سردی سے ٹھٹھر کر منجمد ہوتے تھے، خواتین اپنے بدن ایک روٹی کے لیے فروخت کرتی تھیں اور لاکھوں افغان ہاتھ کفار کی جانب سے فراہم کردہ خوراک کے حصول کے لیے بلند رہتے تھے.. لیکن برادران طالبان پتھروں سے جنگ کرتے تھے..

اس جنگ کا آغاز شاید داسو برج کے شیروں کو توڑنے سے ہوا تھا..

میں متعدد بار افغانستان گیا ہوں ..کبھی سرسری گزرا ہوں ..کبھی قیام کیا ہے ..یہ لینڈ سکیپ کی وسعت اور آبادی ویرانی کے حوالے سے اب بھی میرے پسندیدہ ملکوں میں سے ہے ..اور ہر بار میں نے کوشش کی ہے کہ میں کابل سے بامیان جا سکوں ..اس وادی میں داخل ہوتے ہوئے بدھ کے عظیم مجسموں کو ایک پہاڑی سلسلے کی چٹانوں میں سے ..بہت دور سے ..ظاہر ہوتے دیکھ سکوں ..شائد سرشام ..شائد سویر کی ہلکی دھوپ میں ..اور پھر ان مجسموں کے عقب میں ..چٹانوں میں کھدے جو راہب خانے ہیں ..اُن میں قیام کر سکوں ..ان کی دیواروں پر جو ہزاروں برس پہلے کی تصویریں ہیں انہیں نظروں میں اتاروں ..بدھ راہبوں کی اُن کوٹھڑیوں میں سے بدھ کے پتھر بنے پیراہنوں کے پار وادیٔ بامیان کے جو منظر ہیں ان پر نظر کروں ..کبھی سرشام ..کبھی سویر کی ہلکی دھوپ میں ..

لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

کبھی مجھے ہرات پہنچنے کی جلدی تھی ..

اور کبھی ..بامیان جانے والی بس جا چکی ہوتی تھی۔

چنانچہ ایسا نہ ہو سکا ..

اور اب ..میں نے جو تصویریں دیکھی ہیں ان میں بارش خابان نہایت تمکنت سے بامیان کے گاؤں میں کھڑے ہیں اور ان کے عقب میں جو چٹانیں ہیں ان میں خلا ہیں ..خلاؤ موجود ہیں .. گوتم کے ..دنیا میں سب سے بلند ڈیڑھ ہزار برس قدیم مجسمے موجود نہیں ..ایک اخبار نے اطلاع دی کہ ان مجسموں میں سے ایک کا ایک بازو ابھی تک موجود ہے جو تباہ نہیں کیا جا سکا ..

میں اب بھی اس ایک بازو کے لیے بامیان جانا چاہتا ہوں۔

لیکن ہم تو داسو میں تھے ..بامیان میں نہیں تھے ..ہم آگے بڑھ گئے ..

پُل کے پار گئے اور سندھ کے دوسرے کنارے پر سفر کرنے لگے ..

یہیں وہ پہلی آبشار آئی۔

شدید گرمی میں اس کی پھوار بدن کو زندہ کرتی تھی۔

لیکن بلندی سے اترتی ہوئی اس آبِ رواں کے اردگرد پانی کے بولے تھے جو اس کے گرنے سے دوہرے ہوتے تھے۔

یہاں مجھے اسلام آباد کی ایک پارٹی میں نہایت وسیع الظرفی سے بغل گیر ہونے والے

ایک سینیٹر بیوروکریٹ چیمہ صاحب یاد آ گئے ..

"تارڑ صاحب ..ہم بھی آپ کے شمال گئے تھے ..آپ کے سفرنامے پڑھ پڑھ کر گئے تھے .."

"کہاں گئے تھے"

"یہ تو کچھ یاد نہیں کہ کہاں گئے تھے بس یہ یاد ہے کہ داسو کے پُل کے پار شاہراہ اور پتھر پر ایک آبشار گرتی تھی ..اور ہم نے اپنے گلاسوں میں بلیک لیبل انڈیل کر انہیں اس آبشار کے ٹھنڈے پانیوں سے لبریز کیا تھا ..اور پھر وہیں رات ہو گئی تھی .."

"سر آپ کتنے روز وہاں ٹھہرے تھے .."

"یہ بھی یاد نہیں ..بس یوں سمجھ لیجیے کہ ہم سکاچ وسکی کے دو کریٹ اور بیئر کے چار کریٹ وہاں رہے تھے ..ہم دیوسائی بھی گئے ..معلوم نہیں وہاں کتنے دن ٹھہرے ..بس یہ یاد ہے کہ وسکی کی پانچ بوتلیں اور بیئر کی بیس بوتلیں ٹھہرے ..ہمارا حساب کتاب بس اس حساب سے ہوتا ہے ..دن وغیرہ بھول جاتے ہیں .."

اس آبشار کے آگے چلاس تھا ..تتا پانی تھا ..اور پھر شام ہوئی تھی جب رائے کوٹ کا پُل نظر آیا تھا ..

رائے کوٹ کے پُل پر میلہ لگا تھا ..چائے خانے کُھل چکے تھے ..درجنوں جیپیں سیاحوں کو تاتو تک لے جانے کی منتظر تھیں ..شنگریلا کے بے آباد موٹل کے گیراجوں میں اوپر گئے ہوئے سیاحوں کے کوسٹر اور کاریں کھڑی تھیں ..

کبھی یہاں کچھ بھی نہ تھا۔

اور جب یہاں کچھ بھی نہ تھا تو صرف میں تھا ..اور بے یقینی اور خوف تھا اور میرا خیمہ تھا .. پُل کے دامن میں جہاں ریت اب بھی کچھ دبی ہوئی تھی کہ شیر دریا کے عین اوپر میرا خیمہ تھا ..ہر شام بوندروچ کی تیز دھار اور بلند چٹانوں سے چند پورٹر اُترتے تھے جن میں سے مولوی رحمن اور قدم خان اور ان کے دو گدھے میرے سامان کے نصیب میں تھے ..پُل کے پار ایک تنبو تھا اور اس کے نیچے تھے ..اور کچھ نہ تھا ..نہ تاتو تک جاتی روڈ تھی نہ جیپیں تھیں اور نہ چائے خانے تھے .. کچھ بھی نہ تھا سوائے خوف اور بے یقینی کے ..کیا معلوم اوپر کہیں فیری میڈو نام کی کوئی جگہ ہے بھی کہ نہیں ..میں کسی ایسے شخص سے نہیں ملا تھا جو وہاں تک جا چکا تھا ..اور اب ہر دوسرا شخص جا چکا تھا ..

جیپ پر سوار ہو کرتا تاتو تک ..اور پھر چند گھنٹوں کی چڑھائی کے بعد فیئری میڈو...میں بھی تو اپنے بال بچوں سمیت آج سے آٹھ برس پیشتر اسی طور اوپر گیا تھا..اور پہلی بار کب گیا تھا..شاید سترہ برس..اٹھارہ برس..یا شاید سو برس پہلے جب تاتو کے گاؤں تک پہنچنے کے لیے بولڈر رج کی قہر انگیز گرمی اور بلندی پر چلنا پڑتا تھا..کئی کوہ نورد آدھے راستے سے واپس آ جایا کرتے تھے..

اس بار ہمارے پاس ایک ذاتی کوسٹر تھا جو ہماری مرضی کا تابع تھا..بے شک داسو میں رک کر مرغیاں پکڑ لیں..اس کوسٹر کو ایک گیراج میں بند کر کے تین جیپیں حاصل کی گئیں ان میں سے ایک میرے دوست رحمت نبی کی ذاتی جیپ تھی جو خصوصی طور پر مجھے لینے کے لیے اتری تھی..

عمران بابر اینڈ کمپنی رائے کوٹ پل پر اترتے ہی متحرک ہو چکی تھی..

"سر جی.." عمران نے بیک وقت اپنی نیکر ٹٹولتے اور عینک درست کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا "شوٹنگ شروع کرتے ہیں.."

"تو کر دو.."

"نہیں سر پہلے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ڈاکومنٹری کی بنیادی تھیم کیا ہوگی..اس کو ذہن میں رکھ کر شوٹ کریں گے"

"تھیم یہ ہوگی کہ ایک شخص..یعنی کہ یہ فقیر حقیر بندۂ پُرتقصیر..اٹھارہ برس پیشتر یہاں آیا تھا..بولڈر رج کے راستے تاتو اور پھر وہاں سے فیئری میڈو پہنچا تھا اور اس نے اپنے اس مہماتی سفر کو "نانگا پربت" میں بیان کیا تھا اور اس کتاب کی اشاعت کے بعد بہت سوں نے اُدھر کا رخ کیا تھا..تو تھیم یہ ہوگی کہ ایک نسبتاً نوجوان شخص جب پہلی بار فیئری میڈو گیا تھا تو وہ کیا تھا..اور اب ایک نسبتاً بوڑھا شخص وہاں پہنچے گا تو وہ کیا ہوگا..

"شوٹ.." عمران نے حکم دیا..اور شوٹنگ شروع ہوگئی..

اور شوٹنگ شروع ہوئی تو تاتو تک پہنچتے پہنچتے رات ہوگئی..تاریکی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ شمال کی خوفناک ترین روڈ پر جب ہماری جیپیں اُچھلتی اور گھومتی جاتی تھیں تو ہم کچھ دیکھ نہ سکتے تھے..نہ گہرائی میں گم تاتو نالے کو..نہ سڑک کی خطرناکی اور ہولناک موڑوں کو..اس لیے ہمارے دل اپنے مقام پر ٹھہرے رہے اُچھل کر حلق میں نہ آئے..البتہ نیم تاریکی میں نالے کے دوسری جانب آسمان رفعتوں کی بولڈر رج میں وہ چھوٹا سا راستہ دکھائی دیتا تھا جس پر میں چلا تھا..اور یہاں سے یہ سو فیصد ناممکن لگتا تھا کہ کوئی ذی روح اس پر چل بھی سکتا ہے..

تاتو میں رات ہوگئی تو ہم اوپر نہیں جا سکتے تھے اس کے ندی کنارے کے ہوٹل کی کیمپنگ میں خیمہ زن ہو گئے..اور پھر بارش شروع ہوگئی..

ندیم پیاز چھیل رہا تھا..میاں مرغیاں پکا رہا تھا اور اُن میں بارش کا پانی ٹپ ٹپ گرتا تھا..

ہم اپنے خیموں میں ڈکے ہوئے تھے اور سردی ہڈیوں کے گودے کو جاتی تھی..نانگا پربت اوپر کہیں تنگی تھی اور بہت ہی ننگی تھی..

ہائے اللہ جی میں کیا کروں.. شل مکھی کا دیدار...
سو چہروں والی نانگا پربت کی برہنگی

شب گزر رہی گئی.. جو ہم پہ گزری سو گزری.. سویر ہو گئی..

کیا نکھری ہوئی کنوارے جوبن کی سویر تھی.. جو فضا تھی گویا خنک نمی کا باریک شیشہ تھا جو سانس لینے سے ٹوٹتا تھا، جو ہوا تھی اس میں جنگلی بوٹیوں کا نشہ ہی نشہ مہکتا تھا، اور قربت یار میں جو مدھم آنچ آتی ہے ایسے نانگا پربت کی قربت سے سرد سندیسے آتے تھے کہ میں تمہارے قریب ہوں..

ہمارے سامان کو اوپر تک لے جانے کے لیے حسب معمول ایک ہنگامہ سا ہوا تھا.. پھر لاٹری کے ذریعے فیصلہ ہوا کہ کن خوش نصیبوں کے حصے میں ہمارا سامان آئے گا.. خوش نصیب اس لیے بھی کہ انہوں نے دو تین گھنٹوں کے اندر اندر اوپر پہنچ جانا تھا اور ہم سے چار سو روپے فی کس ہتھیا لینا تھا.. یہ صرف شمال کے نہیں پاکستان کے بھی مہنگے ترین پورٹر تھے اور کوہ نوردوں کا خون نچوڑ لینے پر قادر تھے.. یہاں بندہ مزدور کے اوقات ہرگز تلخ نہ تھے..

پورٹر ہمارا سامان اپنے کندھوں پر بوجھ کر کے روانہ ہو چکے تھے۔

کچھ ساتھیوں نے متروک شدہ سڑک پر چل کر اوپر پہنچنے کو ترجیح دی.. یہ راستہ اگرچہ طویل تھا' لیکن باقاعدہ اور قدرے آسان تھا..

فنتوری والا راستہ کب کا ترک ہو چکا تھا' لیکن مجھے ایک اٹھارہ برس پرانے خواب کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے اسی راستے سے اوپر جانا تھا.. اور میں جانتا تھا اگر چاہ تو جان سے جاتا تھا..

لیکن یہاں شوٹنگ کے آغاز سے پیشتر ایک قضیہ ہو گیا..

پہلے تو میں ایک خاموش اداکار تھا.. لیکن آج مجھے کیمرے سے مخاطب ہو کر بولنا تھا تو عمران نے مجھ سے پوچھا ''سر زبان کونسی ہو گی؟''

''کس کی زبان؟''

''آپ کی زبان سر.. لینگویج سر.. ڈاکومنٹری میں آپ ہمارے بڈھے شیر ہیں تو یہ شیر دیکھنے والوں سے کس زبان میں گفتگو کرے گا..''

''شیر تو صرف دھاڑتا ہے عمران!''

''آپ اگر دھاڑنے کے قابل ہوتے تو میں یہ سوال پوچھتا! طے کرنا ہو گا کہ آپ کونسی زبان میں منظر کو بیان کریں گے''

''میرا خیال تھا کہ ہم صرف شوٹ کریں گے اور بعد میں اطمینان سے بیک گراؤنڈ کومنٹری ریکارڈ کر لیں گے..''

''نہیں سر یہ دراصل ڈاکومنٹری نہیں ہو گی بلکہ ڈرامہ ہو گا.. اور ڈرامہ آپ کریں گے.. اپنی اداکاری کے زمانوں کا تجربہ سامنے لائیے اور بولیے.. تو کونسی زبان میں بولیں گے؟''

''وہ.. میں ذرا گھبرا گیا ہکلا گیا'' بھئی فی البدیہہ بولنے کے لیے بھی کچھ تیاری کرنی پڑتی ہے.. ذہن میں ایک سکرپٹ بنانی پڑتی ہے.. تو یہ ہے کہ.. بس اردو چلے گی اور پنجابی لہجے میں بہت ہی چلے گی..''

''نہ جی..'' عمران جو کبھی کبھی قدرے نسوانی ہو جاتا تھا یہ ''نہ جی..'' کہتے ہوئے ہو گیا' ہو سکتا ہے ہمارا معاملہ کسی ڈسکوری یا نیشنل جیوگرافک ٹائپ کی غیر ملکی چینل سے طے پا جائے تو.. آپ انگریزی بولیں گے..''

''انگریزی؟'' میں مزید گھبرا گیا مزید ہکلا گیا'' یار میری انگریزی بڑی کمزور ہے''

''وہ تو آپ کی اردو بھی بڑی کمزور ہے سر جی'' یہ کاظمی تھا ایک ہنستا ہوا انگریز بگڑ ہو گیا..

''شٹ اپ کاظمی..''

''سوری سر.. آئی ایم شٹ اپ'' اس نے اپنا قہقہہ سمیٹ کر منہ پر ہاتھ رکھ لیا..

''سر جی'' عمران نے مجھے تسلی دی'' آج کل انگریزی کمزور ہی چلتی ہے بلکہ آپ جتنی اوٹ پٹانگ انگریزی بولیں گے باہر کے ویورز زیادہ پسند کریں گے.. ذرا مشرقی اور نہایت پُراسرار ماحول پیدا ہو جائے گا.. تو بسم اللہ کیجیے..''

"بسم اللہ کی انگریزی کیا ہوتی ہے"

"بسم اللہ آپ بے شک پنجابی میں بولیے اور اس کے بعد بلا سوچے سمجھے جو جی میں آئے بولتے جائیے.."

"ہاں اگر میں سوچ سمجھ کر بولوں گا تو کچھ نہیں بولوں گا.. یہ بہتر ہوگا کہ میں آج کل کے پرندہ کمپیئرز کی مانند بے دریغ اور بلا سوچے سمجھے انگریزی بولتا جاؤں"

"تو بسم اللہ.."

میں سڑک پر گرنے والے ایک خنک چشمے سے اپنا چہرہ تر کرتا ہوں۔ ہاتھ جھٹک کر چند چھینٹے اُڑاتا ہوں اور پھر سڑک کے کنارے اُٹھتے متروک شدہ راستے پر چڑھنے لگتا ہوں.. یہ نہایت کٹھن چڑھائی ہے.. میں دو چار قدم اٹھانے کے بعد ہونکنے لگتا ہوں.. میرا دم پھولنے لگتا ہے.. پھول کر کُپا ہو جاتا ہے.. میں رُکتا ہوں.. کسی پتھر کا سہارا لیتا ہوں اور جب دم کپا سے قدرے پچکی ہو کر سمٹتا ہے تو اسے سنبھالتا پھر سے چڑھنے لگتا ہوں اور مجھ پر وہ گانا آشکار ہوتا ہے کہ کی دم دا بھروسہ یار.. دم آوے نہ آوے..

میں آہستہ آہستہ چڑھ رہا ہوں اور عمران اور اس کے دونوں بغل بچے پتہ نہیں کیا کیا پیچیدہ آلات تصویر کشی تھامے میرے پیچھے یوں چلے آتے ہیں جیسے میرا شکار کرنے کو آئے ہوں.. مجھے بچ بچ شوٹ کرنے آئے ہوں۔

تاتو پیچھے رہ گیا..

نہایت پیچھے رہ گیا..

نیچے بہت نیچے پہاڑ کے پیندے میں نظر آنے لگا..

پچھلی شب جہاں ہمارے خیمے نصب تھے وہ مقام فضائی منظر ہو گیا..

وہی مقام جہاں رات کے بارہ بجے سرد بارش کی کپکپاہٹ میں ہم نے شکار شدہ مرغیاں کھائی تھیں۔ اس سے بہتر طعام نانگا پربت کو زیر کرنے والے جرمن کوہ پیما ہرمن بوہل کے نصیب میں بھی نہ ہوگا.. اگرچہ گلداب بھی احتجاج کرتا تھا کہ سائیں گرو کے ڈنر کو دیری ہو گئی ہے اور شوربہ بہت پتلا ہے.. ان مرغیوں کی ہڈیاں اس کیمپنگ میں ابھی تک بکھری ہوئی تھیں لیکن اس بلندی سے نظر نہ آتی تھیں.. ہم اتنے بلند اور اونچے ہو چکے تھے..

عمران اپنی نیکر ٹٹول کر.. داڑھی کھجلا کر اپنی ایئر ہوسٹس بیگم کو اس عمل کے دوران یاد

کرکے ایک آہ بھر کے شاٹ کا تعین کرتا "سر جی آپ اس خطرناک کنارے کے اوپر چلیں گے اور میرا کیمرہ آپ کے جوگرز پر ہوگا.. اور آپ نے چلتے ہوئے جان بوجھ کر اس کنکر کو ٹھوکر مارتے گزرنا ہے.. میرا کیمرہ اس کنکر کو ڈھلوان پر سے گرتے ہوئے فالو کرے گا اور یہ کنکر کہیں گہرائیوں میں گم ہو جائے گا.. تاکہ یہ اسٹیبلش کیا جا سکے کہ آپ کتنی خطرناک بلندی پر چل رہے ہیں.. اپنی جان کو داؤ پر لگا رہے ہیں.."

"لیکن عمران! اس کنکر کو ٹھوکر مارتے ہوئے یہ نہ ہو کہ میں اپنا توازن کھو دوں اور خود بھی لڑھک جاؤں"

"اس کی آپ پروا نہ کریں.. اگر آپ لڑھک جائیں گے تو میرا کیمرہ آخری دم تک آپ کو فالو کرے گا.. تاآنکہ ہر سو خاموشی چھا جائے اور ہر کوئی جان جائے کہ ایک مصنف ایک کوہ نورد بالآخر ہمیشہ کے لیے کھائیوں میں گم ہو چکا ہے"

"یعنی تم اور تمہارے بغل بچے میری مدد کو نہیں آئیں گے؟"

"نہیں سر.. ہم آپ سے زیادہ آپ کے آخری شاٹ میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں کیونکہ ہم کمینے لوگ ہیں"

جو خود اقرار کرتے ہوں کہ وہ کمینے ہیں تو انہیں کمینہ کہنے سے فائدہ!

دراصل وہ یہی تمنا رکھتے تھے..

اس آس میں تھے کہ میں کسی بلندی سے لڑھک جاؤں اور وہ ایک تاریخی شاٹ شوٹ کرنے میں کامیاب ہو جائیں.. ان کی کمینگی کی کوئی حد نہ تھی..

عمران ہدایات جاری کرتا رہا "یہاں سے گزر کر آپ اس سالخوردہ نہایت تجریدی اور سوکھے ہوئے درخت کے تنے میں داخل ہو کر دوسری جانب نکلیں گے اور یکدم آپ اپنے آپ کو ایک انتہائی پُرخطر بلند کنارے پر پائیں گے اور خوفزدہ ہو جائیں گے لیکن پھر بھی مسکرائیں گے کہ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا.. اور پھر آہستہ آہستہ چلتے اس جھاڑی کے عقب میں روپوش ہو جائیں گے اور ہاں.. کوشش کیجیے کہ چلتے ہوئے آپ جوگرز کو سنگریزوں پر ذرا گھسیٹ کر چلیں تاکہ میں ان کی ساؤنڈ ریکارڈ کر سکوں.. تو بسم اللہ"

انسان کو کتنی شہرت اور سستی ناموری کے لالچ میں کیا کیا نہیں کرنا پڑتا.. اور میں نے بھی کیا.. یعنی کیا کیا.. کیا۔

اور پھر اکثر اوقات عمران اپنی ندامت شرمندگی سے کھسیانے لگتا.. "سوری تارڑ صاحب.. میری غلطی ہے.. میں آؤٹ آف فوکس ہو گیا تھا.. آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن ذرا پھر سے نیچے اُتر جائیں اور دوبارہ اسی راستے پر چڑھتے ہوئے اوپر آ جائیں۔"

میں واقعی اس روز بدکو کوستا تھا جب میں نے اس ڈاکومنٹری میں معاونت کی حامی بھری تھی.. بوجھل قدموں سے گرتا پھسلتا پھر نیچے چلا جاتا کبھی بیس فٹ نیچے جاتا اور کبھی بیس میٹر اور پھر کشمیری ہاتو کی مانند سر جھکا کر پہاڑ پر چڑھنے لگتا.. اس روز کم از کم تین بار میں تقریباً فنتوری تک پہنچا.. پھر تقریباً تا تو تک نیچے آیا اور پھر چڑھا..

چنانچہ میری ٹانگوں میں جتنی مچھلیاں تھیں وہ پھڑک پھڑک کر ساکت ہو گئیں..

جتنی رگیں تھیں وہ پھٹنے کو آ گئیں..

اور جتنے پٹھے تھے وہ چڑھ گئے اور اُلو کے پٹھے ہو گئے..

اور مجھ میں ارادے اور ہمت کے جو چند ایک بلب ابھی تک ٹمٹماتے تھے وہ سب فیوز ہو گئے..

لیکن خود کردہ را علاج نیست.. میں نے جان بوجھ کر یہ بی پی پنگھا لیا تھا..

لیکن ایک بات نے مجھے بے حد حیران کیا.. میں سمجھتا تھا کہ عمران، کاظمی اور طاہر نیشنل کالج آف آرٹس کے کُبا کلچر کے نمائندے ہیں.. اگرچہ آرٹی کرافٹی ہیں.. لیکن قدرے نسوانی ہیں.. تھوڑے افیمی ہیں بہت چرسی ہیں اور یہ پورا وقت اونگھنے میں یا ہوا میں انگلیوں سے تصویریں بنانے میں گزاریں گے.. لیکن جب ان تینوں نے اپنے آلات تصویر کشی و صوت سنبھالے تو ان کی پھرتی.. ہمت اور اَن تھکی نے مجھے حیران کر ڈالا.. وہ پارے کی مانند متحرک اور بے چین ہو گئے..

میں تو ان کے لیے ایک انسان نہ تھا بلکہ کسی جنگلی حیات کے پارک میں کسی شیر سے جان بچاتا ہوا ایک لومڑ تھا جسے وہ فالو کر رہے تھے.. اسے فلم بند کر رہے تھے.. بالآخر فنتوری کا طلسمی دروازہ آ گیا..

اس چوبی گیٹ پر میں نے اٹھارہ برس پیشتر اپنا ہاتھ رکھا تھا اور اسے ایک اَن جانی بہشت میں داخل ہونے کے لیے دھکیلا تھا۔ آٹھ سال پہلے میری بیٹی عینی نے اسے وا کیا تھا اور میمونہ یہاں تک پہنچتے پہنچتے بے دم ہو کر اس کے ساتھ کمر لگا کر سستانے لگی تھی..

مجھے اس پھاٹک میں سے بھی متعدد بار گزارا گیا.. واپس لایا گیا.. پھر سے گزارا گیا..

شوٹنگ کا مرحلہ طے ہوا تو ہم اس پھاٹک کے پار ہوئے..

پار فنتوری تھی..

فنتوری ایک فینٹسی..

لیکن پار ہوئے تو پار کچھ بھی نہ تھا..

نہ فینٹسی تھی.. نہ

فنتوری تھی..

میں جو اس کی آتشِ دید میں بھڑکتا چلا آیا تھا.. بھک سے بُجھ گیا..

پار کچھ بھی نہ تھا..

فنتوری ایک اُجڑا ہوا میلہ تھا..

دھول اُڑتی تھی.. جھرنے اور چشمے خاموش پڑے تھے.. خشک پڑے تھے اور اُن کی نالیوں اور گزرگاہوں سے دھول اُڑتی تھی.. سرد پانیوں کی نہریں، ویران اور بیوہ ہو چکی تھیں.. اُن کی ترل رل اور نغمگی ایک قصۂ پارینہ تھی..

کوئی ایک.. صرف ایک ہی.. کوئی پھول نہ تھا..

خنکی کا ایک جھونکا نہ تھا..

سیاہ گلابوں کی جھاڑیاں پژمردہ اور کسی ایک بھی پھول سے نا آشنا.. اور سامنے بھی.. کچھ نہ تھا.. نانگا پربت کی برفوں کے انباروں کا ایک سفید ذرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا.. وہاں گھنے بادل تھے..

وہ جنت کیسی جس میں نہریں نہ چلتی ہوں.. وہ باغِ ارم کیا جس میں کوئی پھول نہ ہو اور وہ فنتوری کیا جس کے اوپر نانگا پربت کی برفیں حکمران نہ ہوں..

میں نہ صرف بجھ گیا بلکہ بے حد خجل اور شرمندہ بھی ہوا اور مجھے یقین محکم تھا کہ اس بے روح اُجڑے ہوئے منظر کو دیکھ کر عمران اور اس کے دونوں بغل بچے مجھے مشترکہ طور پر زدوکوب کرنے لگیں گے کہ سر جی اپنے سفرناموں میں اتنی دروغ گوئی کرتے ہو.. یہ ہے کہ آپ کی فنتوری ایک فینٹسی.. ایسی ہوتی ہے فنتوری..

لیکن صاحبو! ایک عجیب ناقابلِ یقین وقوعہ ظہور پذیر ہوا.. یعنی جونہی ہم پھاٹک پار کر کے فنتوری کے اس اجڑے ہوئے میلے میں داخل ہوئے تو اسے اپنے سامنے پا کر عمران

باقاعدہ غش کھا کر گرنے کو تھا کہ کاظمی اور طاہر نے اسے سنبھال لیا۔
اگرچہ یہ محرم کے ابتدائی ایام نہ تھے لیکن عمران سینہ کوبی کرتا ماتم کرنے لگا.. "ہائے اللہ جی.. ہائے اللہ جی.."

یہ بندہ اداکاری کر رہا ہے یعنی مجھے زدوکوب کرنے سے پیشتر اس لئے میں اپنے دفاع کی خاطر شرمندگی سے باہر آ کر بظاہر غصیلا ہوگیا "اوئے تمہیں ہوا کیا ہے؟؟"

"ہائے اللہ جی".. وہ ماتم کرتا رہا..

"عمران.. تم ٹھیک تو ہو؟؟"

"ہائے اللہ جی.." اس نے مجھ سے مخاطب ہونا ضروری نہ سمجھا اور براہ راست آسمان سے باتیں کرنے لگا "ہائے اللہ جی.. میں اب کیا کروں.. آپ نے مجھے یہ کیوں دکھایا.. اور اب جا کر کیوں دکھایا پہلے کیوں نہیں دکھایا، اللہ جی ہم آپ سے نہیں بولتے.. آپ کی اور ہماری کُٹی.."
عمران اس اُجڑی ہوئی فنتوری کو دیکھ کر بھی حواس کھو بیٹھا تھا اور بین کئے چلا جا رہا تھا۔ "میں نے سمجھا تھا کہ تُو ہے تو درخشاں ہے حیات.. یعنی اگر مری نتھیا گلی اور کاغان ہیں تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے.. یعنی باقی کیا ہے.. لیکن اللہ جی یہ کیا ہے.." پھر وہ مجھ سے گلے گزاریاں کرنے لگا۔ "کیوں تارڑ صاحب آپ یہ مجھے کہاں لے آئے ہیں.. سر جی آپ نے یہ کیا بنا دیا ہے؟؟"

"میں نے نہیں اللہ میاں نے بنایا ہے اور یقین کرو عمران میں نے "نانگا پربت" اور "یاک سرائے" میں حقیقی طور پر رنگ آمیزی نہیں کی تھی کوئی مبالغہ نہیں کیا تھا.. یہاں واقعی جب میں آیا تھا تو برفیلے پانیوں کی روانی راج کرتی تھی.. ان کے گیت اس فضا کو نم کرتے تھے، یہاں گلاب کی جھاڑیوں کے پتے پھولوں سے ڈھکے ہوئے تھے.. بھنوروں کی بھنبھناہٹ اور تتلیوں کی پھڑ پھڑاہٹ اڑتی ہوئی تھی اور سامنے نانگا پربت کی برفیں امڈتی آتی تھیں اور آنکھوں میں بھی برف بھرتی تھیں.. لیکن.. پتہ نہیں ہم کون سے موسموں میں ادھر آ نکلے ہیں کہ یہاں اب کچھ بھی نہیں ہے.. آئی ایم سوری"۔

"یہ اچھا ہے کہ اب یہاں کچھ بھی نہیں ہے.. اگر وہ سب کچھ یہاں ہوتا جو آپ کہہ رہے ہیں تو پھر یہاں سے مرا جنازہ ہی اٹھتا.. ہائے اللہ جی!"
شاید عمران کے لیے جتنی بھی اور جیسی بھی فنتوری تھی کافی تھی، اس کے لیے تہہ در تہہ رائے کوٹ گلیشیر کے بلند کنارے پر بچھے سرسبز کھیت، ان کی ہریالی میں لکڑی کے دیدہ زیب

جھونپڑے جن میں مویشی بھی تھے اور انسان بھی.. ایک بہت ہی بلند سرد موجودگی.. آسمان کی قربت، جھاڑیوں میں گم ہوتی پگڈنڈیاں، دنیا جہان سے کٹی ہوئی اور بہت بلند پہاڑوں کی تنہائی اور ابھی ابھی سامنے ایک سپاٹ افق میں سے گہرے بادلوں کے ایک کونے میں سے دکھائی دینے والی نانگا پربت کی برفوں کے ایک مختصر حصے کی ایک واجبی سی جھلک ہی کافی تھی..
شاید میں موازنہ کر رہا تھا اور اس کے پاس کوئی پیمانہ نہ تھا..
اس کے لیے فنتوری اس کی زندگی میں آنے والا پہلا عشق خاص تھا جو اس کے سامنے تھا.. اُس نے کسی اور کو دیکھا ہی نہ تھا اس لیے اور میرے لیے اجڑی ہوئی فنتوری کو دیکھ کر وہ لوٹ پوٹ ہوگیا تھا بلکہ جاں بحق ہوتے ہوتے بچا تھا..
کاظمی، طاہر بھی متاثرین میں شامل تھے لیکن وہ چپ تھے.. اظہار نہیں کر رہے تھے..
عمران کی حالت مسلسل غیر ہوتی چلی جا رہی تھی..
"ہائے اللہ جی، ہائے اللہ جی" وہ مسلسل شکایت کر رہا تھا..
"کاظمی"
"جی سر" وہ دانت نکالتا حاضر ہوگیا..
"یار اپنے پاس کا کچھ کرو ورنہ یہ شہید ہو جائے گا"
"کچھ کر دوں سر؟"
"ہاں کردو"
"ایک ہی علاج ہے سر.. آپ اگر اجازت دیں تو ہتھیلی پر مسلتے ہوئے تمباکو سے ایک سگریٹ تیار کر کے اس کو سوٹے لگوائے جائیں.. اگر آپ اجازت دیں تو.."
"اجازت ہے"
"تو سر اگرچہ ہم ظاہر نہیں کر رہے.. یعنی میں اور طاہر.. ظاہر نہیں کر رہے لیکن اس منظر کو دیکھ کر ہم بھی نوحہ گی کے قریب ہیں.."
"تو پھر.."
"تو پھر یہ کہ.. ایک نہیں تین سگریٹ تیار ہوں گے.. اگر آپ اجازت دیں"
"پھر اجازت ہے"
چنانچہ کاظمی نے فوراً نہایت چابکدستی سے تین عدد سگریٹ مینوفیکچر کئے جن کا سکون

آور دھواں ان کے حلق میں اترا اور نہ صرف وہ دونوں بلکہ عمران بھی کچھ بحال ہوا..

بحال ہونے پر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ پہلے میرے قدم چھوئے اور پھر میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا "سر جی آپ گریٹ ہیں..آپ ہم تینوں کو یہاں لے آئے..اب حکم کریں کہ میں آپ کے لیے کیا کروں؟"

"تم یہ کرو کہ اپنے کیمرے اور مائیک وغیرہ سنبھال کر اس سین یا منظر کو فلم بند کرو.. یہ کرو" میں اس کی ماتمی ہائے اللہ جی ہائے اللہ جی سے تنگ آ چکا تھا اس لیے غصے میں تھا.. یہ عجیب واہیات اور لگڑ بگڑ قسم کا کراؤڈ تھا جسے میں اپنے ساتھ لے آیا تھا.. میاں، خان سلیم، شاہد، حسن اور خالد ندیم سے سراسر مختلف مزاج کا کراؤڈ اور وہ بھی ایسا کہ اس کی ذہنی حالت بالکل مخدوش..

جب میں نے عمران سے "یہ کرو" کہا تو وہ فوری طور پر اپنی ہائے اللہ جی کی گردان ترک کر کے سیدھا اور متحرک ہو گیا، اپنا ساز و سامان یوں آرگنائز کرنے لگا جیسے ورلڈ وار شروع ہونے کو ہو..اس عمران میں یہ عجیب کوالٹی تھی کہ وہ ابھی ایک لمحے نہایت لاپرواہ، بونگا اور بیہودہ ہو جاتا تھا اور دوسرے لمحے اتنا پروفیشنل اور ٹو دی پوائنٹ ہو جاتا تھا کہ طوطے کی طرح آنکھیں بدل لیتا تھا آپ کو پہچاننے سے انکاری ہو جاتا تھا اور صرف اپنے کام کو پہچانتا تھا اسی سے غرض رکھتا تھا..

میں نے اپنی ٹی شرٹ کو توند پر کھینچ کر برابر کرنے کی کوشش کی، نیلی جین کو کانوں سے پکڑ کر اونچا کیا اور کیمرے کے سامنے کھڑے ہو کر ذرا ہیرو بن کر..اپنے ناکافی بالوں کو کافی سے زیادہ ماتھے پر بکھیر کر ایک خزاں رسیدہ پیلے دانتوں والی مسکراہٹ بکھیر کر کہا "عمران..کیمرہ آن کرو..میں اب بیان کروں گا کہ آج سے اٹھارہ برس پیشتر..جب آتش نسبتاً جوان تھا اس فنتوری میں داخل ہوا تھا تو اسے پہلی بار اپنے سامنے پا کر اس کی کیا حالت ہوئی تھی..یعنی کیا حالت غیر ہوئی تھی.."

عمران نے کیمرے کے ویو فائنڈر پر جھکے ہوئے کچھ دیر توقف کیا اور پھر سر اٹھا کر نہایت بے رخی سے بولا "تارڑ صاحب پلیز آپ اس منظر کو برباد نہ کریں..منظر کو ہلاک نہ کریں..پلیز نکل جائیں یہاں سے..میں صرف نانگا پربت کو شوٹ کرنا چاہتا ہوں جس پر سے بادل ہٹتے جا رہے ہیں، آپ کو اس منظر میں شامل کر کے میں ویورز کو ہنسانا نہیں چاہتا..پلیز.."

میرا دل اور میری انا دونوں پاش پاش ہو گئے..کہاں وہ دن تھے کہ ہماری موجودگی منظر کو بناتی تھی اور کہاں یہ دن کہ ہم منظر کو بگاڑتے تھے..اللہ تعالیٰ جسے چاہے اسے عزت دیتا ہے اور

پھر اس قسم کی ذلت کہ عمران جیسے ہماشما بھی بے عزت کر دیتے ہیں..

لیکن وہ درست کہتا تھا..

کہیں بلند پہاڑوں میں قدرت کا جو سحر انگیز حسن ہوتا ہے اس میں ایک انسان بے حد فالتو اور بے وجہ ہوتا ہے..اور اگر وہ انسان مجھ جیسا بے ڈول اور عمر رسیدہ ہو تو وہ ریشم میں ٹاٹ کا ایک ایسا پیوند ہو گا جسے وہاں نہیں ہونا چاہیے..اس لیے میں منظر سے ہٹ گیا..

نانگا پربت..شل کھی..سو چہروں والی برف پوش چوٹی..اس کے ہر چہرے پر سے گھنے بادل دھیرے دھیرے سرکتے جاتے تھے..وہ عیاں ہوتا جاتا تھا..اس کی سرد برہنگی کے آگے جو حجاب تھے وہ اٹھتے جاتے تھے..وہ ایک ایسی زرد شہزادی تھی جس کے ریشم و اطلس کے لبادے اترتے جاتے تھے اور اس کا گورا بدن اور سنہری ابھار اور اس کا سرو قد ظاہر ہوتا جاتا تھا..وہ مکمل سپردگی کے انداز میں اپنے آپ کو کھولتی تھی..برہنہ ہو کر لیٹتی وہ دیوں گھنے بادلوں کی اوٹ میں سے ظاہر ہو کر فنتوری پر اُمڈتی آتی تھی۔ کسی ایک جنم میں اس سے بڑھ کر کوئی اور خوش بختی نہ تھی..

اور اس کا کمال یہ تھا کہ اس مکمل سپردگی اور سفید عریانی میں بھی چپ تھی..اس کے لبوں سے کوئی "آہ" کوئی "ہائے" نہ نکلتی تھی..

اگرچہ وہاں پانی نہ تھے..فنتوری میں سرسراہٹوں کی آبی اور سرد آہٹیں نہ تھیں اور نہ ہی گلابوں کے جھگھٹے تھے لیکن وہاں اب نانگا پربت تو تھی..

جو دنیا بھر میں کہیں اور نہ تھی..

وہ شل کھی تھی..

اس کے سو چہرے تھے..اور ہر برف چہرے پر سے نقاب اٹھتا جا رہا تھا....آہستہ آہستہ! کسی ایک جنم میں اس سے بڑھ کر کوئی اور خوش بختی نہ تھی....

''فیری میڈو مجھ سے شکائت کرتا ہے..
مجھے کیوں بیان کردیا..تارڑ پتھر 92ء''

کہاں وہ دن کہ پروائے ننگ و نام نہ تھی..یعنی آپ فیری میڈو میں اگر آپ کا جی چاہے تو باقاعدہ برہنہ گھوم سکتے تھے اور کوئی آپ کو دیکھنے والا نہ تھا..زیادہ سے زیادہ ایک آدھ بھیڑ رومینٹک ہو کر آپ کو سونگھ سکتی تھی..تھامس،مشائلہ،جیرلڈ اور مطیع کے سوا وہاں اور کوئی نہ تھا..

پہلی بار جتنے دن یہاں ٹھہرا کوئی ایک سیاح بھی اس کے پھاٹک میں سے اندر داخل نہ ہوا..

فیری میڈو کے کناروں پر چند جھونپڑے تھے،چند بھیڑیں تھیں،کچھ بچے تھے..صرف آٹھ برس پیشتر تک بھی ہم اپنے اپنے پائی پیلس میں جا کر استراحت فرماتے تھے اور اطمینان سے بیٹھتے تھے کہ کوئی دیکھنے والا نہ تھا..

ہم اس کے جنگل میں سنڈریلا کی مانند تنہا اور سحر زدہ گھومتے تھے..سٹرابیری کا پہلا سفید پھول کھلتا..تو ہمارے لیے..

سرد ہواؤں کی ایک سرگوشی تیرتی تو صرف ہمارے کانوں کے لیے..

کہاں وہ دن تھے..اور کہاں یہ دن تھے کہ فیری میڈو کی جادوئی چراگاہ کا نصف حصہ چوبی مکانوں سے ڈھک چکا تھا..بھیڑوں سے زیادہ تعداد میں مقامی اور غیر ملکی سیاح تھے جو منہ اٹھائے گھومتے تھے..میلہ لگا ہوا تھا..

جھیل سیف الملوک کی مانند فیری میڈو بھی طوائف کا وہ کوٹھا ہو چکا تھا جہاں ہر کوئی آ سکتا تھا..

وہاں جہاں کھیت خنکی میں سرد اور سبز ہوتے تھے،چند بھیڑیں آوارہ ہوا کرتی تھیں..شکور کی واحد گائے چرتی تھی،جہاں صرف ایک الاؤ روشن ہوتا تھا تو آسمان کے ستارے اوجھل ہو جاتے تھے اور اسے بجھانے سے وہ نزدیک آ جاتے تھے اور ہم پر برسنے لگتے تھے وہاں اب حرص اور ہوس کے ہوٹل..فحش رونقیں تھیں..

اٹھارہ برس پیشتر جو فیری میڈو چند روز کے لیے میری جائیداد تھا..میری ملکیت میں آ گیا تھا اب میں اسی فیری میڈو میں ایک اور..سینکڑوں سیاحوں میں..ایک اور ناآشنا سیاح تھا..

البتہ ایک فرق ضرور تھا..

فیری میڈو مجھے پہچانتا تھا..اس کی گھاس کا ہر تنکا میرے جوگرز کے بوجھ کو پہچانتا تھا۔اس کے گدلے گھاس بھرے تالاب کے پانیوں کا ہر قطرہ مجھے کہتا تھا کہ تم نے کبھی ہم پر..کبھی سورج کے غروب میں اور کبھی اس کے ابھرنے کے سمے کبھی ہم پر جھک کر نانگا پربت کی برفوں کو عکس ہوتے دیکھا تھا..سویر کی ٹھنڈک میں جب زرد کرنیں ٹھنڈک میں گھل کر آتی تھیں اور ڈوبتے سورج میں ٹھٹھرتی شام کو بھی تم مجھ پر جھکتے تھے..اس کے جنگل سے بھی صدائیں آتی تھیں کہ تم بھی میرے کنوارپن میں ملے تھے..میرے پہلے محبوب تھے..

فیری میڈو میں پہچان بھی تھی اور شکائت بھی!

تمہیں کیا ضرورت تھی کہ اتنا عرصہ پہلے میرے کنوارپن میں اتر کر میرا روپ دیکھ کر..نیچے جا کر..ایک سطحی اور ریاکار دنیا میں میرے بدن اور حسن کو بیان کرتے..کیا حاجت تھی میرا چرچا کرنے کی..کتابوں کے صفحے سیاہ کرنے کی..چپ کیوں نہیں رہے بیان کیوں کیا..نہ بیان کرتے تو میں یوں رسوا نہ ہوتا..پامال اور مجروح نہ ہوتا..تم شیخی خورے تھے رہ نہ سکے..شور مچا دیا..اپنی انا کے تکبر میں کہ لوگو تم نے وہ نہیں دیکھا جو میں نے دیکھا ہے..اور لوگ مجھے دیکھنے آئے اور ان کے لیے ہوٹل اور خیمہ گاہیں بنیں..اور اب مجھے دیکھ کر لوگ مسلسل مجھے روند رہے ہیں..مجھے مسل رہے ہیں اور مجھ سے میرا کنوارپن چھن گیا ہے،بس یہی شکائت ہے تم سے کہ تم چپ کیوں نہ رہے..بیان کیوں کر دیا!..

صرف رحمت نبی اور عزیز کی کیمپنگ سائٹ تھی جس نے فیری میڈو کے زوال پذیر حسن کو زیادہ مجروح نہیں کیا تھا..وہ کسی حد تک اس کے قدرتی ماحول میں رچی بسی تھی..

ہم وہیں ٹھہرے..

اوپر کہیں.. فیری میڈو کی بلند ترین ڈھلوان پر.. نانگا پربت کے سوچہروں کے سامنے.. اگرچہ وہاں سرد ہوائیں سنسناتی تھیں میں نے اپنا خیمہ نصب کیا تھا.. اب مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں وہاں جا کر اپنا خیمہ لگاتا..

اس لیے میں بھی یہیں ٹھہرا.. آرام طلب آسائش پسند ہر سیاح کی مانند رحمت نبی کی کیمپنگ سائٹ میں ہی ٹھہرا..

رائے کوٹ گلیشیئر کے عین اوپر.. نانگا پربت کا سامنا کرتے ہوئے جو گھاس کا میدان تھا وہاں خیموں کے طرح طرح کے رنگ تھے.. خوش رنگ پرندے سمٹے بیٹھے تھے.. ایک جانب ڈھلوان کی اوٹ میں ایک فیری میڈو سے حاصل کردہ مردہ لکڑی سے تعمیر شدہ ایک دیدہ زیب ڈائننگ ہال تھا اور خیمہ گاہ پر جھانکتی ڈھلوان پر دو تین خوش نظر کیبن تھے..

ان میں ایک کیبن ابھی تک ان چھوا تھا..

اس میں ابھی تک کسی نے قیام نہیں کیا تھا..

اس لیے کہ رحمت نبی نے وہ کیبن میرے لیے سنبھال رکھا تھا کہ تارڑ آئے گا تو وہ اس میں پہلا شخص ہوگا جو رات گزارے گا اور تب اس کیبن کی پیشانی پر "تارڑ کیبن" کی تختی آویزاں کر دی جائے گی.. یہ میرے لیے شمال کی محبت کا ایک انداز تھا.. کیبن کے اندر تازہ دیار کی مہک تھی.. ابھی ابھی رندے سے تراشی ہوئی لکڑی کی قدرتی خوشبو تھی..

آسائش کتنی آسانی سے انسان کو گمراہ کر دیتی ہے.. سادہ اور قدرتی زندگی کے عقیدے کو کیسے پاش پاش کر دیتی ہے اس کا احساس مجھے اس کیبن کے اندر داخل ہو کر.. اس کے وسیع بیڈ پر لیٹ کر ہوا.. میں فوری طور پر خیمے کے اندر قیام کرنے کے رومان کو بھول گیا.. اب اگر مجھے پیشکش بھی ہوتی کہ تم اٹھارہ برس پیشتر کے اس بلند مقام پر نانگا پربت کے روبرو خیمہ نصب کر سکتے ہو.. تو میں نہ کرتا..

اس کیبن کی آسائش نے مجھے گمراہ کر دیا تھا..

کیبن سے خیمہ گاہ دیکھی جا سکتی تھی.. اس کے برآمدے میں ایک آرام کرسی پر براجمان ہو کر نیچے پھیلے خیموں اور ان میں سے ظاہر ہوتی اور گم ہوتی مخلوق پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جا سکتی تھی.. لیکن یہ نظر زیادہ دیر خیمہ گاہ پر نہیں رکتی تھی کہ اسے بھٹکانے کے لیے سامنے نانگا پربت کا سفید محل تھا..

میں نے دیکھا کہ گرد آمیز کیمپنگ سائٹ کے کنارے پر.. رائے کوٹ گلیشیئر کے اوپر.. اپنے بیش قیمت کیمرے کو سٹینڈ پر جمائے اس کے ویو فائنڈر میں اپنی داڑھی سمیت گھسا تصویریں اتارنے میں مگن تھا اور گدو اس کے لیے چائے کی ایک پیالی تھامے ایک خادم کی طرح کھڑا تھا..

خان سلیم اپنے خیمے میں سے سر نکالے اپنی بے دریغ مونچھیں سنوارتا تھا.. شاید اپنی متعدد دور جہانوں کی یاد میں ایک آدھ آہ بھر کر نانگا پربت کو تکتا تھا..

میاں فرزندرات کے کھانے کی تیاریوں میں مشغول تھا..

اور شاہد چند جرمن یا فرانسیسی سیاحوں پر اپنی انگریزی آزما رہا تھا اور وہ آزمائش میں تھے..

حسن کے چہرے پر نانگا پربت کو دیکھتے ہوئے ایک معصوم مسکراہٹ کھیلتی تھی اور اس میں اس کی بیگم کھیلتی تھی..

عمران اینڈ کمپنی فیری میڈو کے جنگل میں پوشیدہ ہو کر شاید کچھ دھواں اڑا چکے تھے اس لیے وہ تھکاوٹ اور پژمردگی سے یکسر ناآشنا تھے.. اور فلم بندی میں جتے ہوئے تھے..

لیکن یہاں ایک اور کردار بھی تھا جس نے رائے کوٹ پل پر ہمیں جائن کیا تھا.. لاہور سے ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا اگرچہ لاہور کا تھا اور یہ ندیم تھا..

جو پچھلی شب تاتو کی بارش میں بھیگتا پیاز چھیلتا تھا..

یہ ندیم کیا تھا؟.. ہم سب کا دیرینہ دوست اور کوہ نوردی کا ساتھی.. جو شمال کی الفت میں اسیر لاہور ایسے شہر بے مثال کو ترک کر کے.. یہاں تک کہ اپنے بال بچوں کو ترک کر کے پچھلے تین برسوں سے گلگت میں مقیم تھا.. بینکر تھا.. گلگت میں پوسٹنگ کروا چکا تھا اور ہمیں ملنے کو.. ہم میں شامل ہونے کی خاطر رائے کوٹ پل پر ہم سے آملا تھا..

یہ ندیم.. حسب معمول ایک گمشدہ اونٹ کی مانند ادھر اُدھر منہ اٹھائے پھرتا تھا اور اس اونٹ کی کوئی بھی کل سیدھی نہ تھی.. سوائے دوستی اور معصومیت کی کل کے.. جو بالکل سیدھی تھی..

وہ حسب عادت اپنے سامان کی پوٹلی ایک بڑھیا کی طرح سر پر اٹھائے ہوئے میری کیبن میں آ گیا تھا.. "سر جی.. پلیز میں فرش پر سو جاؤں گا.. آپ جانتے ہیں کہ خیمے کے اندر میرا دم گھٹتا ہے.. "یک سرائے" کے سفر کے دوران میں نے پچن ٹینٹ میں بسیرا کیا کہ وہ کھلا اور ہوادار تھا اور کے ٹو کہانی سے میں اسی لیے خارج ہو گیا تھا کہ تھمنگل سے واپس چلا گیا تھا.. تو اجازت ہے.. پلیز میں فرش پر سو جاؤں گا.."

اس چوبی کیبن کی کھڑکی میں.. نانگا پربت پوری کی پوری.. اپنی برہنہ برفوں اور جادوئی داستانوں سمیت.. ایک تصویر تھی.. کھڑکی کے چوکھٹے میں جڑی ہوئی تھی.. فجر کی نماز پڑھتے ہوئے سلام پھیریے تو وہ یوں نظر آتی تھی کہ کافر بھی اس لمحے ایمان لے آتا تھا..

رحمت نبی اپنی ماگریتا کے تحفہ کردہ پروں والے آسٹرین ہیٹ میں.. اور عزیز اپنے ہاروں اور منکوں کے بہروپ میں.. ہمارے دوست بھی تھے اور میزبان بھی.. ندیم نہ چاہتے ہوئے بھی میرا کیبن میٹ تھا.. اگرچہ فرش پر سوتا تھا اور ایک ناآسودہ اونٹ کی مانند خراٹے لیتا تھا..

کیبن سے اُتریے تو رائے کوٹ گلیشیئر کی قربت میں ایک نہایت مختصر کھلونا سا ٹائلٹ تھا.. یہاں اب جتنی رونق اور گہما گہمی تھی اس میں پائی چیں جانے کی گنجائش نہ تھی.. یہ عین ممکن تھا کہ آپ جنگل میں فارغ ہو رہے ہوں اور یکدم سیاحوں کا ایک غول آپ کے سر پر آن کھڑا ہو کہ اوئے یہ کیا ہو رہا ہے..

چنانچہ کھلونا ٹائلٹ ایک مجبوری تھی..

اور میں ہمیشہ وہاں دیر کر دیتا تھا..

یہ نہیں کہ مجھے قبض وغیرہ کا کوئی مسئلہ تھا.. کوئی بائلز پرابلم تھی.. صرف اس لیے دیر ہو جاتی تھی کہ اس کھلونا ٹائلٹ کیبن میں ایک نہایت مختصر سا روزن تھا.. ایک دو چار انچ کی ایک تکونی کھڑکی تھی اور ایسی تھی کہ استراحت فرماتے ہوئے اس میں نانگا پربت جڑی ہوئی دکھائی دیتی تھی اور میں اسے دیکھتا دیکھتا اکثر غافل ہو جاتا تھا کہ میں یہاں کس فراغت بھرے مقصد کے لیے آیا ہوں اور کیوں آیا ہوں.. میں اس تکونی کھڑکی میں سے دکھتی برفوں کو تکتے تکتے ایسا غافل ہو جاتا تھا..

کیمپنگ کے ڈائننگ روم کی اوٹ میں وہ بڑا پتھر تھا جس پر نو برس پیشتر عینی نے

''تارڑ.. 92ء'' پینٹ کیا تھا..

رحمت نبی نے اس پتھر کو فیئری میڈو کی ایک یادگار کے طور پر محفوظ کر رکھا تھا اور ابھی حال ہی میں اسے صاف کر کے.. دوبارہ پینٹ کر کے بحال کر دیا تھا.. تا کہ سند رہے..

فیئری میڈو ایک ایسا محبوب تھا جو کبھی فقط میرا تھا.. وفا شعار تھا.. اب اگر بے وفا ہو گیا تھا تو اس کا قصور نہ تھا.. اس کے حُسن کا چرچا کرنے والے اور بیان کر دینے والے کا دوش تھا..

پہلے پہل تو یہاں چند لوگ ہی پہنچے.. جو میری کتابیں پڑھ کر پہنچے.. اور پھر اس کا تذکرہ سیاحتی اداروں کے کتابچوں میں آ گیا.. ٹور آپریٹرز باقاعدہ ٹورز کا بندوبست کرنے لگے.. تب یہ

خاص و عام ہوا..

ان تمام قباحتوں کے باوجود.. حرص اور ہوس کے پھندوں کے باوجود.. گہما گہمی.. ہجوم اور بیہودہ رونق اپنی جگہ..... فیئری میڈو میں اب بھی وہ سحر تھا جو جکڑ لیتا تھا.. آپ چاہیں تو اس ہجومِ ناروا میں تنہا بھی ہو سکتے ہیں.. اس میں اب بھی کشش ایسی تھی کہ.. اور وہ کہتی تھی کہ.. فردوس گر بر روئے زمیں است.. ہمیں است و ہمیں است.. و ہمیں است..

طوائف بن جانے کے باوجود اس کی دل کشی زاہدوں کے ایمان ڈگمگاتی تھی.. ہم نے فیئری میڈو میں تین راتیں گزاریں..

''چھوٹا فیری میڈو بھی گمشدہ''

رحمت نبی کی کیمپنگ کے سوا اور بھی دکھ تھے.. اور بھی کیمپنگ سائٹس تھیں..

وہاں بھی.. جہاں میں نے اپنے خاندان کے ساتھ جنگل کے پہلے گھنے درختوں کے سائے میں خیمے لگائے تھے..

اور وہاں بھی..

جہاں میں ایک شام بھٹکتا ہوا.. جنگل میں گمشدہ جا نکلا تھا.. اور جنگل کی نیم سیاہی میں سے نکلتا ہوں تو سامنے ایک اور سرد برف آلود سحر انگیز منظر ہے.. ایک اور فیری میڈو ہے..

ہاں.. فیری میڈو سے پرے اس کے گھنے قدیم جنگل میں چھپا ہوا ایک اور مختصر فیری میڈو تھا.. جہاں دلدل تھی.. گھاس اور پانی تھے اور ان میں وہی نانگا پربت عکس ہوتی تھی..

مجھے یاد ہے کہ اس فیری میڈو میں مجھے ڈر آیا تھا..

یہاں اتنا تنہا اور چھپا ہوا تھا.. اور اس بڑھتی ہوئی تاریکی میں تشویش ہوتی تھی کہ کہیں میں یہیں نہ رہ جاؤں.. یہاں تو کوئی بھی نہیں..

وہاں پہنچ کر میں نے سوچا تھا.. کہ میں جو اب تک شمال میں درجنوں گھر تعمیر کر چکا ہوں.. خوش نظر کوہستانی بلندیوں پر آماجگاہیں بنا چکا ہوں.. لکڑی کے کئی کیبن میری ملکیت میں ہیں.. کبھی وادی نیلم میں.. اور کبھی جھیل کرومبر کے کنارے.. اور کبھی کسی اشکولے میں تو بس ایک اور کیبن اس باحیا سب کی نظروں سے اوجھل چھوٹے فیری میڈو میں بھی بناؤں گا جہاں سے نانگا پربت بڑے فیری میڈو سے بھی کہیں بڑھ کر طلسم خیز اور حواس کے لیے باختگی کے کئی سامان پیدا کرتی ہے.. اور میں یہ کیبن جنگل میں گرے پڑے بھوج پتر کے درختوں سے اپنے ہاتھوں سے

تعمیر کروں گا.. اور جتنی دیر میں وہاں بیٹھا رہا اتنی دیر میں میں نے وہ کیبن تعمیر کر ڈالا اور اس میں ایک شب بھی گزاری.. لیکن ایک خیال جو کبھی اس سے پیشتر دیگر مقامات پر گھر اور کیبن تعمیر کرتے ہوئے میرے دل میں نہ آیا تھا.. اب آیا.. کہ یہاں صرف ایک کیبن کی تعمیر بھی اُس منظر کو جسے ابھی ابھی خالق نے تخلیق کیا ہے.. اُس کا سانس ابھی تک اس کے بوٹے بوٹے پتے پتے میں موجود ہے.. وہ خود موجود ہے.. تو یہاں ایک کیبن بھی اس کی شان میں گستاخی ہوگی.. جیسے کسی عبادت گاہ میں ایک دیوانہ داخل ہو کر اس کی پاکیزگی میں ایک قہقہہ لگا دے..

اور اب میں اس چھوٹے فیری میڈو میں داخل ہوتا ہوں تو اُس کی ڈھلوان پر متعدد کمرے اور چوبی رہائش گاہیں منہ کھولے کھڑی ہیں.. اور سیاح ہیں جو ان میں قیام کرتے ہیں اور اس ہوٹل کا باریش اور سیانا مالک فوری طور پر میرے لیے چائے بناتا ہے.. ڈھلوان کے قریب کراچی سے آئے ہوئے چند نوجوان خیمے لگائے غل کرتے ہیں اور رات کے الاؤ کے لیے لکڑیاں جمع کرتے ہیں..

بے شک یہ کیبن نہایت دیدہ زیب ہیں اور ماحول کے مطابق ہیں لیکن اس کے باوجود یہ وہ قہقہے ہیں جو نانگا پربت کی ہزاروں برس کی خلوت میں مخل ہوتے ہیں..

اگر میں بھی تاتو کا رہنے والا ہوتا اور چھوٹے فیری میڈو کا یہ علاقہ میری ملکیت میں ہوتا تو میں بھی اس کی ابدی تنہائی کی چنداں پرواہ نہ کرتا اور ایک بہتر زندگی کے لیے اور آسائش کے لیے.. سیاحوں کے لیے بغیر سوچے سمجھے یہاں ہوٹل بنا دیتا.. میں بھی ایسا ہی کرتا کہ روئے دنیا کے سب سے خوبصورت منظر سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے تو میں کون ہوتا تھا اعتراض کرنے والا.. کل کلاں اگر نانگا پربت کے بیس کیمپ میں میکڈانلڈ کھل جاتا ہے اور اس کی ایک چوٹی پر ایک نیون سائن آویزاں کر دیا جاتا ہے جس پر میکڈانلڈ کا ایک مسخرہ آپ کو آنکھیں مارتا برگر کھانے کی تلقین کرتا ہے تو میں کون ہوتا ہوں اعتراض کرنے والا.. اس ہوٹل میں ایک خاصیت تھی کہ یہاں جتنے بھی کارکن اور ویٹر تھے وہ سب کے سب نہایت متشرع تھے اور صاحب ریش تھے.. تو کیا یہ غیر ملکیوں کی بے راہ روی کو برداشت کر پائیں گے.. لیکن پیسہ مذہب کو ہمیشہ زیر کر لیتا ہے..

فیری میڈو سے رخصت ہونے کے چند روز بعد یہاں ایک واقعہ ایسا ہوا جس کی بازگشت دنیا بھر میں سُنی گئی.. نانگا پربت کے بیس کیمپ تک جاتے ہوئے گنالو گلیشیر کو عبور کرتے ہوئے اُس کی بھول بھلیوں میں کہیں ایک متشرع پورٹر نے ایک جرمن سیاح خاتون کو بے آبرو

کر دیا.. چونکہ وہ اس کا سہارا لیے گلیشیئر کے پار جا رہی تھی اور پھنس رہی تھی اس لیے پورٹر نے اسے ایک آسان شکار سمجھا.. اس واقعے نے پورے فیری میڈو کو بے آبرو کر دیا.. اس پورٹر کا تعلق رحمت نبی کے گروپ سے تھا یا متشرع حضرات سے.. اس سے کیا فرق پڑتا ہے لیکن باہر کی دنیا میں فیری میڈو اتنا فیری نہ رہا.. کہا جاتا ہے کہ مجرم کو مقامی جرگے نے سخت سزا دی اور اس کی جائیداد ضبط کر لی.. لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے.. چند روز پیشتر سوئٹزر لینڈ کے اعزازی کونسل سے ایک دعوت میں ملاقات ہوئی تو انہوں نے دور سے ہی نعرہ لگایا.. تارڑ صاحب کہیں آپ ہی تو وہ پورٹر نہیں تھے.. ایسا نہ کیا کیجیے''..

یہ درست ہے کہ مغربی خواتین قدرے فراخ دل واقع ہوتی ہیں.. ہر ایک سے خلیق کھیلتی اور فری ہوتی ہیں اور ایک ان پڑھ کوہستانی تو کیا ایک پاکستانی شہری بابو بھی یہی سمجھتا ہے کہ وہ ''گیم'' ہیں.. اور بعض اوقات وہ ہوتی ہیں' لیکن ان کا خاصا یہ بھی ہے کہ وہ اپنی فراخ دلی اپنی من مرضی سے کرتی ہیں.. جی میں آئے گا تو سب کچھ کر گزریں گی.. جی میں نہیں آئے گا تو دولت کے ڈھیر بھی ان کو مائل نہیں کر سکتے.. مجبور نہیں کر سکتے.. بہر حال فیری میڈو کے شفاف ماتھے پر یہ پہلا کلنک کا ٹیکہ ہے..

چھوٹے فیری میڈو میں جو کیبن تھے اُن میں اور اس مقام کی الگ تھلگ تنہائی ایک خاندان کی رہائش کے لیے بے حد موزوں تھی..

رحمت نبی کی کیمپنگ ایک پارٹی تھی..

یہاں کی رہائش گاہیں ذرا پردہ پوش اور شریف تھیں..

میں نے بہت کوشش کی کہ میں اس لمحے کو دوبارہ جی سکوں جب میں یہاں آیا تھا تو یہاں حسن اور تنہائی کے ڈر کے سوا کچھ نہ تھا.. لیکن نہ جی سکا.. کہ وہ لمحہ مر چکا تھا.. ان لکڑی کے کمروں کے نیچے کہیں دفن ہو چکا تھا..

''فیری میڈو کے جنگل کے جھرنوں اور درختوں کی سمفنی اور شام ہو رہی تھی''

میرا خیال ہے کہ میں نے بہت آہ و زاری کر لی.. بہت ماتم کر لیا.. اب آگے چلتے ہیں کیونکہ آج تک جتنا بھی ماتم کیا گیا ہے اس کے اثر سے جو کچھ کھو گیا ہے وہ دوبارہ زندہ تو نہیں ہوا.

اب آگے چلتے ہیں..

میرے ساتھی اب تک بیال کیمپ پہنچ چکے ہوں گے.. اور میں چھوٹے فیری میڈو سے نکل کر برچ اور بھوج پتر کے جنگلوں میں بھٹک رہا تھا..

اور میں تنہا نہیں بھٹک رہا تھا.. میرے عقب میں ہنڈ ہاؤنڈز تھے.. خون کے پیاسے کتے تھے.. اُن کے کندھوں پر کیمرے تھے اور لائٹیں تھیں اور مائیک تھے اور وہ میرا پیچھا کر رہے تھے..

''عمران آخر تم کیا چاہتے ہو''

''سر جی'' اس نے اپنا ثقافتی عمل دوہرایا.. یعنی داڑھی کھجائی.. نیکر کو ٹٹولا اور پھر بولا.. ''آئیڈیا یہ ہے کہ باباجی.. یعنی آپ.. اس بے مثال تنہائی کے جنگل میں اداس اور مغموم اپنے کسی عشق خاص کے تصور میں بھٹک رہے ہیں.. کبھی اس درخت پر چڑھ کر نظارے دیکھتے ہیں اور کبھی اس درخت کے زمین بوس تنے کے نیچے سے گزر کر یکدم کیمرے کے سامنے آ جاتے ہیں.. اس تنے پر جمی ہوئی کائی کی دبیز تہہ کو الٹتے.. اس کائی کے اندر جو ایک گہری سبز ان چھوئی تنہائی ہے اسے دیکھتے.. قدرت کی نیرنگیوں سے حیران ہوتے.. پھر اس ندی کو ناپتے ہوئے پار جاتے ہیں.. اگر ناپتے ہوئے گر جاتے ہیں تو بے حد مناسب ہوگا.. چند خراشیں آئیں گی کمر کا ایک آدھ منکا ٹوٹ

جائے گا لیکن شاٹ بے مثال بنے گا. تو اس ندی کو پھلانگ کر دوسری جانب جب اس سوکھے ہوئے ٹنڈ کے قریب آتے ہیں جو ایک تجریدی مجسمے کی صورت بانہیں پھیلائے کھڑا ہے تو آپ اس پر ہاتھ رکھ کر اپنا سانس درست کرتے ہیں اور پھر راکے کوٹ گلیشیئر کی برفوں کو حیرت سے تکتے ہیں.. میں کیمرہ آپ کے جھریوں بھرے ہاتھ پر لاؤں گا اور یوں سوکھے ہوئے تنے کے پس منظر میں آپ کا ہاتھ بھی ایک خزاں رسیدہ شجر کی ٹہنی دکھائی دے گا. سٹارٹ کیمرہ!"

عمران کیمرے پر ایک زرد ترپال چڑھائے.. اسے بارش یا ندی کے چھینٹوں سے بچانے کے لیے.. اپنا دھڑ کونا سر اس کے اندر گھسائے مجھے شوٹ کرنے لگا.. میں حسب ہدایت فیری میڈو کے ابھی تک ان چھوئے جنگل میں گم ہوا.. اس کی ابدی حیرتوں کو تکتا..

کبھی دھوپ میں آتا.. کبھی چھاؤں میں چلتا.. ندیاں پھلانگتا.. بمشکل پھلانگتا.. کتنی شہرت اور جعلی ناموری کے لیے پھلانگتا.. ایک بوسیدہ درخت کے عظیم اور خاموش پڑے تنے کے نیچے سے سر جھکا کر گزرا.. ایک اور زمین بوس تنے کے نیچے اتنی جگہ نہ تھی تو میں لیٹ کر اپنے آپ کو گھسیٹتا اور اس دوران ان شاخوں اور باریک پتھروں پر بدن کو اذیت دیتا نیچے سے آگے ہوا.. ایک اور پرپیچ اور سوکھے ہوئے شجر کے اوپر چڑھ کر خزاں رسیدہ پتوں کے ایک ڈھیر پر کودا اور اس آہ کو دبا کر جو عمر رسیدگی کا شاخسانہ تھی.. سیدھا کھڑا ہو گیا.. اپنا مختصر رک سیک سمیت..

"واہ تارڑ صاحب" عمران کا دھڑ کونا سر کیمرے کی غار میں سے باہر آ گیا" کیا بے دریغ چھلانگ لگائی ہے.. ایکشن فلموں کے ہیرو لگے ہو.. وین ڈیم لگے ہو.. چوٹ تو نہیں لگی.."

"نہیں جی.. معمولی بات ہے.." میں نے سینہ تان کر کہا.. اور اس "آہ" کو پھر سے دبایا جو پورے بدن میں آہ آہ کر رہی تھی..

"معمولی بات ہے تو پھر یہ شاٹ دوبارہ ہوگا.."

"کیا کہہ رہے ہو عمران.. ہائے!.." اب وہ آہ بے اختیار نکلی جسے میں اب تک دبائے ہوئے تھا..

"سر جی.." ویری فرینکلی میرا نہیں تھا خیال کہ آپ اتنی پھرتی سے درختوں کے تنوں پر چڑھ کر وین ڈیم کی طرح چھلانگیں لگا لیں گے اس لیے میں کیمرے سے آپ کو فالو نہیں کر سکا.. پلیز ذرا دوبارہ کر لیں.. معمولی بات ہے.."

میں کبھی بھی فیری میڈو کے جنگل کو بیان نہیں کر پاؤں گا..

یہ میرے بس کی بات نہیں.. اس کے بیان کے لیے کوئی گارسیا مارکیز یا ٹالسٹائی درکار ہے جو میں نہیں ہوں.. اگرچہ میں ان دونوں سے برتر ہوں کہ میں فیری میڈو کے جنگل میں گم ہوا اور وہ اس کے وجود سے ناآشنا تھے.. ٹالسٹائی کے بارے میں تو ابوالکلام آزاد نے کہا تھا کہ دنیا بھر میں صرف وہ ایک شخص ہے جو تکبر کر سکتا ہے.. یہ کہہ سکتا ہے کہ "میں" ہوں..

میں جب بھی ان قدیم شجروں کے نیم تاریک حجید کے بھیتر میں گیا تو لفظ گم ہو گئے.. میں کورا کاغذ ہو گیا.. میں ان زمانوں میں چلا گیا جب حروف تہجی ایجاد نہیں ہوئے تھے.. بابل اور نینوا کی تختیوں کا وجود نہ تھا.. انسان کے اظہار کے لیے سوائے اس کے چہرے کے اور کچھ موجود نہ تھا.. میرا ذہن اور بدن ایک گاچنی سے پوتی ہوئی تختی ہو گئے جس پر کوئی پورنے نہ تھے.. اور ذہن اور بدن کی اس پوچی ہوئی تختی کے گرد فیری میڈو کے جنگل کی نادیدہ بیلیں لپٹتی چلی گئیں.. سرسبز کائی میں سے زور لگا کر نکلنے والی برفانی ندیاں بہنے لگیں.. اور ان کے کناروں پر جو فرنز.. پانی کے بوٹے اور جھاڑیاں تھیں انہیں وہ تخلیق ہوئی بہاؤ کے ترنگ میں آ گئیں..

چیڑ، بھوج پتر اور برچ اور جانے کیسے کیسے ان جانے شجر مجھ سے کلام کرنے لگے..

اس جنگل کی ان ہونی جھاڑیاں جن میں آسیب بھی تھے اور حُسن بھی.. کائی زدہ پتھر اور سینکڑوں برسوں سے زمین پر گرنے والے پتوں کا فرش میرے جوگرز کے راستے سے میری رگوں میں اترنے لگا.. جو زمین تھی وہ ان بوسیدگی سے دوچار پتوں اور ٹہنیوں کے گدیلے وجود کے نیچے کہیں تھی.. ہزاروں برسوں سے گم ہو چکی تھی..

کوئی ایک ندی تھی جس کے کنارے ایک درویش ایک آوارہ گرد کا جھونپڑا ہو سکتا تھا؟.. ہر ندی اپنے اپنے جھرنوں.. ٹنڈوں اور ہریاول کے گھنیرے جنگلوں میں سے گزرتی تھی کہ اس کا ہر مقام پوری حیاتی.. وہیں بسر کر دینے والا ہوتا تھا..

سورج کی روشنی جو جنگل کے گھنیرے وجود کے چھتنار میں سے راستے بناتی اترتی تھی تو چیڑ اور بھوج پتر کی شاخوں میں سے.. ان سے لٹکتی بیلوں کی بھول بھلیوں میں سے ہوتی نیچے خزاں رسیدہ پتوں کے گدیلے فرش پر جب کہ میرے جوگر اس میں دھنستے تھے مجھ تک آتی تھی تو اتنی مدھم ہو جاتی تھی کہ ایک شام ہوتی تھی..

ایک شام..

ایسی شام جس میں اگرچہ سناٹے کی زبان بندی تھی.. ایک گہری چُپ تھی.. خاموشی تھی

اس شام میں بس اگر آپ ذرا اپنے تمام تر حواس کو آواز دیں..غور سے کان لگا کر سنیں تو اس میں.. آج تک..آپ کی مختصر حیات میں..آپ پر جن دھنوں نے آپ کے دل پر اثر کیا تھا..وہ سب کی سب نہایت مدھم اور سرگوشیوں کی سُروں میں سنائی دیتی تھیں..ہزاروں وائلنوں کا ایک آرکسٹرا جیسی آوازوں میں..مدھم سُروں میں..ہر شاخ..ہر جھاڑی کو چھوتا..ان میں لرزش پیدا کرتا..ندیوں میں مدغم ہو کر ان کے دھیمے شور میں بنا دستک دیے شامل ہوتا..پھر کسی ایک ستار کی مدھ بھری سرگوشی.....کسی طبلے پر مدھم تھاپ جیسے اس پر ہتھیلی نہیں پرندہ اترا ہوا تھی نرماہٹ سے...ایک سارنگی جس کا گز فیری میڈو کے چیڑ کے بال تھے..یہاں وہ تمام تھیوڈن..چائے کوسکی اور خورشید انور فضا میں تھے جنہوں نے کبھی آپ کے دل کی تاروں کو چھیڑا تھا..وہ تمام نغمے جو چمکیلے دنوں میں آپ پر چھکے اور وہ تمام گیت جو اندھیاری شبوں میں دل میں تاریکی بھرتے تھے..سب یہاں موجود تھے..اور میں مبالغہ نہیں کر رہا..انسان کے ہاتھوں سے وجود میں آیا ہوا ہر عجوبہ ہر عمارت کسی نہ کسی طور بیان ہو سکتی ہے..لیکن اس کے ہاتھوں سے ترتیب شدہ جو خود بھی جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے اس کا تخلیق کردہ کوئی بھی قدرتی منظر کبھی بیان نہیں کیا جا سکتا..اگر وہ بیان ہو جائے تو وہ بھی بیان ہو جائے جس نے اسے بنایا ہے..اور وہ تو کبھی بیان نہیں ہوتا کبھی عیاں نہیں ہوتا..انسان بھی تحریر تصویر یا سُر میں جو کچھ تخلیق کرتا ہے وہ جتنا زیادہ بیان ہو سکے اتنا ہی کم تخلیقی ہوتا ہے اور جس قدر اس کے بیان میں دشواری ہو اس حساب سے وہ رب کے قریب پہنچ رہا ہوتا ہے تخلیق کے حوالے سے..اسی لیے فیری میڈو کے جنگل کے لیے لفظ صرف کم نہیں پڑتے بلکہ سراسر گم ہو جاتے ہیں..اور ان لفظوں کی تلاش اور اسے بیان کرنا محض ایک کارزیاں ہے..کبھی کوہ طور پر جلتی جھاڑی کے نُور کو بھی لفظوں میں قید کیا جا سکتا ہے؟ کیا غار حرا میں جو تجلی پھیلی تھی اسے بیان کیا جا سکتا ہے؟..یہ معجزے پیغمبروں کے لیے تھے' لیکن میرا یقین ہے کہ یہ معجزے کبھی منقطع نہیں ہوتے وہ جاری رہتے ہیں صرف ان کا روپ الگ ہو جاتا ہے..ان میں سے ایک فیری میڈو کا جنگل ہے جو ایک درویش ایک آوارہ گرد کے لیے بچا کر رکھا گیا تھا..جس کے سناٹوں اور تنہائی میں آپ پر وہ کچھ وارد ہوتا ہے جس کا اظہار آپ کو تختۂ دار پر لے جا سکتا ہے..انا الحق کا اعلان کرنے والے اسی قسم کے جنگلوں میں گم ہوتے تھے اور جو کچھ ان پر وارد ہوا اس کا برملا اظہار کر دیا..اور دار پر کھینچے گئے..اس لیے میں بھی اظہار نہیں کرنا چاہتا..

''سر جی ہم کھڑے کھڑے سوکھ گئے ہیں اور آپ بت بنے کھڑے ہیں اتنی دیر سے''

کالجی گجر گجر ہنسی ہنسا ''ایکشن دیں ناں..''

عمران اینڈ کمپنی ایک ناممکن شے کے حصول میں جُتے ہوئے تھے..وہ فیری میڈو کے جنگل کو کیمرے میں قید کرنا چاہتے تھے..اور وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کبھی نہیں کر سکتے..صرف میرا وجود تھا جس میں اس قدیم جنگل کی ہمشی بجتی تھی..اس کی راگنی دھڑکتی تھی..اس کے شجر اُگتے تھے..چشمے بہتے تھے..اس کی سینکڑوں برسوں کی تنہائی پھیلتی تھی صرف میرے وجود میں..اور عمران کا کیمرہ میرے وجود میں نہیں اتر سکتا تھا..

''سر جی'' عمران نے بھی احتجاج کیا..''یہیں شام ہو جائے گی..لائٹ چلی جائے گی۔''

''سوری..'' اور میں ناممکن کی جستجو میں چلا گیا..اس کی ہدایت کے مطابق جنگل میں اُترنے لگا..

یہاں کتنی شاہ گوریاں تھیں جن کے بدن کے نیل مدھم نہیں ہوتے تھے..کتنی زرد شہزادیاں تھیں جن کے لبادے اس کی ندیوں میں بھیگتے ان کے سنہری بدنوں کو عریاں کرتے تھے..کیسی کیسی گرو مبر جھیلیں تھیں جو حزن آمیزی میں کلام کرتی مہکتی تھیں..تم مجھے پہلے کیوں نہیں ملے..

عجیب سنولیکس تھیں جن پر یادوں کے بادبان کھلے تھے اور ان پر تتلیاں اڑتی تھیں.. یہاں کتنے اشوکے..ہوشے..اپالی گان..اردوکس اور ترشنگ تھے..گجرات اور جھنگ تھے..سوہڑیاں اور ہیریں تھیں..

کیسی کیسی جدائیاں تھیں..وصال تھے..جن کی سسکیوں میں کبھی اذیت تھی اور کبھی مسرتیں..

یہاں میری پوری زندگی تھی..

''سر جی..'' عمران بہت ہی ناگوار ہو گیا ''لائٹ کم ہو رہی ہے اور آپ چلتے چلتے رُک جاتے ہیں..تھک گئے ہیں''

''ہاں یار میں تھک گیا ہوں..اتنے برسوں سے اس جنگل کی آرزو میں چل رہا ہوں اور اس کے بھید دور ہوتے جاتے ہیں..میں ان تک پہنچ نہیں پا رہا..میں کبھی اس بشام کے موٹل میں سندھ کی سرمئی چادر میں لپٹا دیکھتا ہوں..کبھی برسین میں اس کی جھلک دیکھتا ہوں لیکن اس کو حاصل نہیں کر پاتا..میں اس میں اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کرنا چاہتا ہوں..کہیں مندراں پاکے..

متھے تلک لگا کے..اور یہ جنگل ہے کہ..''

''سر جی..''

''میں واقعی تھک گیا ہوں عمران..ایک مدت چلتے چلتے تھک گیا ہوں..کیمرہ آف کرو..پیک اپ یار..''

''پیک اپ''عمران نے اپنے بغل بچوں کو حکم دیا''سر جی پتہ نہیں کہاں نکل گئے ہیں..''

''بیال کیمپ بھی برباد..لیکن نانگا پربت اب بھی حکمران تھی''

بیال کیمپ..

فیری میڈو کے جنگل سے اُتر کر رائیکوٹ گلیشیئر کے کناروں پر جو ایک ونڈر لینڈ ہے..

جہاں سے نانگا پربت کا بیس کیمپ آپ کو بلاوے بھیجتا ہے کہ بس آ جاؤ..

جہاں نانگا پربت یوں سر پر اُمڈتی آتی ہے کہ آپ اپنے ہاتھ اوپر کر کے اسے روکنا چاہتے ہیں کہ کہیں اس کی برفیں گر کر آپ کو دفن نہ کر دیں..

جہاں سے اٹھارہ برس پیشتر میں اپنے جرمن دوستوں تھامس اور شائمہ کے ساتھ آ گیا تھا اور بیس کیمپ تک نہیں پہنچ سکا تھا اور واپسی پر ایک کھائی میں اٹک گیا تھا اور برفباری شروع ہو گئی تھی..

پھر ایک ندی کے کنارے میں نے میمونہ اور عینی کو چھوڑا تھا اور سلجوق، سمیر کے ہمراہ پورٹر شکور کی راہنمائی میں بالآخر بیس کیمپ تک پہنچ گیا تھا اور شام ڈھلے ہم گنانو گلیشیئر کراس کر کے واپس بیال کیمپ کے قریب آ رہے تھے تو سلجوق پر بلندی کا اثر ہو گیا تھا اور پھر گئی رات ٹہنیوں اور شاخوں سے ساختہ شعلوں کی روشنی میں ہم فیری میڈو واپس پہنچے تھے جہاں میمونہ اور عینی رو رہی تھیں..انہیں بتایا گیا تھا کہ رات کی تاریکی میں بیس کیمپ سے واپس کم لوگ ہی آتے ہیں..

یہ وہی بیال کیمپ تھا..لیکن وہی نہ تھا..

اس کا کھلا منظر بھی ہوٹلوں اور چار دیواریوں میں بند کر دیا گیا تھا..نانگا پربت کا اُجالا داغ داغ ہو چکا تھا..اُس کے سفید چہرے پر کمرشل ازم کی چھائیاں اور کیل اور دھبے تھے..

شل مجھی نانگا پربت کے اس چہرے کا کھلا دیدار اب ممکن نہ تھا..پہلے لکڑی کی کیبنوں..

حد بندیوں.. پتھر روموں اور خیموں کو دیکھو اور ان کے پار نانگا پربت کی بے بسی اداسی دیکھو..

جو منظر میں نے دیکھا تھا وہ صفحۂ ہستی سے مٹ چکا تھا..

جہاں ہم بے دریغ چلتے تھے وہاں اب ذاتی جائیداد کی حد بندیاں تھیں جو کبھی کسی ندی کو کاٹتی تھیں اور کہیں گھاس بھری ڈھلوانوں کے بیچ میں ایستادہ نظر آتی تھیں.. آپ بیال کیمپ کے خوش نظر گھاس بھرے پیالے میں ندیوں کو ناپتے صرف نانگا پربت کو نظر میں رکھتے ہوئے اب نہیں چل سکتے تھے.. بلکہ ان حد بندیوں سے پرے ہو کر درختوں کے ساتھ ساتھ چل کر آگے جاتے تھے..

وہاں پریوں کی چراگاہ کے پرکٹ چکے تھے.. یہاں بیال کے بدن کے ٹکڑے ہو چکے تھے..

اگرچہ یہ طے ہے کہ جو کوہ نورد آج کے فیئری میڈو اور بیال کیمپ کو دیکھتے ہیں اور وہ تصور نہیں کر سکتے کہ کنوارپن رخصت ہو چکا ہے.. وہ جب آج سے اٹھارہ برس بعد یہاں آئیں گے تو وہ بھی رنجیدہ ہوں گے کہ جب ہم پہلی بار یہاں آئے تھے تو یہاں محض چند کیبن تھے.. کچھ خیمے تھے اور آج میکڈانلڈ اور کے ایف سی کھل چکے ہیں..

ہر نسل کے مقدر میں ہے کہ وہ آج کے دیکھے ہوئے منظروں کا کل ماتم کرے.. کم از کم پاکستانی نسل کے مقدر میں یہی ہے کیونکہ یورپ میں تو ایسے منظر سینکڑوں برسوں تک جوں کے توں رکھے جاتے ہیں.. ایک ہم ہی ہیں جو اپنی صورت کو بگاڑ لیتے ہیں..

کچھ سنوار نہیں سکتے محض بگاڑ سکتے ہیں..

کچھ تخلیق نہیں کرتے ہاں تباہ کر سکتے ہیں..

ایک بار جب اُن زمانوں کے صدر پاکستان فاروق لغاری وادیٔ اشکومن سے شروع ہونے والی ازبکستان روڈ کے بارے میں کچھ معلومات چاہتے تھے کہ میں انہی دنوں واکھان ہی کی قربت میں "پاک سرائے" کے ٹریک سے واپس آیا تھا تو میں نے ان کی خدمت میں ایک ہی درخواست پیش کی تھی کہ عوام کی خوشی کے بغیر اگر پورے پاکستان پر قبضہ کیا جا سکتا ہے تو براہ کرم حکومت صرف فیئری میڈو کے علاقے کو ہی اپنی تحویل میں لے لے.. اس پر قبضہ کر کے اسے جوں کا توں محفوظ کر لے.. لیکن اُن دنوں لغاری صاحب اور بی بی بے نظیر کے درمیان ڈوئل شروع ہو چکا تھا جس کے سامنے ایک جنگل.. کچھ گھاس اور ایک برف پوش پہاڑ کی کچھ حیثیت نہ تھی.. ویسے مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ایسا ہو گا.. اقتدار کے ایوانوں میں کوئی نہ کوئی آئے گا

جو فیئری میڈو اور بیال کیمپ کو ان کا اصل روپ لوٹا دے گا..

میرے ساتھی کب کے بیال کیمپ پہنچ چکے تھے..

ہوٹل اور کیمپنگ کے کچن میں سے چائے پی چکے تھے.. بسکٹ کھا چکے تھے اور ایک سیاح گروپ جو یقیناً لاہور یا ملتان سے تعلق رکھتا تھا اس کی منت سماجت کر کے اُن سے دو آم حاصل کر کے انہیں نوش کر چکے تھے اور اب گھاس پر استراحت فرماتے میرا انتظار کر رہے تھے..

ان میں میاں فرزند اور شاہد کے چہرے مغموم تھے اور بجھے ہوئے تھے کہ وہ بھی گمشدہ بیال کیمپ کے سوگ میں تھے.. رنجیدہ اور چپ تھے.. وہ بھی میری طرح من ہی من میں گزر چکے بیال کیمپ کو یاد کرتے تھے..

البتہ گروآمیز پُرمسرت تھا اور اپنی سرخ پی کیپ اوڑھے یہاں سے نظر آتی بجی بجی نانگا پربت کی بے تحاشا تصویریں بنا رہا تھا... اور گدا نگہبانی کر رہا تھا کہیں سائیں کے کیمرے کے آگے سے کوئی گزر نہ جائے..

ندیم ابھی تک آم کی اس ایک پھانک کے تصور میں ہونٹ چاٹ رہا تھا جو اس کے حصے میں آئی تھی..

حسن اس منظر سے خوش تھا لیکن معصومیت سے شکایت کرتا تھا کہ سر جی اگر یہاں ہوٹل کھل سکتا تھا تو ایک پی سی او کیوں نہیں کھل سکتا تھا.. کم از کم میں اپنی بیگم سے ہی بات کر لیتا..

عمران اینڈ کمپنی بھی مستعد تھے اور نانگا پربت کو کیمرے کی قید میں لانے کے لیے زاویے بدلتے تھے..

اس سے آگے جانا ممکن نہ تھا.. شام ہونے کو تھی..

آگے ایک چٹان کی اوٹ میں ابھی تک ان چولہوں کی راکھ تھی.. پتھروں پر دھوئیں کی سیاہی تھی جہاں برسوں پہلے ہرمن بوہل کا بیس کیمپ قائم ہوا تھا اور اس نے نانگا پربت کو پہلی بار تسخیر کیا تھا.. اور اس چٹان سے آگے وہ بڑا پتھر تھا جہاں سے رائے کوٹ گلیشیر کے اوپر معلق ایک راستہ شروع ہوتا تھا.. جس راستے سے میں اور تھامس اور مشا ئمہ گزرے تھے.. پھر سلجوق اور میرے ہمراہ اس راستے پر چند قدم رکھ کر لوٹ آئے تھے اور برچ کے جنگلوں میں گزر کر بیس کیمپ تک گئے تھے..

شام ہونے کو تھی..

میں ایک بار نہیں دو بار ان حیرت بھرے منظروں کو دیکھ چکا تھا لیکن انہیں سہ بار

دیکھنے کی ہوس تھی.. لیکن شام ہونے کو تھی..

ہوس کا کوئی انجام نہیں.. کوئی اختتام نہیں.. یہ ایک ندیدہ بچہ ہے جس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا.. یہ ایک ایسا کتا ہے جو کھاتا چلا جاتا ہے اور اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ اس کے شکم میں اب کوئی گنجائش نہیں.. ہوس یہ سب کچھ ہے..

صوفی اور درویش ہمیں یہی سبق دیتے ہیں کہ ہوس اور حرص کو تیاگ دو کہ اس میں سکون اور فلاح ہے.. لیکن وہ بھی تو اپنے مرشد اور رب کی ہوس اور حرص میں مبتلا ہوتے ہیں.. ابھی دیدار کرتے ہیں اور اس سے اگلے لمحے میں پھر سے اس کے چہرے کو دیکھنے کی ہوس میں بے چین ہو جاتے ہیں..

کوہ نورد بھی ان جیسے ہوتے ہیں.. ان کے مرشد بس ایسے ہی بیال کیمپ ہوتے ہیں ان کے خدا بھی شاہ گوریاں اور کرومبر جیسی جھیلیں ہوتی ہیں.. وہ انہیں دوبارہ دیکھنے کی ہوس میں ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں..

دراصل حرص اور ہوس ہی وہ جذبے ہیں جو انسان کو زندہ رکھتے ہیں.. یہ نہ ہوں تو وہ بے حد شانت ہو جائے.. مٹی کا ایک بے جان تودہ ہو جائے.. یوں عشق اور کوہ نوردی دو سگی بہنیں ہیں..

ان دونوں کا مزاج ایک ہے..

ان دونوں میں حرص اور ہوس مشترک ہے..

ابھی دیکھا اور اگلے لمحے پھر سے دیکھنے کی آرزو..

لیکن شام ہو رہی تھی.. یہاں ان بلندیوں پر حرص اور ہوس کے چراغ جلانے سے بھی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا..

ہمیں یہیں سے لوٹ جانا تھا..

میں نے لوٹنے سے پیشتر جو آخری نگاہ ڈالی تو کیمپوں.. خیموں اور حد بندیوں کے باوجود.. اوپر برچ کے جو جنگل تھے اور نانگا پربت کی اڈتی ہوئی برفوں کا جو طلسم تھا وہ کم نہ ہوتا تھا.. دل کو اسیر کرتا تھا.. شام ان رکاوٹوں کو مدھم کرتی تھی اور قدرت کا بے پناہ طلسم ہر شے پر حاوی ہوتا تھا.. برفانی تودے اب بھی ایک گہری گونج کی دھمال میں نیچے اترتے تھے اور ان کیمپوں اور حد بندیوں کو مسمار کرتے چلے جاتے تھے..

شل کھی.. سو چہروں والی نانگا پربت اب بھی حکمران تھی.. وہ برف کی ملکہ تھی.. اور اب بھی وہ انسانی ہاتھوں کی بدشکلی کو معدوم کر دینے پر قادر تھی.. لیکن کب تک..

"الاؤ بجھا تو نانگا پربت کے برف مینڈک، سانپ' محلات اور ملکائیں فیری میڈو میں اُترنے لگے"

الاؤ روشن تھا..

آگ بھڑک رہی تھی..

سلگتی سرخ دہکتی لکڑیوں میں سے شراروں کے دہکتے چھینٹے اڑتے تھے جنہیں تاریکی دبوچ کر بجھا دیتی تھی..

الاؤ کے گرد ایک ہجوم تھا جو آگ کی قربت کا دمکتا اور سُرخ ایک ہی چہرہ لیے ہوئے تھا..

سب الاؤ کے پُرفریب آتشی طلسم میں اسیر اسے گھورتے تھے.. اور صرف میں تھا جو کبھی کبھار اوپر دیکھتا تھا.. اوپر فیری میڈو کا آسمان تھا اور ستاروں سے خالی تھا..

پٹرول کے خالی کنستروں پر تھاپ پڑتی تھی تو الاؤ کی آگ بھی اس کی دھمک سے دھمک اٹھتی تھی..

رحمت نبی کا بیٹا لکڑیوں سے اپنے ننگے پاؤں بچاتا.. اپنے پُرشوق اور سُرخ چہرے پر الاؤ کی سُرخی مزید سجاتا ایک کوہستانی مستی میں مست ناچتا تھا..

اس سٹیگ پارٹی میں.. مکمل طور پر مردانہ ہجوم میں صرف ایک جرمن سیاح خاتون تھی جو دھڑا دھڑ تصویریں اتار رہی تھی.. اور عزیز اس کا خاص خیال رکھتا تھا.. اگرچہ وہ خاص خیال رکھنے کی عمر سے آگے جا چکی تھی..

تاریکی میں شور بہت تھا..

کچھ موسیقی کا.. کچھ گیت سنگیت کا..

ذرا فاصلے پر ایک ڈچ اور فرانسیسی گروپ کے خیمے تاریکی میں روپوش تھے اور ان میں روپوش سیاح سونے کی سعی کرتے تھے اور کبھی کبھار ان میں سے کوئی ایک خیمے کے پردے میں سے منہ نکال کر اپنی زبان میں احتجاج کرتا تھا کہ ہم سونا چاہتے ہیں.. یہ ہلا گلا موقوف کیا جائے..

یہ سیاح بہت دور سے آئے تھے.. ایک زر کثیر خرچ کر کے آئے تھے اور اب ایک فائیو سٹار ہوٹل کی آسائش اور سکون کے متمنی تھے.. جو انہیں نہیں مل رہا تھا..

باہر اُودھم مچا تھا..

مقامی لوگ نہایت تہذیب یافتہ تھے اور شور مچا رہے تھے..

ایک الاؤ کے گرد ناچتے تھے..

پھر وہ فیری میڈو کیا جہاں راتوں میں کم از کم ایک الاؤ روشن نہ ہوتا ہو..

یہ وہ سیاح نہیں جانتے تھے.. صرف میں جانتا تھا جس نے اٹھارہ برس پیشتر یہاں ایک الاؤ روشن کیا تھا..

یہاں نہیں.. وہاں اس پتھر سے اوپر جہاں "تارڑ... 92ء" نقش تھا اور جسے مقامی لوگ تارڑ پتھر کے نام سے پکارتے تھے.. اس سے اوپر بلندی پر بھی میرا خیمہ تھا.. اور وہیں میں نے اور گیراؤ نے اپنی آخری شب میں.. اس عظیم برفانی وسعت کی گود میں جب یہاں اور کوئی نہ تھا ایک الاؤ روشن کیا تھا.. اور کیا یہ حیرت در حیرت نہیں ہے کہ آج سویرے جب میں اوپر اس بلندی تک گیا تھا جہاں میں نے ان زمانوں میں اپنا خیمہ نصب کیا تھا تو وہاں جو گھاس تھی وہ اب تک دبی ہوئی لگتی تھی.. یقیناً ایسا ممکن تو نہیں' لیکن ایسا لگتا تھا.. گھاس ایک بار چاہت سے دب جائے تو برس ہا برس گزرنے کے بعد بھی اسی بوجھ سے دبی ہوئی لگتی ہے.. لیکن اصل حیرت اس حقیقت میں تھی کہ اُس مقام کی قربت میں جہاں ایک تنے کی اوٹ میں ہم نے الاؤ روشن کیا تھا.. اس کے آثار.. جلی ہوئی لکڑیوں اور ایک نیم سوختہ تنے کی صورت میں ابھی تک موجود تھے.. یہ عین ممکن ہے کہ ہمارے بعد بھی اسی جگہ پر آوارہ گردوں نے الاؤ جلائے ہوں اور یہ اُن کے آثار ہوں.. لیکن میں اُس نیم سوختہ تنے کو پہچانتا تھا.. یہ وہی تھا.. جس کے بجھنے سے فیری میڈو کے آسمان پر ٹمٹماتے تارے ہم پر اُترے تھے..

یہ کل تھا..

اور آج..

درجنوں خیمے تھے.. کیبن اور ڈائننگ روم اور باتھ روم تھے.. اور فیری میڈو کا نصف حصہ چرواہوں کے اگرچہ دیدہ زیب مگر مخل ہوتے مکانوں سے ڈھک چکا تھا.. تو آج یہ الاؤ بجھ بھی جاتا تو ستارے کہاں اُترتے..

ان کے اترنے کے لیے جگہ کم ہو چکی تھی..

آج سویرے سویرے عمران نے مجھے پکی نیند سے بیدار کر دیا تھا اور بیزار کر دیا تھا

"سر.. ہم نے آج تارڑ جھیل کو شوٹ کرنا ہے.. ندی کے اوپر جو لکڑیوں کا کاٹیج ہے جس کی چھت پر آپ کہتے ہیں کہ ان زمانوں میں پھول اُگے ہوئے تھے اور اب اسے گھاس ڈھکتی ہے تو اسے بھی شوٹ کرنا ہے.. پلیز آ جائیے"

جھیل میں پانی بہت کم تھا.. اُس کے کنارے اونچے ہو گئے تھے اور پانی نیچے رہ گئے تھے.. بارش کم ہوئی تھی.. برف کم پڑی تھی.. اسی لیے فنتوری کی ندیاں اور جھرنے خشک اور خاموش تھے.. جنگل میں گھرا ایک ندی پر براجمان وہ شلیے نما لکڑی کا کاٹیج جو میرا پسندیدہ تھا اپنی چھت محض گھاس سے ڈھکتا تھا اور اس گھاس کی ہریاول میں کسی ایک پھول کی بغاوت بھی رنگ نہ دکھاتی تھی..

آج فیری میڈو میں جشن کی شب تھی.. رحمت نبی نے ہم سب کے لیے ایک خصوصی دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا.. ہماری خاطر ایک بکرا ذبح کیا گیا تھا..

عزیز.. رحمت نبی کا بھائی.. اس کیمپنگ کا نگران ہے.. دوستی کے سوا اس میں چالاکی کا عنصر بھی ہے.. دھار ذرا تیز رکھتا ہے.. وہ اپنے گلے کی مالائیں اور موتی منکے چھنکاتا جو اس نے یقیناً غیر ملکی خواتین کو مسحور کرنے کے لیے زیب تن کر رکھے تھے ہمارے پاس آیا "تارڑ صاحب.. ایک فرنچ گروپ ابھی ابھی تو سے اوپر پہنچا ہے.. اگر تو آپ ابھی فوری طور پر ڈنر کرنا پسند کریں تو ہم سرو کر دیتے ہیں.. اور اگر آپ کچھ دیر اور الاؤ کے گرد بیٹھنا یا رقص کرنا چاہتے ہیں تو ہم فرنچ گروپ کو کھانا کھلا دیتے ہیں.. آپ بعد میں اطمینان سے کھا لیجیے گا.. جیسے آپ کی مرضی.."

"بعد میں اے برادر عزیز.."

اور عزیز سر ہلاتا منکے چھنکاتا چلا گیا..

الاؤ کب تک روشن رہتا.. بالآخر بجھ گیا.. کوئی ایک ستارہ بھی نہ گرا..

اس کے انگارے بھی کب تک دہکتے رہتے..وہ بھی سرد ہو گئے اور تب نانگا پربت کی برفوں نے ہمارے بدنوں پر اپنے یخ ہاتھ رکھے کہ اب تو ہماری جانب دیکھ لو..اور وہ ہم پر حکمران ہو گئیں..ہم پر راج کرنے لگیں..فیری میڈو کی شب سیاہ میں نانگا پربت کی برفوں میں جتنی بھی برف ملکائیں مقیم تھیں..جو برفانی محل ایستادہ تھے..برف کے سانپ اور مینڈک تھے وہ سب کے سب جیسے زندہ ہونے لگے..وہ ملکائیں محل' سانپ اور مینڈک نانگا پربت کا مسکن چھوڑ کر نیچے فیری میڈو میں اترنے لگے اور انہوں نے ہم سب کو..وہاں جتنے بھی ذی روح تھے..درجنوں سیاح تھے..خیمے اور کیبن تھے..چرواہوں کے گھر تھے..جو کچھ بھی فیری میڈو کے بدن پر برص کے داغوں کی مانند تھا..اس کو نانگا پربت سے اترتے ہوئے طلسم ہوش ربا نے خاک کر دیا..مٹا دیا..نابود کر دیا..سب کچھ مٹ گیا..فنا ہو گیا اور فیری میڈو ایک مرتبہ پھر وہی ہو گیا جو آج سے اٹھارہ برس پیشتر تھا..

قدرت کی بے مثل صناعی میں انسانی ہاتھوں نے جو دراڑیں کھود دی تھیں وہ معدوم ہو گئیں..جو زخم لگائے تھے وہ بھر گئے..

اوپر تارڑ پتھر کے اوپر فیری میڈو کے سب سے بلند مقام پر..رائے کوٹ گلیشیر کے کناروں پر..تیمور جن برفانی درّوں میں میرے لیے مارخور شکار کرنے گیا تھا ان کے رو برو..نانگا پربت سے ماتھا لگائے صرف میرا خیمہ تھا..اور کچھ نہ تھا..اور صرف میں تھا..

اٹھارہ برس پیشتر کا میرا حدت سے بھرا بدن تھا..اور کوئی نہ تھا..

اور آسمان سے ستارے اُترتے تھے اور میرے بدن کی حدت میں شامل ہو کر میرے پر جوش خون میں دیے جلاتے تھے..

اور ایک دیے میں فیری میڈو کے ان چھوٹے جنگل میں سٹرابیری کے سفید پھول فرش پر بچھتے جاتے تھے..جو مجھے صدائیں دیتے تھے..

ایک دیا..چھوٹے فیری میڈو کی درختوں میں پوشیدہ تنہائی میں جلتا تھا..اور وہاں بھی کوئی نہ تھا..صرف بیابانی اور حُسن کا ذرّ تھا اور میں تھا..

فیری میڈو ایک مرتبہ پھر وہی ہو گیا..جو اٹھارہ برس پیشتر ہوا کرتا تھا..اور میں تنہا..اس کے ان چھوٹے جنگل میں..دنیا کے سب سے سحر طراز منظر میں یکتا اور تنہا تھا..میں اس کے سحر کے آگے ہتھیار ڈالتا تھا اور وہ میرے سامنے سجدہ ریز ہوتا تھا..

ایک ایسا بُت جس کا ایک ہی پجاری تھا..

اور وہ بت اس لیے سر جھکاتا تھا کہ میرے معبد میں بہت مشکل سے..اور بہت تردد سے اگر یہ پجاری آن پہنچا ہے تو میں بھی اس کی تعظیم کروں..

ایک بت تبھی بے رُخی برتتا ہے جب اس کے پوجنے والے حد سے بڑھ جائیں..لیکن اس شب سب کچھ معدوم ہو چکا تھا..

صرف میں تھا اور وہی فیری میڈو تھا جو اٹھارہ برس پیشتر ہوا کرتا تھا..

''تلوار ہے کہ نہیں؟''

میں شب کی ٹھنڈک اور تاریکی میں پردہ پوش خوبانی کے ویران شجر سے واپس گلگت کے اس شالیمار میں آیا جہاں فضل کے ماموں ابھی تک تلوار گھماتے گوٹے کناری سے مزین چوغے میں گھومتے رقص میں مصروف تھے..

''سر جی آپ ماموں سے درخواست کریں کہ وہ اپنے قدیم صندوق میں سے وہ تاریخی تلوار نکال کر لے آئیں.. میں اسے شوٹ کرنا چاہتا ہوں.. پلیز..'' عمران نے پھر میرے کان میں سرگوشی کی..

یہ سرگوشی اکرام کے تیز کانوں میں تیرتی چلی گئی اور وہ سر اُٹھا کر بولا'' تارڑ صاحب.. کوئی تلوار نہیں''

''کیوں فضل.. تلوار ہے؟'' میں نے فضل کے کان میں سرگوشی کی..

فضل بدن جھٹک کر ہنسا اور پھر ڈپلومیٹک ہو گیا'' ماموں کہتے ہیں تو ہے.. ویسے شاید نہیں ہے..''

''بدلتا ہے رنگ گدا کیسے کیسے''

ہم فیری میڈو سے اُترے تو جا گلگت قیام کیا..

گلگت میں اب بے شمار نئے نویلے ارزاں بھی، مہنگے بھی.. سادہ بھی اور شاندار بھی ہوٹل تعمیر ہو چکے تھے' لیکن میرا دل'' چناران'' میں ہی اٹکا ہوا تھا.. مجھے اس کی عادت ہو گئی تھی.. میں سلجوق کے ہمراہ'' ہنزہ داستان'' کے زمانے میں جب پہلی بار گئی رات گلگت پہنچا تو اسی ہوٹل نے میری میزبانی کی تھی.. اور میں اُس کے بعد جب بھی گلگت میں ہوا تو'' چناران'' میں ہی ہوا.. جیسے ایک مجرم بے اختیار اس جگہ کو لوٹتا ہے جہاں اس نے جرم کا ارتکاب کیا تھا تو میں بھی اُسی بے اختیاری کے تحت'' چناران'' کو ہی لوٹتا تھا..

یہاں اب ہشام موئل کا شیرستان راج کرتا تھا..

اور شیرستان اپنے شیرانہ نام کے باوجود ایک ایسا دوست تھا جس سے دوبارہ ملاقات کی تمنا رہتی تھی..

ہم سب چناران کے ایک کمرے میں کوئی کرسی پر اور کوئی صوفے پر اور کوئی قالین پر براجمان فیری میڈو کو بھگتانے کے بعد اب اصل ٹریک کی منصوبہ بندی کر رہے تھے..

وادی نلتر کی جھیلوں کے پار درّہ نلتر کو عبور کر کے وادی اشکومن کے گاؤں پکھورا میں اُترنے کی منصوبہ بندی..

یہ ٹریک قدرے مختصر تھا.. صرف پانچ روز کی مسافت تھی.. اور شنید تھی کہ مشکل ہرگز نہ تھا.. آسان تھا.. '' سنولیک'' کے ٹریک کے بعد میں توبہ تائب ہو چکا تھا.. میں اب اس جیسی ہولناکیوں اور برف بلاکتوں کا تمنائی نہ تھا.. آسان سی کوہ نوردی کرنا چاہتا تھا.. اس لیے میں نے

اس مختصر اور آسان ٹریک کا چناؤ کیا تھا..

چنانچہ جب وادی ہلتر تک لے جانے کے لیے جیپوں کے حصول، وہاں سے پورٹروں کو ہائر کرنے..خوراک خریدنے..راستے میں برفباری کے امکانات اور دیگر جزیات کے بارے میں چھان پھٹک کی جا رہی تھی گدا نے اپنے بہرے کان پر ہاتھ رکھ کر گرد آمیز کی معصوم موجودگی میں شکایت کی ایک صدا بلند کی'' سائیں اس مرتبہ مینجمنٹ ٹھیک نہیں ہے..''اور مینجمنٹ کو اس نے مے نے ج منت..کہا..

''کس چیز کی مینجمنٹ گدا بھائی؟''شاہد اپنے حساب کتاب اور پورٹروں اور اخراجات کے تخمینے پر جھکا ہوا عینک اُتار کر سیدھا ہو گیا..

''سائیں خوراک کا بندوبست ٹھیک نہیں''

''نہ کیسے ٹھیک نہیں، کیا گڑبڑ ہے اس میں۔''میاں فرزند نے حیرت سے پوچھا..

''دیکھیں ناں تو میں سائیں گرد آمیز کو رات گیارہ بجے کے بعد کھانا ملا..اور انہیں اتنی دیر سے کھانے کی عادت نہیں..تو یہ کیا مے نے ج منٹ ہے؟''

''یار گدا..''میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔''تم جانتے ہو کہ بارش شروع ہو گئی تھی ہم سب تھکے ہوئے تھے اور اس کے باوجود میاں فرزند اور ندیم باہر برستی بارش میں ہمارے لیے دا سو کی مرغیاں بنا رہے تھے تو یہ ان کی مہربانی نہیں ہے کیونکہ باقی پوری ٹیم تو خیموں میں دبکی ہوئی تھی''

''کھانا تو رات گیارہ بجے ہی نصیب ہوا ناں..''گدا کو اتنا سنجیدہ ہم نے پہلی بار دیکھا تھا یہاں تک کہ اس کی مونچھیں بھی ساکت تھیں۔

''اور پھر اس کے جب ہم لوگ بیال کیمپ گئے ہیں تو تارڑ صاحب تو اپنی فلم کے کام میں ہم سب کو بھول گئے..تو وہاں بھی ہم بھوکے رہے..''گرد آمیز نے مسکراتے ہوئے شکایت کی ''ہم آپ کے ساتھ بھوک سے مرنے کے لیے نہیں آئے سائیں۔''

''لیکن گرد آمیز صاحب..آپ کو یا کسی بھی ممبر کو خوراک مہیا کرنا تو میری ڈیوٹی نہیں..فیری میڈو کی کیمپنگ میں خوراک کے جو تین چار کارٹن تھے آپ ان میں سے اپنی مرضی سے جو جی میں آتا تھا نکال لیتے اور بیال کیمپ لے جاتے..وہ مشترکہ خوراک تھی''

گرد آمیز بدستور تبسم فرماتا رہا'' سائیں ہم نے ان کارٹن کا بھی معائنہ کیا تھا..ٹین بند خوراکیں تھیں اور دالیں تھیں اور وہ بھی کچی..''

''نہ تو ان کو کہن یا ترکا لگا ہوتا..''میاں تلملایا..

''بندوبست ناقص ہے سائیں..''گدا سر ہلاتا گیا۔''اور پھر آخری رات بھی ہمیں کھانا رات گیارہ بجے کے بعد ملا..سائیں گرد آمیز تب تک سو چکے تھے..یہ کیا مے نے ج منٹ ہے؟''

یہ ناروا اور یکلخت شکایتیں ہم سب کی سمجھ میں نہ آ رہی تھیں..گدا ایک مدت سے ہماری کوہ نوردیوں میں شریک تھا..اچھی رفاقت ثابت ہوتا تھا..ٹریک کے اصولوں اور قوانین سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ ٹریک کی ہر ذمہ داری..خوراک، قیام، پورٹروں کا حصول وغیرہ ایک مشترکہ ذمہ داری تھی تو وہ کیسے شکایت کر سکتا تھا..

''گدا..''میں نے خود کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے اُسے سمجھانے کی سعی کی''تم جانتے ہو کہ آخری رات رحمت نبی اور عزیز نے ہم سب کے اعزاز میں ایک بکرا ذبح کیا اور میرے کہنے پر انہوں نے فرنچ گروپ کو پہلے سرو کیا کیونکہ یہ ان کا کاروبار ہے..انہوں نے تو ہم پر مہربانی کی''

''بے شک مہربانی کی ہو گی لیکن سائیں گرد آمیز تو بھوکے سو گئے ناں..''

سائیں گرد آمیز نے ایک مرتبہ پھر ہمیں ایک مسکراہٹ سے نوازا جو کہتی تھی کہ اے عام لوگو تم کیا جانو کہ ہم اپنا ہر کھانا وقت پر تناول فرماتے ہیں اور بھوکے سونے کے عادی نہیں..

''اور رحمت نبی نے تین دنوں کے قیام کے لیے نہ ہم سے کیمپنگ کرنے کی کوئی رقم چارج کی اور نہ متعدد ناشتوں کا کوئی حساب کیا..''

''یہ تو آپ پر احسان ہو گا سائیں..ہم تو بھوکے مر گئے سائیں۔''

''نہ جی گدا صاحب..''میاں فرزند کچھ زیادہ ہی تلملا گئے''میں نے پوری شام لگا کر فیری میڈو میں آپ کے لیے حلوہ نہیں بنایا تھا..''

''حلوہ؟''گرد آمیز مسکراہٹ ترک کر کے ایک واجبی سے تضحیک آمیز قہقہے میں مبتلا ہوا''وہ کیا حلوہ تھا سائیں..ایسا حلوہ تو کسی قبرستان میں نذر نیاز کے لیے بھی قبول نہیں ہوتا..میٹھا کم تھا اور سوجی بھونی ہوئی نہیں تھی..کچا حلوہ تھا سائیں..سائیں ہم ٹیم کے اخراجات میں حصے دار ہیں کوئی مفت میں تو آپ کے ساتھ نہیں ہیں..''

ہم سب کے منہ حیرت اور دکھ سے کھلے تھے..یہ ہماری کوہ نوردی کی زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا..

''دیکھیں گرد آمیز..''میں نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا'' مجھے بے حد افسوس

ہے..میرے تمام ساتھی بھی بے حد شرمندہ ہیں کہ آپ کو تاتو کی رات میں گیارہ بجے کھانا ملا..یہاں کیمپ میں خوراک کا بندوبست نہ ہوا..آخری شب ڈنر میں تاخیر کے باعث آپ بھوکے سو گئے.. اور میاں فرزند کا حلوہ آپ کی منشا کے مطابق نہ تھا..یقیناً آپ کی درگاہوں میں حلوے کے جو چڑھاوے چڑھتے ہوں گے وہ اس حلوے سے کہیں شیریں اور معیاری ہوتے ہوں گے اور مفت ہوتے ہوں گے لیکن ہم لوگ کاروباری ٹور آپریٹر نہیں ہیں..ساتھی اور دوست ہیں..آپ نے نہایت لجاجت سے درخواست کی تھی کہ سائیں پلیز مجھے بھی ساتھ لے چلیں میں نے آپ کی منت نہیں کی تھی..روانگی سے پیشتر آپ کو پہاڑی سفر کی مشکلات سے آگاہ کر دیا تھا اور آپ جواب میں جی سائیں جی سائیں کہتے رہے تھے..اور گدا کی سفارش پر آپ کو شامل کیا گیا تھا..اب میں آپ کی خدمت میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں اور میری عرض ذرا غور سے سنئے گا..کہ ہلتر پھورا ٹریک کے دوران ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی بدتر بندوبست ہوں..اگر آپ متحمل نہیں ہو سکتے تو بے شک یہیں سے واپس ملتان تشریف لے جائیے..ہم لوگ اس سے بہتر نہیں ہو سکتے..اور نہ ہی میں اس قسم کے سلوک اور شکائتوں کا عادی ہوں..''

گروآمیزی کی مسکراہٹ سمٹ گئی..اور پھر وہ یکدم فرینڈلی اور چارمنگ ہو گیا'' نہ سائیں نہ..ہم تو دوستوں کے لیے جان دے دیتے ہیں..یہاں تک آ گئے ہیں تو آگے بھی چلیں گے آپ کے ساتھ..''

گدا نے گروآمیزی کی مصالحت آمیزی کو ناپسند کیا اور کہنے لگا'' لیکن اس بارے نے ج منت ٹھیک نہیں سائیں..''

''یار آئی ایم سوری..آئندہ میں اگر بھن یا حلوہ بناؤں تو جو چور کی سزا وہ میری..''
میاں فرزند نے عینک جھٹک کر چہرے سے الگ کی اور سلیپنگ بیگ میں روپوش ہو گئے..

''لیڈر کی تقریر اور پورٹر سامان اٹھانے سے انکاری ہو جاتے ہیں''

باہر کوئی لیڈر نما شخص تقریر کر رہا تھا..

اس کی پُرجوش آواز ہلتر ہوٹل کے اس تاریک اور کچے غسل خانے کے اندر تک آ رہی تھی جہاں ایک کموڈ نما شے پر میں اپنی جبین سر کائے براجمان..اپنی بربڑاتی خرابیٔ پیٹ کی اصلاح کے عمل میں ہمہ تن مشغول تھا..

میں سب بندوبست کر چکا تھا..سب کچھ طے پا چکا تھا..کتنے پورٹر ہوں گے..روزانہ مزدوری کتنی ہو گی..پانچ روزہ ہلتر پھورا ٹریک کے لیے سب تفصیلات مکمل ہو چکی تھیں..پورٹر سامان اپنے کندھوں پر بوجھ کئے تیار بیٹھے تھے اور صرف میرے منتظر تھے..چلنے کو تھے کہ میرے تن بدن میں ہنگامی حالت کا اعلان ہو گیا اور میں انہیں صبر کی تلقین کرتا خود بے صبری سے اپنی جبین سنبھالتا ایمرجنسی سے فراغت حاصل کرنے کے لیے یہاں اس تاریک اور کچے غسل خانے میں آ بیٹھا تھا..لیکن باہر کوئی لیڈر نما شخص تقریر کئے چلا جا رہا تھا..

گلگت سے وادی ہلتر کی جانب جیپوں میں کوچ ہوا..

دریا پار شاہراہ ہنزہ تھی اور اس کنارے پر نول کو جانے والی روڈ اب پہلے کی نسبت کشادہ اور پکی تھی..

نول کی باغ و بہار بستی..شاداب اور دریا کی قربت میں ٹھنڈک والی..جہاں عینی کی ایک چینی فرینڈ..ایک اور عینی رہا کرتی تھی..

اس ٹول میں ہماری جیپ کے ڈرائیور نے اپنی خالہ کے گھر کے اندر جا کر دیواروں اور چھتوں پر پھیلتی انگور کی بیلوں سے وہ خوشے اتارے تھے جن کے تازہ ذائقے نے ہمارے حلق میں رس گھولے تھے..

ملتر ہمارے لیے ایک عارضی پڑاؤ تھا..ہم نے وہاں دوپہر کا کھانا تناول کرنا تھا، پورٹروں کا بندوبست کرنا تھا اور آگے نکل جانا تھا..

ہمارے ہمراہ راہبری کے لیے اعظم چلا آیا تھا جو گلگت کے ایک سفری ادارے میں ملازم تھا..کہ تارڑ صاحب میں ملتر تک آپ کے ساتھ چلتا ہوں..آپ کے لیے پورٹر وغیرہ فراہم کر کے واپس آ جاؤں گا..اور وہ بے حد مددگار ثابت ہوا.. پورٹروں کے ساتھ تمام معاملات طے کیے..ادائیگی کیسے ہوگی..کہاں پہنچ کر ہوگی..کتنا وزن اٹھانا ہے وغیرہ وغیرہ.. بوجھ ترازو پر تولے گئے،ہر پورٹر نے اپنے حصے کا سامان باندھا..کچھ نے اپنے بدن پر باندھا اور کچھ نے دو گدھوں پر اور چلنے کو تیار ہو گئے..سب لوگ چلنے کو تیار ہوتے ہیں تو میرے پیٹ میں کچھ بڑبڑاتی دھما چوکڑی سی مچی جو یقیناً ان انگوروں کی عطا کردہ تھی جو میں نے ٹول میں نہایت رغبت سے نوش کیے تھے.. میں نے روانگی سے پیشتر اس کا سدباب کرنا مناسب جانا اور ہوٹل کے کچے اور تاریک غسل خانے میں جا براجمان ہوا..اور یہیں پر تھوڑی دیر بعد مجھے لیڈر کی بلند آہنگ تقریر سنائی دینے لگی..

میں اپنی جین سنبھالتا نیم تاریکی میں سے باہر کی تیز روشنی میں آ گیا..

کیا دیکھتا ہوں کہ ہماری ٹیم کا کل سامان ایک جانب ڈھیر ہے اور ہمارے حاصل کردہ پورٹر اپنے کندھے اور گدھے خالی کیے ایک نوجوان لیڈر نما شخص کی مسلسل اور جذباتی تقریر منہ کھولے نہایت دھیان سے سن رہے ہیں..

معلوم ہوا کہ پورٹروں نے اس لیڈر کے کہنے پر ہمارا سامان اٹھانے سے انکار کر دیا ہے جب تک طے شدہ روزانہ مزدوری میں سو روپے کا اضافہ نہ کیا جائے اور اس کے علاوہ بھی متعدد ڈیمانڈز تھیں..

یہ صورت حال نہایت حیران کن تھی..میں پورٹروں سے مخاطب ہوا "بھائیو اب کیا ہوا ہے؟..ابھی ابھی نہایت خوش اسلوبی سے تمام معاملات طے پا گئے تھے..روزانہ مزدوری..کتنی منزلوں کی مزدوری ادا کی جائے گی..بکرا کب پیش کیا جائے گا..اور آپ لوگ چلنے کو تھے جب مجھے

بلاوا آ گیا تو اب کیا ہوا ہے؟"

پورٹروں نے خاموشی اختیار کر لی..

لیڈر مسلسل تقریر کیے جا رہا تھا اور لگتا تھا کہ ابھی انقلاب آ جائے گا اور پورٹر" دنیا بھر کے پورٹرو ایک ہو جاؤ" کے نعرے لگاتے ہوئے ہم پر دھاوا بول دیں گے..تب لیڈر میری جانب متوجہ ہوا اور تقریر کی والیوم بلند کر دی" ہم غریب لوگ ہیں..سیاحوں اور کوہ نوردوں کے بوجھ ڈھوتے ہیں..اور آپ جیسے لوگ ہماری مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں..ہمیں صرف ڈھائی سو روپے روزانہ ادا کرتے ہیں جب کہ آپ کی کمپنی سیاحوں سے چھ سو روپے چارج کرتی ہے..ہم لوگ آپ کا بوجھ نہیں اٹھائیں گے..نہیں اٹھائیں گے..آپ کے ساتھ نہیں جائیں گے..نہیں جائیں گے..جب تک کہ ہماری ڈیمانڈز پوری نہیں کی جاتیں.."

"بھائی صاحب..ہم زبردستی تو نہیں کر رہے.." میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی "ابھی ابھی پورٹروں کے ساتھ تمام معاملات طے کر لیے گئے تھے ان کی خواہش کے مطابق ادائیگی ہو رہی تھی..جب آپ تشریف لے آئے.."

"یہ تو بھولے لوگ ہیں..سادہ لوگ ہیں آپ کی باتوں میں آ گئے..ہمیں یہ ریٹ منظور نہیں"

"لیڈر بخوبی جانتا تھا کہ ہم پتہ نہیں کہاں سے اور کن مصیبتوں اور طویل مسافتوں کے بعد مارو مار کرتے یہاں ملتر پہنچے ہیں اور بہرصورت ہم نے اس ٹریک پر جانا تھا..اس لیے وہ ہمیں بلیک میل کر رہا تھا..

"دیکھیں یہ کسی سیاحتی کمپنی کا ترتیب شدہ ٹور نہیں..چند دوست ہیں جو ہر برس آپ کے علاقے میں آتے ہیں اور یقین کیجیے نہایت حق حلال کی روزی خرچ کر کے آتے ہیں اور جب گھر واپس جاتے ہیں تو بیویوں کے طعنے بھی سنتے ہیں کہ اتنی رقم برباد کر کے آ گئے ہو کالے سیاہ ہو کر..ہم کوئی تجارتی لوگ نہیں..ہم نے سرکاری شیڈیول کے مطابق پورٹروں کے ریٹ طے کیے ہیں.."

"ہم سرکاری شیڈیول کو نہیں مانتے" لیڈر دھاڑا" ہم اپنے ریٹ مانگتے ہیں نہیں تو چلے جایئے ہمارے علاقے سے.."

صورت حال نہایت تشویش ناک ہو چکی تھی..دوپہر ڈھل رہی تھی اور اگر ہم فوری طور پر یہاں سے روانہ نہیں ہوتے تھے تو ملتر جھیلوں تک پہنچتے رات ہو سکتی تھی..میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا اور لیڈر کی ٹھوڑی مضبوطی سے گرفت میں لے کر اس کا تقریر کرتا چہرہ اپنی جانب کیا.." آپ کون ہیں؟.."

''میں علتر سکول میں ٹیچر ہوں اور عوام کے حقوق کی نگہداشت کرتا ہوں۔''

''کیا آپ مجھے جانتے ہیں!''

''شائد۔''

''شائد نہیں۔۔اگر نہیں جانتے تو میں اپنا تعارف کروا سکتا ہوں۔''

''آپ تارڑ صاحب ہیں۔''

''تو پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ جسے آپ ہمارا علاقہ کہہ رہے ہیں میں ہر برس اس علاقے میں دھکے کھانے کے لیے آجاتا ہوں اور پھر واپس جا کر کتابیں لکھتا ہوں جنہیں پڑھ کر بہت سے لوگ اِدھر کا رخ کرتے ہیں اور یوں آپ کے روزی روزگار میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔۔یہ جانتے ہیں؟''

''ہاں صاحب۔''

''اور اس کے باوجود۔۔اس علاقے میں میری محبت کے باوجود۔۔آپ میری ٹیم کے لیے مشکلات کھڑی کر رہے ہیں۔۔معاون ثابت ہونے کی بجائے ہمیں ذلیل کر رہے ہیں۔۔سُنئے لیڈر صاحب۔سکردو میں۔گلگت میں۔۔سوات اور کاغان میں ایسے بہت سارے مہربان ہیں جو مجھے اپنے علاقوں میں خوش آمدید کہنے کے خواہش مند ہیں تاکہ میں ان کے بارے میں بھی کچھ تحریر کروں۔۔اب اگر میں نے آپ کی وادی کو چنا ہے تو آپ مجھے اس کی سزا دینا چاہتے ہیں؟''

''نہیں صاحب۔۔میں تو صرف عوام کے حقوق کی بات کر رہا ہوں''

''ٹھیک ہے اگر آپ دوست دشمن میں تمیز نہیں کر سکتے اور ان معصوم لوگوں کو ان کی جائز روزی سے محروم کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی۔۔ہم جن جیپوں پر یہاں آئے تھے وہ ابھی تک گلگت واپس نہیں گئیں۔۔ہم انہی پر سوار ہو کر گلگت چلے جاتے ہیں۔''

لیڈر نے کچھ نہ کہا۔

''چلیں میاں صاحب۔۔سامان جیپوں میں لوڈ کروائیں'' میرے ذہن میں مکمل منصوبہ تھا عفر ٹریک ترک کیا جاتا ہے۔۔آج رات گلگت میں جا بسر کریں گے اور کل صبح اکرام بیگ کی معاونت سے ہم تھورو گلیشیئر کے ٹریک پر چلے جائیں گے۔۔

میرے ساتھیوں نے سامان اٹھانا شروع کر دیا۔۔

پورٹر جو ابھی ابھی اس لیڈر کو نہایت اشتیاق بھری نظروں سے تک رہے تھے اس

کارروائی کو دیکھ کر اس کے گرد ہو گئے اور ہاتھ ہلا ہلا کر سوال جواب کرنے لگے۔۔وہ جان گئے تھے کہ ہم گلگت واپس چلے جانے کے بارے میں سو فیصد سنجیدہ ہیں۔۔اور ہم تھے۔۔قدرے توقف کے بعد لیڈر میرے پاس آ گیا۔۔سر ہم آپ کی بہت قدر کرتے ہیں۔۔شمال میں اگر ہم باہر کے کسی شخص کی عزت کرتے ہیں تو وہ۔۔صرف آپ ہیں''

''آپ نے کیا خوب عزت کی ہے میری۔۔تھینک یو''

''دراصل آپ کے ہمراہ وال جیز ٹورز کا جو شخص ہے اُسے دیکھ کر مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی کہ یہ کمپنی کا ٹور ہے۔۔یقین جانئے یہ لوگ ہمارے مزدوروں کو بہت کم رقم دیتے ہیں اور سیاحوں سے ہماری مزدوری کے کھاتے میں تین چار گنا زیادہ پیسے وصول کرتے ہیں''....ہم لوگ سارا سال گرمیوں کے ان دو تین مہینوں میں روزی کمانے کی آس میں گزارتے ہیں۔۔آپ سے تو ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے''۔۔

''آپ کو میری بات کا یقین کیوں نہیں آیا تھا کہ یہ ایک تجارتی ٹور نہیں ہے۔۔''

''صرف اس شخص کی وجہ سے جو آپ کے ساتھ ہے۔۔''

''تو پھر چلے جائیں گلگت؟''

''نہیں جائیے سر۔'' وہ مسکرانے لگا۔۔اور اس کی مسکراہٹ میں معذرت تھی'' آپ کے ساتھ تو پورٹر مفت بھی جانے کو تیار ہیں۔''

''تھینک یو''

لیڈر اب نہایت بے لوث ہو کر پورٹروں کو تلقین کر رہا تھا کہ صاحب اور اس کی ٹیم کا خیال رکھنا۔۔انہیں تنگ نہ کرنا۔۔

''روانہ ہو جائیں سر۔۔دیر ہو رہی ہے'' اس نے نہایت خوشدلی سے کہا۔۔

پھر سے گہما گہمی شروع ہو گئی۔۔پورٹر سامان اٹھانے اور باندھنے لگے۔۔گدھے پھر سے لوڈ ہونے لگے۔۔

شمال کے بیشتر باسی دل کے کھرے ہیں۔۔وقتی اُبال آتا ہے اور پھر پُرسکون ہو جاتے ہیں۔۔اور یہ اُبال بھی کسی حد تک جائز ہے کہ ان کی محرومیاں اور مایوسیاں بہت ہیں۔۔زندگی کٹھن اور پتھروں سے بھری ہوئی ہے۔۔نامہربان موسموں اور دشوار زندگی کے ستائے ہوئے یہ لوگ پورا سال ان مہینوں کے منتظر رہتے ہیں جب یہاں سیاح اور کوہ نورد اترتے ہیں اور ان کو روزی روزگار کی صورت نظر آتی ہے تو وہ بے چین ہو کر ذرا جوشیلے اور بے احتیاط ہو جاتے ہیں۔۔

''ٹریک کا پہلا قدم..بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے آزاد ہو کر مصر سے نکلتے ہیں''

ملتر ہوٹل سے قافلہ نکلنے لگا..

جب اس کے دو کمروں کے سامنے والی گھاس پر سے تمام بوجھ اُٹھ گئے.. پورٹر اور گدھے نکل گئے تو ہم سب باری باری اپنے رُک سیک اٹھائے اس راستے پر گامزن ہوئے جو وادی ملتر کے دل میں سے سفر کرتا آج شب کی منزل..ملتر جھیلوں کو جاتا تھا..

ایک پہاڑی سفر کے آغاز کا..ایک ٹریک..ایک کوہ نوردی کا سب سے ہیجان خیز اور مسرت سے اُبلتا دمکتا ہمکتا اور چنچل لمحہ بس یہی ہوتا ہے..جب پورے برس کی منصوبہ بندی کے بعد..ایک خواب کی تکمیل کا پہلا لمحہ..مشوروں اور تجربہ کار کوہ نوردوں سے ہم کلامیوں کے بعد..خوراک..خیموں اخراجات کے تخمینے اور دیگر ضروریات کے حصول کے بعد..اور سب سے اہم..پورٹروں کے ساتھ معاملات طے کرنے کے بعد جب آپ اُس ٹریک پر روانہ ہونے کے لیے پہلا قدم اُٹھاتے ہیں..تو جیسے بنی اسرائیل فرعون کی غلامی سے آزاد ہو کر مصر سے نکلتے ہیں..اس شوق اور خوشی سے..ایک نئی زندگی کی خواہش میں..تو تقریباً ایسی سرخوشی میں ڈوبے ہوئے..ایک آوارہ گرد ایک کوہ نورد کہیں بلند پہاڑوں میں جانے کے لیے..پہلا قدم اٹھاتا ہے..

وہ بھی ایک برس تک معاشرے اور خاندانی بندھنوں کے فرعون کی غلامی کرنے کے بعد اُس سرزمین کی جانب جاتا ہے جس کا اُس کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا..

آبادیوں اور تہذیب کے کفار اور مُشرک اس کی جان کے درپے ہوتے ہیں اور وہ وہاں

سے ہجرت کر جاتا ہے..

تو یہ پہلا قدم تمام کلفتیں اور غلامی کی صدیاں بُھلا دیتا ہے..

جیسے ایک عشق خاص برسوں کی جدائی پہلی نظر میں بھلا دیتا ہے..

یوں میں نے پہلا قدم رکھا..

میرے ساتھی کوہ نوردوں کے احساسات بھی مجھ سے جدا نہ تھے..

گردآمیز کی مسرت دیکھنے کے لائق تھی.....وہ ایک رولی پولی ٹیڈی بیئر کی طرح ادھر اُدھر لڑھکتا اپنے متعدد کیمرے سنبھالتا ہر اس شے کی تصویر اتارتا تھا جو اس لائق نہ تھی کہ اس کی تصویر اُتاری جائے..اور اس میں مَیں بھی شامل تھا..گدا کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ گردآمیز کو اپنی ہتھیلیوں پر چلانا چاہتا تھا..سائیں ذرا دیکھ کر چلیں..ادھر پانی ہے..ادھر گہرائی ہے سائیں..ٹھنڈا پانی حاضر کروں سائیں..سائیں بلندی ہے آہستہ چلیں سانس پھول جائے گا..گدا ہمارے وجود سے یکسر غافل ہو چکا تھا بلکہ ہم میں سے کوئی ایک جب گردآمیز سے آگے نکلتا تھا تو وہ خفا ہو جاتا تھا کہ سائیں فوٹو اُتارتے ہیں آپ ادھر پاسے ہو جاؤ..

حسن اپنی بیوی کے عشق میں فنا اور ہیار ہر منظر کے سامنے آنے پر اس کی یاد میں ایک ہوکا بھرتا تھا اور مسکراتا تھا..

شاہد نہایت متانت سے قدم دھرتا میاں صاحب سے چہلیں کرتا چلتا تھا..

صرف ایک قلق تھا کہ ہمارے دونوں جانب پتھریلی دیواریں تھیں جو وادی ملتر کو ہم سے جُدا کرتی تھیں..

پیچھے سے..ملتر کی جانب سے ایک نوجوان بھاگتا ہوا آیا اور زرد رس بھری خوبانیوں کی ایک پوٹلی ہمیں پیش کر دی..

یہ خوبانیاں لیڈر نے خاص طور پر ہمارے لیے بھجوائی تھیں..

مَیں اور خان سلیم برابر میں چلتے تھے..اور بیوقوف مگر آزاد پنچھیوں کی طرح چہچہاتے ہوئے چلتے تھے..

''تارڑ صاحب..یہ عشق کیا چیز ہے؟''سلیم نے یکدم سوال کیا..

''یار ٹریک کے پہلے دن..پہلے قدموں پر..اتنا مشکل سوال نہیں پوچھا کرتے..''

''مَیں انتظار کر سکتا ہوں..''اُس نے اپنے غیر متوازن دانت نمائش کئے''ابھی پانچ

روز کا پہاڑی سفر باقی ہے"

میاں اور شاہد ایک ایسا جوڑا تھے جو اگرچہ مدتوں سے شادی شدہ تھا لیکن ابھی تک وہ ایک دوسرے کو جل دے رہے تھے.. اور جل دینے میں شاہد ایک ایکسپرٹ تھا..

حسن کے چہرے پر وہی معصوم مسکراہٹ تھی جو ایک بچے کے چہرے پر پہلی بار آئس کریم چکھنے پر پھیلتی ہے..

ندیم نے ہم سے بے وفائی کی تھی.. فیری میڈو میں ساتھ دینے کے بعد گلگت میں رہ گیا تھا کہ اُس کا بنک اس کی طویل غیر موجودگی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا.. اور ہم سب اس کی کمی کو محسوس کرتے تھے..

عمران اور اُس کے بغل بچے.. ہماری نسبت بوجھ اُٹھانے والوں گدھوں کو زیادہ اہمیت دے رہے تھے اور ان کی تھوتھنیوں اور دیگر اعضاء کو شوٹ کر رہے تھے..

مجھے وہی اُلجھن ہو رہی تھی..

ہم ابھی تک مکمل طور پر آزاد نہیں ہوئے تھے..

ہمارے دونوں جانب پتھریلی دیواریں تھیں.. ذاتی جائیداد کی حرص نے وادی کو اور اس کے منظر کو کاٹ کر رکھ دیا تھا..

میں اس سے پیشتر صرف ایک بار ملتر آیا تھا.. اپنے خاندان کے ہمراہ.. اور ملتر ہوٹل سے آگے نالے کے پار ایک نہایت پوش وی آئی پی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا جس کی بکنگ مجھے انتقاماً مل گئی تھی.. میں اُس زمانے میں جہاں اس وادی کی گھنی سرسبز ٹھنڈک اور بھید بھرے سیاہ جنگلوں میں سائیں سائیں کرتی شفاف ہواؤں سے متاثر ہوا تھا وہاں اس کے مکمل سناٹوں نے مجھ میں ہول بھر دیا تھا.... یہاں اتنی تنہائی تھی کہ دکھ دیتی تھی.. اتنی خاموشی تھی کہ ڈراتا تھا.. صرف ایئرفورس کی موجودگی اور سکی لفٹ اس ویران مگر دل پر بلندی اور ٹھنڈک کے ہاتھ رکھنے والی وادی کو کچھ رونق بخشتے تھے..

لیکن اب.. جو کچھ کُل جہان میں ہو رہا تھا.. وہ یہاں بھی ہوا تھا.. ملتر بہت پھیل چکا تھا.. بڑا ہو چکا تھا.. یہاں اب میدانوں سے آنے والوں نے ذاتی گھر تعمیر کر لیے تھے.. اس رونق نے سناٹوں کو دھکیل دیا اور ان کے ساتھ کچھ خوبصورتی بھی دھکیلی گئی.. لیکن کیا کیجیے.. یہاں بھی وہی کچھ ہو رہا تھا جو کُل جہان میں ہو رہا تھا..

ابھی کچھ دور گئے ہیں تو دائیں جانب مقامی آبادی اور کھیت کچھ کم ہوئے اور ایک شاندار ہوٹل کی عمارت دکھائی دی جو تعمیر تو ہو چکی تھی لیکن تکمیل تک نہیں پہنچی تھی.. اس کے نگران جو صاحب تھے وہ شاید بیکار بیٹھے تھے چند کوہ نوردوں کو گزرتے دیکھ کر برآمدے میں سے اُٹھے اور ہمارے پاس آ گئے.. "صاحب ہوٹل کے تین کمرے بالکل تیار ہیں.. رات ادھر گزاریئے" یہ دل کو خوشی سے بھر دینے والی پیشکش تھی کہ یہ ہوٹل آرام دہ لگتا تھا.. قدرتی منظر کا حصہ تھا اور اس کی کھڑکیوں میں کچھ نیلی چٹانیں، دو آبشاریں، بہت سی برفیں نہ صرف دکھائی دیتی تھیں بلکہ اندر آتی تھیں.. ہم تھکے ہوئے بھی تھے.. ہم اپنے آپ پر جبر کر کے آگے بڑھ گئے.. کیونکہ ٹریک میں حساب کتاب بہت ہوتا ہے.. منزلوں، پورٹروں اور آپ کو فلاں دن وصول کرنے والی مختصر جیپوں کی تاریخوں کا حساب اور آپ اپنے من کی موج میں جہاں جی چاہے ٹھہر نہیں سکتے.. شیڈول کی پابندی کرنی پڑتی ہے.. اس راستے میں مویشی ہانکتے، بھیڑیں چراتے، گدھے آگے لگائے، گھروں کو لوٹتے جتنے کسان اور مقامی لوگ ملے وہ سب سادہ مزاج اور خوش اخلاق تھے..

ایک کسان مجھ سے آگے اپنی گائے کو ہانکتا چل رہا تھا.. میں اس کے برابر میں جا پہنچا، "جھیلیں کتنی دور ہیں؟"

"پاس ہیں.." اس نے اطلاع دی..

گائیڈ بکس میں بھی یہی اطلاع تھی.. ملتر ہوٹل میں بھی یہی بتایا گیا تھا کہ ہم وہاں آسانی سے تین چار گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے.. لیکن جب اس کسان بھائی نے یہ کہا کہ "پاس ہیں" تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کیونکہ شمال میں جب کوئی مقامی شخص کسی بھی مقام کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ.. پاس ہے.. تو جان لیجیے کہ وہ ہرگز پاس نہیں بہت دور ہے.. اور اس پاس تک پہنچتے پہنچتے آپ بالکل فیل ہو جائیں گے..

ہم بہت بلند کناروں پر تھے اور نیچے دریا کا پھیلاؤ تھا جس کے پار نیلی چٹانیں بہت بلندی تک جاتی تھیں برفیں ٹھہری ہوئی تھیں اور ان میں سے دو آبشاریں گرتی تھیں..

راستے میں ٹائروں کے نشان ثبت تھے اور ہم دھیرے دھیرے کچھ پچھتائے کہ جھیلوں تک جانے کے لیے جیپوں کا سہارا کیوں نہ لیا..

اگرچہ اس راستے پر جیپیں بھی آسانی سے نہیں چلتی ہوں گی..

آبادی کم ہو گئی.. اور آس پاس بھی گھنے شجر سایہ کرنے لگے.. راستہ نیچے دریا تک آیا اور

پھر بلند ہو گیا..

دوسری جانب سے پہلے ایک ٹریکٹر آیا جسے راستہ دینے کے لیے ہم ڈھلوان پر اُترے اور اپنے آپ کو بمشکل گرنے سے بچایا.. پھر ایک لینڈ کروزر نمودار ہوئی جس میں ایک غیر ملکی براجمان تھا.. اس لینڈ کروزر نے بھی ہمیں پریشانی میں مبتلا کیا کہ راستہ بہت تنگ تھا..

پھر ایک اور جنگل کا آغاز ہو گیا.. یہ گھرا اور نیم تاریک تھا.. اس کے اندر شام ہو گئی.. باہر آئے تو وہ شام پھر سے دن میں بدل گئی..

پانچ بج گئے لیکن جھیلوں کی قربت کے کوئی آثار نہ تھے..

ہم تھکنے لگے..

سفر کے آغاز کی چلبلاہٹ اور نوخیزی دم توڑنے لگی.. ہم ذہنی طور پر تین چار گھنٹوں میں جھیلوں تک پہنچنے والے تھے اور نہیں پہنچے تھے.. پہلے صرف جنگلوں کے اندر شام تھی اب باہر بھی اُترنے لگی..

گردآمیز کی مسکراہٹ سمٹ چکی تھی اور اس کے کیمرے واپس کیسوں میں جا چکے تھے اور وہ بار بار پوچھتا تھا کہ سائیں آپ نے تو کہا تھا کہ ہم تین چار گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے تو نہیں پہنچے.. جھیلیں کہاں ہیں؟..

''گردآمیز.. جھیلوں کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا.. یہ تو کبھی عمر بھر کی مسافت کے بعد بھی نہیں ملتیں.. آپ تو ابھی صرف پانچ گھنٹے چلے ہیں..''

''دریائے برالڈو کے چھوٹے بھائی کے وحشی پانیوں میں ڈوبتا ابھرتا ایک متروک شدہ اداکار.. اور ایک بکری''

ہمیں مسلسل بتایا جا رہا تھا کہ.. جھیلیں بس قریب ہیں.. کوئی گھر کو لوٹتا کسان.. کوئی گمشدہ سا بچہ ایک بکری ہانکتا ہوا.. اور کوئی گڈریا شام سے پہلے اپنی گڈرین کے پاس پہنچنے کی خواہش میں.. یہ ہمیں مسلسل بتاتے تھے کہ جھیلیں اب بہت قریب ہیں.. پاس ہیں صاحب.. جب میرے کانوں وہ آبی شور اُترا..

وہ آبی شور جس کی دہشت بدن کو ڈر کے سناٹے میں اُتار دیتی ہے.. اُس میں سے جان نکال دیتی ہے.. در گوتھ کی ندیوں ایسا ہولناک آبی آہنگ.. اور وہ بھی سرِ شام.. جب صور پھونکا جائے گا تو اس سے ملتی جلتی دہشت.. آپ اپنے تئیں بہرے بن جاتے ہیں.. پوری کوشش کرتے ہیں کہ یہ ایک واہمہ ثابت ہو.. اور وہ واہمہ نہیں ہوتا دل کو مٹھی میں لے کر نچوڑ دینے والی ایک حقیقت ہوتی ہے.. وہ خبر کرتی ہے کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو اس کے آگے شاید اس ٹیلے کے پار بلند پہاڑوں سے اُترنے والا مہیب گرجدار اور نہ لحاظ کرنے والا ایک نالہ ہے جسے تم پار نہیں کر پاؤ گے..

ہمیں کسی نے بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ وادی ہلتر سے جھیلوں کو جاتے ہوئے کوئی ایک نالہ بھی راستے میں آتا ہے.. نہ پورٹروں نے، نہ گائیڈ جس نے اور نہ کسی ٹریکر نے بتایا تھا.. ہر ایک نے یہی کہا تھا کہ جھیلیں.. وادی ہلتر سے صرف تین گھنٹے کی آسان مسافت پر.. سرگشت کرتے.. ہرے بھرے جنگلوں میں چلتے.. گپیں لگاتے.. ایک خوشگوار واک کے بعد آپ کے سامنے ہوں گی..

اور سامنے کیا آتا ہے..

درگوتھ کی ایک سفید اور وحشی ندی کا بڑا بھائی.. بلکہ بھائی جان.. ایک نالہ.. جو نالہ تو کیا تھا دریائے براللڈو کا چھوٹا بھائی تھا.. بلندی سے اترتا.. بلند کناروں کے بیچ سر پٹختا.. کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی.. کل کائنات میں یہی آبی شور ہے اور اس کے سفید مرگ صفت پانیوں میں سے ہر لحظہ اناللہ.. کی صدائیں آ رہی ہیں.. ہم ہرگز اس کے پار نہیں جا سکتے تھے..

کوہ نوردی کا کھیل تماشہ ختم ہو چکا تھا اور ہم سب اس کے کناروں پر کھڑے ڈر نے بدن کو جو بے اختیار کپکپاہٹ عطا کی تھی اس پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے..

ہم کھیل تماشے میں پہاڑوں کے شیر کی دم سے کھیلتے رہے تھے اور اب اس نے پیچھے مڑ کر دھاڑنا شروع کر دیا تھا..

"صاحب.." ایک پورٹر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "ہم تو صاحب کسی نہ کسی طرح پار چلے جائیں گے لیکن آپ کے لیے بہت مشکل ہے.. اس میں اگر گرتے ہیں تو پھر یہ آپ کو اٹھنے نہیں دے گا.."

"اس کے بارے میں ہمیں کسی نے نہیں بتایا تھا.."

"یہ دن کے وقت تو بہت آسان ہوتا ہے صاحب".. پانی کم ہوتا ہے بچے بھی گزر جاتے ہیں.. آپ کی غلطی ہے.. آپ عشر سے بہت دیر میں چلے.. اب شام ہو رہی ہے تو یہ کناروں تک بھر گیا ہے.."

اور یہ نالہ وہ ہرگز نہیں تھا جس کے بارے میں حضرت علامہ نے فرمایا تھا کہ اس خاموشی میں جائیں اتنے بلند نالے..

یہاں نہ خاموشی تھی اور نہ یہ نالہ بلند ہوتا تھا بلکہ بلندی سے نیچے آتا تھا..

اب میں اس امکان پر سنجیدگی سے غور کر رہا تھا.. اور اس امکان کو نالے کا پُردہشت شور اور چنگھاڑ تقویت دے رہے تھے کہ رات اسی کنارے پر کر لی جائے اور اسے کل سویرے جب اس کے پانی اتر چکے ہوں گے عبور کیا جائے جب عمران وڈیو کیمرے کے کالے برقعے میں سر دیے اسے ایک توپ کی طرح میرے چہرے کے قریب لاتا اندر ہی اندر بولا "چلو جی تارڑ صاحب.."

"کہاں چلو جی.." میں نے لرزتے ہوئے دریافت کیا..

"اس نالے میں.. آپ اب ایک نڈر اور جانباز لیڈر کی حیثیت سے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر.. بلکہ ہتھیلی پر رکھ کر ٹیم کے لیے مثال قائم کرنے کے لیے سب سے پہلے اس نالے میں

اترتے ہیں.. چلیں"

"مثال قائم کرتا ہوں اور پھر ڈوب جاتا ہوں"

"مثال قائم کرنے والے ہمیشہ ڈوب جاتے ہیں سر.. یہی ہوتا چلا آیا ہے.. آپ ہمت کریں"

"عمران تم میری جان کے ویری ہو؟"

"سر دیر نہ کریں.. ساؤنڈ سسٹم آن ہے.. بیٹریاں آن ہیں.. کیمرہ آن ہے۔"

"نہیں یار.. کسی اور کو اتار دو"

"لیڈر آپ ہیں.. اور اس ڈاکومنٹری کے ہیرو آپ ہیں.. آپ ہی پہلے اتریں گے"

"یار اتنے بلند کنارے سے پہلے نیچے اتروں اور پھر اس آتش نمرود میں کود جاؤں بنا کسی پیغمبری کے.. تم دیکھ نہیں رہے کہ پانی کی تندی ایسی ہے کہ پتھروں کو بھی لڑھکا رہی ہے.. میں پہلا قدم رکھوں گا تو میری قلابازی لگ جائے گی.. پار اترنا تو دور کی بات ہے"

پورٹر اس مکالمے سے لطف اندوز ہو رہے تھے.. میرے ساتھیوں میں سے بھی کوئی میری مدد کو نہ آیا.. انہیں خفیف سا احتجاج تو کرنا چاہیے تھا کہ عمران ہمارے لیڈر کو مجبور نہ کرو.. اور وہ ایک ہاتھ سے اپنی نیکر ٹٹول رہا تھا.. پھر اسی ہاتھ سے داڑھی کھجاتا تھا" یہی تو میری زندگی کا بہترین شاٹ ہو گا سر.. کہ ایک سیلف سٹائلڈ بابا جی کوہ نورد جو باہر کی دنیا کو اپنے ہولناک پہاڑی اور برفانی سفروں کی داستانیں سنا سنا کر مرعوب کرتا ہے وہ اب ایک وحشی پہاڑی نالے میں بے خطر کود پڑتا ہے.."

"بے خطر کود پڑتا ہے تو پھر کیا ہوتا ہے عمران؟"

"تو پہلے قدم کے بعد اس کی قلابازی لگ جاتی ہے.. پانی میں گرتا ہے.. سنبھل نہیں سکتا اور کیمرے کی آنکھ سے اوجھل ہو جاتا ہے.. اور تب سکرین پر صرف اس نالے کے پُرشور پانی دکھائی دیتے ہیں وہ کہیں دکھائی نہیں دیتا.. وہ غائب ہو چکا ہے اور پھر پاکستان کا قومی ترانہ بجتا ہے کہ عجب آزاد مرد تھا.. یہ اس کی زندگی کا آخری شاٹ ہے جس میں وہ آزاد مرد ادھر ڈوبا اُدھر نکلا اور پھر ڈوبا تو نکلا ہی نہیں"

عمران کے بارے میں میرا وہ شک پختہ یقین میں بدل گیا کہ وہ اس سفر پر صرف اس لیے آیا ہے کہ میری زندگی کے آخری لمحوں کو قلم بند کرنے کا اعزاز حاصل کر سکے..

عمران وہ پتھر دل کیمرہ مین تھا جو رابرٹ کینیڈی کے سر میں گولی لگنے کے بعد اسے طبی امداد دینے کی بجائے کیمرہ اس کے پچکے ہوئے بھیجے پر جمائے اس کے مرنے کا منظر محفوظ کرنے میں محو تھا اور جب اُس کی بیوی احتجاج دوہائی دیتی ہے کہ یہ تم کیا کر رہے ہو تو وہ کہتا ہے ''لیڈی دس از ہسٹری۔''

تو اب عمران اس قسم کی ہسٹری ریکارڈ کرنے کا تمنائی تھا اور میرے پاس اس کے سوا کوئی چارا نہ تھا کہ میں ہسٹری کے آگے ہتھیار ڈال دوں۔ اس آتش آب میں کود پڑوں جس کے گل وگلزار ہو جانے کا کوئی چانس نہ تھا۔۔

مجھے بہر طور اولین شہید آب ہونا تھا۔۔

'' چلیں سر جی۔۔ لائٹ بھی کم ہو رہی ہے۔۔ آپ بھی تو سوہنی کے دیس کے ہیں جو کچے گھڑے کے ساتھ چناب میں اُتر گئی تھی''

'' لیکن یہاں تو کچا گھڑا بھی نہیں ہے''

'' اور آپ بھی تو سوہنی نہیں۔۔ چلیے سر جی بیسٹ اور ٹائم ضائع نہ کریں''

یہ شام تھی۔۔ اگر کچھ نظر آ رہا تھا تو پانیوں کی جھاگ کی سفیدی تھی۔۔ یا موت تھی۔۔ میں اپنی جبین سنبھالتا ایک پورٹر کا سہارا لیتا بڑی مشکل سے بلند کنارے سے نیچے اُترا اور پانیوں کی بوچھاڑ کی قربت میں ہوا۔۔ پھر نالے کو جانچا۔۔ کہاں کہاں اس کے پانیوں میں پتھر دکھائی دیتے ہیں۔۔ کہاں وہ قدرے اطمینان سے بہتے ہیں اور کہاں ایسے گرداب گھومتے ہیں جو مجھے نگل سکتے ہیں۔۔

نالے کی بے لگام بوچھاڑوں میں کبھی کبھار کوئی مقامی کسان تیرتا۔۔ اُبھرتا۔۔ پتھروں کو پھلانگتا پار چلا جاتا۔۔ ان لوگوں کو دراصل گر کر سنبھل جانا آتا تھا۔۔

میں نے ایک بار ایک گڈریے کو دیکھا کہ وہ اپنی بکری کو پار لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔۔ بکری کے پاؤں فوراً اُکھڑتے اور وہ اس کے گلے سے بندھی ہوئی رسی اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر اسے پانی سے باہر گھسیٹ لیتا۔۔ دو تین بار ایسا ہی ہوا تو بکری نے عقل سلیم استعمال کرتے ہوئے نالے میں پھر سے اُترنے سے انکار کر دیا۔۔ وہ لاکھ رسی کھینچنے سے بھی پانیوں کے قریب نہ آتی تھی۔۔ اس نے چاروں ٹانگوں کو ریورس گیئر لگا رکھا تھا۔۔ تب گڈریے نے جیب میں سے ایک دھجی برآمد کر کے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔۔ یہ طریقہ آزمودہ تھا۔۔ بکری پانی میں اُتر گئی۔۔ کبھی وہ گڈریا گرتا اور کبھی بکری پانی میں ڈوب جاتی۔۔ لیکن وہ پار ہو گئے۔۔

لیکن میری آنکھوں پر تو پٹی باندھنے والا بھی کوئی نہ تھا۔۔

میرے ساتھی کناروں پر کھڑے۔۔ میرے لیے تشویش میں کھڑے تھے اور عمران کے کیمرے کی لوتھی مجھے زوم ان کر رہی تھی۔۔

میں نے بسم اللہ پڑھ کر۔۔ اپنے بچوں کو یاد کر کے نالے میں پہلا قدم رکھا اور یہ میری توقع کے عین مطابق تھا۔۔ یہ پانی نہیں تھے بھونکتے ہوئے پاگل کتے تھے جو میری ٹانگوں کو جھنجوڑتے تھے۔۔ میں نے ایک پورٹر کی بانہوں کا سہارا بھی لے رکھا تھا۔۔ میں ایک بار بڑی طرح لڑکھڑایا پھر سنبھل گیا۔۔ میں ان پتھروں کو نظر میں رکھتا تھا جو کبھی کبھار پانی میں سے اُبھرتے ننگے ہو جاتے تھے۔۔ مجھے وہاں تک پہنچنا تھا اور پھر کسی اور پتھر کی تلاش میں۔۔ اب اس کی تفصیل میں کیا جانا کہ جان سے جاتے ہوئے، پار جاتے ہوئے ہم پہ کیا گزری۔۔ جو ہم پہ گزری سو گزری۔۔ لیکن ایک اقرار میں بہر طور کروں گا۔۔ کہ اس جان لیوا آبی پارگی کے دوران بھی میرے اندر کا مرا ہوا اداکار ہوشیار تھا۔۔ اور ہر لمحے اسے احساس تھا کہ اسے شوٹ کیا جا رہا ہے اور وہ صرف شاٹ کے لیے ایک جعلی بہادری اور بظاہر نڈر خصلت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔۔ اگر میں ڈوب جاتا تو بھی یہ طے ہے کہ میں آخری بار سطح آب سے باہر آتے ہوئے کیمرے کی جانب ہاتھ لہرا کر مرتے ہوئے لبوں پر ایک مسکراہٹ سجا کر ''ہیلو'' ضرور کہتا۔۔ یہ ایک متروک اداکار کی مجبوری تھی۔۔

دوسرے کنارے پر متعدد ہاتھ تھے جنہوں نے مجھے باہر گھسیٹ لیا۔۔

اگرچہ شعلۂ عشق کو میرے بعد سیاہ پوش ہو جانا چاہیے تھا۔۔ یعنی شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے۔۔ لیکن میری حیات کی شمع نالے کے پانیوں سے گل نہ ہوئی تو میرے ساتھی بھی نالے میں قدم دھرنے لگے۔۔

میں نالے کے دوسرے کنارے پر بیٹھا اپنے جوگرز اُتار کر۔۔ جرابیں اُتار کر انہیں نچوڑ رہا تھا لیکن پانیوں کی برف سردی میرے پورے بدن کو جھنجوڑ کر اسے ٹھٹھرنے پر مجبور کرتی تھی۔۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ میں پار آ گیا ہوں۔۔

''ملتر جھیلیں جو ہڑ جھیلیں.. اور میری شان میں گدھے کا راگ درباری''

اب شام رخصت ہوا چاہتی تھی اور تاریکی پر تولتی تھی..

گوجروں کے کچھ جھونپڑے تھے.. آلو کے کھیت تھے اور ایک گھنا جنگل تھا..

کسی ایک جھونپڑے میں پہلا دیا روشن ہوا..

ہم ابھی تک بھیگے ہوئے.. ٹھٹھرتے ہوئے.. جھیلوں کی آس میں بھٹکتے ہوئے چلتے تھے.. پھر ایک پُل آیا..

پُل کے پار درختوں کا ایک گھنا ذخیرہ تھا جس میں گوجروں کے چند جھونپڑے تھے.. گائیڈ بکس میں اس مقام کا نام ''بنگلہ'' ہے..

ہم ان کے قریب سے ہو کر جنگل میں بھٹکتے چلتے.. تھکاوٹ سے اور سردی سے اور پانی سے شرابور چلتے ذرا کھلی فضا میں آئے جہاں دو ندیاں بہتی تھیں.. جو بے حد پُرسکون اور ہموار تھیں..

ہم بے پرواہ ہو کر ان میں سے مزید سرد اور ٹھنڈے ہوتے گزر گئے اور تب جا کر جب شام کے بعد رات ہو چلی تھی اندھیرے میں ایک ٹیلا نظر آیا.. ہم اس پر قدم گھسیٹتے.. بیزار.. ایک دوسرے کے وجود سے غافل.. اپنی اپنی تھکاوٹ میں چُور اُس ٹیلے پر چڑھے تو ایک پورٹر نے کہا ''صاحب جھیل آ گیا ہے..''

''کہاں آ گیا ہے؟'' میں نے اپنے سامنے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کچھ نہ کچھ دیکھنے کی جستجو کی اور وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا..

''صاحب رات کے اس ٹیم کیسے نظر آئے گا.. دن کو نظر آئے گا.. لیکن جھیل آ گیا ہے''

سامنے ایک موہوم اور اندھیاری سی.. بجھی ہوئی شاید کوئی تصویر تھی یا نہیں تھی.. یا ایک واہمہ تھی.. ایک جوہڑ نما علاقے کی تھی..

ہم جھیلوں کے ماہر تھے.. ایکسپرٹ تھے.. دور سے جان جاتے تھے کہ جھیل کیسی ہے.. اس کی خصلت میں کیا ہے.. اس میں اُترنے سے خنکی اور ناپسندیدگی کا احساس ہو گا یا آپ کے بدن کے لمس سے اس کے پانی یکدم بڑھ جائیں گے اور آسودگی دینے والے ہو جائیں گے.. اور چھپاک چھپاک کی مسرت آمیز آہوں سے وہ آپ کا استقبال کرے گی..

لیکن ہم جھیلوں کے ماہر آج مات کھا گئے تھے..

ملتر کی جھیلیں اس تاریکی میں جیسی بھی دکھائی دے رہی تھیں کچھ اچھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں.. بس جوہڑ سی دکھائی دے رہی تھیں.. ہم ٹیلے سے نیچے اُترے تو پانی کی قربت کا احساس ہوا جسے ہم دیکھ نہیں سکتے تھے چٹانوں کی اوٹ میں ہمارے خیمے نصب ہو چکے تھے اور ایک لالٹین روشن تھی.. خیمہ گاہ کچھ بے کشش سی لگتی تھی لیکن ہم اس سے خوبصورتی کے نہیں خوراک کے تمنائی تھے.. میں نے ابراہیم یعنی ہمارے آفیشل کُک کو طلب کیا ''آپ نے ہمارے لیے کھانا تیار کر لیا ہے؟''

اور ابراہیم نہایت معصومیت سے کہتا ہے.. نہیں صاحب.. میں آپ کا انتظار کر رہا تھا کہ آپ آئیں اور بتائیں کہ کیا بنانا ہے..

''یار کچھ بھی بنا لو.. بس گرم ہو اور بہت ہو.. کتنی دیر میں بنا لو گے..''

''دو تین گھنٹے میں تیار کر لیں گے صاحب..''

''دو تین گھنٹے میں تو ہم فوت ہو جائیں گے ابراہیم'' سلیم بولا..

''تو پھر ڈھائی گھنٹے میں بنالیں گے آپ آرڈر کرو''

میں اپنے خیمے میں جا گرا.. میری رانیں خراشوں سے بھری ہوئی تھیں اور ان میں سے خون رستا تھا.. میں اُن حضرات کو کوس رہا تھا جنہوں نے کہا تھا کہ ملتر جھیلیں تو محض تین گھنٹے کی آسان اور گنگناتی ہوئی مسافت پر ہیں.. سردی تھی اور میرے بھیگے ہوئے جوگرز پاؤں کو برف کر رہے تھے.. میں انہیں اتارنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہ تھی..

خیمہ گاہ چند بڑے بڑے پتھروں کی اوٹ میں تھی.. جھیل کنارے نہ تھی..

جونہی میرے بدنی حالات سنبھلے میں نے جوگرز اُتار کر انہیں نچوڑا.. پھر جرابیں کھینچ کر

انہیں نچوڑا اور خیمے سے باہر پھینک دیا.. اور ایک مرتبہ پھر ابراہیم کو طلب کر لیا'' تم نے کچھ پکانا شروع کیا ہے؟''

''صاحب آپ نے ابھی تک آرڈر ہی نہیں دیا.. ویسے چولہا جلا لیا ہے''

''خدا کے واسطے کچھ بھی بنا لو.. کیا بناؤ گے؟''

''بریانی بنائے گا. قورمہ کا ڈبہ کھولے گا.. پراٹھے کھلائے گا.. مرغی مصالحہ بنائے گا''

''سب کچھ بنا لو.'' میرے منہ میں پانی آنے لگا..

''سب کچھ بناؤں گا تو صبح ہو جائے گی صاحب..''

''تو پھر..''

''آلو شوربہ بنا لیتا ہوں.. بس دو گھنٹے میں تیار ہو جائے گا..'' وہ جانے لگا..

''سنو ابراہیم.. ادھر پتھروں کے درمیان کیوں کیمپ کر لیا ہے.. جھیل کنارے خیمے کیوں نہیں لگائے؟''

''ادھر گھاس ہے.. دلدل ہے اور رات کو قلفی جمتا ہے بہت ٹھنڈی ہوا چلتا ہے.. ادھر پتھروں کے درمیان ہوا سے بچاؤ ہوگا.. گورا لوگ بھی ادھر کیمپ کرتا ہے..''

ایک تو شمال میں ان گورا لوگوں کے حوالوں سے بہت تنگ آیا ہوا تھا.. پورٹر.. گائیڈ باورچی سب لوگ بات بے بات پر گورا لوگ کا تذکرہ شروع کر دیتے تھے.. گورا لوگ تو ہمیں ٹپ دیتا ہے.. گورا لوگ تو اُبلی ہوئی سبزی کھاتا ہے اور آپ روز پلاؤ پراٹھا مانگتا ہے.. گورا لوگ تو ٹائلٹ جاتا ہے تو پیپر استعمال کرتا ہے آپ کہتا ہے کہ لوٹے میں گرم پانی لاؤ نہیں تو نیچے سے قلفی ہو جائے گا.. اور گورا لوگ کے ساتھ گوری لوگ ہوتا ہے اور آپ کے ساتھ میاں صاحب ہے..

''لیکن ابراہیم ہم تو جھیل دیکھنا چاہتے تھے..''

''تو صبح اُٹھ کر دیکھ لینا.. اب دیکھ کر کیا کرے گا.. نظر بھی نہیں آئے گا..''

''ٹھیک ہے تم آلو شوربہ تیار کرو..''

گئی رات ابراہیم کی یہ خصوصی ڈش ترپال بچھا کر پیش کی گئی.. درمیان میں لکڑیاں سلگائی گئی تھیں جنہیں الاؤ کا نام بھی دیا جا سکتا ہے.. چنانچہ ہمارے چہرے تو آگ کی حدت سے آسودہ ہوتے تھے لیکن ہماری پشتیں بقول ابراہیم قلفی ہوتی تھیں.. آلو شوربے میں روٹی بھگوتے تو لگتا جھیل کے پانیوں میں ہاتھ ڈال دیا ہے.. ٹھنڈا اور چٹا چٹنگ.. اور آلو پتھر کے موافق..

''سر جی یہ عشق کیا چیز ہے؟'' سلیم نے شوربے کی پلیٹ کو منہ سے لگا کر تر چھا کیا اور ڈیک لگا کر پی گیا.. پھر مونچھیں پونچھیں اور پھر پوچھا..

''تمہیں ہو گیا ہے؟''

''نہیں''

''تو پوچھتے کیوں ہو؟''

''تاکہ جب ہو تو پتہ چل جائے کہ ہو گیا ہے..''

عجیب مسخرہ شخص تھا..

خیمے میں جانے سے پیشتر میں الاؤ سے پرے ایک بڑے پتھر تک گیا جس کے عقب میں جھیل کی شنید تھی.. وہاں ٹھہرے ہوئے بساند دیتے پانیوں کا شائبہ سا تھا.. اور اس کا حجم بھی زیادہ نہ لگتا تھا.. وہی گاؤں کے کسی عام سے جوہڑ کے سائز کا.. اسی لیے میں نے آج تک کسی کو وانو روکو ان جھیلوں کے بارے میں پُر جوش ہوتے نہیں سنا تھا.. اور نہ کبھی ان کی کوئی قابل ذکر تصویر دیکھی تھی.. میں واپس ہوا الاؤ کی روشنی کو نظر میں رکھتا احتیاط سے قدم رکھتا خیمہ گاہ میں واپس آیا اور اپنے خیمے میں جا لیٹا.. پھر احساس ہوا کہ سلیپنگ بیگ کے اوپر پڑا ہوں.. اس کی زِپ کھولی اور اس کے اندر دُکھتے بدن کو سرکاتا گھس گیا.. میں پورے ایک برس بعد اپنے کمرے سے نکل کر ایک خیمے کی آوارہ گرد آزادی میں رات کرنے کو تھا لیکن آج شب میں کوئی ہیجان کوئی خوش بختی محسوس نہیں کر رہا تھا.. ایک تو اس بار بھان متی یعنی میں نے ایک عجیب سا کنبہ جمع کر لیا تھا.. میں، شاہد، میاں اور سلیم ایک گروپ تھے.. عمران، طاہر اور کاظمی ایک الگ فرقہ تھے اور گدا اور گردآ میز کی جوڑی بھی کیا رب نے بنائی تھی.. اور سب لوگ الگ الگ اپنے گروپ، فرقے اور جوڑے میں مگن چلتے تھے.. مصروفیات مختلف تھیں اور آپس میں کوئی رابطہ نہ تھا.. غلط میں لیڈر نے بھی کچھ عارضی بدمزگی پیدا کر دی تھی.. فیری میڈو کے بعد وادی بلتر بھی کچھ پھیکی پھیکی لگ رہی تھی اور سونے پر سہاگا وہ کمبخت غیر متوقع نالہ تھا.. اور ان سب کا نکتہ عروج آلو شوربہ اور جوہڑ جھیلیں تھیں..

لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ نکتہ عروج تو ابھی آنے کو ہے.. اور اسی شب آنے کو ہے.. میں اپنی خون آلود خراشوں کو سہلاتا ایک حاملہ عورت کی مانند ٹانگیں چوڑی کیے ابھی نیند کی وادی میں اُترنے کی آرزو اور کوشش میں تھا کہ میرے خیمے کے پردے کے عین اوپر ایک ہلکی سی خرخراہٹ ہوئی جو کسی خر کی تھی اور پھر اس خرخراہٹ کے تسلسل میں پہلے ایک زوردار ڈھیں ہوئی

پھر وہ ڈھینچوں ہوئی اور یوں جگر سوز اور دلدوز اور بہت ہی بلند ہوئی کہ خیمے کے پردے لرزنے لگے.. اس کے ساتھ میرے کانوں کے پردے بھی لرزنے لگے.. یہ ڈھینچوں ڈھینچوں اتنی بلند والیوم میں تھی کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اس خرِ غلتز نے جاپان سے خصوصی طور پر کوئی ہائی فائی ساؤنڈ سسٹم امپورٹ کیا ہے اُس کے کم از کم چھ سپیکر میرے خیمے کے گرد نصب کیے ہیں اور پھر مائک میں تھوتھنی گھسا کر آہ و فغاں کا یہ سلسلہ صدا آزار شروع کر دیا ہے.. میں نے تحمل سے کام لیا.. اپنے آپ پر جبر کیا اور صبر کیا اس خیال سے کہ بلندی کی وجہ سے ہماری طرح اس گدھے کا سانس بھی تھوڑی دیر میں پھول جائے گا لیکن یہ دہی خیال تھا جسے خام کہتے ہیں.. وہ نیک جانور بے تکان اور ایک عجیب عالم بے خودی میں اس الاپ میں مصروف رہا.. صرف ایک بار کچھ توقف کیا اور جتنی دیر میں میں نے سلیپنگ بیگ میں سے سر نکال کر اطمینان کا ایک سانس لیا اتنی دیر میں وہ پھر فن کی بلندیوں کو چھونے لگا.. میں کہاں تک صبر کرتا.. مجھے ابھی تک کسی بھی پورٹر کا نام یاد نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے پھر ''ابراہیم ابراہیم'' کی دوہائی دی.. یہ دوہائی متعدد بار دی گئی کیونکہ گدھے کے سُر سے اونچا سُر لگانے کے لیے ایک اور گدھا ہونا ضروری تھا..

ابراہیم ابھی کھانے کے برتن سمیٹ رہا تھا.. وہ فوری طور پر خیمے کے باہر حاضر ہو گیا اور چیخ کر پوچھا ''کیا ہے صاحب؟''

''یہ گدھا کس کا ہے..''

''ہمارا اپنا ہے سر..''

''لیکن ہمارے ساتھ تو میاں، شاہد.. گردآمیز اور گدا وغیرہ آئے ہیں، گدھا کہاں سے آ گیا..''

''ٹیم ممبر ہے سر..''

''یہ سلیم تو نہیں ہو سکتا وہ تو میرے برابر میں خراٹے لے رہا ہے اور اُس کی مونچھیں پھڑک رہی ہیں.. شاہد ہے؟''

''نہیں صاحب..'' ابراہیم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں'' یہ تو پورٹر گدھا ہے سر۔''

''میں نے تو کسی گدھے کو پورٹر کے طور پر ہائر نہیں کیا''

''لیکن صاحب آپ نے جس امین پورٹر کو ہائر کیا ہے یہ اس کا گدھا ہے.. جو بوجھ اٹھا

کر چلتا ہے اور وہ اسے ہانکتا ہے''

''درست.. تو یہ رات کے اس پہر کیوں بولتا ہے؟'' اور اس طرح کیوں بولتا ہے؟''

''گدھا تو اسی موافق بولے گا سر..''

''یہ چپ نہیں ہو گا؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''اس کا مرضی ہے صاحب..''

میں سلیپنگ بیگ سے اُلجھتا.. غصے سے سلگتا اور اُبلتا.. سردی میں ٹھٹھرتا خیمے سے باہر آ گیا'' اس کے ساتھ جو پورٹر ہے امین.. تو وہ کہاں ہے؟''

''وہ اُدھر پتھروں کے نیچے مزے سے سوتا ہے سر..''

''تو اسے کہو کہ اپنے اس گدھے کو فوری طور پر میرے خیمے سے کہیں دور لے جائے..''

''کہاں لے جائے گا سر.. گدھا تو اِدھر ہی رہے گا.. ٹیم ممبر ہے''

''کہیں بھی لے جائے.. بے شک جھیل میں ڈبو دے.. لیکن یہاں سے لے جائے.. نہیں لے جائے گا تو اس کو مزدوری نہیں ملے گا..

''آپ کو ایک اور گدھا بھی نہیں ملے گا صاحب.. وہ پورٹر کا سامان اٹھاتا ہے''

''تم بحث کیوں کرتے ہو ابراہیم.. کیوں کرتے ہو''.. میں چونکہ تقریباً چیخ رہا تھا اس لیے بقیہ خیموں میں نیم خوابیدہ ٹیم ممبران بھی بیدار ہو گئے اور بجائے اس کے میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے.. جگتیں کرنے لگے.. مجھ پر پھبتیاں کسنے لگے..

''مائی لیڈر..'' یہ شاہد کی آواز تھی'' ہمیں تو آپ بولنے نہیں دیتے گدھے کو تو بولنے دیں''

فوری طور پر میاں صاحب نے شاہد کا ساتھ دیا'' تارڑ صاحب.. گدھے کا پتہ نہیں کیا پرابلم ہے.. ڈرا ڈرا میٹک ہو رہا ہے تو اس کی مجبوری ہو گی.. آپ غصہ کیوں کرتے ہیں''

''یار یہ تمہیں ڈسٹرب نہیں کر رہا؟''

''نہیں..'' دونوں نے کورس میں جواب دیا..

اس دوران عمران بھی اپنے خیمے میں سے بولا.. اور ایسے بولا جیسے خواب میں بول رہا ہو.. رُک رُک کر.. اور آسودگی میں گم بولا.. وہ تینوں آج کی تھکن کا مداوا دھوپ سے کر رہے تھے..

انہیں گدھے کی آواز بھی سُریلی لگ رہی تھی'' سر جی.. گدھے کو پرفارم کرنے دیں.. ذرا ہمدردی سے سنیں.. خود کو اس کی جگہ رکھ کر سنیں.. نہایت سُریلا ڈکی ہے.. کیا میوزک ہے سر.. جھیل علتر کے کناروں پر گویا سمفنی ہے.. آپ ذرا ہمدردی سے سُنیں..''

ویسے ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جتنی دیر میں ابراہیم سے گفت و شنید کرتا.. یا ٹیم ممبران مجھ پر فقرے بازی کرتے رہتے گدھا بالکل خاموشی اختیار کر لیتا اور جونہی گفتگو میں وقفہ آتا وہ طویل التنفس بے چین روح اپنی کسی بے وفا محبوبہ کے فراق میں شائد نہایت جگر شگاف ڈھینچوں ڈھینچوں کا سلسلہ کلام پھر سے شروع کر دیتا..

''ابراہیم..'' میں پھر گرجا..

''سر میں امین کو جگاتا ہوں اور اس کو بولتا ہوں کہ اپنے گدھے کا کچھ کرے...'' ابراہیم اس پتھر کی جانب چلا گیا جہاں سردی سے لاپرواہ ہمارے پورٹر بوسیدہ کمبلوں اور پرانی جیکٹوں میں ننگے پاؤں گچھا مچھا ہو کر گہری نیند میں تھے.. تھوڑی دیر بعد گدھے کا مالک امین آنکھیں ملتا ہوا نمودار ہوا.. ازار بند اُڑستا اور بیزار شکل کے ساتھ نمودار ہوا اور اپنے اس عزیز کے ایک لمبے کان کو گرفت میں لے کر اسے ایک جانب لے گیا.. خیمہ گاہ سے کہیں دور لے گیا لیکن جہاں بھی لے گیا وہاں سے ایک مختصر وقفے کے بعد اس نے پھر راگ درباری الاپنا شروع کر دیا.... اگرچہ اب دوری کے باعث اس کا ساؤنڈ سسٹم نسبتاً کمزور پڑ چکا تھا.. بالآخر میں نے اسے ایک لوری سمجھ کر قبول کر لیا اور اونگھنے لگا.. بلکہ گدھے کی دور سے آتی ہوئی فراق آمیز آواز میں وقفہ ہوتا تو میری آنکھ کھل جاتی.. یعنی شب بھر راجہ جاتیر!..

''علتر جھیلیں.. شیشے کا ایک شہر.. آبی جادوگری کے گُل رنگ انار.. ایک طلسم ہوش رُبا''

شمال میں کوہ نوردیوں کے دوران اگر آپ رات گئے تھکے ہارے کسی منزل پر پہنچتے ہیں، خیمے نصب کر کے شب گزارتے ہیں تو اکثر اوقات اگلی سویر حیرانی کی ہوتی ہے.. آپ اپنے آپ کو ایک حقیقی طور پر مختلف جگہ پر پاتے ہیں.. اور ہمیشہ حیران ہوتے ہیں کہ کیا یہ وہی مقام ہے جہاں پچھلی شب میں آیا تھا.. اس لیے کہ اندھیرے کے باعث جو منظر لالٹین کی روشنی میں محدود اور مختصر ہوتا ہے وہ دن کی روشنی میں پھیل جاتا ہے.. سفر کی تھکاوٹ کم ہو چکی ہوتی ہے اور بینائی بڑھ جاتی ہے..

اگلی سویر.. وادی علتر میں پہلی شب گزارنے کے بعد میں خیمے سے باہر آیا تو یہی کیفیت تھی..

ہماری خیمہ گاہ تو خاصی خوش نظر تھی.. کناروں پر چند چٹانیں تھیں.. پتھروں کی ایک فصیل کے اندر ایک ہموار جگہ روپوش تھی جہاں ہمارے خیمے تھے اور اردگرد دور و دیوار پر سبزہ اُگ رہا تھا.. کچھ درخت تھے.. جھاڑیاں اور گھنی گھاس اور کہیں بیلیں لٹکتی تھیں اور جو سویر کی ہوا تھی اس میں ایک نم آلود.. ستھری سرد مہک تھی جو ہمارے آس پاس تیرتی تھی اور اس میں سانس نہیں وہ نایاب انعام تھا جو صرف کوہ نوردوں کی قسمت میں ہوتا ہے..

ہمارا پرسنل گدھا بھی کب کا شانت ہو چکا تھا..

ابراہیم بڑے پتھر کی اوٹ میں ایک دھواں دار چولہا جلائے پراٹھے تل رہا تھا جن کی مست مہک آلو شوربے سے عاجز آئے ہوئے ہمارے بدن کے اندر بارانِ رحمت کی مانند برستی

دھوم مچاتی تھی..

میں نے اپنی شیونگ کٹ سنبھالی.. برش پر ٹوتھ پیسٹ لگا کر ابراہیم کو پکارا'' یار لوٹے میں گرم پانی لے کر آؤ.. صاحب شیو کرے گا.. برش کرے گا''

ابراہیم نے میری پکار پر دھیان نہیں دیا پراٹھے پر دھیان دیا اور بے رُخی سے بولا'' صاحب.. اُس پتھر کے پار چلے جاؤ.. درختوں کے پیچھے.. وہاں دنیا بھر کا پانی ہے.. زیادہ ٹھنڈا نہیں ہے..''

میں اپنے سلیپر گھسیٹتا.. برش پر جمی ٹوتھ پیسٹ کو بیلنس کرتا.. درختوں کے پیچھے گیا جہاں دن کی روشنی نے منظر کو وسیع کر دیا تھا اور وہاں دنیا بھر کا پانی تھا..

اگرچہ وہاں دنیا بھر کے پانی تھے لیکن دنیا بھر میں ایسے پانی کہیں اور نہیں ہو سکتے تھے.. ایسے ملتر جھیلوں کے پانی تھے..

میں اپنے سلیپر گھسیٹتا، برش پر جمی ٹوتھ پیسٹ بیلنس کرتا درختوں کے پیچھے گیا ہوں تو ایک اور دنیا میں چلا گیا ہوں.. سویر کی ہلکی دھوپ میں ملتر جھیلوں کے پانی تھے جن میں میں چلا گیا ہوں.. وہ دکھائی ہی نہیں دیتے تھے کہ اتنے شفاف تھے.. دکھائی نہیں دیتے تبھی تو میں رُکا نہیں ان کے اندر چلا گیا ہوں..

یہ آبی جادوگری کا ایک شہر تھا جس میں سب کچھ دکھائی دیتا تھا.. پانی کے سوا ہر شے دکھائی دیتی تھی..

شیشے کا ایک شہر تھا اور دکھائی نہیں دیتا تھا اتنا شفاف تھا..

یہ اس ساحر کے سحر سے وجود میں آیا تھا اور میں آنکھیں نہیں جھپکتا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہ میری پلکوں کی زد میں آیا تو یہ گیا.. کرچی کرچی ہوا..

میں اپنے سلیپنگ بیگ میں سے اٹھا ہوں تو اس طلسم ہوش ربا میں داخل ہو گیا ہوں اور اب آنکھیں نہیں جھپکتا کہ یہ ٹوٹ نہ جائے..

یہ پانی نہ تھے.. شیشہ گری کا شفاف کام تھا جس کی تہہ میں پڑے برچ کے درختوں کے سفید تنے زندہ لگتے تھے.. اس میں سبز کائی کے پھریرے ہولے ہولے سرسراتے تھے کہ وہ تہہ میں سے پھوٹنے والے چشموں کی زد میں آتے تھے اور ہولے ہولے سرسراتے تھے.... جہاں کہیں کوئی چشمہ پھوٹتا تھا وہاں وہ شیشہ آب میں ایک گل رنگ انار کی طرح پھوٹتا تھا، رنگوں کی پھلجھڑیاں اس

شیشے کے شفاف بدن میں شب برات کرتی تھیں.. چشموں کی نیلاہٹ کے نیل شیشہ پانیوں میں دھیرے دھیرے سرگوشیاں کرتے تھے.. اور سب کچھ دکھائی دیتا تھا سوائے پانیوں کے جن کی شفافی اُنہیں شیشہ کرتی تھی..

ٹیڑھے میڑھے کناروں پر گھاس کے کناروں پر کہیں برچ کے درخت پانیوں میں اوندھے پڑے تھے اور کہیں ان پر جھکے ہوئے تھے..

یہ ایک جہانِ شیشہ گری تھا.. میں سانس بھی آہستہ لیتا تھا کہ نازک ہے بہت کام.. میں نے زندگی بھر ایسے طلسم خیز ستھرے اور آر پار شفاف پانی کہیں نہیں دیکھے تھے..

میں اپنے ٹوتھ برش کو ایک فاتر العقل شخص کی مانند تھامے.. منہ کھولے.. ملتر جھیل کو تکتا جا رہا تھا کہ جھیلیں ایسی تو نہیں ہوتیں..

وہ شاندار ہوتی ہیں برف پوش پہاڑوں میں گھری پیالہ سیف الملوک ہوتی ہیں.. رنگ بدلتی سونے کے ذرّوں والے چشموں کے کنارے صد پارہ ہوتی ہیں..

کوئی کرومبر ہوتی ہیں جو سردیوں میں منجمد ہوتی ہیں تو ان پر یاکوں کے قافلے چلتے ہیں..

خشک پہاڑوں میں گھری حنا ہوتی ہیں اور کنجھر ہوتی ہیں جن پر دور دیسوں کے پرندے اُترتے ہیں..

مگر ایسی نہیں ہوتیں جیسی یہ ملتر جھیل تھی..

میں جو اپنے تئیں جھیلوں کا ماہر تھا یہاں مار کھا گیا تھا.. اپنی نادانی میں شب کی تاریکی میں اسے جوہڑ سمجھ بیٹھا تھا اور اس نے مجھے برباد کر دیا تھا.. یہ تو رینائر اور وان گوگ کے برش سے وجود میں آنے والی شوخ تازہ رنگوں کی تصویر تھی جس میں سب کچھ دکھائی دیتا تھا سوائے پانی کے..

یہ قطعی مبالغہ نہیں کہ اس کے پانی اتنے شفاف اور شیشہ تھے کہ سویر کی دھوپ میں بالکل دکھائی نہیں دے رہے تھے.. صرف اس کی تہہ میں سے جو چشمے اُبل رہے تھے اُن کے بلبلوں کے اُٹھنے سے ان شیشوں میں عارضی دراڑیں پڑتی تھیں.. اور جو نیلاہٹ اس کی تہہ میں بچھی تھی وہ نیلاہٹ نہیں تری حیرت تھی.. جہاں کہیں تہہ میں سے پھوٹنے والے پانی زور کرتے تھے وہاں سبز کائی ان کی زد میں آ کر سرسراتی اور زندہ ہوتی لگتی تھی..

گہرائی زیادہ نہیں تھی.. لیکن اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے پانیوں میں گرے ہوئے برچ کے تنے.. شاخوں کے انبار.. کائی کے مختلف سبز بھی اور بھورے رنگ.. پتے اور کچھ

کنکریاں عریاں تھے جیسے ان کے اوپر پانی نہیں صرف خلاء ہے.. میں آپ کو اس طلسم میں یوں شامل کرتا ہوں کہ ذرا میرے ساتھ دیکھئے.. سطح آب پر سویر کی ہلکی روشنی میں ایک خزاں رسیدہ تانبے کے رنگ کا پتہ ہے جو ہوا کے زور سے ہولے ہولے حرکت کرتا ہے کہ پانی تو سکوت میں ہے.. اب سطح آب سے نیچے جھیل کی تہہ کو دیکھئے.. اس پتے کے عین نیچے جھیل کی تہہ میں اس کا سایہ اسی مدھم رفتار سے ہولے ہولے آگے ہوتا ہے..

اسے ایک باقاعدہ جھیل نہیں کہا جا سکتا تھا..

اس کا کوئی باقاعدہ حدود اربعہ نہیں تھا..

یہ خاصی بے ترتیب تھی..

محض پانیوں کا ایک ساکن ذخیرہ تھی..

چند ٹیلے تھے جن کے اندر یہ پانی بھرے ہوئے تھے.. اس کے دوسرے کنارے پر بھی جو دور نہ تھا.. برچ کے کیڑے.. کچھ زندہ کچھ خشک ہو چکے سفید درخت جھکے ہوئے تھے.. کچھ اس کے پانیوں میں گرے ہوئے تھے اور ان کی سفید شکلیں تہہ میں ذرا بھی مدھم نہ ہوتی تھیں.. میں قطعی طور پر پچھلی شب اس جھیل کو جوہڑ خیال کرنے پر شرمندہ نہ تھا.. شرمندگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے..

ایسے شیشہ پانی.. کائی کے سبزے اور بھورے.. اور نیلے اور گوڑھے رنگ میں نے آج تک کسی بھی جھیل میں نہیں دیکھے تھے..

جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ یہ ایک باقاعدہ جھیل نہیں تھی.. یہ ایک جھیل کے تصور پر پوری نہیں اترتی تھی.. یہ ایک شعبدہ تھا.. شیشہ گری اور حیرت گری کے رنگوں کی ایسی نگری تھی جو صرف جادوئی داستانوں اور قصوں میں ہی جنم لیتی ہے..

یہ کہیں دکھائی نہیں دیتی.. صرف اس کا تخیل پرواز کرتا ہوا اسے کوہ قاف تک لے جاتا ہے اور پھر بھی اسے سچ مچ اپنے سامنے پا کر وہ تخیل بھی حیرت زدہ رہ جاتا ہے..

میں ابھی تک اس سحر کے سناٹے میں آیا ہوا اسی خزاں رسیدہ پتے کو تکتا تھا جو سطح آب پر ہوا کی نامعلوم زد میں آ کر ہولے ہولے سرکتا تھا اور اس کے نیچے کئی فٹ نیچے اس کا سایہ جھیل کی تہہ میں حرکت کرتا تھا..

اگرچہ اس آسمانوں سے اتری ہوئی شیشہ نگری میں اپنا ٹوتھ برش ڈبو کر دانت مانجھنا اور پھر سیفٹی ریزر اس کے پانیوں میں تر کر کے شیو بنانا اور کلیاں کرنا توہین جھیل تھی.. لیکن ادھر اس کی

کوئی سزا نہ تھی، کوئی فتویٰ نہ تھا اس لیے میں نے مجبوراً ایسا کیا..

میں برش کو جھیل میں اتارتا تو وہ پانی کے آر پار دکھائی دیتا رہتا.. اگر میں اپنا ہاتھ ڈبوتا تو وہ بھی ایک مائیکل انجلو کے تراشیدہ ہاتھ کی مانند پوری تفصیل سے دکھائی دیتا رہتا..

دھوپ کے قدرے تیز ہونے سے.. یہ پانی تو بالکل ہی شیشہ ہو کر نظر سے اوجھل ہو رہے تھے اور تہہ کے بوٹے اور کائی رنگ نکھارتے آپ کے لبوں تک آتے تھے.. یہ اگرچہ شیشہ پانی تھے لیکن ان پر جھکنے سے چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا، تہہ میں جو جہان رنگ و بو تھا وہ نظر آنے لگتا تھا..

ایسا ہوا اور اکثر ہوا کہ میں نے کسی موڑ پر.. کوہ نوردیوں کے کسی موڑ پر.. کوئی بدن میں سنسنی اور تشکر بھر دینے والا منظر یکدم دیکھا تو میں نے آوارگی جو دیوانگی عطا کرتی ہے اس سے مغلوب ہو کر کبھی ''یا ہو'' قسم کا بیہودہ نعرہ بلند کیا اور کبھی اس منظر کو ہاتھ ہلا کر ''ہیلو'' کہا.. یا انگلیوں کو لبوں پر رکھ کر ''آئی لو یو'' کی سرگوشی کی.. اور کبھی ''سبحان اللہ'' کہا.. اور اکثر چُپ بھی ہوا.. یہاں میں چُپ نہیں رہنا چاہتا تھا.. کچھ نہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ نہ کہا کیونکہ کچھ بھی کہنے سے منظر ٹوٹتا تھا..

''شیشۂ آب پر ایک کنکر.. ایک پتہ اور ایک رنگین مچھلی''

مجھے اپنے آپ پر تو اختیار تھا لیکن میں عمران کا کیا کرتا کہ اس نے کچھ لحاظ نہ کیا اور منظر کو توڑ دیا'' واہ تارڑ صاحب.. کیا اور جنل اور نیچرل شاٹ دیا ہے آپ نے..'' وہ اپنے بغل بچوں سمیت.. آلات فلم بندی سمیت.. کیبل کھینچتا.. اپنے دور بین نما لینز سنبھالتا.. تیکر ٹٹولتا.. داڑھی کھجاتا بڑے پتھر کے عقب میں سے ایک ناگہانی آفت کی طرح نازل ہوا اور منظر کو برباد کر دیا'' سر میں نے ادھر چھپ کر آپ کو ملتر جھیل کنارے نوتھ برش کرتے.. شیو بناتے شوٹ کیا ہے.. قسم سے کیا موازنہ ہوا ہے آسمانی خوبصورتی کا اور زمینی بدصورتی کا..''

یہ عمران کی ذی ہوشی کے آخری فقرے تھے.. انہیں ادا کرنے کے فوراً بعد اس نے کیمرہ زمین پر رکھا.. دیگر آلات فلم بندی کو گلے سے الگ کیا اور جھیل کنارے لیٹ کر پھر سے'' ہائے اللہ جی.. میں آپ سے نہیں بولتا اللہ جی.. میں کیا کروں.. کدھر جاؤں.. تو نے یہ رنگ مجھے پہلے کیوں نہیں دکھائے.. یہ رنگ میری زندگی میں پہلے کیوں نہیں آئے.. میری بیوی پہلے کیوں آئی..''

''یار عمران ڈرامہ بند کرو..'' میں نے بیزار ہو کر کہا..

''دلی کیفیت ہے سر جی.. قسم سے ڈرامہ نہیں کر رہا..'' وہ اٹھا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا'' معافی چاہتا ہوں لیکن آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ میرے ساتھ یہ ہونے والا ہے''.. اور'' یہ'' کہتے ہوئے اُس نے ہاتھ لہرا کر جھیل کے پورے کینوس پر بچھے شیشہ گری کے کام اور رنگوں کی جانب اشارہ کیا..

''فرہنگی عمران.. مجھے خود پتہ نہیں تھا کہ میرے ساتھ یہ ہونے والا ہے.. میں تمہیں کیا بتاتا..''

''پچھلی شب تو آپ کہتے تھے کہ یہ جوہڑ ہیں''

''پچھلی رات میں نے جھک ماری تھی..؟''

''مجھے پہلے سے ہی شک تھا کہ آپ جھک مارنے میں ماہر ہیں.. لیکن سر شکریہ'' وہ میرے سامنے جھک گیا'' یہ تو اخیر ہے''

''نہیں عمران کوہ نوردی میں کوئی اخیر نہیں ہوتا.. ممکنات اور طلسم کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا.. کوئی آخری سرحد نہیں ہوتی.. یہی تو آوارگی کی شان ہے کہ عقیدے.. حب الوطنی اور شاید محبت کی بھی کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہے.. لیکن یہ تو وہ دشت امکان ہے جس میں آرزو کے قدم دھرتے جاؤ تو یہ وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے''

''یقیناً..'' عمران نے بیزار ہو کر اپنی تیکر ٹٹولنے کا عمل پورا کیا'' لیکن اب ذرا سنجیدہ ہو کر کچھ کام کر لیں..''

''مجھے بتاؤ کہ کیا کرنا ہے؟''

''سر جی.. آپ اپنے آپ میں گُم.. کیمرے کے وجود سے غافل جھیل کے کناروں پر چلتے جایئے.. اپنی حیرت کو برقرار رکھئے.. کبھی رکیے اور اس کے پانیوں میں ہاتھ ڈال کر ان کی کرچیاں کیجیے.. کبھی چہرے پر چھینٹے ماریئے اور مسکرایئے.. کسی تنے کو پھلانگ کر دوسری جانب جایئے.. یہ کچھ کرتے جایئے.. بلکہ وہ کچھ جو آپ کرنا چاہتے ہیں کرتے جایئے اور میں ایک بے دام غلام کی مانند کیمرے کے ساتھ آپ کا پیچھا کرتا چلا آؤں گا..''

اگرچہ عمران کبھی غلاموں کی منڈی میں برائے فروخت ہوتا تو میں اسے بے دام بھی حاصل نہ کرتا لیکن میں نے وہی کیا جو وہ کہتا تھا.. اس جھیل کا کمال یہ تھا کہ اس نے اس متروک شدہ اداکار کو بھی فراموش کروا دیا جو اس آفت نالے کو پار کرتے ہوئے بھی چوکنا رہا تھا..

میں جو اس کے کناروں پر چلتا تھا تو اپنے آپ میں چلتا تھا.. کیمرے کی موجودگی مجھ پر ذرہ بھر اثر انداز نہ ہوتی تھی..

چلتے چلتے وہ ٹیلا آیا جس کے عقب میں سے برآمد ہو کر ہم پچھلی شب اپنی خیمہ گاہ میں اُترے تھے.. یہاں سے جھیل رخ بدلتی تھی اور دوسرا کنارہ شروع ہو جاتا تھا.. اور یہاں چلنا آسان نہ تھا کہ راستے میں کچھ چٹانیں تھیں..

ان چٹانوں سے آگے لمبی گھاس اور نرم آلود فرش کے جھیل کنارے تھے.. کچھ پتھر تھے..

یہاں سے پار کا منظر دکھائی دیتا تھا اور وہ پار بھی کچھ زیادہ دور نہیں تھا..
یہ جھیل آپ کے بس میں تھی.. آپ کی پاکٹ میں تھی.. یہ اتنی مختصر اور منی ایچر تھی..
یہاں.. دوسرے کنارے پر تو یہ جھیل سامری ہو گئی.. اس کے سحر کا کوئی حساب نہ تھا.. یہ ابھی ابھی سونے کا بچھڑا جنم دے سکتی تھی..
پانی کی قربت میں ہو کر.. پار کے منظر کو اپنے اندر اتارنے اور جمع کرنے کی خاطر میں اس کے دلدل نما کنارے پر بیٹھ گیا..
"سر جی.. آپ ذرا اپنے خیالوں میں گم جھیل کے پانیوں پر ایک کنکر پھینکئے میں اس کو فالو کروں گا.."
میں نے ایک کنکر پھینکا..
وہ کنکر سطحِ آب پر.. اس شیشۂ آب پر گرا.. چھپاک سے گرا.. اور پانیوں میں میری نظروں کے سامنے اُترتا گیا.. ایک بھاری کٹی پتنگ کی مانند ڈولتا جھیل کی تہہ تک گیا اور وہاں بیٹھ گیا.. اور میں حیرت سے اُسے دیکھتا گیا.. .
"ایک اور پتھر پھینکئے سر.. میں آؤٹ آف فوکس ہو گیا تھا.."
میں نے ایک اور کنکر تلاش کر کے آہستہ سے جھیل پر پھینکا.. اور وہ بھی سطحِ آب سے نیچے ہوا.. میری نظروں کے سامنے ڈولتا بالآخر تہہ کے اس حصے میں جا بیٹھا جہاں سے ایک چشمہ پھوٹ رہا تھا.. اُس پتھر کے اردگرد بلبلے پھوٹ رہے تھے اور مجھے یہ لگ رہا تھا کہ میں ایک گھریلو ایکوریم سے ناک چپکائے اُس کی تہہ میں سے پھوٹنے والے آرٹی فشل بلبلوں اور زیبائشی پتھروں کو دیکھ رہا ہوں.. یہ پانی اتنے شفاف تھے..
میں کیمرے سے غافل تو تھا اب اور غافل ہو گیا..
یہ ایک کھیل تھا..
میں نے ایک اور کنکر پہلے کی نسبت بڑے حجم کا کنارے سے کچھ فاصلے پر پانیوں پر پھینکا.. اب اس کی آبی تصویر کچھ اور بنی.. پتھر جھیل کی سطح پر گرا تو فوراً پانیوں پر دائرے در دائرے پھیلنے لگے اور میں حیرت در حیرت تھا کہ یہ دائرے بلکہ ان کا سایہ جھیل کی تہہ میں بھی اسی طور پھیلنے لگا.. اور ہاں اس عمل کے دوران ایک درمیانی منظر بھی تھا جب وہ پتھر سطحِ آب سے نیچے اُترتا تھا تو اوپر بنے ہوئے دائروں کی تہہ میں تخلیق ہوتے سایوں کے درمیان میں وہ پتھر جا بیٹھتا تھا.. یہیں

اسی مقام پر گھاس پھونس اور جھیل میں گرے پتوں اور برچ کی سفید شاخوں کے درمیان میں جب میں نے غور سے دیکھا تو کنارے کے پانیوں میں ایک چھوٹی سی مچھلی تیرتی تھی.. اور وہ بھی ایک گھریلو ایکوریم میں قید مچھلی کی مانند دکھائی دیتی تھی.. ہریاول.. گھاس اور بوسیدہ پتوں کے درمیان تیرتی ایک چھوٹی سی رنگین مچھلی.. تیرتی اور جب کوئی گھاس یا کائی کی رکاوٹ آتی تو پھڑکتی اس سے بچ کر نکلتی اور پھر تیرتی..
عام جھیلیں ایک مناسب فاصلے سے شاندار اور پُرشکوہ دکھائی دیتی ہیں.. پس منظر کے برف پوش سلسلے، گھاٹیاں اور آسمان اس کے سحر میں اضافہ کرتے ہیں.. لیکن یہ ان سے الگ ایک اور جھیل تھی، فقط یہ جھیل تھی جسے فاصلہ بے شناخت کر دیتا تھا اور اسے قربت حُسن دیتی تھی.. اسے اس کے پانیوں پر آنکھیں بچھا کر ہی دیکھا جا سکتا تھا کہ جو کچھ تھا اس کے باطن میں تھا، اس کی تہہ اور شفافی میں تھا..
یہ وہ قربت تھی جس میں چہرے اور بدن معدوم ہو جاتے ہیں اور صرف وصل کی آنچ باقی رہ جاتی ہے..
جھیل کے پانی رنگ بدلتے تھے..
کہیں تہہ میں کائی جو سرسراتی تھی زندہ لگتی تھی.. گھنے سبز اور بھورے خزاں رسیدہ بھورے رنگ کی کائی.. زندہ لگتی تھی.. اور جہاں چشمے پھوٹتے تھے وہاں جھیل کی تہہ گہرے نیلے رنگ کی تھی.. کہیں پتوں اور تنوں کے گھلنے سے ایک مٹیالی دلدل نظر آتی تھی.. چنانچہ دور سے اس کے پانی رنگوں میں بٹے ہوئے لگتے تھے.. جیسے کسی نادان رنگ ریز نے چُنریا کو ایک رنگ میں رنگنے کی بجائے مختلف رنگوں میں رنگ دیا ہو.. یا پانی سے بھرے ایک ٹب میں کسی بچے نے کئی رنگوں کی پچکاریاں چلا دی ہوں.. یہ بہاولپور کی وہ اوڑھنی تھی جسے صحراؤں کی بانکی نار.. گرمی سے رسیلی ہوتی نار اوڑھ کر دیس پیا کے جاتی ہے..
جھیل طغر کا پس منظر اور محلِ وقوع بھی نہایت معمولی تھا.. اور نہ ہی اس کا کوئی واضح حدودِ اربعہ تھا.. یہ بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے پانیوں کا ایک مجموعہ تھی جس کے کنارے بھی اس لیے واضح نہ تھے کہ کہیں کچھ پتھر تھے اور کہیں اس میں درخت گرے ہوئے تھے..
یہ جھیل کی کسی بھی تعریف پر پوری نہیں اُترتی تھی اور پھر بھی یہ ایسی تھی کہ اس کی تعریف کے لیے لفظ کم پڑتے تھے..

"رنگوں کے فریب.. نظر کے دھوکے..

پانیوں نے مجھے بے ایمان کردیا"

ہماری خیمہ گاہ میں کوچ کی تیاریاں ہو رہی تھیں..

خیمے سمیٹے جا چکے تھے.. دونوں گدھوں پر سامان باندھا جا رہا تھا.. پورٹر اپنی آخری چائے پی رہے تھے اور ابراہیم ناشتہ سرو کر رہا تھا..

میں بے ایمان ہونے لگا..

جھیل کے پانیوں پر آنکھیں بچھاتے رنگوں اور شفاف کے معجزے کو ان پانیوں کے نیچے رونما ہوتے دیکھتے میں بے ایمان ہونے لگا.. ابھی سویر تھی اور پانیوں پر کہیں دھوپ تھی اور کہیں نہیں تھی.. کہیں سائے بچھے تھے اور کہیں وہ روشن تھے لیکن ابھی تھوڑی دیر بعد ہر شے بدلنے کو تھی..

جھیل نے دھوپ سے بھر جانا تھا تو یہ رنگ اور یہ سائے اور پانی کی روشنائی نے کچھ اور ہو جانا تھا..

پھر دوپہر کے وقت اس کا روپ کچھ اور لشکیلا ہو جانا تھا.. اور پھر سرِ شام یہاں ایک زرد اور بجھتے ہوئے سنہری رنگ کی قیامت کا نزول ہونا تھا.. غروب کی زرد کرنوں نے اسے سونے سے پوچ دینا تھا.. اور مجھے یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے آج یہاں ٹھہرنا چاہیے تھا..

میرے سامنے جھیل کا وہ حصہ دھوپ میں تھا جہاں ابھی ابھی ایک کنکر دائرے بناتا تہہ تک اُترا تھا اور میں ان دائروں سے مسحور ہو کر اس کے کنارے پر ایک تماشائی کی مانند بیٹھا تھا..

میں ازل سے جھیلوں میں اترنے کا تمنائی تھا..

جھیل کو آپ تب تک نہیں جان سکتے جب تک آپ اس کے اندر اتر کر اس کی سانسیں

نہ سنیں.. اُس کی گیلاہٹ کو اپنے بدن کا حصہ نہ بنائیں.. اس کی سردی کو اپنی حدت سے نم آلود نہ کریں.. ایک جھیل کو آپ تبھی جان سکتے ہیں..

عمران مجھ سے فارغ ہو کر اب جھیل میں سے نکلنے والے ایک گھاس بھرے کناروں میں دمکتے سفید نالے کو شوٹ کر رہا تھا اور جو نیچے دریا میں شامل ہونے جا رہا تھا..

"عمران.." میں نے اُسے پکارا..

وہ کیمرہ سنبھالتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا میری جانب آنے لگا..

وہ قریب ہوا تو میں نے کہا "جہاں میں نے کنکر پھینکا تھا.. جہاں پانی اتنے شیشہ ہیں کہ دھوپ میں نظر ہی نہیں آ رہے.. تو میں اسی سپاٹ پر اگر میں کپڑوں سمیت کود جاؤں تو کیسا رہے؟"

"آپ کو نمونیہ ہو جائے سر تو کیسا رہے.."

"میں سیریس ہوں"

"میں بھی سیریس ہوں سر.."

"دیکھو عمران.. اگر تم اپنے کیمرے کے ساتھ چوکنے رہو.. کیونکہ اس شاٹ کی ری ٹیک نہیں ہو سکتی.. تم بالکل تیار رہو اور جب میں اس مقام پر غڑاپ سے گروں تو تم مجھے فالو کرو.. میں ان پانیوں میں دھیرے دھیرے تہہ تک اترتا ہوا دکھائی دوں گا.. میں سانس بند رکھنے کی کوشش کروں گا اور پھر جب تہہ کو چھوؤں گا تو اسے اپنے جوگرز سے دھکیل کر پھر سے آہستہ آہستہ سطحِ آب پر ابھر آؤں گا.. یہ شاٹ کیسا جادوئی اور ناقابلِ یقین ہوگا.. اس میں میرا بے ڈول بدن اگرچہ کامیڈی تخلیق کرے گا لیکن پھر بھی شاٹ شاندار ہوگا.. کیا خیال ہے"

اور میری اس خواہش میں قطعی طور پر خودنمائی کو کچھ دخل نہ تھا، عمران کا کیمرہ تو محض ایک بہانہ تھا.. اور میں اس جھیل میں اترنے کے لیے اسی بہانے کی تلاش میں تھا۔ عمران اگرچہ میری موت کا تمنائی لگتا تھا لیکن وہ بھی جھجک گیا، نیکر کو ترک کر کے داڑھی ٹٹولنے لگا "دیٹ ول بی اے بِٹ تھنگ.. لیکن تارڑ جی کیا آپ.. میرا مطلب ہے.. عمر کا مسئلہ تو ہے ناں تو کیا آپ اس کے برف پانیوں کو سہہ جائیں گے؟"

"ہاں.. میں نے تو کے ٹو کے راستے میں بھی ایک گلیشیئر سے رستے پانیوں سے اشنان کر لیا تھا.."

"وہ تو بہت برس پہلے کی بات ہے.."

''یار میں تمہیں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ایک زبردست زندگی میں صرف ایک بار سامنے آنے والا شاٹ آفر کر رہا ہوں اور تم بحث کرتے ہو''

''اور کیا آپ تہہ تک اترتے سانس روکے رکھ سکتے ہیں؟''

''ہاں بالکل..وہاں زیادہ سے زیادہ گہرائی چھ سات فٹ ہو سکتی ہے..اور یہ زیادہ نہیں''

''اور کیا آپ کے پاس اتنا وقت ہے کہ بعد میں آپ اپنے کپڑے بدل سکیں..گیلے جوگر اور جرابیں اتار کر پھر اور پہن سکیں کیونکہ قافلہ تیار ہے..صرف ہمارا انتظار ہے..ابھی ابھی سلیم دوسرے کنارے پر غصے میں ہاتھ ہلاتا ہوا دکھائی دیا تھا..''

''اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں بے ایمان ہو چکا ہوں''

''کیسے؟''

''میں سوچ رہا ہوں کہ آج یہیں ٹھہر جائیں..اس جھیل کو دن کے مختلف رنگوں اور روشنیوں میں دیکھیں..میں لیڈر ہوں اور کہہ سکتا ہوں کہ سامان کھول دو ہم آگے نہیں جا رہے''

''ہاتھ ملائیں سر..'' عمران کی داڑھی میں سے بھی مسرت ٹپکنے لگی۔''میں بھی بے ایمان ہو چکا ہوں..یہاں دھوپ کے زاویے بدلیں گے تو پانی بدلیں گے..رنگوں کے فریب ہوں گے..نظروں کے دھوکے ہوں گے اور میں انہیں شوٹ کروں گا..میں آپ کے ساتھ ہوں..ہاتھ ملائیں سر''..

''تو پھر تم اپنے کیمرے کو تر میں کرو...میں جھیل میں کودنے کو تیار ہوں''

کاظمی اور ظاہر اس مکالمے میں حصہ دار نہ تھے وہ گونگے خادموں کی طرح عمران کے دائیں بائیں منکر نکیر ہوتے تھے اور اپنے اپنے آلات تھامے اس کے حکم کے منتظر تھے..

دوسرے کنارے پر..اور اس کنارے کے عقب میں خیمہ گاہ تھی اور ہم چلتے چلتے اس کنارے پر آ چکے تھے..تو دوسرے کنارے پر کوئی شخص ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں بلاتا تھا..اور یہ شخص ابراہیم تھا جو ہمیں متوجہ کرنے کی کوشش میں تھا اور ''ناشتہ...بریک فاسٹ سر'' چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا..

''ابھی صاحب اُدھر جھیل میں چھلانگ لگائے گا پھر آئے گا'' عمران نے بھی جواباً چیخ کر اسے مطلع کیا..

ابراہیم یہ جواب سُن کر وہاں کھڑا نہیں رہا..ایک غزال کی مانند زقندیں بھرتا جھیل کا چکر لگا کر اچھلتا کودتا چند لمحوں میں ہمارے پاس پہنچ گیا''کیا کہتے ہو صاحب..''

''ابھی تارڑ صاحب..ادھر پانی میں کودے گا تو ہم فلم بنائے گا..پندرہ بیس منٹ کا کام ہے..تم چلو ہم ابھی آتا ہے اور پھر ناشتہ کرتا ہے..''

''نہ صاحب..'' اس نے سر ہلایا..

''کیا..نہ صاحب؟'' میں نے پوچھا''

''ادھر جھیل میں بالکل نہیں اُترو..اس کا تہہ میں بہت دلدل ہے..نیچے جائے گا تو اوپر نہیں آئے گا..دلدل میں پھنس جائے گا..ادھر ایک میم صاحب بھی کپڑے اُتار کر اندر گیا تھا تو نیچے پھنس گیا تھا بڑی مشکل سے نکالا تھا..بعد میں ادھر ننگا بیٹھ کر روتا تھا..نہیں اُترو بہت خطرہ ہے..''

ہم کچھ دیر اس دھیان میں رہے کہ میم صاحب ادھر ننگا بیٹھ کر جب روتا تھا تو کیسا لگتا تھا پھر میں نے پوچھا''یار..کتنا دلدل ہوگا..''

''اتنا..'' ابراہیم نے اپنی شلوار کے پائنچے سمیٹ کر اوپر کئے اور کنارے سے دو تین قدم پانی کے اندر گیا..اور وہ جس مقام پر کھڑا ہوا تو واقعی آہستہ آہستہ نیچے ہونے لگا اور پھر جلدی سے پاؤں اکھاڑتا باہر آ گیا''صاحب ادھر اتنا دلدل ہے تو آگے آپ اندازہ کرو''

''اندازہ کر لیا..'' میں نے جھیل میں کودنے کا ارادہ فی الفور ملتوی کر دیا۔

''صاحب بہت زمانوں سے اس جھیل میں پتے' درخت اور گھاس وغیرہ گرتا ہے تو نیچے اس کا دلدل بنتا جاتا ہے..بس جدھر سے چشمہ نکلتا ہے تو بس وہاں پانی کے زور سے کچھ نہیں ٹھہرتا اور تہہ صاف رہتا ہے لیکن اُدھر..مت اترو۔''

''تو پھر ادھر اُتر جائیں جہاں چشمے پھوٹتے ہیں..وہاں تو دلدل نہیں۔''

''نہیں سر..'' عمران بولا'' وہ جگہ سائے میں ہے اور آپ تہہ تک جاتے ہوئے دکھائی نہیں دیں گے اور وہاں پانی بھی گہرا لگتا ہے..''

اگر اس لمحے ابراہیم نمودار ہو کر مجھے خبردار نہ کر دیتا تو کیا ہوتا..وہی ہوتا جو تقریباً چالیس برس پیشتر پیرس کے دریائے سین میں ایک حالت بے خودی میں چھلانگ لگا دینے سے ہوتا ہوتا بچا تھا..

''ناشتہ ٹھنڈا ہوتا ہے سر..دیسی انڈہ کا آملیٹ بنایا ہے..ٹھنڈا ہوتا ہے تو ربڑ کا ہوتا ہے سر..آ جاؤ..آپ کا ٹیم بھی انتظار کرتا ہے''

ہم آ گئے..بادل نخواستہ آ گئے..رک سیک بھی پیک ہو چکے تھے..گدھے بھی تیار تھے..اور ہمارے ساتھی بڑبڑا رہے تھے..خیمہ گاہ میں آئے تو جھیل پتھروں کی اوٹ میں چلی گئی اور اس کی

جدائی بڑی گی..نزدیک ترین بڑبڑاتا ہوا ساتھی سلیم تھا" یار سلیم.. میں سوچ رہا تھا کہ آج یہیں ٹھہر جاتے ہیں..عمران اینڈ کمپنی بھی متفق ہے..جھیل کو سارا دن دیکھنے کی آرزو ہے..اسے سویرے سویرے سرسری طور پر گھٹکا دینا تو زیادتی ہے..بلکہ بدتمیزی اور بے ایمانی ہے..اس کے رنگ رنگ کے رنگ دیکھیں گے..ہمارے پیچھے پولیس تو نہیں لگی ہوئی کل چلے جائیں گے..اور پھر تمہیں یہ بھی تو بتانا ہے کہ عشق کیا ہے..کہ نہیں؟"

" تارڑ صاحب مجھے تو کوئی اعتراض نہیں" اور اس نے یہ کہا ایسے ہی کہ مجھے تو سخت اعتراض ہے" لیکن صرف ایک قباحت ہے کہ سامان پیک کر کے پورٹر تو کب کے جا چکے ہیں.."

" یار میں کیسا لیڈر ہوں کہ میری اجازت کے بغیر ہی پورٹر چلے گئے ہیں.." میں ذرا طیش میں آ گیا..

" تارڑ صاحب پچھلی شب جب ہم یہاں پہنچے تھے تو آپ نے سب کے سامنے ایک تقریر کی تھی کہ یہ ہم کیسی واہیات جگہ پر آ گئے ہیں..جھیلوں کے کنارے نہیں آئے جوہڑوں کے کناروں پر آ گئے ہیں تو کل صبح سویرے منہ اندھیرے یہاں سے نکل چلو..پورٹروں کو بھی آپ نے یہی آرڈر دیا تھا.."

میں نے کہا تو یہی کچھ تھا..

اور وہ کیا کہتے ہیں کہ خود کردہ را علاجے نیست..

تو میں اپنے کہے کی مار کھا گیا تھا..

" یار کوئی سبیل نہیں ہو سکتی ٹھہرنے کی.."

اور اب میاں فرزند جو صرف بڑبڑا نہیں رہے تھے اندر ہی اندر کھول رہے تھے پھٹ پڑے" سبیل تو محرم میں لگائی جاتی ہے جناب عالی" انہوں نے ایک خصوصی لاہوری بلکہ بھاٹی دروازے کا کھنگورا مارا" آپ ناں اس ٹریک میں کچھ آف ٹریک ہو رہے ہیں..بلتر پھوڑا ٹریک پانچ دن کا ہے..اور آپ نے گلگت میں جیپ ڈرائیوروں کو کہہ دیا تھا کہ آج سے پانچویں دن کے اگلے روز پھوڑا پہنچ جائیں اور ہمیں واپس گلگت لے جائیں..تو ہم کیسے کسی بھی جگہ ایک رات سے زیادہ ٹھہر سکتے ہیں..اگر ٹھہرتے ہیں تو پورٹر بھی ناراض ہوں گے اور پھوڑا میں آئی ہوئی جیپیں بھی خالی گلگت واپس چلی جائیں گی اور انہیں ایڈوانس میں دی ہوئی رقم بھی ضائع ہو جائے گی..اب کرو بات.."

میں کیا بات کرتا..چپ رہا..

ہر برس میں اپنے آپ سے وعدہ کرتا تھا کہ آئندہ برس اگر زندگی ہوئی اور کوہ نوردی نصیب ہوئی تو اُس میں دنوں اور شیڈیول کی کوئی زنجیر نہیں ہوگی..قتل و غارت اور مار دھاڑ نہیں ہوگی کہ آج ہر صورت اُس منزل پر پہنچو..راستے میں کہیں بھی رات کرنے کو جی چاہے تو اپنے آپ پر جبر کرو..چلتے رہو..منزل پر جا رات کرو..اور پھر اگلی صبح مارو مار کرتے..گرتے پڑتے..جیتے اور بار بار مرتے اس سے اگلی خیمہ گاہ میں جا گرو..میں نے اپنے آپ سے ہر مرتبہ یہی وعدہ کیا تھا کہ اس بار کوہ نوردی ایسی ہوگی کہ جہاں بھی من چاہے گا..بے شک روانگی سے چند لمحوں کے بعد ہی چاہے تو وہاں پڑاؤ کر لیں گے اور تصور جاناں کئے ہوئے بیٹھے رہیں گے..جب تک وہاں سے کوچ کرنے کو جی نہ چاہے..لیکن کیا قیامت ہے کہ باقاعدہ ٹریکنگ میں یہی تو آزار ہوتا ہے کہ منصوبہ بندی کے بغیر یہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی..من کی موج کے ساتھ کوئی بھی بستی آباد نہیں کی جا سکتی اُسے شیڈیول کے مطابق ہی بسانا پڑتا ہے..چنانچہ میں نے اپنے آپ کو وہی جھوٹی طفل تسلی دی جو میں ایسے مقامات سے کوچ نہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو دیتا آیا تھا کہ ابھی تو روانہ ہونا ہے لیکن انشاء اللہ پھر آئیں گے اور اطمینان میں آئیں گے اور پھر کہیں نہیں جائیں گے یہیں رہ جائیں گے..

اور میں نے اپنے آپ کو یہ طفل تسلی کوئی پہلی بار دی تھی..میری حیات میں ایسی طفل تسلیوں کا ایک ڈھیر تھا..کبھی افغانستان کی کسی کارواں سرائے میں..جب بجلی چمکتی تھی..اور کبھی نوح کے پہاڑ کے دامن میں..شہزادوں کے جزیروں میں اور بیروت کی خانہ جنگی میں..اور ہاں جب اطالیہ اور سسلی کے سمندروں میں سے میرا جہاز گزرتا تھا اور کوہ ایٹنا رات کی گھپ تاریکی میں اناروں کی مانند پھوٹتا اور آگ برساتا تھا اور جہاز کے عرب مسافر" النار..النار" پکارتے تھے کبھی فلارنس میں اور کبھی سویڈن کے جنگلوں میں..کبھی دامن کوہ کے دامن میں ایک خشک گھاس کے میدان میں ایک دیا سلائی کے سلگنے سے آگ پھیلنے سے..یا پھر سنولیک پر آلتی پالتی مارے میں نے یہی خواہش کی تھی کہ یہاں ٹھہر جاؤں..آگے نہ جاؤں..اور اپنے آپ کو یہی طفل تسلی دیتا تھا کہ میں پھر بھی یہاں آؤں گا اور قیام کروں گا..

تو یہی طفل تسلی یہاں تھی..بلتر جھیلوں کو چھوڑتے ہوئے بھی میرے کام آئی..البتہ عمران نے اپنا تیسرا دیسی انڈہ نوش کرنے کے بعد علم بغاوت بلند کر دیا" سر آپ لوگ بے شک چلے

جائیں میں نہیں جانے کا.. میں نے آج اس جھیل کو اپنے کیمرے کے لینز میں سے دیکھا ہے تو احساس ہوا ہے کہ میں نے آج تک اس لینز کے راستے جو کچھ دیکھا ہے.. ٹاپ کلاس ماڈلز کے ٹاپ کلاس بدن دیکھے ہیں.. اور حیران کُن منظر اور لوگ دیکھے ہیں تو میں آج تک جھک مارتا رہا ہوں.... میں لیڈر کی نافرمانی کا مرتکب تو نہیں ہو سکتا کہ آپ ہی تو مجھے یہاں تک لائے ہیں لیکن صرف یہ گزارش کرتا ہوں کہ آپ چلیں.. روانہ ہو جائیں.. میں کچھ دیر اور ٹھہرنا چاہتا ہوں.. جھیل کو دن کی مختلف روشنیوں اور سایوں میں شوٹ کرنا چاہتا ہوں.. صرف دو گھنٹے عنایت کریں.. آپ چلیں میں آپ سے آملوں گا''

''کیسے آملو گے تم راستے سے واقف نہیں ہو.. یہ نہ ہو کہ بھٹک جاؤ''

''آملیں گے سر جی..'' کاظمی بولا.. اور اس نے آج سویرے پہلی بار منہ کھولا.. اپنے دانت دکھلائے جو ایک دوسرے سے الگ الگ، اجنبی اور خاصے فاصلے پر تھے'' شوٹنگ سے فارغ ہو کر ہم تینوں کچھ مست الست دھواں اپنے اندر اتاریں گے اور پھر پہاڑ.. دریا اور ندی نالے پھلانگتے آپ کو جا لیں گے بلکہ آپ سے بھی آگے نکل جائیں گے.. آپ چلیں سر جی....''

''مائی لیڈر دیر ہو رہی ہے.. بسم اللہ کریں'' شاہد نے درخواست کی..

''اگر آپ لوگ اجازت دیں'' میں نے چلنے کو تیار، بے چینی سے پہلو بدلتے اپنے ساتھیوں سے گزارش کی'' میں اپنے دانتوں کو برش کر لوں؟''

''دوبارہ برش کریں گے جناب عالی؟'' میاں صاحب حیران ہو گئے..

''آہو..'' میں نے خوش ہو کر کہا..

''مائی لیڈر آپ کے دانت پہلے ہی کمزور ہیں.. دوبارہ برش کریں گے تو شائد ان میں سے ایک آدھ گر پڑے.. کیوں رسک لیتے ہیں.. بہر حال آپ لیڈر ہیں.. جو کچھ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں..''

وہ سب مجھے دوبارہ برش پر پیسٹ لگاتے ہوئے نہایت غور سے دیکھتے رہے کہ یہ شخص چاہتا کیا ہے.. اور یہ شخص کسی نہ کسی بہانے ایک مرتبہ پھر جھیل کی طرف جانا چاہتا تھا..

بڑے پتھر کے پار میں اسی مقام پر پانی کی قربت میں ہو بیٹھا جہاں آج سویرے بیٹھا تھا اور پھر جھک کر اپنے ٹوتھ برش کو پانی میں ڈبویا.. ڈبویا تو پانی کی سطح چند لمحوں کے لیے کرچی کرچی ہوئی، شیشے کی شفافی ٹوٹی اور جڑ گئی.. لیکن میری انگلیاں، ان میں تھاما ہوا برش اور برش پر لگی ہوئی

نیلی ٹوتھ پیسٹ جھیل ملتر کے پانیوں میں یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ پانی میں نہ ہو میری نظر کے سامنے ہو.. وہ ایسی شفاف تصویر تھی..

اور کیسے کیسے رنگ اس کے پانیوں کے تھے..

اناڑی رنگ ریز نے اس جھیل کی چنریا کو کیسے رنگا تھا کہ رنگ ہی رنگ 'رنگ- یے تھے..

اور میں اس چنریا کو چند لمحوں کے لیے دیکھ سکا تھا اوڑھ نہ سکا تھا.. رنگ ریجوا نے پانیوں کو کیسی سندرتا دی تھی.. لیکن وہ جو برہا کی ماری تھی.. نصیبوں جلی تھی.. نہ اسے اوڑھ سکی اور نہ ساجن کو لبھا سکی..

''نیلاہٹ کے دو جزیرے دکھائی دیتے ہیں..اور یہ عشق کیا چیز ہے''

یہ پہلی جھیل تھی جس سے جُدا ہوتے ہوئے مَیں نے اُسے مڑ کر ایک بار بھی نہ دیکھا..
خیمہ گاہ کے پتھروں کے پہلو میں سے اُٹھتی بلندی پر سانس تھامے آہستہ آہستہ چلتا گیا..اوپر چند درختوں کا ایک مختصر ذخیرہ تھا جس میں سے ایک راستہ سیدھا جا رہا تھا لیکن ہم اسے چھوڑ کر ایک پتھر کے دامن میں سے نیچے اترتے ایک پُرشور نالے کے قریب آ گئے..نالے پر چند لکڑیوں کا ایک مخدوش سا پُل تھا جسے ہم نے باری باری سنبھل سنبھل کر پار کیا.. پار ہوئے تو ایک خدشے نے سر اُٹھایا کہ پورٹر تو آگے جا چکے ہیں تو وہ کون سے راستے پر گئے ہیں..جنگل میں سے نکلنے والے سیدھے راستے پر یا وہ بھی اس نالے کے پار ہو کر کہیں آگے جا چکے ہیں..پھر بہت دور ایک بلند راستے پر ایک پورٹر ہاتھ ہلاتا ہوا نظر آیا..یہی راستہ تھا..

پُل کے دوسری جانب ایک ڈھلوان تھی جس کے درمیان میں ایک پگڈنڈی چلی جا رہی تھی اور نیچے پھیلے دریا سے لحہ بہ لحہ اونچی ہوتی چلی جاتی تھی..ہم اس نسبتاً آسان راستے پر بلند ہوتے ڈھلوان کی چوٹی پر پہنچ گئے..دوسری جانب ایک بے حد وسیع منظر کھلتا تھا ایک بہت چوڑی وادی نظر آ رہی تھی..ایک دل کو خوش کر دینے والی کشادگی تھی..اس کشادگی کے درمیان مٹیالے رنگ کا ططر دریا..یا نالہ خاموشی سے لیٹا ہوا تھا اور اس کے وسیع کنارے پتھروں کے سلسلے تھے اور گیلی ریت تھی جس میں چھوٹی چھوٹی ندیاں نالے سے جدا ہو کر بکھرتی جاتی تھیں..کہیں گھاس کے میدان تھے جن میں مویشی ساکت نظر آتے تھے..اور پھر وہ بلند اور برفپوش پہاڑ تھے جو اس وادی

کے پہرے دار تھے..اس کی سرحد تھے..

یہ منظر تو سامنے کا تھا..

اور جو کچھ ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے یا نیچے چھوڑ آئے تھے وہ بھی ایک کمال کی تصویر تھی..
وہ پُل جسے ہم ابھی ابھی پار کر کے آئے تھے یہاں سے ایک کھلونا پُل لگ رہا تھا..نالے کا شور سکوت میں جا چکا تھا اور اس کی تندی تھمی ہوئی لگتی تھی..اُس کے پیچھے جو پہاڑی سلسلے تھے ان میں دو جھیلیں جھلکنے لگی تھیں..میں اور میرے ہمراہی شدید حیرت سے دوچار ہوئے کہ ہم ان کی موجودگی سے آگاہ نہیں تھے..ہمیں ان کے وجود کی خبر تک نہ تھی..

اُن میں سے ایک جھیل کے کنارے واضح نہ تھے..صرف پتھریلی چٹانوں میں گھرے ہوئے شدید سبز رنگ کے پانی تھے اور پاکستانی پرچم ہوتے جاتے تھے..

اس سے اوپر..ذرا بلند سطح پر ایک اور جھیل نظر آ رہی تھی..وہ پتھروں کی سلیٹی رنگت کی قید میں شدید نیلاہٹ کا ایک دل فریب جزیرہ تھی..

میں بہت دیر تک رُکا رہا..انہیں دیکھتا رہا..مجھے خبر نہیں تھی کہ ططر جھیل کی خیمہ گاہ سے بلند ہو کر درختوں کے ذخیرے میں سے جو راستہ سیدھا چلا جاتا ہے وہ انہی جھیلوں تک جاتا ہے..بہت بعد میں ایک عادی اور کوہ نوردی کے جنون میں مبتلا شخص نے بتایا کہ جھیل ططر سے پہلی جھیل صرف دو گھنٹے کی مسافت پر ہے اور وہاں بہت کم لوگ جاتے ہیں اور دوسری جھیل قدرے بلندی پر ہے اور زبردست نظاروں والی ہے..لیکن اب کیا ہو سکتا تھا جب چڑیاں بلکہ جھیلیں چُگ گئیں کھیت..

میں نے ایک آخری نگاہ ان انجانی جھیلوں پر ڈالی..اور غرناطہ کے آخری تاجدار ابو عبداللہ کی مانند ایک آخری آہ بھری..اُس نے غرناطہ کو آخری بار دیکھ کر بھری اور میں نے ان جھیلوں کو ہی اپنا غرناطہ جان لیا..اس کی آہ مُور کی آخری آہ کہلائی..لیکن یہ تارڑ کی آہ تھی اور ہرگز آخری نہیں تھی کہ کوہ نوردی میں ایسے مقامات آہ و فغاں آتے ہی رہتے ہیں..

اُس اونچائی کے دوسری جانب ہم اُس عظیم وسعت والی وادی میں اُترے..اُترے تو جھیل ططر کا علاقہ ڈھلوان کے عقب میں روپوش ہو گیا..ہم نیچے اُترتے گئے..

ایک نالہ عبور کیا جو بہت ہی معصوم سا تھا..

ڈھلوانوں پر گھاس کی تہیں تھیں..

اور کہیں بڑے بڑے پتھروں میں سے ہو کر نکلنا پڑتا تھا..بالآخر ہم دریا کی بڑے پھیلاؤ

والی وسعت کے کناروں پر اُترے.. جہاں پہاڑ اُتر کر تھمتے تھے وہاں اُترے.. موٹی ریت اور کنکروں کے درمیان دریا کی ایک شاخ مزید شاخوں میں بٹ رہی تھی.. ان کے پانی ٹھنڈے ٹھار تھے یہ ہمیں ہمارے جوگرز نے بتایا کیونکہ انہیں پھلانگتے ہوئے وہ بھیگ چکے تھے.. ان شاخوں کے آگے ہم کچھ دیر ریت پر چلے اور پھر چھوٹے چھوٹے پتھروں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا..

ہم انہی پتھروں پر چلتے گئے..

دریا ہم سے بہت دور جانے کہاں تھا.. تھا بھی یا نہیں.. یہاں سے نہ وہ دکھائی دیتا تھا اور نہ وہ سنائی دیتا تھا..

آج بھی تین فرقے تھے..

گلا اور گرد آمیز کا فرقہ جو ہمیں کفار میں سے جان کر ہم سے بالکل الگ چلتا تھا اور چہلیں کرتا چلتا تھا.. نہایت الگ انداز میں..

عمران اور اس کے بغل بچے جو ابھی تک جھیل طلتر کے کناروں پر تھے اور مجھے ان کے بارے میں تشویش ہو رہی تھی کہ کہیں وہ راستے میں بھٹک نہ جائیں اور قدیمی فرقہ.. جس کے معتقدین میں شاہد، میاں فرزند، سلیم اور یہ فقیر شامل تھا..

لیکن آج میں اور سلیم ساتھ ساتھ تھے..

بلکہ آج تو میں گھوڑا ہو چکا تھا..

ڈاکٹر عمر کی تحقیق کے مطابق پہاڑوں میں پہلے دن انسان بمشکل شپ شپ چلتا ہے اور اس کا وہ سب کچھ سوج جاتا ہے جو نہیں سوجنا چاہیے.. اگلے دن اس کا پورا بدن دکھتا ہے لیکن وہ چلتا جاتا ہے اور تیسرے دن.. وہ گھوڑا ہو جاتا ہے..

اب میرا کمال ملاحظہ کیجیے کہ میں دوسرے دن ہی گھوڑا ہو گیا.. اس لمحے میں یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ میرے گھوڑا پن کا پہلا اور آخری دن ہے.. آج کے بعد مجھے خچر ہو جانا تھا.. اور سلیم.. وہ اطمینان سے بے تکان چلتا تھا..

''ہاں جی اب تو بتائیں.. دور دور تک نہ کوئی بندہ نہ پرندہ.. اب تو بتائیں کہ یہ عشق کیا ہوتا ہے..''

''یہ تم بار بار ایک ہی سوال کیوں پوچھتے ہو..؟'' میں نے جھلا کر کہا..

''کیونکہ ایک ہی سوال ہے..''

''اور مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟''

''سر یہ ہے بڑی مصیبت.. بڑی اتھل پتھل بڑی پرابلم ہے سمجھ میں نہیں آتی.. آپ سمجھائیں ناں.. آپ پر بہت کچھ بیتا ہے.. تو اپنی ہڈ بیتی سے.. اپنے تجربے سے بتائیں ناں کہ یہ کیا ہے..''

''میرے ایک دوست کا کہنا ہے کہ اگر آپ کی محبوبہ کالا شاہ کاکو میں رہتی ہے اور آپ نیویارک چلے جاتے ہیں تو وہاں نیویارک میں ہر چہرے کو اس آس میں دیکھتے ہیں کہ شائد وہ یہاں ہو.. یہ عشق ہے''

''سوری سر.. یہ تو نہایت بیہودہ ڈیفی نیشن ہے.. کچھ دانشورانہ قسم کی توجیہہ..''

''تو پھر جیسا کہ موہن سنگھ رب کو ایک گنجل دار بجھارت کہتا ہے جسے سلجھانے کی کوشش میں بندہ کافر ہو جاتا ہے.. تو عشق بھی ایک ایسی ہی بجھارت ہے..''

''نہ سر..'' اس نے اپنے غیر متوازن دانت نمائش کے لیے پیش کر دیئے ''یہ تو گھمن گھیریاں ہیں.. مجھے تو سیدھا سادا جواب چاہیے، گنجل بغیر..''

''تو پھر اسے فرید کے، میرا عشق وی توں میرا یار وی توں.. میں تلاش کرو..''

''لو.. میں اب تحقیق شروع کر دوں.. تارڑ صاحب وہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا'' میں ایک ملٹی نیشنل میں ایگزیکٹو ہوں.. بڑے بڑے بین الاقوامی گوروں کی آنکھوں میں دھول ڈالتا ہوں مجھ سے ہیرا پھیری نہ کریں..''

''یار سیدھا سادا کالا شاہ کاکو والی محبوبہ کا جواب دیتا ہوں تو کہتے ہو کہ بیہودہ ڈیفی نیشن ہے.. دانشور ہونے کی کوشش کرتا ہوں تو پھر اعتراض کرتے ہو..''

''سوری سر..''

''دیکھو میرے لیے یہ شاہ گوری ہے.. جھیل کرومبر ہے.. جھیل طلتر میں آج سویر جتنے رنگ تھے وہ اس کے بدن کے رنگ تھے.. بس اُسی کا وجود اُس کے پانیوں میں رنگ بھرتا تھا.. یہ میرے لیے تھا.. دوسروں کے لیے.. عثمان فقیر کے لیے یہ یارڈ ابڈی عشق آتش لائی ہے.. یہ وحدت الوجود بھی ہے اور انا الحق بھی..''

''میری تسلی نہیں ہوئی..'' اس نے سر ہلایا..

''تو پھر تم بھاڑ میں جاؤ.. میرا سانس پھول رہا ہے.. یہ پتھریلے کنارے ختم ہونے میں نہیں آتے.. میرے جوگرز کے اندر لگ رہا ہے کہ پاؤں خون آلود ہو چکے ہیں اور تمہاری تسلی ہی

نہیں ہو رہی.. مجھے جو کچھ معلوم نہیں وہ کیوں پوچھتے ہو.. "اگر معلوم ہوتا تو یوں کہیں بلند پہاڑوں میں بھٹکتا پھرتا"

"یہ تو نرے بہانے ہیں بلند پہاڑوں میں بھٹکنے کے.. آپ کی سرشت میں ہی لکھا گیا ہے کہ ہمیشہ در بدر ہوں.. آپ کے شوق دشت نوردی میں کسی لیلیٰ کا دخل نہیں.. عشق تو محض ایک بہانہ ہے"

"نہیں سلیم.. عشق ہے.. وہ حقیقی ہے یا مجازی یہ میں نہیں جانتا.. لیکن آج سے بتیس برس پیشتر میں اس کی تلاش میں نکلا تھا.. اسے پا لیا ہوتا تو میری تلاش اختتام کو نہ پہنچ جاتی.. میں عمر کے اُس حصے میں ہوں جب دامن میں کوہ کے ایک چھوٹے سے جھونپڑے کی آرزو ہوتی ہے لیکن میں ابھی تک اسی کوہ میں بھٹکتا پھرتا ہوں اس لیے کہ شہرِ آرزو کے دروازے مجھ پر بند ہیں.. میرے ناول "راکھ" کی نُوراں مشاہد علی سے پوچھتی ہے کہ مشاہد جی یہ عشق کیا چیز ہے اور وہ کہتا ہے.. عشق چیز ہے.."

"اور عشق کے بغیر تو سنولیک بھی ممکن نہیں.." سلیم ہنسنے لگا..

"ہرگز ممکن نہیں" میں بھی کوہ نوردی کے اس چسکے اور بلند دن کی سرد ہواؤں میں سانس لیتا خوش ہو گیا.. میں آزاد اور لاپرواہ تھا اگرچہ میرے جوگرز میں میرے پاؤں خون آلود لگتے تھے..

"ایک گوجر بستی.. اور پہاڑوں کے سرکس کے بازی گر.."

پتھریلی وسعت اختتام کو پہنچی.. دریا آہستہ آہستہ ہمارے قریب ہوتا گیا تھا اور ہم عشق کی ڈیفی نیشن میں الجھے اس کی قربت سے بےخبر رہے تھے.. اب وہ شور مچاتا ہمارے قدموں میں پھواریں پھینکتا تھا.. وسیع وادی تنگ ہو گئی تھی اور اب صرف دریا تھا اور اُس کے بُھربُھرے اور خطرناک کنارے تھے جہاں ہم پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے.. گفتگو موقوف ہو چکی تھی کہ شور بہت تھا..

یہ کنارے ایک شہتیروں سے بنے ہوئے پل تک اُترتے تھے.. اور اس کے پار ہم گئے.. کیوں گئے؟ اسی کنارے پر کیوں نہ چلتے گئے.. کیونکہ آگے ایک پل تھا اور پل کے پار ہی جایا جاتا ہے.. پار یکلخت چڑھائی کے معاملات تھے لیکن پُرخطر نہ تھے محض سانس کے لیے ایک امتحان تھے.. پتھروں کے درمیان گھاس تھی اور پتھر بڑے بڑے تھے.. ہم ان میں سے راستہ تلاش کرتے اوپر چلے گئے اور اوپر گوجروں کی ایک بستی ایک پڑاؤ کے آثار تھے..

ہم اس بستی کے باہر درختوں کی چھاؤں میں.. چوٹیوں پر جو ایک بڑا اور سفید اژدہا گلیشیر تھا اس کی پھونک سرد ہوا کو اپنے بدنوں پر محسوس کرتے بیٹھ گئے اور سستانے لگے..

گلیشیر میں سے چھوٹی چھوٹی برفانی پانیوں کی نالیاں پگھلتی اُترتی تھیں..

ہمارے بدنوں میں چلنے کی مشقت سے جو حدّت پیدا ہوتی تھی وہ سرد ہونے لگی..

پسینہ سوکھ کر سرد ہونے لگا..

گوجروں کے جھونپڑوں میں بےشمار چھوٹے چھوٹے بچے کونپلوں کی مانند پھوٹنے لگے.. اگرچہ یہ نہایت غلیظ کونپلیں تھیں اور وہ دوڑتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے..

سلیم نے انہیں خوش آمدید کہا اور نہایت فراخدلی سے ہر ایک میلی کچیلی ہتھیلی پر ایک ایک چاکلیٹ سویٹ رکھ دی..

''لسی ہے لسی؟'' میں نے پوچھا..

اور وہ تمام بچگان اس جادوئی لفظ کی ادائیگی پر فوراً اباؤٹ ٹرن ہوئے اور بگٹٹ بھاگتے اپنے جھونپڑوں میں گم ہو گئے. تھوڑی دیر بعد ان میں سے برآمد ہوتے ہیں تو ہر ایک کسی زنگ آلود کنستر.. پلاسٹک کے لوٹے یا ڈبے سے لیس تھا اور ان میں سفید لسی لبریز ہوتی تھی..

یہ ان کے لیے لسی تھی.. ہمارے لیے دہی تھا..

یہ دہی بھی آج سے اٹھارہ برس پیشتر فیری میڈو کی پہلی یاترا کے دوران تاتو کے گاؤں میں مولوی عبدالرحمن کے گھی کے گندے کنستر میں پیش کردہ دہی کی مانند قدرے نہیں خاصا مخدوش تھا.. اس میں زیادہ سے زیادہ کچھ بھی ہو سکتا تھا اور کم سے کم چند مکھیاں.. اور بچوں کی بہتی ناکوں کا کوئی ہلکا سا ذائقہ.. ہو سکتا تھا.. لیکن جناب صفائی اور ستھرائی کے سب نخرے صرف آبادیوں اور بستیوں میں ہوتے ہیں.. کہیں بلند پہاڑوں میں نہیں.. یہاں آپ کو بہت ساری ایسی مفاہمتیں کرنی پڑتی ہیں جو آپ اپنے گھر میں کریں تو اگلے لمحے بستر پر لوٹ پوٹ ہو کر فوت ہو جائیں.. لیکن یہاں کہیں بلند پہاڑوں میں.. کنوار پن سے خنکی سرد فضا، روزانہ کم از کم آٹھ گھنٹے کی پرمشقت سیر، بے فکری، خوشی اور آزادی آپ کی صحت کی ضامن بن جاتی ہیں.. محض چند مُردہ مکھیاں اور کچھ نمکین ذائقہ آپ کی صحت پر چنداں اثر انداز نہیں ہوتا.. چنانچہ ہم اس دہی کو پی گئے.. گھبرا کے پی گئے اور لہرا کے پی گئے.. اور یقین کیجیے کہ ہم نے فرانس اور جرمنی میں جراثیم سے پاک حفظانِ صحت کے اصولوں کے تحت پیک کیا ہوا جو دہی نوش کیا تھا اُس میں یہ نشہ اور یہ فرحت نہ تھی..

سلیم نے خوش ہو کر ان بچوں کو مزید ٹافیوں اور کچھ رقوم سے نوازا.. اتنی دیر میں ان کے لواحقین بھی برآمد ہونے لگے.. باریش.. جوان بھی اور سفید داڑھیوں والے بھی بظاہر کھردرے گوجر.. جو موسم گرما میں اپنے مال مویشی ہانکتے ان بلند اور گھاس بھری چراگاہوں میں آ جاتے ہیں اپنے بال بچوں سمیت اور ان عارضی جھونپڑوں میں گرمیاں گزار کر موسم سرما کی پہلی برفباری سے پہلے پہلے نیچے چلے جاتے ہیں.. نیچے سے مراد وادی کلتر ہے یا پھر ان کے نزدیک نہایت ہی میدانی علاقہ ہے گلگت.. وہاں چلے جاتے ہیں..

یہ اُن کے عارضی پڑاؤ تھے..

وادیٔ سوختر آباد کے داخلے پر بھی ایسے ہی خانہ بدوش گوجروں سے ملاقات ہوئی تھی.. ہم نے ان کی پتھریلی مسجد میں نماز پڑھی تھی.. ایک اوپن ایئر تالاب میں نہائے تھے اور آگے بڑھ گئے تھے..

کلتر پھسورا ٹریک کے دوران میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ گوجر قبیلے کے یہ افراد نہایت ہمدرد اور وضع دار ہوتے ہیں.... آپ کو دیکھ کر نہ خوش ہوتے ہیں نہ ناراض بلکہ نارمل انداز میں ملتے ہیں جیسے آپ بھی انہی کی مانند اپنے مویشی چرانے بلند چراگاہوں کی جانب جا رہے ہیں..

گوجر مجھے بھروسے کے لوگ لگے.. اور میں نے انہیں کوہ نوردوں سے پیسے بٹورنے کے لالچ میں مبتلا نہیں پایا.. شاید اس لیے بھی کہ وہ دیگر پہاڑی لوگوں کی نسبت کھاتے پیتے بلکہ دودھ دہی اور مکھن کھاتے پیتے لوگ ہوتے ہیں..

ویسے ہم نے تھوڑی دیر انتظار کیا.. کہ اس مکھی بھرے دہی کو نوش کرنے کے بعد اگر پیٹ میں کوئی انقلاب برپا ہونا ہے تو یہیں ہو جائے.. کچھ روپوش مقام بھی ہیں اور پانی بھی میسر ہے لیکن کچھ بھی نہ ہوا.. راوی نے چین ہی چین لکھا.. بلکہ ہم پہلے سے کہیں زیادہ فرحت آمیز ہو گئے..

گوجروں کی یہ بستی دریا سے اوپر ایک بلند ڈھلوان پر آباد تھی.. ایک بڑے گلیشیئر کی چھاؤں میں تھی.. ہم اس بستی سے اُٹھے اور پھر سے نیچے اُترنے لگے اور دوبارہ دریا کے کناروں پر آ گئے.... ہم اُس شہتیروں والے پُل کو پار کر کے اتنی مشقت سے اوپر گوجروں کے جھونپڑوں تک جانے اور پھر سے نیچے اُترنے کی بجائے وہیں سے دریا کے کنارے کنارے آگے کیوں نہ چلے گئے.. صرف اس لیے کہ پورٹر حضرات اس راستے سے اوپر گئے تھے..

دریا کے پار جانے کے لیے.. دوبارہ پار جانے کے لیے جو ایک پُل تھا وہ بھی کمال کا پُل تھا.. دو شہتیر اور چند ٹہنیاں.. اور ان پر چلنے کے لیے محض ایک ماہر بازی گر ہونا درکار تھا..

اور ہم تو سب کے سب بازی گر تھے.. کرتب دکھانے والے تھے.. صرف ہمیں دیکھنے والے کوئی تماشائی نہ تھے کہ ہم بلند پہاڑوں کے سرکس میں کرتب دکھاتے تھے.. کوئی ہمیں نہ دیکھتا تھا ہم ایک دوسرے کو دیکھتے تھے کہ واہ میاں صاحب کیا چھلانگ لگائی ہے.. کیا بات ہے شاہد میاں واخانی نالے پر سے کیسے ایسے گزرے ہیں جیسے کوئی تنے ہوئے رسّے پر چلتا ہے.. اور تارڑ صاحب آپ کا تو جواب نہیں.. آپ تو پہاڑوں کے سرکس کے جوکر ہیں.. چلتے ہیں تو دیکھ کر ہنسی آتی ہے..

"تین سیاہ پوش نالے اور پھر.. یاکوں کے غول.. ڈھلوان پر.. ہمارے اوپر گرتے آرہے ہیں"

اس پُل کے پار دریا جو گوجروں کی بستی کے احترام میں ذرا کناروں کے اندر سمٹ گیا تھا پھر سے ایک خوش نظر چراگاہ کے بیچ اطمینان سے بہنے لگا.. اور ہم نے دیکھا کہ اس گھاس بھرے میدانی علاقے میں پانیوں کی نزدیکی میں ہمارے رُک سیکوں کے شوخ رنگ بکھرے ہوئے ہیں اور پورٹر استراحت فرماتے ہیں اور ابراہیم کے چولہے سے دھواں اٹھ رہا ہے..

یہ لنچ بریک تھی..

ہم اُن کے قریب ہوئے تو ابراہیم کو نہایت متحرک پایا.. اس نے ہمارے گھاس پر ڈھیر ہونے سے پہلے ہی انرجائل کی زرد زندہ کر دینے والی ٹھنڈک پیش کی اور پھر ٹیونا فش.. کریکر.. پنیر اور ان کے ساتھ ایسے گرم گرم اور خستہ فرنچ فرائز سرو کیے کہ کیا کسی میکڈونلڈ یا کے ایف سی میں ہونگے.. اور ظاہر ہے ٹومیٹو ساس کی سنگت میں.. اور ان پر مستزاد بھاپ دیتی لبوں کو جلانے والی گرم کافی.. اب کسی بھی انسان کو دنیا جہان سے الگ تھلگ ایک بلند وادی میں اور کیا چاہیے تھا.. اس شاہانہ طعام کے بعد ہم ایک برفانی ندی کے کنارے گھاس پر لیٹ گئے بلکہ لُم لیٹ گئے اور اونگھنے لگے... کہیں بلند پہاڑوں میں یہ اونگھ بھی کمال کی چیز ہوتی ہے.. آپ نے اپنے جوگرز اتار دیے ہیں اور آپ کے تھکے ہوئے ننگے پاؤں برفانی ندی کی قربت میں کہ ان پر کچھ چھینٹے بھی برستے جا رہے ہیں.. ٹھنڈک سے گدگدائے جا رہے ہیں اور آپ کھانے کی مستی میں مسکرائے جا رہے ہیں اور اونگھے جا رہے ہیں.. آپ کی پنڈلیوں کے پٹھے تھکاوٹ سے چُور ہیں اور ان کی اکڑی ہوئی

رگیں درد بھی کرتی ہیں اور استراحت کے خمار میں لطف بھی لیتی ہیں..

اسی پُرفضا لنچ سپاٹ میں عمران اور اس کے بغل بچوں نے ہمیں جوائن کر لیا.. وہ ہم سے بات نہ کرتے تھے.. ہم کہتے تھے کہ اچھا تو جھیل پر جب دھوپ پھیلی تو وہ کیسی لگتی تھی اور وہ کہتے تھے "چھوڑو جی.." ہم جو کچھ پوچھتے وہ ناراض ہو کر کہتے "چھوڑو جی.."

"کیوں چھوڑو جی.." میں نے ذرا تلملا کر کہا..

"آپ کو کیا بتائیں کہ آپ نے وہاں نہ ٹھہر کر اپنے آپ پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے.. کیا کچھ مس کیا ہے.. اس لیے.. چھوڑو جی" عمران ایک اپنی ہی اونگھ میں تھا.. اس جواب کے بعد میں بھی واپس اپنی اونگھ میں چلا گیا..

جب پورٹر پھر سے سامان کو اپنے کندھوں پر بوجھ کرنے لگے.. ابراہیم کا باورچی خانہ سمیٹا جانے لگا تو یہ گویا نقارۂ کوچ کا تھا..

دوبارہ جرابیں اور جوگر پہننا بہت بُرا لگا..

ننگے پاؤں جو سرد اور نشآور ہواؤں میں موج کر رہے تھے پھر سے ڈھکے گئے.. آج کی شب ہم نے لوئر شاہی کی بلند چراگاہ میں پہنچنا تھا..

"ابراہیم.." میں نے مغلِ اعظم کی مانند ہو بہو "شیخو" کے انداز میں پکارا..

"جی سر.." وہ اپنے فرائی پین اور دیگچیاں چھوڑ کر حاضر ہو گیا..

"یہ لوئر شاہی کہاں ہے؟"

"وہ سامنے ہے صاحب.." اس نے دریائے ملتر کی اس وادی کے پھیلاؤ کو بالآخر روک دینے والی عظیم چٹانوں اور برفوں کی طرف اشارہ کیا.. اور وہ ابھی بہت دور تھیں "وہ جہاں ایک سرمئی رنگ کی چٹان ہے اور اس کے برابر میں جو چھوٹا پہاڑ ہے وہ سرخ رنگ کا ہے.. نظر آیا ہے صاحب.. تو اس کے برابر میں ذرا اوپر لوئر شاہی کی گھاس ہے.."

بے شک وہ سرخ رنگ کا پہاڑ یہاں سے نظر آ رہا تھا لیکن محض نظر آنا اس بات کی دلیل نہ تھی کہ ہم شام سے پہلے وہاں پہنچ بھی سکتے ہیں.. پہاڑوں کے فاصلے فریب کے جال ہوتے ہیں..

"چلو چلو لوئر شاہی چلو.." میاں نے اعلان کیا اور پھر ادھر ادھر دیکھ کر اپنی عینک درست کی "اوئے یہ گدا اور گرد آمیز کہاں ہیں؟"

"میاں صاحب وہ تو پیار کے پنچھی ہیں چہکتے ہوئے نکل گئے ہیں" سلیم ہنسا..

"نہ تو یہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟"

"میاں صاحب پیار کے پنچھی تو ہمیشہ تنہائی کے تمنائی ہوتے ہیں.."

"اچھا؟" میاں قدرے فکر مند ہو گیا "اوئے پتہ کرو کہیں ان کا ڈیپارٹمنٹ ہی الگ نہ ہو"

ہم چلنے لگے..

دریائے ططر کا یہ گھاس بھرا میدان اور سپاٹ میدان جلدی ہی ختم ہو گیا اور کنارے اونچے ہو گئے ..ہم بھی ذرا پھسلتے اور کچھ خوفزدہ ہوتے ان کناروں کے ساتھ اونچے ہوتے گئے.. چڑھائی ختم ہوئی تو ایک اور وسیع چراگاہ نظروں کے سامنے پھیلتی گئی جس کے آخر میں مکمل طور پر سلیٹی رنگ کا ایک ویران اور سنسان پہاڑ تھا اور اس کی آغوش میں جو گلیشیئر تھا وہ بھی سرمئی تھا.. گدلی ریت اور کنکروں سے ڈھکا ہوا اور اس میں سے جو گدلا نالہ نکل کر نیچے جا رہا تھا اس کے پانی بھی نیم سیاہ تھے..

پہاڑ.. گلیشیئر اور نالے کے پانی کے رنگ اتنے یکساں تھے کہ وہ شکل سے الگ الگ دکھائی دیتے تھے.. پانیوں کا بہاؤ بھی سرمئی تھا.. اس منظر کی تصویر میں بس یہی ایک رنگ تھا اور وہ دل میں ایک عجیب بے چینی بھرتا تھا.. اس نالے کو پار کرنے کے لیے ہم چراگاہ سے اوپر اس مقام تک گئے جہاں سلیٹی برف زار میں سے وہ اس رنگ میں رنگا برآمد ہو رہا تھا.. جوں جوں وہ نیچے جا رہا تھا بے لگام اور ناقابلِ عبور ہو رہا تھا۔ نالے کے پانی تو سیاہ رنگ کے تھے ہی لیکن اس میں جو پتھر تھے وہ بھی اس کی سیاہی میں ڈوب کر کالک زدہ ہو گئے تھے.. ان پانیوں کو دیکھ کر بدن میں ٹھنڈک کی بجائے ایک سیاہی اُترتی تھی..

نالے کے پار جا کر ہم پھر سے نیچے اُترنے لگے.. ایک فوکر جہاز کی مانند بلندی کم کرنے لگے ..ہم بہت نیچے تک چلے گئے .. آسانی سے نہیں.. ذرا گرتے پڑتے.. اپنے ٹخنے زخمی کرتے نیچے گئے..

اب ہم پر وہ وقت آ چکا تھا جب پہاڑوں میں مسلسل چلنے کی تھکاوٹ اور ایک خوف ہر کوہ نورد کو الگ الگ کر دیتا ہے، تنہا اور خود غرض کر دیتا ہے.. گفتگو اور دوستی یاری موقوف ہو جاتی ہے اور غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ بقیہ لوگ تو جائیں بھاڑ میں.. کم از کم میں تو اس بھربھری بلندی سے لڑھکے بنا نیچے اُتر جاؤں.. یہ بھی اونچے اور نہایت دیوار نما کنارے تھے جن سے چمٹ چمٹ کر ہم

نیچے گئے.. نیچے اُترے ہیں.. تو اپنے سامنے اس سیاہ منظر کو دیکھا جسے ہم نے چراگاہ سے دیکھ تو لیا تھا لیکن ایک کبوتر کے موافق آنکھیں بند کر لی تھیں کہ نہیں.. یہ جو سیاہ پتھروں اور بجری میں بچھے کالے نالے ہیں اور سیاہ آفت متعدد نالے ہیں تو یہ محض ایک منظر ہیں ان کے پار تو ہم نے نہیں جانا..... کسی اور نے جانا ہو گا ہم نے تو نہیں جانا.. اور اگر جانا بھی ہے تو ان کے آس پاس یقیناً کوئی آسان سا راستہ ہو گا..

نیچے اُترے ہیں ان سیاہ آفت بلاؤں کے شور سے کان بہرے ہوتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ کوئی اور راستہ نہیں ہے..

سامنے ایک بحرِ اسود ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور تصویرِ مرگ میں مزید سیاہ رنگ بھرنے کے لیے شام بھی ہو رہی ہے..

اب صورت حال یہ ہے کہ سب حضرات ذاتی طور پر بھیگے ہوئے سلیٹی پتھروں اور بجری پر پھسلتے گرتے اِدھر اُدھر اس کاوش میں بھٹک رہے ہیں کہ کہیں نہ کہیں تو یہ نالہ مختصر ہو گا.. اس میں چند پتھر ہوں گے جن پر قدم رکھتے ہوئے ہم اسے ناپ جائیں گے.. لیکن آفرین ہے اس نالے پر کہ اس نے اس قسم کی کوئی سہولت ہمیں مہیا نہ کی.. جہاں وہ ذرا مختصر ہوتا تھا وہاں اُسی حساب سے وہ تیز اور گہرا بھی ہو جاتا تھا.. اور جو پتھر کہیں کہیں تھے وہ اس کی مانند سیاہ تھے اور الگ سے دکھائی نہ دیتے تھے.. چنانچہ ہم نے یہ دلیرانہ فیصلہ کیا کہ اس نانہجار کو پورٹروں کی مدد سے پار کیا جائے..

یہ نالہ مجھے یاد نہیں کہ کس کس نے کیسے پار کیا.. البتہ میں نے تین چار پورٹروں کے بازوؤں سے جھولتے اور لٹکتے ہوئے پار کیا..

اس کے بعد ایک اور نالہ تھا..

یہ پہلے نالے کے بڑے بھائی لگتے تھے اور غصے میں لگتے تھے.. میں اُن کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا.. اسے ہم نے.. یا کم از کم میں نے گڈو اور ابراہیم کے کندھوں پر سوار ہو کر پار کیا..

میں اس شام کی نالہ کراسنگ کو بہ طریق احسن بیان نہیں کر پایا.. بس یوں سمجھ لیجیے کہ ہر جانب ہا ہا کار مچی ہوئی تھی.. قیامت کا شور تھا اور شام تھی.. ماں بچے کو نہ سنبھالتی تھی صرف گدا.. گردآمیز کو سنبھالتا تھا کہ سائیں کے چہرے پر بھی ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا اور وہ اپنے کیمروں کو بھی بھول چکا تھا..

اب جو تیسری اور آخری آفت سامنے آئی ہے تو وہ قدرے دھیمے مزاج کی تھی اور میں

جو ابراہیم کے کندھوں پر سواری کرنے کے بعد اپنی عزتِ نفس اور مردانگی کو بُری طرح مجروح کر چکا تھا اسے کچھ بحال کرنے کے لیے بہ نفسِ نفیس اس کے درمیان اُبھرے پتھروں پر اپنے آپ کو بچھوتا.. پھسلتا اسے عبور کرنے لگا.. مسئلہ یہی تھا کہ پانیوں میں جو پتھر تھے وہ بھی اسی رنگ کے تھے چنانچہ کبھی تو آپ ایک بیچ کے پتھر پر پاؤں جماتے تھے اور کبھی پانیوں کے کسی ابھار کو پتھر سمجھ لیتے تھے اور گھٹنوں تک پانیوں میں چلے جاتے تھے..

میں نے ایک مرتبہ پھر اُن گائیڈ بکس کو کوسا.. اُن حضرات کے خاندانی شجرہ نسب میں کیڑے نکالے جنہوں نے مجھے انفارم کیا تھا کہ فلتر پکھورا ٹریک تو بے حد آسان ہے.. ان تین نالوں کے پار کچھ پتھر تھے.. بڑے بڑے.. ان کے آس پاس بھی پانی بہتا تھا.. ہم نالوں کے شور سے دور ہونے لگے.. شکر کرنے لگے کہ دور ہوتے ہیں اور وہ سرخ ڈھلوان جس کے دامن میں لوزر شاہی تھا قریب آنے لگی..

چڑھائی پھر سے شروع ہو گئی..

بائیں جانب یکدم کچھ برف سے ڈھکی چٹانیں اور گلیشیئر قریب آنے لگے اور ہاں ان سیاہ آفت پانیوں کے کناروں پر.. انہیں عبور کرنے کی جان لیوا کوششوں میں جب ہم تھے تو کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو نہ ان سے ڈرے نہ پیچھے ہٹے نہ ذرہ بھر خوفزدہ ہوئے بلکہ وہ تو قہقہے لگاتے جشن مناتے تھے اور یہ عمران تھا اور اس کے بغل بچے تھے جو کیمرے کاندھے پر لادے.. بیٹریوں کا بوجھ اٹھائے.. تاریں بچھاتے.. مائیک کا منہ کھولے ان سیاہ عفریتوں کو بے خوفی سے پھلانگتے بندروں کی طرح ان پر سے کودتے.. لدھڑوں کی مانند پانیوں کی قربت میں اُچھلتے.. ہم سب کی بے بسی اور خوف کو فلم بند کرنے میں مشغول رہے.. یہ لوگ بخشے جانے والوں میں کبھی شمار نہ ہوں گے..

شام میں ڈھلتی شام ہوتی سرمئی ندیوں کی وادی نیچے رہنے لگی اور ہم ہانپتے ہوئے بلند ہونے لگے.. سُرخ مٹی کی پہاڑی قریب آ رہی تھی..

لوزر شاہی کی چراگاہ کی بس جھلک نظر آنے لگی اور وہاں جو ابھی کچھ دیر پہلے دھبے سے تھے وہ ہولے ہولے حرکت کرنے لگے کہ یہ وہ مویشی تھے جو اس چراگاہ میں عیش کرنے کے لیے آئے تھے.. بابر بہ عیش کوش کہ یہ گھاس دوبارہ نیست.. اور شائد اُس لمحے وہ ہمیں بھی سیاہ پانیوں اور سرمئی چٹانوں کی وادی میں سے بلند ہو کر ایک مختصر پگڈنڈی پر ہانپتے ہوئے حرکت کرتے ہوئے دیکھتے تھے اور انہیں حیرت ہوتی ہوگی کہ یہ کیسے مویشی ہیں جو گھاس نہیں چرتے بس گرتے پڑتے

ہماری جانب آتے چلے جاتے ہیں..

کہیں بلند پہاڑوں میں شام بھی یکلخت اُترتی ہے.. بلکہ گر پڑتی ہے.. ابھی وہ گری نہیں تھی.. اُتر رہی تھی.. ہم سب تھکاوٹ کے بوجھ میں خاموش.. کوہ نوردی کے جرم کی سزا بھگتتے ہوئے اُس پگڈنڈی پر چلتے جا رہے تھے جب اُس شام کے سکوت میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی.. ہمارے پاؤں تلے جو زمین تھی اس میں ایک کپکپاہٹ تھرانے لگی.. جیسے ایک سانپ جان جاتا ہے کہ اس کے نیچے جو زمین ہے اُس میں ایک دھمک ہے اور کوئی دشمن آس پاس ہے ایسے ہمارے پاؤں تلے جو زمین تھی وہ کچھ خبر کرتی تھی.. پھر جیسے ایک نومولود زلزلے کے آثار لرزنے لگے.. کچھ پتھر گرے.. جھاڑیوں کے پتے ہلنے لگے اور ہم تھم گئے..

ابراہیم بھی رُک گیا اور ہاتھ آگے کر کے کہنے لگا "صاحب احتیاط کرو.. اوپر سے یاک آ رہا ہے.."

ہم جو احتیاط کے مارے پگڈنڈی سے نظریں نہیں ہٹاتے تھے.. ہم نے نظریں ہٹا کر اوپر بلندی کی جانب نگاہ کی تو اس خوفزدہ نگاہ نے دیکھا کہ وہاں سے دھول اڑاتے دھومیں مچاتے.. ہماری موجودگی سے بے پرواہ، متعدد زلزلے نیچے آ رہے ہیں.. ان میں کوئی تو بھورے رنگ کا تھا.. تو کوئی چتکبرا.. کوئی بالکل سیاہ تو کوئی سراسر سفید.. آپس میں بھڑتے.. درجنوں یاک پھنکارتے بلندی سے نیچے آ رہے تھے اور ہم سب اُن کے راستے میں تھے.. یاکوں کا ریوڑ براہِ راست ہمیں روندنے کے لیے دھول اُڑاتا.. دھومیں مچاتا نیچے آ رہا تھا..

سیدھا ہماری جانب اُترتا آ رہا تھا..

اور وہ صریحاً موت تھے..

اُن کے سُموں کی دھمک سیاہ ندیوں کے شور سے کہیں بڑھ کر ہولناک تھی..

اُس لمحے مجھے خیال آیا کہ یہ تو نہایت زیادتی ہوگی کہ میں ورگوتھ کے سفید نالے پار کر جاؤں.. بیافو ہسپر کے قاتل گلیشیئر عبور کر جاؤں.. شاہ گوری کو ہاتھ لگا آؤں اور مجھے کچھ نہ ہو اور پھر یہاں لوزر شاہی کے قریب بلندیوں سے بے قابو اُترتے ہوئے یاکوں کے نیچے آ کر کچلا جاؤں.. یہ تو نہایت زیادتی ہوگی.. سنولیک کی کسی دراڑ میں گر کر ہلاک ہو جانا کسی حد تک رومینٹک ہوتا لیکن یاکوں تلے آ کر ہلاک ہو جانا تو نہایت نامناسب اختتام ہے..

چونکہ فرار کا کوئی راستہ نہ تھا اس لیے ہم سب گُم صُم کھڑے تھے.. بت بنے دم بخود

کھڑے تھے کہ اب تو جو مزاج یاک میں آئے.. اور ہم میں سے کون ہے جو کچلا جائے گا اور کون ہے جو بچ جائے گا اس کا فیصلہ اگلے چند لمحوں میں ہو جانا تھا..

یاک سیدھے ہماری جانب لڑھکتے آ رہے تھے اور جب وہ اتنے قریب آ گئے کہ ہم ان کی آنکھوں میں آنکھیں اور اگر ہماری بھی مورچھل نما دُمیں ہوتیں تو دُموں میں دُمیں ڈال کر دیکھ سکتے تھے.. لیکن ہم نے انہیں زیادہ دیر نہ دیکھا کیونکہ ان کے سُموں سے اُٹھنے والی دھول ہماری آنکھوں میں جھونکی گئی.. کچھ دکھائی نہ دیا.. وہ افریقہ میں کسی دہشت کے باعث ظہور پذیر ہونے والی جانوروں کی بھگدڑ کی طرح ہمارے آس پاس سے گزر گئے اور نیچے چلے گئے.. جب گرد چھٹی تو ہم نے دیکھا کہ وہ سیاہ ندیوں کے کناروں تک پہنچ چکے تھے..

یہ منظر اور یہ وقوعہ یقیناً دہشت ناک تھا.. یہاں تک کہ پورٹر بھی پتھروں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں دُبکے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود اس میں ایک المناک خوبصورتی تھی.... اس ڈھلتی اور بلند چراگاہوں کی شام میں ان یاکوں کا پہاڑوں سے دھول اڑاتے لڑھکتے آنا.. اس میں بھی ایک گُنگ کر دینے والا حُسن تھا.. کسی بھی شے کے حُسن کا معیار اس کے کم کم ہونے اور یکتا ہونے میں ہوتا ہے.. جہاں کہیں اس کی بہتات ہوتی وہیں اس کی بے قدری بھی ہوتی.. یورپ میں گوری رنگت دل نہیں روکتی کہ وہ عام ہے.. ایک نیوڈ بیچ پر برہنگی آپ کو ہیجان میں مبتلا نہیں کرتی کہ وہ کھلے عام ہے.. نمائش پر ہے اور بہت ہے.. البتہ ادھر پنجاب میں وہی گورا رنگ ہو تو اس کے گیت گائے جاتے ہیں اور گورا رنگ نہ دینے کی دعائیں کی جاتی ہیں نہیں تو پورا پنڈ ویری ہو جاتا ہے..
چنانچہ حُسن کا اور منظر کا بھی معیار اس کے کم کم ہونے میں ہے..

تو اس منظر میں.. سرِ شام.. کہیں بلند پہاڑوں میں.. سرد گلیشیئر ہواؤں اور جنگلی بوٹیوں کی تیز مہک میں درجنوں یاکوں کا پہاڑوں سے اُترنا.. دھول اُڑاتے.. آپس میں بھڑتے.. آپ کو روند دینے کا امکان رکھتے.. یوں نیچے آنا بھی ایک بے مثل خوبصورتی والا ڈرامہ تھا..

اس لیے کہ صرف ہم نے اُسے دیکھا تھا.. بلکہ میں نے اُسے دیکھا تھا کیونکہ ان درجنوں یاکوں میں سے ایک یاک ایسا تھا جسے میں نے پہلے بھی دیکھا تھا.. کہیں ملاقات ہوئی تھی..

جب میں دم روکے کھڑا تھا اور وہ بے اختیار نیچے آتے ہوئے اپنے سموں کی لرزش میرے بدن میں بھرتا قریب آیا تھا تو.. اس نے بھی مجھے دیکھا تھا..

اور اس یاک کے دماغ میں بھی یہی اُلجھن تھی کہ اس خوفزدہ بندے کو میں نے پہلے بھی

کہیں دیکھا ہے..

دیوسائی کے میدان میں خیمہ زن.. وادیٔ روپل میں یا وادیٔ بروغل کی یاک سرائے میں.. یا پچھلے برس وادیٔ شمشال میں.. کہیں نہ کہیں اس بندے کو دیکھا ہے.. اور یہ بندہ باز نہیں آتا.. پھر آ جاتا ہے کہیں نہ کہیں..

اس یاک کے گھٹے ہوئے بدن سے برگد کی داڑھیوں کے مانند لٹکتے گھنے کھردرے بال.. کہیں سیاہ تھے اور کہیں برف سفید.. دُم خوب گھنی اور مورچھل نما تھی.. اگر وہ یاک یہ سوچتا تھا کہ یہ شخص پھر آ گیا ہے..

تو میں بھی یہی سوچتا تھا کہ یہ یاک پھر آ گیا ہے..

''ہمہ یاراں، ایسی بلندی.. ایسی برفیں.. اور ایسی چراگاہ.. لوئر شاہنی.. سبحان اللہ''

لوئر شاہنی ہماری آمد سے آباد ہو گیا تھا..

یہاں میلے کا سا سماں تھا..

جہاں ایک ڈھلوان اُترتے اُترتے ہموار ہوتی تھی.. چند پتھر تھے گھاس میں ڈھکے ڈھکے.. ایک مختصر چراگاہ تھی.. اور پھر ایک کنارہ بلند ہوتا تھا جس کے عین نیچے ایک گلیشیئر کا وجود اپنی سفید شان اور تمکنت میں ٹھہرا ہوا تھا اور اس گلیشیئر کے پار اس برف کے جمے ہوئے دریا کے دوسری جانب برفوں سے ڈھکے چُپ کھڑے.. نہایت سرد ہوتے پہاڑ تھے جو بے حد ویران تھے..

کہیں بلند پہاڑوں میں پوشیدہ اس ناآشنا مقام میں میلہ لگا تھا..

ہمارے ٹینٹ لگے تھے..

الاؤ روشن ہو رہا تھا..

چولہے میں آگ جل چکی تھی اور اس کی لَو میں ابراہیم کا سفید چہرہ دمکتا تھا.. اور سردی تھی.. اور بہت تھی..

چراگاہ میں جب ہم وارد ہوئے.. ابھی ابھی یاکوں کی دہشت میں لرزتے بدن کے ساتھ تو وہاں دو تین آوارہ قسم کی گائیں چرتی تھیں جنہیں ہم نے شُو شُو کر کے بھگا دیا تھا کہ تم کہیں اور چلی جاؤ.. تم تو یہاں آتی ہی رہتی ہو.. ہم اِدھر پہلی بار آئے ہیں.. مسافر ہیں آج ایک شب گزار کر کل چلے جائیں گے.. اور وہ ایسی شرمیلی گائیں تھیں کہ پہلی شُو پر انہوں نے اُدھر کا رخ

کر لیا جدھر بپھرے ہوئے یاک اُترے تھے..

میں اپنے خیمے میں جا کر ابھی لیٹا ہی تھا.. کمر ابھی مکمل طور پر سیدھی نہیں ہوئی تھی اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ گرم پانی میں ڈیٹول کے چند قطرے ڈال کر اپنی رانوں پر آئی ہوئی خراشوں کو اس سے دھولوں.. اور آج کل کی نسبت میں کم زخمی ہوا تھا.. تو ابھی اسی قسم کے ناآسودہ سے حالات تھے جب ابراہیم نے خیمے کے پردے میں سے جھانک کر قدرے ہچکچاہٹ سے کہا ''صاحب آپ تھک گیا ہے.. ہم آپ کو دباتا ہے''

''نہیں..''

''نہیں صاحب.. مہمان تھک جائے تو ہم اسے دباتا ہے.. ہمارا فرض ہے..''

''یاک سرائے'' کے سفر کے دوران تگیر خان نے بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا تھا.. یہ ایک زمانے میں آدابِ میزبانی میں شامل تھا کہ اگر ایک مہمان پہاڑوں میں سفر کرتا کہیں برفوں کے کناروں پر بنے آپ کے جھونپڑے تک پہنچتا ہے تو ظاہر ہے اس کا بدن ٹوٹ رہا ہوگا تو پہلے اسے دباتا ہے اور پھر خوراک پیش کرتی ہے.. اور یہ دستور اب تک چلا آتا ہے..

پنجاب کے دیہات میں بدن دبانا.. مٹھی چاپی کرنا روزمرہ کے معمولات میں شامل تھا.. گاؤں میں مہمان آتا تھا تو سب سے پہلے کسی ملازم یا کسی کو اس کی تھکاوٹ اُتارنے کے لیے بدن دابنے پر معمور کر دیا جاتا تھا چوہدری صاحب کے کندھے دابنے کے لیے کوئی نہ کوئی شخص ہمہ وقت ڈیوٹی پر رہتا تھا اُدھر چوہدرانی صاحبہ کے بھی یہی معمولات تھے کہ نائن یا میراثن ان کے کولہے اور کندھے دابنے میں مشغول ہے.. لاہور شہر میں بھی کچھ عرصہ پہلے تک یہ نارمل روٹین تھی کہ پرانی فصیل کے گرد جو باغات ہوا کرتے تھے وہاں سرِ شام معززین لنگوٹ باندھ کر اپنے آپ کو دبواتے تھے اور مالش کرواتے تھے.. میری بیگم جو بنیادی طور پر ایک شہرن تھی جب شادی کے فوراً بعد میرے گاؤں گئی تو اسے شدید شکایت ہوئی کہ وہاں تو جو بھی خاتون ملنے کے لیے آتی تھی سر پر پیار دے کر مجھے دبانے لگتی تھی کہ وہ بہتی تھک گئی ہو گی اور مجھے تو بڑی شرم آتی تھی.. میرے اباجی کا بھی فیورٹ پاس ٹائم یہی تھا کہ کاروبار سے واپس آتے، اپنا تھری پیس سوٹ اتارا.. ہیٹ کھونٹی پر ٹانگا اور تہمد اور بنیان زیب تن کر کے پلنگ پر لیٹ گئے اور ہم سارے.. بہن بھائی جن کا کل وزن ان کی نسبت آدھا بھی نہ تھا ان پر چڑھ کر اُچھل کود کرنے لگے.. اور وہ خوش ہو کر دعائیں دیا کرتے تھے..

اب ہم متمدن یافتہ ہو گئے ہیں اور کسی کو اپنا بدن چھونے تک نہیں دیتے البتہ مساج

کروانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے اور فزیوتھراپی کے لیے زرِ کثیر خرچتے ہیں.. تو جب ابراہیم نے مجھے دبانے کی پیشکش کی تو میں نے ایک واجبی سی "نہیں" کے بعد قبول کر لی کیونکہ میرا بدن تو ایسا تھکا ہوا تھا کہ اسے اگر مٹی میں بھی دبا دیا جاتا تو میں اعتراض نہ کرتا..

ابراہیم کی ایکسپرٹ مُٹھی چاپی نے مجھے بحال کر دیا.. اگرچہ اس نے پہلے میرے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک ایک کر کے گرفت میں لیا اور ان میں پٹاخے نکالے پھر پاؤں کو دوہرا کر کے اس کے کڑاکے نکالے اور پھر کمر پر متعدد گھونسے رسید کر کے مجھے اَدھ موا کر دیا لیکن بحال کر دیا.. اب میں اسے بار بار کہتا ہوں کہ بس ابراہیم کافی ہے اور خواہش یہی ہے کہ یہ بس نہ کرے کہ اس عمل سے جو راحت حاصل ہو رہی تھی اور جو تھکاوٹ اُترتی تھی اس کا بیان ممکن نہیں..

"بس ابراہیم.. تھینک یُو" میں نے بادلِ نخواستہ دل پر جبر کر کے اُسے روک دیا..

"آپ مہمان ہیں صاحب.." وہ کہہ کر خیمے سے نکل گیا..

علی جھیل کی خیمہ گاہ بُری نہ تھی بلکہ خاصی خوش نظر تھی لیکن اس نے مجھے مایوس کیا تھا کہ وہ پتھروں اور درختوں میں دم روکے ہوئے تھی.. ڈھکی چھپی تھی لیکن لوزر شاہنی کی اس بلندیوں کے تختِ پر براجمان کھلی برفوں اور آسمان کی قربت میں سانس لیتی آماجگاہ نے مجھے مسحور کر دیا تھا..

بس یہی زندگی تھی..

یارو یہی زندگی ہے..

سرد ہوائیں اگرچہ بہت مدھم بے آواز.. لیکن ایسی کہ ان میں لوزر شاہنی کے نیچے لیٹے گلیشیئر کی برف کی کرچیاں گویا ہم تک آتی تھیں اور رخساروں کو چھوتی تھیں.. برف بوسے ہم سے پیار کرتے تھے.. آوارہ گردی کا کھوٹا سکہ یہاں کھرا ہوتا تھا.. چلتا تھا.. بدنی زوال اور عمر معدوم ہوتی تھی.. اور.. آپ کو ایک انوکھے راز میں شریک کرتا ہوں جنیوا کی میونسپل کیمپنگ میں میرے اولین خیمے میں رتھ کی جو مہک تھی.. اور کتنے برس پیشتر؟.. شاید چالیس برس ہونے کو آئے.. تو وہی مہک آج بھی کتنے زمانوں کے بعد میرے خیمے میں تھی.. اگرچہ رتھ کی نہ تھی..

شاہ گوری کی تھی جس کے گورے برف بدن پر نیل تھے..

جھیل کرومبر کے پانیوں کی نمی کی تھی..

اُس بوٹے کی تھی جو زمین سے پھوٹا لیکن جڑیں پکڑنے سے پہلے بہہ گیا.. میں اب اُس انوکھے راز کی طرف آتا ہوں.. میں اپنے پڑھنے والوں کے ساتھ ایک غیر معمولی حسّی تجربہ شیئر

کرنا چاہتا ہوں.. جیسے ایک طوائف اور ایک شریف زادی کے تجربوں میں فرق ہوتا ہے.. ایک درویش اور ایک دنیادار کی حیات الگ الگ ہوتی ہیں.. جو کچھ ایک بدن ایک رُوح پر بیتتی ہے وہ کسی دوسرے بدن دوسری روح کے نزدیک ناممکن کی فہرست میں درج ہوتی ہے.. کچھ اسی طور ایک آوارہ گرد کے حسّی تجربے غیر معمول کے اس ضمن میں آتے ہیں جنہیں ایک معمول کی زندگی گزارنے والا دیوانگی میں شمار کرتا ہے.. مجھ پر ایک ایسا وقت تھا کہ میں جناح باغ لاہور میں ایک باقاعدہ.. آندھی ہو بلا خیز بارش ہو.. طوفان درختوں کو جڑوں سے اُکھاڑ رہا ہو.. پھر بھی ایک باقاعدہ اور نشئی قسم کا سیریا ہوا کرتا تھا.. صبح کی اس روزانہ سیر کے دوران ایک وکیل صاحب سے ملاقات ہوا کرتی تھی جو یوگا پر دسترس رکھتے تھے.. چلتے پھرتے بالکل نہیں تھے ایک ہی مقام پر اُلٹے سیدھے ہو کر سر کے بل کھڑے ہو کر اور آسن جما کر فارغ ہو جاتے تھے.. اور بے حد فٹ تھے.. میں کچھ دنوں یوگا میں ان کا مرید ہوا لیکن میرے بدن میں اور دماغ میں وہ طمانیت اور لچک پیدا نہ ہو سکی جو یوگا کا خاصا ہے پھر بھی کچھ کچا پکا کام سیکھ لیا.. ایک دو آسن سیکھ لیے.. کچھ گُر حاصل کر لیے.. ان میں سے صرف ایک نے میرا ساتھ دیا.. وہ یہ کہ سیر کے بعد جب آپ کا بدن تھکا ہوا ہوتا تھا.. اگرچہ ایک پھول کی مانند تازگی میں چلبلاتا بھی تھا تو آپ کولہوں پر ہاتھ رکھ کر اپنا سانس اندر کو کھینچتے ہوئے اپنے سر کو آہستہ آہستہ جہاں تک ہو سکے پیچھے لے جاتے ہیں اور پھر دم روکے وہیں ٹھہر جاتے ہیں جب تک آسانی سے اس حالت میں رہ سکتے ہیں رہتے ہیں اور جب چہرہ سُرخ ہونے کو آتا ہے.. سانس سہارا نہیں جا سکتا تو آپ دھیرے دھیرے اس سانس کو خارج کرتے ہوئے سیدھے ہو جاتے ہیں.. سیدھے ہونے پر ایک تو آپ بری طرح لڑکھڑا جاتے ہیں جیسے نشے میں بے اختیار ہوں اور اسی لیے یہ ورزش کسی بنچ یا پتھریلی سطح کے قریب نہیں کریں تا کہ گر جانے کی صورت میں زخمی نہ ہوں.. تو جونہی آپ لڑکھڑا کر سیدھے ہوتے اپنے آپ کو سنبھالتے ہیں تو ایک تبدیلی ظہور پذیر ہوتی ہے آپ کے حواس کی کئی ایسی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں جو مدت سے بند پڑی زنگ آلود ہو چکی تھیں.. حیرت انگیز طور پر آپ کی بینائی بڑھ جاتی ہے.. نظر تیز ہو جاتی ہے اور وہ اشیاء جو آؤٹ آف فوکس تھیں فوکس میں آ جاتی ہیں.. گھاس کی ہر پتی.. ہر برگ.. اور اس پر اوس کی ہر بوند ایک ہیرے کی مانند دمکتی اور اس ہیرے میں جو چمکتی کرچیاں ہیں وہ بھی الگ الگ.. اگر اس لمحے کوئی پرندہ نظر کے سامنے سے گزرتا ہے تو وہ اتنے سلوموشن میں گزرتا ہے کہ اُس کے پر بھی گنے جا سکتے ہیں.. ایک عجیب سی سنسنی بدن میں تیرنے لگتی ہے.. لیکن یہ سب کچھ پل دو پل کا

تکمیل ہوتا ہے.. ایک دوبارآنکھیں جھپکنے کی دیر ہے کہ زائل ہو جاتا ہے.. وکیل صاحب کا کہنا تھا کہ ان چند لمحوں میں آپ جو کچھ بھی اپنے خیال میں لے آئیں مکمل توجہ کے ساتھ.. جس چہرے یا جس منظر کو ذہن میں لائیں تو وہ زندہ ہو کر آپ کے حواس پر اثر انداز ہونے لگے گا. تو ان دنوں ایک بار جب میں اس یوگا ورزش کے بعد سانس کو آہستہ آہستہ خارج کرتا سیدھا کھڑا ہوا.. قدرے چکرایا تو یکدم جنیوا میونسپل کیمپنگ سے نیچے آتے ہوئے دریائے رہون کے اوپر جو راستہ تھا جس کے کناروں پر درختوں کی ٹہنیوں کی ایک حفاظتی باڑھ تھی اور اس باڑھ سے لگ کر.. میری جانب چہرہ کیے زتھ کھڑی ہوئی تھی اور میں اسے دریا کے سرد پس منظر میں دیکھ رہا تھا تو وہ ایک لمحہ یوں زندہ ہوا کہ ان چند ساعتوں میں نہ صرف میں دریائے رہون کا شور سن رہا تھا بلکہ زتھ کے گلے میں جو لاکٹ تھا اور جیسے وہ اس کے بدنی ابھار پر ادھر اُدھر ہوتا تھا اس کے سانس لینے سے اُسے دیکھتا تھا.. اور حیرت در حیرت کہ اس روز.. چالیس برس پیشتر اس کے بدن پر جو سینٹ لگا تھا اس کی مہک بھی واضح طور پر میرے نتھنوں میں آتی تھی.. اب میں نہیں جانتا کہ یہ محض میرے تصور کا کرشمہ تھا.. کوئی شعبدہ بازی تھی یا کیا تھا لیکن ایسا ہوا.. اگر یہ صرف تصور کی شعبدہ بازی تھی تو یہ تبھی جنم لیتی تھی جب میں یوگا کی وہ ورزش کرتا تھا.. میں اب بھی سیر کے بعد یہی عمل کرتا ہوں..

میرے سیر کے ساتھی مجھے ہر صبح شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جب میں سانس خارج کرتے ہوئے سیدھا ہوتا ہوں اور مسکرانے لگتا ہوں اور آمد آفتاب سے پہلے کے سرخ ہوتے آسمان میں سے گزرتے کسی پرندے کو دیکھتا ہوں اور نہ صرف ماضی کو یاد کرتا ہوں بلکہ اپنے لیے.. اپنے بچوں کے لیے اور اپنے پیاروں کے لیے ہاتھ جوڑ کر دعائیں بھی کرتا ہوں اور جب میرے دوست پوچھتے ہیں کہ چوہدری صاحب یہ آپ سورج دیوتا کی پرستش کر رہے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ ہاں چند لمحوں کے لیے ہر شخص وقتی طور پر ابراہیم ہو جاتا ہے.. تو اس شب.. لوئر شاہ جنی کی نامعلوم بلند برفانی چراگاہ میں.. اپنے خیمے میں.. واضح طور پر شاہ گوری کے بدن کی مہک میرے نتھنوں کو مہکاتی تھی.. اور وہ کبھی میری انگلیوں کی پوروں میں سے پھوٹتی تھی اور میں انہیں ناک سے لگا کر اس کی موجودگی محسوس کرتا تھا.. اور کبھی ایسا لگتا تھا کہ شاہ گوری کا انجماد میرے بدن کی گرمی سے پانیوں میں بدلتا ہے.. اور وہ سرد نہیں بلکہ نیم گرم اور مہک زدہ ہو کر میرے سلیپنگ بیگ کو گیلا کرتے ہیں..

یہ سب کچھ اپر شاہ جنی میں.. کہیں بلند برفوں کے دامن میں میرے خیمے میں ہو رہا تھا..

برسوں پہلے جو بوسے میرے وجود پر اترے تھے وہ میرے بدن کی مٹی کو گیلا کر رہے تھے اور سوکھی پیاسی مٹی پر گرنے والی بارش کی پہلی بوند کی مانند مجھے مہکا رہے تھے.. اور اس لمحے ایک زبردست اینٹی کلائمکس ہوا..

سلیم دانت نکالتا.. بے دریغ اور بے تکلف مجھ سے اجازت طلب کیے بغیر میرے خیمے میں دندناتا ہوا آ گیا..

اور میں اپنے ہی وہم اور اپنے ہی خیالوں میں تھا تو میں نے نہایت ناگواری سے کہا ''جی فرمایئے''

''فرمایئے کیا؟'' وہ ٹھٹک گیا..

''آپ کس سلسلے میں یوں دندناتے ہوئے میرے خیمے میں چلے آ رہے ہیں؟''

''چلا جاتا ہوں'' اس نے قطعی طور پر برا مانے بغیر جواب دیا.. اور جانے کو ہوا..

''سوری..'' میں نے معذرت کی.. ''لیکن خیریت ہے؟ کس سلسلے میں آئے تھے؟''

''ویسے میں تو اسی سلسلے میں آیا تھا کہ یہ خیمہ میرا ہے.. آپ کہتے ہیں تو چلا جاتا ہوں.. نو پرابلم..''

اور میں فوری طور پر وہم اور گمان کی وادیوں میں سے نکل آیا اور نہایت خجل اور شرمندہ ہوا.. دراصل اس ٹریک کے لیے میں اپنا ''پاک سرائے'' خیمہ جو تنگ نما خیمہ لایا تو تھا لیکن اس کی ایستادگی میں جو پیچیدگیاں تھیں اور پھر اس میں اُلٹے پاؤں اپنی پشت کی نمائش کرتے ہوئے اس میں داخل ہونے کی جو شرمندگیاں تھیں انہیں مدنظر رکھتے ہوئے میں نے سلیم سے درخواست کی تھی کہ وہ اس ٹریک کے دوران مجھے اپنے قدرے کشادہ اور کم پیچیدہ خیمے میں فروکش کر لیا کرے..

خیمہ اُس کا تھا اور میں پوچھ رہا تھا کہ تم کس سلسلے میں یہاں آئے ہو..

''سوری پرنس.. میں ذرا تھکاوٹ سے نڈھال تھا اور خواب و خیال کی وادیوں میں بھٹک رہا تھا.. تمہارا اپنا خیمہ ہے.. چلے آؤ..''

''سر مجھے شرمندہ تو نہ کریں'' وہ سچ مچ شرمندہ ہونے لگا ''میں چلا جاتا ہوں..؟''

''بیٹھ جاؤ..''

''بیٹھ گیا سر..'' وہ مسکراتا ہوا.. میری فاترالعقلی کو سمجھتا ہوا.. مسکراتا ہوا بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی نہایت سنجیدہ ہو گیا اور پوچھا ''عشق کیا ہے سر؟''

"میں ابھی وہیں تھا جہاں عشق ہے.."

"اور اب کہاں ہے؟"

"اب وہاں نہیں ہے جہاں تھا. تمہاری آمد سے اس کی لٹیا ڈوب گئی ہے.."

"اگر میرے جانے سے عشق کی لٹیا تیر سکتی ہے تو میں چلا جاتا ہوں"

"بیٹھے رہو.." میں اس کے لاڈ پیار سے لطف اندوز ہو رہا تھا" کیا خبریں ہیں؟"

"خبر یہ ہے کہ مجھ تک یہ اطلاع پہنچی ہے کہ ندیوں اور جھیلوں کا پانی آپ کو موافق نہیں آیا. آپ کے پیٹ میں گڑگڑ ہوتی ہے. معدہ اسے قبول نہیں کرتا تو میں اپنے ساتھ اسلام آباد سے منرل واٹر کی چند بوتلیں لے کر آیا ہوں.. میں وہ پیش کر سکتا ہوں" کیا آپ پسند فرمائیں گے؟"

"مجھے منرل واٹر ہمیشہ سے پسند ہے.. خاص طور پر کہیں بلند پہاڑوں میں.. پیش کیا جائے"

سلیم نے پیش کر دیا..

اس عام سے منرل واٹر کی تاثیر بھی الگ تھی.. اس پانی نے اپنی میدانی خصلت ترک کر دی تھی اور بلندی کی وجہ سے کہ یہاں آکسیجن کم تھی پُرخمار ہو گیا تھا..

جیسے بلندی پر پی جانے والی لسی.. پاک سرائے کے راستے میں یا فیری میڈو کے راستے میں.. محض لسی ہوتی ہے اور جب اسے میدانوں میں لاہور کے راکل پارک کے بھاوی پہلوان کی دوکان کے باہر کھڑے ہو کر پیا جاتا ہے تو اس میں خمار آ جاتا ہے..

"میں نے کہا پہلوان جی.. یہاں کیا گڑبڑ ہو رہی ہے" میاں صاحب بھی وارد ہو گئے اور ہم سے اجازت لیے بغیر ایک کونے میں فروکش ہو گئے..

ان کی غیر متوقع آمد سے خیمے میں شاہ گوری کی جتنی بھی مہک باقی تھی وہ بھی فی الفور کافور ہو گئی..

میاں صاحب بس ایسی ہی پرسنیلٹی تھے کہ یا تو وہ رہ سکتے تھے اور یا شاہ گوری.. وہ نہ صرف فروکش ہو گئے بلکہ بولنے بھی لگے" تارڑ صاحب.. جناب کیا جبر جنگ کیمپنگ سائٹ ہے.. آپ نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں.. آتے ہی خیمے میں گھس گئے ہیں اور تب سے اپنی رانوں کو تیل سے چوپڑ رہے ہیں اور خراشوں پر ڈیٹول لگا رہے ہیں.. یا ابراہیم سے منٹھی چاپی کروا رہے ہیں.. باہر آ کر دیکھیں تو سہی کیا نظارے ہیں.."

"کیا نظارے ہیں.. آپ بیان کر دیں.. رنگ میں بھنگ ڈالنے میں آپ کا جواب نہیں

تو آپ بتا دیں کہ باہر کیا نظارے ہیں.."

"جناب عالی.. یوں سمجھ لیں کہ ہم ایک بلند ہرے بھرے اور پھولوں بھرے تخت پر براجمان ہیں.. ذرا اوپر دیکھو تو برفیں ہی برفیں.. اور اس خیمے سے باہر آ کر دیکھو تو نیچے ایسا نامہ نیم گلیشیر ہے.. ایسا گلیشیر ہے کہ اُسے دیکھتے ہوئے ڈر سے روح قبض ہوتی ہے.. اور اس کے پیچھے جو پہاڑ ہیں تو گویا برف کے انبار ہیں.. ویسے یہاں آپ اور سلیم کیا گڑبڑ کر رہے ہیں.. کیا کھا پی رہے ہیں؟"

"ہم منرل واٹر پی رہے ہیں.." میں نے بھنا کر جواب دیا..

اتنی دیر میں شاہد کا سفید چرمرا ہیٹ بھی زبردستی خیمے کے اندر نازل ہو گیا.. وہ خود تو دکھائی نہ دیا صرف ایک ہیٹ اور سیاہ چشمہ اندر آ گیا".. اجازت ہے؟"

"تشریف لے آئیے"

"ویسے میں آپ حضرات کو ڈسٹرب تو نہیں کر رہا.."

"کر بھی رہے ہوں تو کون پرواہ کرتا ہے.. آپ آ جائیے"

"ویسے اگر کوئی پرائیویٹ کام ہو رہا ہے تو میں چلا جاتا ہوں"

"نہیں نہیں شاہد بھائی آپ تشریف لے آئیں.." سلیم نے بھی درخواست کی..

"نہیں اگر آپ کہتے ہیں تو.. میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا.." اُس کا سفید پلپلی ہیٹ اور سیاہ چشمہ وہیں معلق رہا..

"اوئے شاہد.. تو سیدھی طرح اندر آتا ہے کہ میں تجھے ایک گھسن پھیروں.." میاں صاحب کی طاقت برداشت جواب دے گئی..

"میاں صاحب تشدد کرنے کی کیا ضرورت ہے میں حاضر ہو جاتا ہوں.. کیوں مائی لیڈر اجازت ہے.."

شاہد بھی ایک کونے میں سمٹ گیا..

کچھ دیر ہم چپ بیٹھے رہے.. گفتگو کا تانا بانا بکھر گیا تھا.. اس خاموشی کے دوران خیمے کے باہر سے ایک شرمیلی جھجکی مسکین سی آواز آئی" سر جی میں بھی اندر آ جاؤں.. باہر اکیلا رہ گیا ہوں".. یہ حسن صاحب تھے..

کورم پورا ہو گیا..

حسن صاحب بھی سارا دن برفانی ندیوں کے پانی پیتے رہے تھے اور یہ پانی حلق میں کڑواہٹ بھرتے ہیں اور گلا سکھاتے ہیں اس لیے انہیں بھی میدانوں کا منرل واٹر پیش کیا گیا۔۔ انہوں نے دو تین گھونٹ بھرے تو ان کا حلق تر ہو گیا اور وہ بولنے لگے'' کیا بات ہے سر جی۔۔''

''کونسی بات' کیا بات ہے حسن صاحب؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔۔

''کوئی سی بھی بات ہو تو وہ بات کیا بات ہے سر جی۔۔''

''ہیں جی؟'' میں مزید حیران ہوا۔۔

''آہو جی۔۔'' حسن صاحب مزید پُرمسرت ہو گئے۔۔اُن پر واضح طور پر بلندی کا اثر ہو چکا تھا۔۔

''لیکن جناب۔۔'' شاہد نے شرارت بھرا ایک کھنگورا مارا'' آپ باہر اکیلے کیسے رہ گئے تھے۔۔''

حسن نے شاہد کے سوال پر کان نہ دھرا اور مجھی سے مخاطب رہے'' کیا بات ہے سر جی۔۔کیا کیمپنگ ہے''

''حسن صاحب'' شاہد نے پھر انہیں متوجہ کرنے کی کوشش کی۔'' میں پوچھ رہا تھا کہ آپ باہر اکیلے کیسے رہ گئے۔۔''

''کیا بات ہے۔۔'' حسن نے نہایت شانت لہجے میں کہا۔۔

شاہد اشتعال میں آ گیا'' جناب من میں پوچھ رہا ہوں کہ۔۔آپ باہر اکیلے کیسے رہ گئے تھے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ کیا بات ہے۔۔''

''شاہد صاحب'' حسن نہایت دھیمے لہجے میں بولا'' کوئی بات ہے تو میں کہہ رہا ہوں کہ کیا بات ہے۔۔تو آپ کیا بات کر رہے تھے؟''

''میں سر بکواس کر رہا تھا آپ مجھے معاف کر دیں'' شاہد نے ہیٹ اتار کر اپنے چند بال نوچنے کے بارے میں سوچا اور پھر یہ ارادہ ترک کر دیا۔۔

''نہیں نہیں شاہد جی آپ بتائیں تو سہی کہ کیا بات کر رہے تھے۔۔''

مجھے اب خدشہ ہوا کہ شاہد اپنے بال نوچنے سے باز نہیں آئے گا اس لیے میں نے دخل اندازی کر دی'' یہ پوچھ رہا ہے کہ آپ باہر اکیلے کیسے رہ گئے؟''

''چلیے میں جھک مار لیتا ہوں۔۔بتایئے'' شاہد نے زبردستی اپنے آپ کو پُرسکون کیا

''ہاں۔۔تو اکیلا میں اس لیے رہ گیا کہ عمران، طاہر اور کاظمی یہاں پہنچتے ہی سگرٹوں کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے ان کو دوبارہ بھرنے لگے اور کیمپنگ سائٹ سے دور ہو کر تخلیے میں دھواں اڑانے لگے۔۔اور ابھی تک قہقہے لگا رہے ہیں۔۔گدا اور گرد آمیز نے بھی اپنا خیمہ ہم سے ذرا فاصلے پر لگایا ہے اور وہ دونوں جوں اندر گئے ہیں ابھی تک باہر نہیں آئے تو یوں میں باہر اکیلا رہ گیا۔۔''

''تھینک یو حسن صاحب۔۔'' شاہد گفتگو سے ریٹائر ہو گیا۔۔

''ویسے تارڑ صاحب۔۔'' میاں صاحب نے عینک درست کی اور شکائت آمیز لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئے'' اس ٹریک میں ابھی تک کوئی پُشت پاڑ مزا نہیں آیا۔۔کچھ زنانہ سا ٹریک ہے۔۔

''کل علتر جھیلوں کے راستے میں جو نالہ آن پڑا تھا اور پھر یہ جو سیاہ ندیاں عبور کی ہیں اور ابھی ابھی جو یاکوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے کا پروگرام ہونے لگا تھا اس کے بارے میں آپ کی پُشت کیا کہتی ہے''

''کچھ نہیں کہتی جناب عالی۔۔بس تسلی نہیں ہوتی۔۔نہ کسی برالڈو کے اوپر معلق کوئی بی پی گیلری ہے۔۔نہ کسی بیافو گلیشیئر سے ایک کلومیٹر کی بلندی پر کوئی چٹان اور شکاری جھونپڑا ہے۔۔اور نہ کوئی برفانی پُل صراط ہے اور نہ کوئی درگوتھ کی ندیاں۔۔موت کے ساتھ دست پنجہ نہ ہو تو تسلی نہیں ہوتی مزا نہیں آتا۔۔''

شاہد اب تک بحال ہو چکا تھا اس نے دھیمے لہجے میں کہا'' نہ آپ اپنے بھائی دروازے کے کسی اکھاڑے میں اُترے ہوئے ہیں۔۔موت سے دست پنجہ لے کر اسے دھوبی پٹرہ دینا چاہتے ہیں۔۔تب آپ کی تسلی ہو گی''

''دراصل راستے میں کوئی ناپے پتھر بھی تو نہیں آئے جن پر میں اپنے آپ کو بیلنس کرتا اور تاتھئی تاتھئی کرتا۔۔'' میاں جی ذرا کھسیانے ہو گئے'' راستہ بے شک مشکل تھا لیکن جان لیوا نہ تھا اور جب تک کسی ٹریک کے دوران فوتیدگی کے امکان پیش نہ آئیں روح میں بالیدگی پیدا نہیں ہوتی۔۔''

''پرسوں ہم وزہ علتر کو عبور کریں گے تو آپ وہاں اپنی روح میں بالیدگی پیدا کر لیجیے گا''

''خطرناک ہے؟''

''خطرناک ہے؟''

''تو پھر سبحان اللہ۔۔'' میاں صاحب کی مسرت دیدنی تھی'' تیر پہ تیر چلاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے''

کہا تو یہ جاتا ہے کہ ہمہ یاراں دوزخ۔۔اور ہمہ یاراں جنت۔۔لیکن لوئر شاہتی کی خیمہ گاہ

میں کہا جا سکتا تھا کہ ہمہ یاراں ایسی بلندی.. ایسی برفیں اور ایسی چراگاہ.. سبحان اللہ.. "ویسے میاں صاحب یہ تو آپ نے درست فرمایا کہ ٹریک کے ان دو دنوں کے دوران فوری طور پر فوحیدگی کے امکان کچھ کم تھے لیکن جب دو یاکوں کا ریوڑ یکدم ڈھلوان پر سے لڑھکتا ہماری جانب آیا تھا تو تب آپ کے کیا احساسات تھے؟"

"سچی بات ہے پہلے تو سب کچھ حوش ہو گیا تھا بی پی ہو گیا تھا.. لیکن پھر میں نے ان یاکوں میں سے یاکنیاں تلاش کرنی شروع کر دیں.." میاں صاحب کو یاک سرائے کی کوئی من موہنی یاکنی یاد آ رہی تھی..

"کیوں حسن صاحب؟"

"سر کیا بات ہے.."

"کونسی بات کیا بات ہے" شاہد کے منہ سے نکل گیا..

"کوئی نہ کوئی بات تو ہے جو کیا بات ہے"

"لعنت ہے مجھ پر.." شاہد منہ پھلا کر بیٹھ گیا..

"لیکن سر عشق کیا ہے.." سلیم کی سوئی عشق پر اٹکی ہوئی تھی..

"تم چپ ہوتے ہو کہ نہیں" میں نے اُسے ڈانٹا "کیا ایک بینڈے کی طرح عشق عشق ٹرائے رہتے ہو"

"اس لیے کہ میں بھی عشق میں ایک بینڈا ہو گیا ہوں"

"یہ بینڈا کیا ہوتا ہے سر جی؟" حسن نے معصومیت سے پوچھا..

"ایک چبل.. ایک جھینگر جو سدا اترا اترا رہتا ہے.."

"کیا بات ہے سر جی.."

"کونسی بات کیا" میں نے فوراً اپنے آپ کو روک لیا لیکن حسن نہ رک سکا اور مزید معصومیت سے کہنے لگا "کوئی سی بھی بات کیا بات ہے سر جی.."

لوزرشاہنی کی برف پوش اونچائیوں پر ایک خیمے میں یہ کیا یادگار محفل تھی..

"کھانا تیار ہے صاحب.." ابراہیم کا بلاوا آ گیا..

ہم سب ہمہ یاراں جھکے جھکے خیمے سے باہر آ گئے..

اور خیمے سے باہر لوزرشاہنی کی سردرات کب سے ہماری منتظر تھی.. اس نے ہمیں اپنی

ٹھنڈک سے نیلی ہوتی بانہوں میں لے لیا..

گلیشیئر کے بلند کناروں پر براجمان ایک الاؤ کے گرد گھیرا ڈالے ہمارے پورٹر وہ پورٹر ہرگز نہ تھے جو ہم سے ناراض ناراض.. روٹھے ہوئے.. لاتعلق.. بوجھ اٹھائے ہم سے بے خبر آگے آگے چلے جاتے تھے بلکہ وہ سب کے سب ماہر رقاص اور گلوکار ہو چکے تھے.. اور اپنے اپنے محبوب سے جدائی میں آہیں بھرتے.. اُس کے حسن کی توصیف کرتے.. گلے پھاڑ پھاڑ کر گیت گاتے تھے..

کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑے پتھر کے اوپر طاہر کھڑا تھا اور ایک طویل قامت جن کی مانند کھڑا تھا اور مسلسل گلیشیئر کو گھور رہا تھا اور کاظمی قہقہے لگاتا اسے بار بار تنبیہ کر رہا تھا.. اوئے طاہر گلیشیئر کو کچھ نہ کہنا یار..

گدا اور گرد آمیز البتہ ابھی تک اپنے خیمے کی پرائیویسی میں پوشیدہ تھے..

انسان ایک عجیب نا قابل فہم جانور ہے..

آپ اس کے ہمراہ ایک عمر بتا دیتے ہیں.. طویل رفاقتوں کے دوران آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اسے جان گئے ہیں اور آپ کچھ بھی نہیں جانتے.. وہ کسی ایک لمحے گرگٹ کی طرح بنا معذرت کے ساتھ اپنا رنگ بدل لیتا ہے وہ اپنے مفادات کا حساب لگاتا ہے اور فوراً رنگ بدل کر آپ کو آپ کے ساتھیوں کو ترک کر دیتا ہے اس کے باوجود کہ آپ اس کی گمنامی کو شہرت میں بدل دیتے ہیں.. اس کی بے جا توصیف کرتے ہیں لیکن وہ اپنے حساب کتاب میں مصروف ہوتا ہے..

انسان واقعی ایک نا قابل فہم جانور ہے.. بلکہ جانور تو قابل فہم ہوتا ہے..

گدا ہمیں گرد آمیز کی خوشنودی کی خاطر ترک کر چکا تھا..

عمران ایک گنجے مکڑے کی مانند کیمرے میں سر گھسائے پورٹروں کا رقص فیتے پر اتار رہا تھا اور طاہر ابھی تک لوزرشاہنی گلیشیئر کو گھور رہا تھا اور کاظمی اب قہقہے لگانے کی بجائے نہایت سنجیدگی سے اُسے درخواست کر رہا تھا کہ یار طاہر.. گلیشیئر کو کچھ نہ کہنا.. اس کا کوئی قصور نہیں..

آج لنچ کے بعد جس بلند میدان پر ہم آئے تھے اور پھر سیاہ ندیوں تک اُترے تھے وہ نیلولاٹ کہلاتا تھا.. یہیں سے وہ برف میں سفید ہوتی گنبد نما وہ چوٹی دکھائی دی تھی جسے ڈوم کا نام دیا گیا تھا اور اس کی بلندی 5029 میٹر تھی.. یہ یہاں سے لوزرشاہنی کی خیمہ گاہ سے بھی ایک برف گنبد کی صورت آسمانوں میں اذانیں دیتی تھی..

اور جب ہم اپنے خیمے سے باہر آتے ہیں تو شاہنی گلیشیئر کے پار نہ صرف 5.260 میٹر

اونچی سینٹینل پیک یعنی محافظ چوٹی دکھائی دے رہی تھی بلکہ ہمارے سامنے 5887 میٹر بلند شاہنی چوٹی بھی اپنے سفید جوبن کے اُبھاروں کے ساتھ کھڑی تھی.. میرے جوبناں کا دیکھو اُبھار جناں.. بقول جوش.. اور اُبھار جو جوبن کے ہوتے ہیں عام اور قدرتی حالات میں دو ہوتے ہیں یہاں تین تھے.... تین سروں والی شاہنی چوٹی.. تین گنبدوں کے اُبھار والی شاہنی آسمانوں کے سامنے سینہ نہیں سینے تانے کھڑی تھی اور اس کے سفید برفیلے جوبن کا جواب نہ تھا.. اس کے برابر میں دو جڑواں چوٹیاں تھیں جنہیں جڑواں یعنی ٹوئنز ہی کہا جاتا تھا.. ان کی بلندی میں بس اتنا ہی فرق تھا جتنا کہ جڑواں بچوں کی پیدائش میں ہوتا ہے.. یعنی ایک جو پہلے پیدا ہوئی تھی 5798 میٹر اونچی تھی اور دوسری 5700 میٹر کی تھی.. یہ سات سو میٹر کا فرق اُن کی پیدائش میں وقفے کا تھا..

یہ لوئر شاہنی کا شاہانہ منظر تھا..

ویسے اس لوئر شاہنی کی ساری شہنشاہیت اور جاذبیت اور بلند برفانی تنہائی کی جاذبیت دراصل ہم سے تھی..

ہم اپنے اپنے شہروں میں.. اپنے روزمرہ کے کاموں میں اُلجھے ہوئے وہاں بھی اسی تنہائی اور جاذبیت کو اپنے اندر پوشیدہ رکھتے دبائے ہوئے زندگی کرتے ہیں اور اس کیفیت کو ایک عشق خاص کی مانند دنیا بھر سے چھپائے ہوئے رہتے ہیں..

اور یہ کیفیت یہاں لوئر شاہنی میں اس پوشیدگی سے باہر آ گئی تھی..

یہ ہم ہی تھے جو اس بلند چراگاہی خیمہ گاہ کو حسن دیتے تھے ورنہ دیکھا جائے تو لوئر شاہنی کیا تھی..

چند پتھر.. تھوڑی سی گھاس اور ایک ویران بلندی..

شاہنی پیک کے تین سفید گنبد جن کے ابھاروں میں جو نا آسودگی تھی اُسے ہم نے اپنی آنکھوں سے آسودہ کیا..

تو یہ صرف ہم تھے جو آج کی شب اس چراگاہی خیمہ گاہ کو زندگی.. رونق اور خوبصورتی عطا کرتے تھے..

ہم نے کل سویرے یہاں سے کوچ کر جانا تھا اور ہمارے بعد اس نے پھر سے بے آباد اور ویران ہو جانا تھا..

تو یہ صرف ہم تھے..

"شاہنی پیک کی تین چوٹیوں سے اُترتی برف کا آبشار.. ایک ایولانچ"

تین سروں والی شاہنی پیک ایک ترشول کی مانند شفاف گہرے سمندر نیلاہٹ آسمان میں خاموش کھڑی تھی.. ایک چُپ سکوت میں تھی.. اور ہمیں علتر گلیشیئر کے پار ایک رنگ و بو سے اٹی.. گل و گلزار ہوتی ڈھلوان میں چلتے دیکھتی تھی جب اُس کی دو چوٹیوں کے درمیان جو برفوں کا بوجھ تھا اور جانے کب سے تھا اپنے آپ کو مزید سہار نہ سکا اور شفاف گہرے سمندر نیلاہٹ آسمان کے گنبد میں ایک ملفوف گونج کے ساتھ وہ برفوں کا بوجھ ایک سفید آبشار کی مانند نیچے گرنے لگا..

اُس کی گڑگڑاہٹ اور مسلسل گونج سے پوری وادی لرزنے لگی..

ہم سب.. چلتے چلتے.. جہاں کہیں بھی تھے رک گئے اور اپنے اپنے مقام پر.. دم بخود اس برفانی آبشار کی دودھ سفیدی اور باریک پھوار کو نیچے گرتے دیکھنے لگے.. برف کا انبار دونوں چوٹیوں کے درمیان میں سے بہتا ایک خاص مقام پر پہنچ کر ایک آبشار کی صورت کرتا چلا جاتا تھا اور پھر ایک برف زار پر گر کر اس کی برفوں کو بھی اپنے آپ میں شامل کر کے ایک سفید غبار اٹھاتا نیچے گلیشیئر تک اترتا جاتا تھا.. یہ آبشار مسلسل تھی اور تھمنے میں نہ آتی تھی.. لگتا تھا کہ شاہنی پیک کی تینوں چوٹیوں پر ازل سے جو برفیں سکوت میں تھیں وہ سب کی سب اسی لمحے کی منتظر تھیں اور اب اس سفید آبشار نے تب تک گرتے جانا تھا جب تک کہ یہ تینوں چوٹیاں ننگی نہیں ہو جاتیں.. وہ برہنہ اور چٹیل ایسے ہو جائیں گی جیسے کبھی برف سے وہ آشنا ہی نہ ہوئی تھیں..

برفیں ایک مسلسل سفید دُھند کی صورت گرتی جا رہی تھیں اور ہم دم رو کے انہیں دیکھتے

جا رہے تھے.. آج کا دن..... یہ ایک ایسا کھلکھلاتا شفاف دن تھا جس کی آرزو ہر کوہ نورد کرتا ہے.. راستہ ایسا رنگ رنگ کے پھولوں سے آراستہ.. جس پر چلنے کی خواہش ہر آوارہ گرد کے دل میں کسک بھرتی ہے..

جس بلند ڈھلوان پر ہم چل رہے تھے وہ لوئر شاہی کی خیمہ گاہ کے تسلسل میں تھی اور یہاں بھی گلیشیر اور اس ڈھلوان کے درمیان میں ایک تنگ وادی تھی جس کے اونچے کناروں کے دوسری جانب گلیشیر کا پھیلاؤ پھنکارتا تھا اور اس کے پار وہی دیدہ زیب برف بھری بلند چوٹیاں تھیں جن کا تذکرہ میں کر چکا ہوں.. آسمانی درجوں پر فائز شاہی پیک پر سے ایک ایوالانچ اتر رہا تھا.. ایک برف پھوار آبشار گر رہی تھی..

یہ ایک ایسا ہی دن تھا..

اور تب ہم جان گئے تھے کہ یہ ہمارے ٹریک کا سب سے دل فریب راستہ اور بدن سے آلام اور دکھوں کی سیاہ کائی اتار دینے والا دن ہے.. آج صبح لوئر شاہی کی ڈھلوانوں پر ہم نے دیکھا کہ یاکوں کے ریوڑ اوپر بلند چراگاہوں کی جانب اپنا سفر شروع کر چکے تھے.. وہ سفید اور سیاہ دھبوں کی صورت جھاڑیوں اور گھاس میں ہولے ہولے اوپر اٹھتے جاتے تھے.. ان کے سموں سے ہلکی دھول اٹھتی تھی جو چوٹیوں سے اترتی صبح کی دھند سے ملاپ کرنے کو اوپر اٹھتی تھی..

انہی یاکوں نے سرِ شام ان ڈھلوانوں پر سے لوٹنا تھا لیکن اپنے راستے میں ان کوہ نوردوں کو نہیں پانا تھا جو خیمے سمیٹ کر کوچ کرنے کو تھے..

لوئر شاہی کی یہ چراگاہ جس میں ہم نے خیمے نصب کیے تھے کچھ کچھ ہسپر گلیشیر کے کناروں پر جو مختصر ہرے بھرے پیالہ نما جزیرے تھے اُن سے مشابہ تھی.. شائد یہ اُن جیسا ہی حسن بے مثال رکھتی ہو لیکن ماضی کی بڑی مصیبت ہوتی ہے.. یہ آنکھوں کے سامنے کی حقیقت نہیں دیکھ سکتا.. گزرے زمانوں کے خوابوں میں مبتلا رہتا ہے.. اس کی سیاہ غار میں جو کچھ چلا جائے وہ فقید المثال لگتا ہے کہ بیت چکے منظروں اور چہروں میں جدائی کے برسوں کے رنج اور انہیں پھر سے دیکھنے کی کسک شامل ہوتی ہے.. لوئر شاہی عین ممکن ہے کہ سنو لیک کی خیمہ گاہوں سے کمتر نہ ہو لیکن یہ ایک برف تنہائی کے سکوت میں ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جانے والی جگہ نہ تھی جہاں صرف اور صرف آپ کے سانس چلتے ہیں اور آپ کے قدموں کی چاپ ہے اور کچھ نہیں۔ کئی دنوں کی مسافت پر کچھ نہیں اور اشکولے بہت پیچھے رہ گیا ہے اور نگر بہت آگے کہیں ہے.. اور آپ کہاں

ہیں؟ کہیں بھی نہیں.. اوپر آسمان اور نیچے برف اور آپ چلتے چلتے جانور ہو جاتے ہیں بھیڑ یے اور مارخور ہو جاتے ہیں.. یہ ایسی تنہائی نہ تھی..

ڈھلوان بے نشان نہ تھی.. اس پر یاکوں نے راستے بنا رکھے تھے اور ہم ان کے نقش قدم پر قدم رکھتے چلتے تھے.. قافلہ ہائے رنگ و بو میں سے گزرتے چلتے تھے.. نیچے گہرائی میں گلیشیر کے کنارے کی اوٹ میں گوجروں کا ایک جھونپڑا تھا جس میں سے ایک سرخ دھبہ گوجر گرل سرخ ملبوس میں نکلی اور بلند کنارے پر چڑھنے لگی.. ہم تو اسے دیکھ رہے تھے لیکن اُس کے لیے ہمیں دیکھنا ممکن نہ تھا کیونکہ ہم گھاس اور پھولوں میں اوجھل ایک پگڈنڈی میں اوجھل تھے..

اور یہی وہ مقام تھا جب ہم ٹریک کی تمام تر دشواریاں بھلاتے.. پورٹروں کے دنگا فساد کو فراموش کرتے.. نہ جھیلوں کے راستے میں پڑتے نالے کو یاد کرتے اور نہ ہمیں روند دینے والے یاکوں سے شکائت کرتے یہاں تک کہ گدا اور گرد آمیز کے ناروا سلوک کو بھی فراموش کرتے کل دنیا کے لیے امن و آشتی اور محبت کے جذبات رکھتے چل رہے تھے جب ہماری نظروں کے سامنے شاہی پیک میں سے ایک گہری گونج کے ساتھ جنم لیتے ایوالانچ نے ہمارے قدم روک لیے.. اور ہم جہاں کہاں تھے رک گئے.. دم بخود اسے تکنے لگے..

گرد آمیز اپنے متعدد تھیلوں کی پھولا پھالی کر رہا تھا جن میں اُس کے آلات کیمرہ بازی بند تھے.. اور وہ ایک لمبے بگل نما قدرے فحش لگتے ٹیلی لینز کو اپنے کیمرے کے منہ میں گھسیڑ کر اس ایوالانچ کی تصویریں اُتارنے کو تھا..

عمران ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں دم روکے کیمرہ آن کئے بیٹھا تھا اور اس کے بغل بچے بھی سانس نہیں لے رہے تھے..

یہ ہمارا پہلا ایوالانچ نہیں تھا..

لیکن برف کے یکدم گرنے اور گونج مچانے کا ہر منظر اپنے اندر وہ سحر رکھتا ہے کہ پہلا ہی لگتا ہے..

ہم نے یہ ایوالانچ کہاں کہاں نہیں دیکھے تھے..

اور جب بھی دیکھے تھے اُن کی گونج.. سفید گرد اور ان کی پر شکوہ سفید آبشاری کیفیت نے ہمیں گرفت میں لے کر دم بخود کر دیا تھا.. جیسے ہم انہیں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہے ہوں.. یہاں کیمپ اور اس کے دوسری جانب وادیٔ روپل کے پار تاپ میدان میں گرتے نانگا پربت کے برفانی

تو دے.. کنکورڈیا کے گرد پہاڑوں کے جو آسمانی تخت تھے.. چوغولیزا.. مشابرم.. براڈپیک اور کے ٹو اُن کی برفوں کے پیچھے آنے کے منظر.. اور سنوولیک کے سفر کے دوران تو وہ بیک گراؤنڈ میوزک کا کام دیتے تھے.. کچھ لمحوں کا سکوت بھی الجھن میں مبتلا کرتا تھا کہ کوئی ایولانچ گرے تو زندگی نارمل ہو..

شاہی پیک سے گرنے والی دُھندآبشار کے حجم میں کمی آنے لگی..

آہستہ آہستہ اس کے گرنے کی گونج معدوم ہونے لگی.. اور اب صرف سفید سلوف کے بادل رہ گئے جو باریک ہوتے.. اپنے عقب میں پوشیدہ چٹانوں کو ہولے ہولے ظاہر کرتے چھٹ گئے.. پہاڑوں کا منظر اپنے ابتدائی سکوت میں چلا گیا جیسے یہاں کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو.. شاہی چوٹی.. بلکہ اس کی تینوں چوٹیوں پر اب بھی اتنی ہی برف تھی.. لگتا تھا کہ ان میں سے ایک ذرّہ بھی کم نہیں ہوا..

"کوہ قاف کے میدان میں چرتے کھلونا گھوڑے.. گھاس کے بلند تخت"

ہم پھر سے چلنے لگے..

میں کل گھوڑا ہو گیا تھا.. جب کہ مجھے خچر ہونا چاہیے تھا..

اور آج جب کہ مجھے اصول کے مطابق گھوڑا ہونا تھا میں خچر ہو گیا تھا..

البتہ میرے ساتھی نہ صرف گھوڑے بلکہ عربی گھوڑے ہو گئے تھے اور مجھ سے کہیں آگے نکل گئے تھے.. صرف سلیم تھا جو اپنے آپ پر جبر کر کے میرا ساتھ دے رہا تھا.. گردآ میز ایک پلاسٹک کی پیلی پھولی ہوئی جیکٹ میں یوں ملفوف تھا جیسے زرد ریپر میں ایک میٹھی گولی پیک کی گئی ہو.. اُس نے بالوں کی تقریباً مکمل رخصتی کو ایک نیلی پی کیپ میں پوشیدہ کر رکھا تھا اور اس کیپ کے پیچھے پر "نامی" کا لفظ سرخ دھاگے سے کاڑھا ہوا تھا..

عمران جب بھی اپنے کیمرے کا رخ اس کی جانب کرتا تو اُسے متوجہ کرنے کے لیے "نامی نامی" کہتا اور گردآ میز پیچھے مڑتا تو وہ کہتا.. ہیلو ڈیئر نامی.. گڈ بوائے.. شیک ہینڈز..

شاہی گلیشیئر ذرا پرے ہونے لگا.. یا ہم اُس سے پرے ہونے لگے اور دھیرے دھیرے آسمان کے قریب ہونے لگے..

ایک موڑ پر.. عین سامنے بلندوبالا پہاڑوں میں گھری ایک مختصر وادی دکھائی دینے لگی.. جیسے ابھی ابھی تخلیق ہوئی ہو.. اس وادی سے اوپر برفانی بلندیوں کی اوٹ میں ایک آسمانی تخت کی مانند بلند ایک وسیع اور ہرا بھرا میدان دکھائی دینے لگا.. یہ میدان وادی اور برفانی پہاڑوں کے درمیان میں معلق نظر آتا تھا.. ان دونوں سے الگ تھلگ اور تنہا..

ہم پھر رُک گئے..

یہ یقین سے ماورا ایک ایسا میدان تھا جو کوہ قاف میں بچھا تھا.. وادی سے اوپر برفوں کے سائے میں یہ ہرا ابھرا تخت کسی نا آسودہ جن نے اپنی محبوبہ کے وصل کے لیے بچھا رکھا تھا..

یہ میدان خالی نہ تھا..

اس میں گھوڑوں کے ننّھے ماڈل تھے.. یاکوں کے چند کھلونے تھے جب کبھی کوئی گھوڑا گھاس سے سر اٹھاتا تو پھر شک ہوتا کہ نہیں یہ کھلونا تو نہیں اس میں جان ہے اور یہ سچ مچ کا گھوڑا ہے جو دوری کے باعث کھلونا لگ رہا ہے.. اس دوری نے انہیں کسی مغل منی ایچر میں شکار کے منظر کے مختصر گھوڑے بنا دیا تھا.. اوپر برفیں تھیں اور اُن کے دامن میں یہ ہریاول نظر میدان نظر کا دھوکا تھا اور اس کی ہرا سمندر گھاس میں بہت دور... کچھ گھوڑے تھے.. چند یاک تھے..

ملتر پھوور ٹریک اتنا بھی معمولی اور بے رُوح نہیں تھا جتنا ہم نے سمجھ لیا تھا.. اگر اس راستے میں صرف اسی میدان کا دھوکے باز منظر ہوتا تو بھی ادھر سے گزرنا جائز ٹھہرتا..

گلگت میں اکرام بیگ کی ایک تصویری البم میں اسی میدان کی ایک تصویر میں نے دیکھی تھی.. خیموں سے آراستہ اس میدان کے پس منظر میں برف کی دیواریں تھیں اور اُس نے بتایا تھا کہ آپ ایک رات یہاں بسر کریں گے.. میں اس تصویر کو بھول چکا تھا اور اب وہ یکلخت میرے سامنے آ گئی تھی..

ازابیل نشا جس نے پاکستانیوں کو پاکستان کے راستے دکھائے ہیں لکھتی ہے..

"آپ شاہی گلیشیر کے بلند کناروں پر چلتے ہوئے تین گھنٹوں میں ابرشاہی میں پہنچتے ہیں.. ڈھلوان چراگاہوں کا ایک وسیع میدان جس میں گڈریوں کے چند بے آباد جھونپڑے ہیں.. وہاں تک پہنچنے کے لیے آپ ڈھلوان سے نیچے اترتے ہیں.. ایک ندی کو عبور کرتے ہیں اور وہاں سے سیدھا ایک عمودی بلندی پر ایک بل کھاتے راستے پر چڑھنے لگتے ہیں جہاں پھول تمہارے گھٹنوں تک آتے ہیں اور بالآخر ایک ایسے میدان میں قدم رکھتے ہیں جہاں یاکوں کے ریوڑ اور گھوڑے چرتے ہیں.. آپ کہیں بھی کیمپ کر سکتے ہیں.. وہاں شفاف ندیاں ہیں اور برف کے منجمد ستون آپ کے عین اوپر معلق ہوتے ہیں.. یہ میدان تقریباً تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے..

"ابراہیم.."

وہ بہت آگے جا چکا تھا.. لیکن میرے پکارنے پر واپس ہوا اور لڑھکتا سنبھلتا مجھ تک پہنچ

گیا اور بریک لگا کر بولا "جی صاحب.."

"وہ برفوں کے نیچے جو میدان دکھائی دے رہا ہے.. جہاں یاک اور گھوڑے چرتے ہیں.."

"جی صاحب.. ابرشاہی ہے"

"رات اُدھر کریں گے ناں؟"

"نہیں صاحب.. آگے جائیں گے"

"آگے کہاں؟"

"درہ ملتر کے نیچے جو اس کا بیس کیمپ ہے وہاں تک پہنچیں گے جناب اور وہاں رات کریں گے.."

"لیکن ٹریکنگ کی تمام کتابوں میں یہی درج ہے کہ رات ابرشاہی کے اس میدان میں کی جاتی ہے تو ہم کیوں نہیں کرتے.."

"صاحب ایسا ہی ہوتا ہے.. اور ہمیں کوئی اعتراض نہیں.. آپ لوگ گورا لوگ کے موافق نہیں چلتا.. بہت سوچ سوچ کر چلتا ہے.. تصویریں اتارتا ہے.. فلم بناتا ہے.. تو اگر ہم ابرشاہی میں رات کرتا ہے تو کل سویرے ہمیں ملتر ٹاپ کے بیس کیمپ تک پہنچتے کم از کم تین گھنٹے لگے گا.. وہاں سے ٹاپ کو پار کر کے جب ہم سرخ پتھر کیمپ تک پہنچے گا تو آپ کی رفتار سے آدھی رات ہو جائے گا.. اور اُدھر راستہ اچھا نہیں ہے.. بہت تیکھا اور اونچا ہے رات کے ٹیم گلیشیر میں گر جائے گا.."

"نہیں ابراہیم.. ہم کل بہت تیز تیز چلے گا.. کوئی ریسٹ نہیں کرے گا لیکن رات اُسی میدان میں کرے گا جس میں یاک اور گھوڑا چرتا ہے.."

"ٹھیک ہے صاحب.. ہمیں کوئی اعتراض نہیں.. یہ تو قریب ہے.. ہم ابھی اُدھر جا کرے گا.. لیکن پھر ٹریک میں ایک اور دن لگے گا.. رات کو نہیں چلے گا اور ایک اور دن کا مزدوری بھی بڑھ جائے گا کیا کہتا ہے کہ پھر چلے؟"

مجھے تو مزدوری بھی منظور تھی..

لیکن کوہ نوردی میں فوری جذبات اور خواہشوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا.. میں نے جیپ ڈرائیوروں کو پورے پانچ روز بعد وادیٔ اشکومن کے گاؤں پھوور میں پہنچ جانے کے لیے کہہ رکھا تھا.. انہوں نے وہاں پہنچنا تھا اور ہمیں وہاں موجود نہ پا کر واپس گلگت چلے جانا تھا.. ہم اگر ایک روز کی تاخیر سے پہنچتے تھے تو اگلے روز کسی اور سواری کا بندوبست بھی ہو سکتا تھا.. لیکن ہم نے

ڈرائیوروں کو کچھ رقم پیشگی بھی ادا کر دی تھی.. اور شائد ہمیں اگلے روز کوئی سواری نہ ملتی..

کیا یہ میدان نظر کے سامنے.. دور سے دکھتا.. کوہ قاف کے دامن میں.. وادی پر معلق ایک ہرا بھرا بے یقین کر دینے والا میدان جس پر برفوں کے منجمد ستون جھکے ہوئے تھے ایسے کہ وہ اُس پر گر بھی سکتے تھے اور اس میں گھوڑوں اور یاکوں کے کھلونے گھاس میں تھوتھنیاں دیئے مختصر مجسمے تھے.. اور اس کی ہوائیں بھی الگ ہوں گی اور ان میں سانس لیتے ہوئے برف کی کرچیاں بھی بدن میں اترتی ہوں گی.. برفیلی سرد یلی بدن کو کاٹتی اور پھر گھاس پر پھیلتی اُس کی ایک ایک پتی کو سرد کرتی کنواری، چھلکتی سرد ہوائیں..

کیا یہاں سے.. اس ڈھلوان سے نیچے اترنا.. وہ جو برفانی ندی نیچے وادی میں بہہ رہی ہے اسے عبور کرنا.. پھر سے اوپر چڑھنا.. بلند ہوتے جانا اور وہاں تک پہنچ جانا جہاں یہ سر سبز تخت بچھا ہے اور وہاں برف ستونوں کے دامن میں خیمہ لگا کر اس منظر کا ایک حصہ بن جانا.. کیا یہ اس لائق تھا کہ پکھورا میں ہماری منتظر جیپیں ہمیں وصول کیے بنا واپس ہو جائیں اور ہم وہاں جانے کب تک کسی سواری کی آس میں پڑے رہیں اور ہماری پیشگی رقم بھی ضائع ہو جائے..

یقیناً یہ سب کچھ اس لائق تھا..

لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ کوہ نوردی میں فوری جذبات اور خواہشوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا.. کہیں بلند پہاڑوں میں اگرچہ عمومی تاثر تو یہی ہے کہ آپ آزاد اور بے پرواہ ہو جاتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوتا وہاں نیچے کی دنیا کی نسبت کہیں زیادہ پریکٹیکل ہونا پڑتا ہے.. دیکھ بھال کر سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے.. حساب کتاب مسلسل کرنا پڑتا ہے کہ اتنے دنوں کا راشن ہے.. اتنی ہمت ہے.. پورٹروں کے ساتھ کیا طے ہوا ہے.. ایک لہر میں.. ایک موج میں.. من کی موج میں.. ایک ترنگ میں اپنے طے شدہ منصوبے سے یکدم انحراف نہیں کر سکتے.. کوہ نوردی کے مذہب میں بھی کچھ بنیادی رکن ہوتے ہیں جن سے انحراف پر آپ مرتد ہو جاتے ہیں.. بھٹک جاتے ہیں..

''ابراہیم کیا تمہیں یقین ہے کہ اگر ہم اُس میدان میں رات کرتے ہیں تو کل اپنی اگلی خیمہ گاہ سُرخ پتھر تک.. شام تک نہیں پہنچ سکتے.. ٹریک میں ایک اور دن کا اضافہ ہو جائے گا؟''

''ہاں صاحب..''

''تو پھر چلے چلو ابراہیم.. گھاس کے ایک بلند تخت.. کچھ برفوں.. چند یاکوں اور گھوڑوں کے لیے ایسا کرنا حماقت ہوگا..''

''ٹھیک ہے صاحب..'' وہ لڑھکتا ہوا پھر آگے چلا گیا..

میں نے اگرچہ کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن میں چلتے چلتے ٹھوکریں کھاتا تھا کہ میں اپنا راستہ نہیں دیکھتا تھا اس معلق ہرے بھرے تخت کو دیکھتا تھا جس پر براجمان ہونا میرے نصیب میں نہ تھا..

ازابیل نشاء نے بھی لکھا تھا کہ اگر آپ اس میدان کی جانب نہیں جاتے اور درہ ملتر کا رخ کر لیتے ہیں تو یہ ایک ایسا راستہ ہے جو خوش نظر نہیں اور اس پر صرف گدھے چلتے ہیں..

چنانچہ ہم بھی چلنے لگے.. اور ہم کیسے شاندار گدھے تھے جو کوہ قاف کی بجائے کسی اور جانب تھوتھنیاں اٹھائے چلنے لگے تھے..

ہم ڈھلوان سے اُترتے گئے اور وہ میدان ہم سے اونچا ہوتا گیا یہاں تک کہ اس کی گھنی ہریاول اور اس میں چرتے یاک اور گھوڑے روپوش ہو گئے اور صرف اس کی چٹانی ڈھلوانیں سامنے رہ گئیں جن کے دامن میں وہ ندی بہتی تھی.. اور اس ندی کو ہمارے دو پورٹر عبور کرنے کی کوشش میں تھے کہ وہ اپنے تئیں اپر شاہجی کو جاتے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ ہم اس کی خواہش کو ترک کر چکے ہیں.. ابراہیم نے سیٹیاں بجا کر انہیں متوجہ کیا اور اشارے سے بتایا کہ اُدھر نہیں جانا.. درّہ ملتر کے بیس کیمپ کی چڑھائی کی طرف آ جانا ہے..

ابھی میں اُس میدان سے جدائی کے سوگ میں تھا.. کہ سلیم جو بہت دیر سے چُپ چلا آتا تھا میرے کندھے سے جھانکتا ہوا بولا ''سر آپ اپنی بُڈھی سے مطمئن ہیں؟''

''بڈھی؟''

''بڈھی.. آپ کی بیگم.. ہماری بھرجائی..''

اہلِ لاہور کے اس کھردرے اور بدتمیز اظہار سے میں کبھی مفاہمت نہیں کر پایا کہ وہ اپنی بیگم کو بڈھی کہتے ہیں..

کیا ایک ایسی خاتون کو جو بے شک مین ایجر ہو لیکن آپ کی بیوی ہو اُسے بڈھی کہہ کر اس کے بستر میں شریک ہو سکتے ہیں..

''یار ابھی تو یہ عشق کیا ہے والا مسئلہ طے نہیں ہوا اور اب یہ.. بڈھی کا سوال آ گیا ہے''

''یہ دونوں سوال آپس میں جُڑے ہوئے ہیں سر.. اگر آپ اپنی بڈھی سے مطمئن ہیں تو پھر عشق کیسے کریں گے.. نہیں سمجھے؟''

''سمجھ تو گیا ہوں لیکن یہ سوال ہرگز جڑے ہوئے نہیں ہیں.. ایک اپنی بڈھی سے مطمئن

شخص بھی دماغ کے اس خلل میں مبتلا ہو سکتا ہے..تم بتاؤ؟''

''میں بھی مطمئن ہوں..''

''تو پھر کیوں پوچھتے ہو؟''

''یونہی''

''پھر بھی..''

''میری بڈھی ڈاکٹر ہے..بڑی قابل قسم کی..اور دیگر ڈاکٹروں کی مانند بے حد پریکٹیکل ہے اور اس میں حس مزاح بالکل نہیں ہے اور میں ٹھہرا پکا لاہوریا تو مجھ میں کچھ مزاق کرنے کی پیدائشی عادت ہے..تو ابھی ہماری شادی کو چند روز گزرے تھے میں اپنی پرانی کار میں اسے بٹھا کر سیر کے لیے لے گیا..ایک ٹریفک لائٹ سرخ ہوئی تو میں رُک گیا..برابر میں ایک اور کار آ کھڑی ہوئی جس میں ایک نو بیاہتا جوڑا تھا..میری بڈھی کہنے لگی'' ذرا دیکھو ان کی کار تو نئے نویلے ماڈل کی ہے..''میں نے کہہ دیا کہ اس کی بڈھی بھی تو دیکھو کتنی خوبصورت ہے..''

''نہائت واہیات بات کی تم نے..پھر کیا ہوا؟'' سانس اگرچہ پھولتا تھا لیکن میں اپنی ہنسی روک نہ سکا..

''بس وہ ناراض ہو گئی..منہ پھلا کر روٹھ گئی..بڑی مشکل سے منایا کہ جان میں تو مذاق کر رہا تھا..ایک مرتبہ وارڈ ڈیوٹی کرنے کے بعد گھر واپس آئی تو بے حد خوش تھی..چہکتی ہوئی تھی..کہنے لگی..تمہیں پتہ ہے آج جب میں وارڈ میں داخل ہوئی تو تمام مریض میری جانب متوجہ ہو گئے اور ان میں سے ایک کہنے لگا..'' ڈاکٹر صاحب آپ کتنی خوبصورت ہیں''..سلیم رُک گیا..میری خاطر کہ میں سانس درست کرنا چاہ رہا تھا..

''تو پھر..''

''تو پھر سر..میری تو کُتی زبان ہے میں نے ہنس کر کہا..اچھا اچھا آج پاگلوں کے وارڈ میں تمہاری ڈیوٹی تھی..''

''مجھے شرم آ رہی ہے کہ تم جیسے لوگ میرے دوست ہیں..''

''مجھے بھی شرم تو بہت آئی لیکن زبان پر اختیار نہیں تھا..میری بڈھی پھر ناراض ہو گئی..لیکن آہستہ آہستہ اُسے عادت ہو گئی..بُرا تو اب بھی مان جاتی ہے لیکن بائیکاٹ نہیں کرتی..آپ جانتے ہیں کہ اس عمر میں بڈھی بائیکاٹ کر دے تو..بُرا حال ہوتا ہے..آپ کی عمر میں کر دے تو آپ رب کا شکر ادا کرتے ہیں''

''صحیح..میری عمر میں بڈھی بائیکاٹ کر دے تو عزت رہ جاتی ہے..مطمئن اور نا مطمئن کی کیفیت تو پچھلے زمانوں کی بات ہے..اب تو پانی سر سے گزر چکا..ویسے ہم بے دھیانی میں چل رہے ہیں..تم ذرا دھیان سے اس ندی کو عبور کرو..''ہم ڈھلوان کے دامن میں پہنچ چکے تھے جہاں ایک واجبی سی ندی ہمارے راستے میں آ گئی تھی..اسے شاہد اور میاں صاحب کب کے پار کر چکے تھے اور حسن صاحب اس کے پار جانے کے لیے پر تول رہے تھے..

اور اس لمحے جب ہم نے حسن صاحب کو اس ندی کو پرکھتے اور پر تولتے دیکھا تو اس سے اگلے لمحے انہوں نے پانیوں میں ابھرے ہوئے ایک پتھر پر پاؤں جمائے..پھر دوسرا قدم رکھا اور پھر جانے کیا ہوا..وہ جو پر تولتے تھے ان میں توازن نہ رہا اور وہ منہ کے بل ندی میں گر گئے..

یہ زیادہ سے زیادہ بالشت بھر پانی کی ندی ہوگی..اس میں اتنا پانی تو نہ تھا کہ حسن اس میں ڈوب جاتے یا بہہ جاتے اس لیے ہمیں قطعی تشویش نہ ہوئی اور ہم کولہوں پر ہاتھ رکھے اس کے گرد کھڑے اس کے اٹھنے کے منتظر رہے..جب وہ نہ اٹھا اور اس کے بال پانی میں تیرتے رہے تو پھر ہمیں تشویش ہوئی..کہ کہیں خدانخواستہ اس کی کنپٹی پر چوٹ تو نہیں لگ گئی..ابھی اس تشویش کا آغاز ہی ہوا تھا کہ وہ کمر پر ہاتھ رکھے ہائے ہائے کرتا اُٹھ کھڑا ہوا..اس کے بازوؤں اور پنڈلیوں پر خون آلود خراشیں تھیں لیکن وہ مزید کراہنے کی بجائے مسکرا رہا تھا..

یہ ایک ایسی ندی نہ تھی جسے پار کرتے ہوئے گرنے کا کوئی بھی امکان ہو سکتا تھا..نہ اس کے پانی ٹخنوں سے اوپر آتے تھے اور نہ ان میں بہا لے جانے والا زور تھا اور اس کے باوجود کسی ایک پتھر پر جمی کائی پر اس کا پاؤں پھسل گیا تھا..ہم اس سے کہیں تند و تیز اور گہری سینکڑوں ندیاں عبور کر چکے تھے..وہاں یہ پاؤں پھسلتا تو بیڑہ پار ہونے کی بجائے غرق ہو جاتا..شمال میں ایک بڑا ڈر یہی ہوتا ہے کہ آپ بے شک ورگوتھ اور سیاہ ندیاں عبور کر جائیں..سنو لیک پار کر جائیں لیکن ان راستوں میں کوئی ایک پتھر ایسا ہوتا ہے جس پر پاؤں رکھنے سے آپ اجل کی لپیٹ میں چلے جاتے ہیں..بس اسی نامعلوم پتھر سے ڈرنا چاہیے..

حسن کی خراشوں پر فوراً ڈیٹول کا پھریرا کیا گیا اور پھر اس کے ہاتھ میں جو کیمرہ ہوا کرتا تھا اسے پانیوں سے دستیاب کیا گیا بلکہ وہ دو تین ٹکڑوں میں دستیاب ہوا..اور سفر پھر سے شروع ہو گیا..

ہم ڈھلوان سے اُتر آئے تھے اور اب سامنے کچھ بڑے بڑے پتھر تھے..جھاڑیاں اور

ریت تھی اور چند معمولی نوعیت کی ندیاں تھیں اور ان کے آخر میں ایک زبردست چڑھائی دکھائی دے رہی تھی جس کی آخری منزل پر ایک پورٹر اٹکا ہوا نظر آتا تھا.. وہ شائد ہمیں دیکھ رہا تھا یہ تسلی کرنے کے لیے کہ کہیں ہم کسی اور جانب نہ نکل جائیں.. چڑھائی آئی کہ بس اجل آئی.. میں نے اپنی ہمت آپ بندھائی اور ہر دو قدم پر رُکتا سرد مگر آکسیجن سے خالی ہوا کو اپنے اندر کھینچتا اوپر چڑھنے لگا.. البتہ میرے یاران تیز گام نے پورٹر کو جا لیا.. اس چڑھائی میں البتہ کوئی خدشہ نہ تھا بس خلا میں اُٹھتی ہوئی ایک سیڑھی تھی اور وہاں چھاؤں بھی تھی.. اوپر چوٹی پر دھوپ کی سفیدی تھی.. اور جب میں ہونکتا ہوا وہاں پہنچا ہوں تو کیا کُھلا اور پہاڑوں کی بلندیوں اور برفوں کے نشے میں گم ایک منظر آس پاس تھا.. قافلہ لنچ کے لیے رُکا ہوا تھا..

اور ہم کہاں پہنچے تھے..

دو کوہ قاف کا تخت میدان اور اُس میں چرتے یاک اور گھوڑے جو وادی میں اُترنے سے بلندی پر رہ گئے تھے اور ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے.. اب ایک مرتبہ پھر ہماری آنکھوں کے سامنے نمودار ہو گئے تھے کہ ہم چڑھائی چڑھ کر اس میدان کی سطح پر آ گئے تھے.. لیکن اب وہ منظر بہت پیچھے رہ گیا تھا..

شاہی پیک کی برفیں خاموش تھیں اور اس کے تین ابھاروں پر جمی برف کا کوئی ارادہ نہ تھا کہ وہ ایک آبشار کی صورت نیچے گرنے لگے..

ہم سب تیز دھوپ میں تھے اور نیچے جو وادی تھی اور اس میں جو ندیاں تھیں وہ چھاؤں میں اُترتی سرد ہو رہی تھیں..

ابراہیم نے یہاں باورچی ہونے کا حق ادا کر دیا.. پہاڑوں میں گھری اس نسبتاً ہموار سطح پر اس نے ہمیں آلو کے گرم گرم قتلے.. نمک اور کالی مرچ چھڑک کر.. ٹماٹو کیچپ ان پر انڈیل کر پیش کیے.. اتنے گرم کہ ہمارے لب جلنے کو آئے.. پھر سوپ پلایا اور آخر میں وہی کریکر پنیر اور مچھلی.. اور اگر کوئی کافی کا شوقین ہے تو کافی بھی.. لنچ سے فارغ ہو کر میں نے ایک سگرٹ سلگایا.. اُس کے زہر آلود دھوئیں سے لطف اندوز ہوا اور پھر ایک نیلی ترپال پر لیٹ کر چہرے کو دھوپ سے بچانے کی خاطر اسے فلسطینی رومال سے ڈھک لیا اور اونگھنے لگا.. دیر تک لیٹا رہا.. گھاس کی سرد مہک.. ٹانگوں میں تھکاوٹ کے درد کا سرور.. تازگی بھری سرد ہوا.. میں دیر تک لیٹا رہا.. اور جب میں نے اپنے چہرے سے فلسطینی رومال اٹھایا تو کوچ کا عمل شروع ہو چکا تھا..

"گدھے ہمارے بھائی ہیں.. اور تین بندر.. اور یاک.. جنہیں ایک ہیئر کٹ کی شدید ضرورت تھی"

پورٹر ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے..

میرے ساتھی منزلیں مارتے کہیں اوپر جا چکے تھے.. اور وہاں صرف میں تھا.. عمران اپنے کیمرے کو ایک راکٹ لانچر کی طرح تھامے کھڑا تھا.. ایک پورٹر تھا اور ایک گدھا تھا..

"سر..." اس نے ایک بھاری پتھر میری جیب میں ڈال دیا.. اتنا بھاری کہ اگر میں اپنی سفری پتلون کے کان نہ تھام لیتا تو وہ اس کے بوجھ سے میرے پاؤں پر گر جاتی.. گر جاتی تو کتنی شرمندگی ہوتی.. مجھے بھی اور دیکھنے والوں کو بھی.. یہ پتھر دراصل ہانگ کانگ سے درآمد شدہ ایک نہائت حساس اور دُور رس نتائج کا حامل مائک تھا.. "سر آج سارا دن آپ فارغ رہے ہیں.. تھوڑی سی ریکارڈنگ کر لیں.. آپ اس گدھے اور پورٹر کے ساتھ ساتھ اوپر چڑھتے جائیں اور باتیں کرتے جائیں.."

"گدھے کے ساتھ؟"

"بے شک گدھے کے ساتھ بھی.. جو جی میں آئے کہتے جائیں.. خود کلامی کرتے رہیں اپنا حال زار بیان کریں.. آس پاس کے منظر کو بیان کریں.. یہ مائک ریکارڈ کرتا جائے گا اور مجھے فراموش کر دیں میں جہاں بھی ہوں گا آپ کو شوٹ کرتا جاؤں گا.."

"او کے باس.." میں نے سرکس کے ایک مسخرے کی طرح ذرا جھوم کر اسے سیلوٹ کیا..

اس نے میرے سیلوٹ کا جواب نہ دیا اور اپنے مونڈھے ہوئے دھڑ کو نے سر کو ذرا سا خم دے کر کاٹھی

اور طاہر کو اشارہ کیا اور پھر وہ تینوں بندر ہو گئے..جی ہاں موکلیز..وہ تینوں اُچھلتے کودتے کیمرے.. بیٹریاں اور تاریں سنبھالتے بڑے بڑے پتھروں کو پھلانگتے چند لمحوں میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئے..اور پھر تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک وسیع کھائی کے پار چٹانوں میں کیمرہ فٹ کئے مجھے اشارے کر رہے ہیں کہ شروع ہو جاؤ..ان کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی..وہ اتنی دور تھے..عمران ایک پیدائشی کیمرہ مین تھا..وہ محض منظر کو کبھی نہیں دیکھتا تھا بلکہ اُس مقام کی تلاش میں رہتا تھا جہاں سے اس منظر کو بہترین زاویے سے فلم بند کیا جا سکتا تھا..اسی لیے اس نے اس ٹی سٹاپ پر پہنچتے ہی یہ بھانپ لیا تھا کہ اگر میں اس چڑھائی پر تارڑ اور گدھے کو چلاتا ہوں تو اُدھر کھائی کے پار ایک ایسا مقام ہے جہاں سے میں اس پوری وادی کے پھیلاؤ اور اس میں رینگتے اس تارڑ اور اس گدھے کو بہترین زاویوں سے شوٹ کر سکتا ہوں..

وہ تینوں بندر اُچھل اُچھل کر مجھے اشارے کر رہے تھے کہ چلو چلو..

''باندر کے بچے..''میں بُڑبُڑایا''بندے کو باندر ہی نہیں سمجھتے اپنی طرح کا چڑی باندر سمجھتے ہیں..''

اس بُڑبُڑاہٹ کے خاتمے سے پہلے ہی مجھے احساس ہوا کہ غلطی ہو گئی ہے..میری جیب میں جو بھاری پتھر مائک ہے وہ میری ہر قسم کی بُڑبُڑاہٹ باندر نمبر ون تک پہنچا رہا ہے اور اُس شام اس نے قہقہے لگاتے ہوئے مجھے بتا دیا تھا کہ سر جی جو کچھ آپ ہمارے بارے میں فرما رہے تھے وہ ہم سُن رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے..ویسے ہم تو باندر ہیں لیکن دور سے آپ جو کچھ لگ رہے تھے وہ ہم نہیں بتائیں گے..

تینوں حضرات اُچھل اُچھل کر اشارے کیے چلے جا رہے تھے کہ چلو چلو..

چنانچہ میں نے پورٹر کو اشارہ کیا کہ گدھا سٹارٹ کیا جائے اور پھر اس کے متحرک ہونے پر اس کے پہلو بہ پہلو مختصر بیگ اٹھائے واکنگ سٹک ٹیکتا چلنے لگا بلکہ چڑھنے لگا..اور حسب ہدایت خود کلامی میں محو ہو گیا..میں جو جی میں آ رہا تھا کہہ رہا تھا..اور ہانپتا لرزتا کہہ رہا تھا..چڑھائی ذرا دشوار تھی..اور جو کہہ رہا تھا حیرت در حیرت بزبان انگریزی کہہ رہا تھا..اور انگریزی بھی ایسی کہ اہل فرنگ بھی دنگ رہ جائیں اور صدمے سے گڈ مین ڈی لائنین ہو جائیں..

''ہو ہو.....''میں اپنے آپ سے بلکہ جیب میں رکھے مائک سے کہہ رہا تھا جس کے

وزن سے میری پتلون کا دایاں حصہ کئی کھاتا نیچے چلا جا رہا تھا''ہو ہو تارڑ جی..تم کہاں ہو..اور کیوں ہو لیکن یار بلتر جھیلیں بھی کیا جھیلیں تھیں ڈوب مرنے کو جی چاہتا تھا..لیکن ڈوبنے کے لیے شرط یہ ہے کہ ایک عدد شاہ گوری جل پری تمہارے عشق میں فنا ہو کر تمہارے ساتھ ڈوبنے پر آمادہ ہو جائے..یار ہم دونوں کے ڈوبنے کا کیا منظر ہوگا..وہ بدن..ایک بھالو بدن جس کا کچھ حصہ سفید اور گلابی..اور بقیہ براؤن ہی براؤن..اور اس کے ہمراہ ایک جل پری اپنی پُوشل ہلاتی ہوئی ان چھاتیوں کے ساتھ جو سلطنتیں الٹ دیتی ہیں..اُس کی لمبی گداز ٹانگیں پانی کے رنگوں کے ساتھ رنگ بدلتیں..لیکن نہیں..سوری جل پری کی ٹانگیں تو نہیں ہوتیں پُوشل ہوتی ہے اور ڈیم اٹ جل پری میرے ساتھ کیسے ڈوب سکتی ہے وہ تو تیر سکتی ہے اور پانی کی مخلوق ہے..تو چلیے ہم اکیلے ہی ڈوب جاتے..اور اب میں کہاں ہوں..ایک گدھے کے ہمراہ جس کا پورٹر آگے نکل چکا تھا..ہیلو ڈنگی (میں گدھے کے کان پکڑ کر اس ساتھ فرینڈلی ہوتا ہوں) ہاؤ آر یو مائی فرینڈ..تم مجھے گدھے دکھائی دے رہے ہو تو میں تمہیں کیا دکھائی دے رہا ہوں..(گدھا جواب نہیں دیتا) تم تو مجبوراً یہاں آئے ہو اپنی پیٹ کی خاطر لیکن میں اپنی من مرضی سے یہاں آیا ہوں یعنی گدھا تو میں ہوا..ہیلو ڈنگی ڈیئر کیا ٹائم ہوگا؟ میرا خیال ہے دو کے لگ بھگ ہوگا..اس وقت میرے بال بچے دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر لیونگ روم میں ایک دوسرے کے ساتھ چہلیں کر رہے ہوں گے..شائد کسی کو میرا خیال بھی آ جائے کہ ابو اس وقت کہاں ہوں گے..سلجوق کہتا ہوگا کہ میں پاکستان فارن سروس کا ایک معزز ڈپلومیٹ ہوں اور ذرا دیکھیے میرے والد صاحب اس عمر میں کیا حرکتیں کر رہے ہیں..اور ڈاکٹر عینی نے فوراً حساب کتاب کیا ہوگا کہ ڈیڈی پتہ نہیں ہائی بلڈ پریشر کی گولیاں روزانہ کھا رہے ہیں یا نہیں..اسے کیا پتہ کہ میں اس سے کتنا ہائی ہو رہا ہوں..شاہنی پیک اور سپینٹیل پیک جتنا ہائی تو پھر میرا بلڈ پریشر کیا ہوا.....ہائی ہائی..ہیلو ڈنگی کیا تم سن رہے ہو..نہیں نہیں عمران تم سے نہیں کہہ رہا..سنو میری ایک کتاب کا نام ہے''گدھے ہمارے بھائی ہیں''..تو تم ہمارے برادر ہو..کوئی بات کرو یار...''بول بول کر میرا سانس اُکھڑنے لگا اور میں اس لایعنی خود کلامی سے تنگ آ گیا اور میں نے مائک کی جانب جھک کر کہا''اوئے عمران کے بچے..اگر تم سن رہے ہو تو سن لو کہ بلندی کی وجہ سے اور اپنی عمر کی وجہ سے میں اب مزید بکواس نہیں کر سکتا..شوٹنگ پیک اپ''

میں اور گدھا خاصی بلندی پر آن پہنچے تھے..ڈھلوان ختم ہو گئی تھی اور ہمارے سامنے

کہیں بلند پہاڑوں میں گھرا ایک پیالہ نما میدان تھا جس کے چاروں کناروں پر نیلی چٹانوں کی دیواریں تھیں اور برفیلے لبادوں والے پہرے دار کھڑے تھے.. میدان میں کہیں سفید پتھر جمے ہوئے تھے اور کہیں گھاس بلند ہوتی تھی.. کہیں ٹیلوں کی اونچ نیچ تھی.. اور یہ منظر اتنا وسیع اور آسمان کی ہمسائیگی میں تھا اور اتنا اَن چھوا اور دنیا جہان سے الگ تھلگ اور بلند تھا اور اُس لمحے اُس میں صرف میں تھا اور گدھا تھا اور میرا جی چاہا کہ میں اپنی جیب میں بھاری ہوتے مائک کو نکال کر منہ کے قریب کروں اور زور زور سے پکاروں.. شکریہ اللہ جی.. ہائے اللہ جی یہ آپ نے مجھے کیا دکھا دیا ہے.. شائد اللہ جی سُن لیں..

یہ منظر یہ پھیلاؤ.. برفانی قربتوں کی گود میں.. جب کہ سورج ڈھلتا تھا.. سردی بڑھتی تھی اور کہیں نیچے لوئر شاہی میں یاکوں کے ریوڑ دھول اڑاتے وادی میں اترتے تھے.. یہ منظر کوہ نوردی کے جنون کے لیے قدرت کی جانب سے ایک اور تحفہ تھا.. شکریہ اللہ جی!

ہم بلند تھے..

پہلے لاہور سے گلگت تک کسی قدر بلند ہوئے.. پھر وادی ہلتر میں اور بلند ہوئے.. جھیلیں تقریباً وادی کی سطح پر ہی واقع تھیں.. ان کے بعد البتہ ہم لوئر شاہی میں آسمان کے نزدیک ہوئے.. اور اب وہ قربت تقریباً وصال کو جنم دے رہی تھی اور ہم اس پیالہ نما حیرت میں اُسے چھونے کو تھے.... سردی بڑھتی تھی اور ڈھلتے سورج کی سرد تر شعاعوں میں ہر شے سنہری ہو رہی تھی.. اور یہ سب بندوبست بلکہ گڈ بندوبست اس کوہ نورد کا منتظر تھا جو ایک گدھے سے باتیں کرتا یہاں تک پہنچ گیا تھا.. یہی لگتا تھا کہ ہم دونوں.. وہ پہلے ملاح ہیں جو ڈوبتے تیرتے اس ویران جزیرے میں آنکلے ہیں.. پہاڑوں کی اس وسیع جھولی میں آگئے ہیں..

میں رُک گیا کیونکہ میں بے پناہ تھکاوٹ میں چُور چُور ہو رہا تھا.. اور یوں بھی بلندی کا وہ برفانی اور آسمانی طلسم مجھ پر اثر کر رہا تھا.. وہ شاہ گوریاں میرے دل کو روکتی تھیں..

میں رُک گیا اور گدھا آگے نکل گیا..

اب میں تنہا تھا..

میرے چہرے پر وہی حماقت آمیز مسکراہٹ منجمد تھی جو فاتر العقل لوگوں کا خاصا ہوتی ہے.. اور یہ مسکراہٹ کوئی ایک بار میرے لبوں پر بے اختیار ہوئی تھی.. کوئی ایک بار میں نے حواس کھوئے تھے کہ ان کی تفصیل بیان کروں..

میں گہرے سانس لے رہا تھا اور آنکھوں کو برفوں، بلندیوں اور آسمانوں کی نیلاہٹ اور پیالہ نما میدان سے بھر رہا تھا..

میں ابھی تنہا تھا.. اور ابھی کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ فاصلے پر ایک ٹیلے کی اوٹ میں چند یاک گردنیں جھکائے ساکت کھڑے ہیں.. ان کے لامبے لٹکتے ہوئے گھنے بال ایک عرصے سے کنگھی پٹی سے نا آشنا تھے.. انہیں کسی ہیئر ڈریسر کی خدمات کی شدید ضرورت تھی..

میں نے ان کی موجودگی کو ناپسند کیا کہ انہوں نے مکمل تنہائی اور برفیلی بلندی پر میری پرائیویسی کو مجروح کیا تھا.. ابھی میں اس مجروحیت کے ماتم میں تھا کہ تینوں بندر بچے اُچھلتے کودتے کہیں سے نمودار ہو گئے..

''واہ تارڑ صاحب..'' عمران باچھیں کھلاتا میری جانب آ رہا تھا..

''واہ جی واہ سر..'' کاظمی نے اگرچہ جبر کر کے اپنے قہقہے کو روکا لیکن باچھیں اس کی بھی کھلی ہوئی تھیں..

''کیا پرفارمنس دی ہے سر.. لونگ شاٹ میں گدھا اور آپ..'' عمران رواں ہو گیا.. اور وہ مجھے بُرا لگ رہا تھا کہ میں ان پہاڑوں میں کھویا ہوا گمشدہ تھا اور کسی سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا نہ کچھ سننا چاہتا تھا'' برفیں ہی برفیں اور ان کے دامن میں ایک ڈھلوان پر لونگ شاٹ میں کچھ حرکت کر رہا ہے پھر میں زوم اِن کرتا ہوں تو آپ گدھے کا کان پکڑ کر اس سے باتیں کرنے میں مشغول ہیں.. جل پریوں.. شاہ گوریوں اور ہلتر جھیلوں کی باتیں.. سر جی یہ ایسا شاٹ ہے کہ نیشنل جیوگرافک چینل پر چلے گا اور تہلکہ مچا دے گا.. کیا میں آپ کو چوم سکتا ہوں''

میں نے ذرا غور سے اور تشویش سے اپنی جانب بڑھتے عمران کو دیکھا.. نیکر ٹوٹا.. چھدری داڑھی.. مونڈھا ہوا دھڑکوتا سر اور دبیز شیشوں کی عینک.. میں نے ہاتھ آگے کر دیا'' میرا خیال ہے کہ تم یہ اظہار مسرت رہنے دو.. میں اسے زیادہ پسند نہیں کروں گا۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ اس دوران تم نے کچھ سگرٹ بھی پھونکے ہیں۔''

''نہ پھونکتے سر جی تو اتنے ایکٹو کیسے ہوتے.. اس پورے علاقے میں کھائیاں اور برفیں پار کرتے چوٹیوں پر پہنچتے.. پتھروں کو پھلانگتے آپ کی نظروں سے اوجھل ہم آپ کو شوٹ کرتے رہے ہیں تو کیسے کرتے رہے ہیں.. دھوئیں کے زور سے..''

تمام پورٹر اور ہمارے ساتھی آگے جا چکے تھے..

''کہیں بلند پہاڑوں میں ..رسول حمزہ توف مر چکا ہے''

دن ڈھل رہا تھا..

نیچے میدانوں میں پرندے اپنے گھونسلوں کی جانب لوٹ رہے ہوں گے..اور ہم نے آج شب درہ ملتر کے دامن میں پہنچ کر اپنے عارضی گھونسلے بنانے تھے..ہم چلنے لگے..عمران نے پھر اپنے کیمرے کا رُخ میری جانب کیا ''نہیں..پلیز اسے آف کردو..بہت ہو چکا..اب میں اس پُرسحر اور ایک اَن دیکھے پہاڑی منظروں کے درمیان بلاخوف وخطر..کیمرے کی گھورتی آنکھ کے بغیر..چلنا چاہتا ہوں..آپ چاہے کتنے بھی تجربہ کار..کتنے بھی گھاگ ہوں..ٹیلی ویژن کیمروں کے سامنے پوری عمر گزار چکے ہوں پھر بھی جب ایک کیمرہ آپ پر کُھلتا ہے..اُس کا لینز آپ کو فوکس میں لیتا ہے تو آپ وہ نہیں رہتے جو آپ ہوتے ہیں..میں اب کچھ لمحوں کے لیے دور رہنا چاہتا ہوں۔''

''اوکے باس'' اس نے مجھے اسی انداز میں سیلوٹ کیا جس انداز میں شوٹنگ کے آغاز میں.. میں نے اسے سرکس کے مسخرے کی طرح جھومتے ہوئے سیلوٹ کیا تھا..

یہاں چلنا دشوار تھا..

بلندی اگرچہ سانس کو گمراہ کرتی تھی لیکن یہاں نسبتاً ہمواری تھی جس کے باعث چلنے میں چنداں دشواری نہ ہوتی تھی..

ہم اُس برف کناروں والے پیالے میں چلتے گئے..

پھر ایک مقام پر میں اپنا دم سنبھالنے کے لیے رُکا اور آس پاس اطمینان سے نگاہ کی تو حقیقی معنوں میں میرا دم رُکنے کو آیا..

میرے چاروں اور برف پیراہنوں میں پوشیدہ بلندیاں تھیں..نیلی چٹانیں اور تنہائیاں تھیں..سورج ڈھلتا تھا اور ان کی نیلاہٹ..سفیدی اور تنہائی بھی روپہلی ہوئی جاتی تھی..اور انسان

اس بلند سکوت میں بچھڑ چکے..مر چکے عزیزوں اور دوستوں کو یاد کرتا تھا کہ یہ اکلاپا ان اونچے سنگھاسنوں میں اجل کی قربت میں بھی تھا..وہ لوگ جو کبھی موت کے دامن تک گئے اس کی ٹھنڈک اور فضا کو محسوس کیا..اور پھر کسی معجزے سے..کہ ابھی اُن کے نصیب میں چند سانس اور تھے..واپس آ گئے..تو جب انہوں نے موت کی نزدیکی کو بیان کیا تو کہا کہ ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہم ایک سیاہ غار میں سفر کر رہے ہیں لیکن اُس کے آخر میں کوئی روشنی ہے..ایک نور ہے..اور کچھ نے کہا کہ ہم کہیں ایک سناٹوں سے بھری بلند وادی میں تھے اور تنہا تھے..اوڑک جاناں مروے..چل میلے نُوں چلیے..

یہی وہ میلہ تھا جو موت کی نزدیکی میں برپا ہوتا تھا..

یہی پیالہ نما میدان اور اس کے چاروں اور برف لبادوں والے پہرے دار تھے جو تمہیں خوش آمدید کہتے تھے..

اجل کی قربت میں جو وادی تھی..وہ ایسی ہی ہوگی..یہاں پر بھی وہی ٹھنڈک اور فضا خاموشی تھی..

اجل کی قربت..

جس روز اجل آئے..

شاہ گوری ایسی اُجلی برفوں کے سفید ہاتھ تمہیں سہاریں تو اجل آئے..

میں اگرچہ ان تینوں سے غافل تھا مگر وہ میرے پیچھے پیچھے آتے تھے..

میں رُکا تو وہ بھی رُک گئے..

اور وہ میری کیفیت سے خوب واقف تھے کہ ان پر بھی یہی اجل تنہائی ارزتی تھی..

''عمران..میں نے ''پاک سرائے'' کے آغاز میں رسول حمزہ توف کی نظم ''اے عورت'' کا حوالہ دیا ہے..اور یقین جانو کہ جب میں رسول کے قدموں میں بیٹھا اپنی عقیدت کا اظہار کر رہا تھا تو مجھے یہی احساس ہوا کہ وہ عورت میری طرف بڑھ رہی ہے..اور اس داغستانی شاعر نے جس کی شاعری کا ترجمہ ''سروادیٔ سینا'' میں فیض صاحب نے کیا ہے مجھے تھپکی دے کر کہا تھا کہ تم بے حد خوش نصیب ہو..میرے ساتھ یہی پرابلم ہے کہ اگر کوئی غزل یا نظم مجھے پسند آ جائے تو پھر اسے بیان اتنا کرتا ہوں کہ اس کا ناس مار دیتا ہوں..تو جہاں ناس وہاں ستیاناس..میں نے اپنے ٹیلی ویژن سیریل ''شہپر'' میں اسے تھیم سانگ کے طور پر پیش کیا اور ایک پاپ سنگر نجم شیراز نے جو بے سُرا نہ تھا اسے گایا..تو کہنا میں یہ چاہتا ہوں..تم سن رہے ہو عمران؟''

وہ چونک گیا.. اس کے چونکنے سے اس کے بغل بچے بھی چونک گئے..

''آپ کہئے جو کہنا چاہتے ہیں ہم بھی کچھ منظر اور کچھ دھوپ کے سحر میں ہیں''

''تو عمران اس بلند مقام پر پہنچ کر مجھے محسوس ہوا ہے کہ رسول حمزہ توف کی نظم کا آخری بند ان پہاڑوں میں آ کر لکھا گیا تھا.. یہی وہ بلند پہاڑ ہیں جن میں رسول حمزہ توف مر گیا تھا.. میں ایک مرتبہ پھر اس نظم کو رسول کی یاد میں.. کہیں بلند پہاڑوں میں.. جہاں وہ مر گیا تھا.. پڑھنا چاہتا ہوں۔''

عمران فوراً چوکس ہو گیا اور اس نے کیمرہ کھول دیا..

کاظمی بیٹریوں کے کمربند سے بکتر بند ہو کر عمران کے قدموں میں لیٹ گیا اور طاہر نے طاقتور لائٹس آن کر دیں کہ ہم چھاؤں میں ہو رہے تھے..

''تارڑ صاحب..'' عمران کیمرے میں پوشیدہ بولا اور مجھے اس کے لینز میں دیکھتے ہوئے مخاطب ہوا ''آپ یہ نظم پڑھتے ہوئے میرے گرد گھومتے جائیں گے.. کیمرے کی آنکھ میں آنکھیں ڈالے اسے پڑھتے جائیں گے.. اور میں آپ کے ارد گرد جو بلند پہاڑ ہیں ان کے پورے سلسلے کو فوکس میں لاتا جاؤں گا.. نظم شروع کرتے ہوئے آپ کی نگاہیں برفوں اور بلندیوں پر ہوں گی اور آپ آہستہ آہستہ میرے گرد ایک چکر مکمل کریں گے اور جب یہ دائرہ مکمل ہو گا تو آپ آخری بند پڑھ رہے ہوں گے.. اور اس کے اختتام پر میں کہیں بلند پہاڑوں میں چلا جاؤں گا.. شروع کریں سر..''

میں نے جب وہ نظم شروع کی تو مجھے قطعی طور پر احساس نہ ہوا.. علم نہ ہوا کہ وہاں عمران بھی ہے اور اس کا کیمرہ مجھے گھور رہا ہے.. میرے ساتھ حرکت کر رہا ہے کہ میں پھر سے تنہا تھا اور وہ نظم مجھ پر اترتی چلی جاتی تھی جسے میں نے رسول حمزہ توف کی خواہش پر آسان اردو میں ڈھالا تھا..

میں جب بھی اس نظم کا حوالہ دیتا ہوں اس کا ترجمہ مختلف ہوتا ہے کہ میں اور اس لمحے کی کیفیت اور ماحول اس پر اثر انداز ہو کر اسے مختلف کر دیتا ہے..

''اے عورت....''

وہ کس عورت سے مخاطب تھا؟''

یقیناً اُس عورت سے جس کے بارے میں گارسیا مارکیز نے کہا تھا کہ ہر مرد.. نامرد ہوتا ہے اور پھر ایک عورت اس کی زندگی میں آتی ہے جو اسے مرد بنا دیتی ہے..

تو رسول بھی اُسی عورت سے مخاطب تھا..

''اے عورت..
اگر ایک ہزار مرد تمہاری محبت میں مبتلا ہوں تو..
جان لینا کہ رسول حمزہ توف ان میں سے ایک ہو گا..''

کہ عشق تو وہ ہے کہ کوئی آپ سے محبت نہ کرے تو آپ اُس سے محبت کریں.. اگر کوئی آپ سے محبت کرتا ہے اور آپ بھی اُس کی محبت میں مبتلا ہیں تو یہ عشق نہ ہوا کاروبار ہوا.. کہ یہی غرناطہ کی ماریا نے سامبرا ناچتے ہوئے کہا تھا..

''اور اگر ایک سو مرد تم سے محبت کرتے ہوں تو..''

میں کہیں بلند پہاڑوں میں رسول کی نظم اُس کے لفظوں میں نہیں اپنے احساسات کے تابع اپنے حرفوں میں ڈھالتا تھا اور کیمرے کی آنکھ میں تکتا اور اُس کی موجودگی سے غافل بھی اُس کے گرد طواف کرتا جاتا تھا..

''اور اگر صرف ایک مرد..
تو یہ رسول حمزہ توف کے سوا کون ہو سکتا ہے''

اور جب نیشنل لائبریری کے ہال میں اسلام آباد میں رسول حمزہ توف.. داغستان کا امیر الشعراء یہ مصرع پڑھتا ہے تو ہال تالیوں سے گونج اٹھتا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مقطع ہے.. لیکن رسول ہاتھ بلند کر کے نظم کا آخری بند پڑھتا ہے..

''لیکن.. اگر تم تنہا ہو.. اور اداس ہو..
اور کوئی بھی تمہاری محبت میں مبتلا نہیں..
تو سمجھ لینا کہ.. کہیں بلند پہاڑوں میں..
رسول حمزہ توف.. مر چکا ہے''

یہی وہ بلند پہاڑ تھے..

میں کیمرے کے گرد دائرہ مکمل کر کے آخری بند پڑھنے کے بعد ایک ناتمام سحر میں گرفتہ رُک گیا.. کہ اب میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا..

تب عمران نے کیمرے میں سے سر نکالا ''یہ رسول حمزہ توف یہاں تو آیا نہیں تو اُس نے کیسے یہ نظم لکھ لی..''

''لیکن میں جو یہاں آیا ہوں..'' میں نے ہنس کر کہا'' کسی بھی بڑے شاعر کو کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں ہوتی.. وہ جگہ خود چل کر اس کے پاس آ جاتی ہے..''

''کیا آپ اِس نظم کو انگریزی میں ریسائٹ کر سکتے ہیں؟''

رسول نے یہ نظم اپنی مادری زبان آوار میں لکھی تھی.. پھر ایک ازبک دوشیزہ نے اسے انگریزی میں منتقل کیا جہاں سے میں نے اسے اردو میں ڈھالا اور اب ایک مرتبہ پھر جب میں نے اسے انگریزی میں واپس کیا تو وہ یقیناً اور کی اور ہو گئی.. اور اس کے باوجود اس کی تاثیر میں کوئی فرق نہ آیا.. جیسے فارسی کی ابتدائی سوجھ بوجھ رکھنے والے فرخ جیرالڈ کے اپنے احساسات اس پر حاوی ہو گئے.. کچھ اسی طور یہ نظم اب رسول کی نہیں رہی تھی بلکہ میرے کچے پکے جذبات میں ڈوب کر اور کی اور ہو گئی تھی..

''او وومین..'' میں نے پھر سے عمران کے کیمرے کو اپنی آنکھ میں رکھا اور اس کے گرد گھومنے لگا..

''اِف اے تھاؤزنڈ مین آر اِن لو وِد یو..
ریسٹ اشورڈ دیٹ رسول.. وِل بی وَن آف دیم..
اور پھر آخر میں..
''اینڈ اِف یو آر لونلی.. ڈیسولیٹ..
اینڈ نوباڈی اِز اِن لو وِد یو..
دین.. سم وِیئر اِن دے ہائی ماؤنٹینز..
رسول حمزہ توف اِز ڈیڈ..''

کہیں بلند پہاڑوں میں.. رسول حمزہ توف مر چکا ہے..
اِز ڈیڈ.. اِز ڈیڈ..
یہ آواز دیر تک بلند پہاڑوں میں گونجتی رہی..

''درّہ ظلتر کے بیس کیمپ سے دھواں اٹھ رہا تھا''

وہ یاک جنہیں ایک عدد ہمیر کٹ کی شدید ضرورت تھی ہمارے قریب آ گئے.. بلکہ ہم تھے جو چلتے چلتے اُن کے قریب آ گئے تھے..

انہوں نے تھوتھنیاں اُٹھا کر ہمیں ناراض نظروں سے دیکھا.. انہیں اپنے رکھوالوں کی عادت تھی جو انہیں اس بلند چراگاہ میں چھوڑ کر نیچے جا چکے تھے.. انہیں اس مکمل تنہائی میں اطمینان سے چرتے رہنے کی عادت تھی ہم جیسے حاجی بغلول قسم کے لوگوں کی عادت نہ تھی جو بوجھ اٹھائے.. جیکٹیں پہنے ان کے قریب ہو کر انہیں دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے.. یہ یاک کچھ جنگلی سے ہو چکے تھے.. ذرا قریب ہوتے تو بھینسوں کی مانند دھمکی آمیز خراٹیں نتھنوں سے نکالنے لگتے.. ہم نے اُن سے کیا لینا دینا تھا تھوڑی دیر اُن کا مشاہدہ کیا اور پھر آگے بڑھ گئے.. میدان کے خاتمے پر کنارہ اونچا ہوا.. اور وہاں ایک اور منظر ہمارا منتظر تھا..

کچھ فاصلے پر چٹانوں اور برفوں کی ایک بلند دیواری ہے اور اس کے دامن میں ایک وسیع گھاؤ ہے.. ایک پھیلاؤ ہے سلیٹی رنگت کا اور اُس میں سے تین چار ندیاں جو پُرشور نہیں تھیں اطمینان سے بہتی اُترتی تھیں اور اُن کے پانی پھیلتے جاتے تھے.. یہ ندیاں درّہ ظلتر کی برفوں میں سے جنم لے کر ایک گلیشیئر میں راستے بناتی نیچے آ رہی تھیں.. درّہ ظلتر ان چٹانوں اور برفوں کی دیوار کے اوپر کہیں تھا.. ہمیں اس منظر کی توقع نہیں تھی کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ ہم بیس کیمپ تک پہنچ گئے ہیں.. ندیوں پر.. گلیشیئر اور اُس بلند دیوار پر شام کے سائے گہرے اور سرد ہو رہے تھے.. ہم آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگے اور پہلی ندی کے کنارے پر پہنچ گئے جہاں ابراہیم ہمیں راستہ دکھانے کے لیے رُکا ہوا تھا وہ ہمیں پہلے بالکل دکھائی نہیں دیا تھا اور سرمئی منظر میں گم تھا..

''صاحب آپ کہاں رہ گئے تھے؟''
''کہیں بلند پہاڑوں میں..''
''ادھر تو پہاڑ ہی ہوگا ناں صاحب..میدان تو نہیں ہوگا..اب آگے چلے گا..''
''کہاں..'' میں یکدم تھکاوٹ سے چُور ہوگیا..گرنے کو ہوگیا..''آگے کہاں تک چلے گا ابراہیم؟''

''اب تو قریب ہے سَر..ان ندیوں میں اُتر کر پار ہوں گے..آسان ہیں سرخطرناک نہیں..پھر وہ جو اونچا کنارا ہے بہت اونچا اس پر چڑھ جائیں گے..اس کے دوسری طرف نیچے جائیں گے تو پھر ایسی ہی دو تین ندیاں ہیں..بس ان کے پار ہیں کیمپ ہے..یہ جو سلیٹی رنگ کی دیوار ہے ناں صاحب اس کے نیچے بالکل..ٹلتر ٹاپ کا بیس کیمپ ہے..دور نہیں..اب آگے چلے گا''

سورج کی کچھ مرتی ہوئی سرد شعاعیں تھیں جن کی زردی میں ہم ان ندیوں کے پار ہوئے..یہ تیز تو تھیں کہ ابھی ابھی گلیشیئر میں سے برآمد ہوئی تھیں..لیکن زیادہ گہری نہیں تھیں اور ان میں پتھروں کی بجائے ریت کی تہہ تھی..

البتہ جب آخری ندی کے قریب ہوئے تو وہ تند اور خود سر نظر آئی..اس کا شور کان بہرے کرتا تھا..پانی پتھروں سے لڑتے جھگڑتے انہیں دھکیلتے تھے..سفید بھنور بناتے تھے اور اس میں گر کر دوبارہ سنبھلنا مشکل ہوسکتا تھا..اسے احترام سے پار کرنا چاہیے تھا..میں سوچ رہا تھا کہ اس کا احترام کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس میں سرے سے قدم ہی نہ رکھا جائے..قدم ابراہیم رکھے اور میں اس کے کندھوں پر سوار ہو کر بخیر و عافیت پار ہوجاؤں..یوں بھی میں بار بار جوگرز اُتارتا..جرابیں اُتارتا..ندی پار کر کے پھر سے پاؤں خشک کر کے جرابیں پہنتا..تنگ آ چکا تھا..میں نے ابراہیم کو پکارا تو اس کی جگہ عمران چلا آیا''سر ایک آخری گزارش ہے..ہم تینوں اس کے دوسرے کنارے پر پہنچتے ہیں اور جب ہم آپ کو اشارہ کریں تو آپ پتھروں پر ناچتے بھاگتے ہمارے پاس نہ پہنچ جایئے گا بلکہ ابراہیم کا ہاتھ تھام کر اس میں اُتریئے اور جہاں پانی زیادہ پُرشور اور گہرے ہیں ان میں سے گزرتے ہوئے ہماری جانب آیئے تو کیا زبردست کرانگ بنے گی..اگر کہیں گر جایئے تو بس گر جایئے ہم آپ کو نکال لیں گے لیکن شاٹ لینے کے بعد..''

میں نے جھک کر اس برفانی نالے کے پانیوں میں ہاتھ ڈالا تو وہ حسب توقع شل ہوگیا..جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ انسان شہرت اور ناموری کے لالچ میں وہ کچھ بھی

کر گزرتا ہے جو باعزت اور باوقار نہیں ہوتا''میں ابراہیم کے سہارے کے بغیر اس ندی کے پار جاؤں گا..یہ تو معمولی کام ہے''

عمران پار گیا اور کیمرہ آن کر کے مجھے کیو کر دیا..

اتنی دیر میں میں جوگرز وغیرہ اتار کر انہیں ابراہیم کے حوالے کر چکا تھا..میں نے ایک بار کیمرے کے لینز کا تعین کیا کہ رخ اس جانب ہونا چاہیے اور ننگے پاؤں پانی میں اُترا..دو تین قدم مشکل سے اٹھائے لیکن چہرے پر مسکراہٹ اور بے خوفی کھیلتی رہی کہ میں کیمرے کو خوش کر رہا تھا..دو تین قدم اور اٹھائے ہیں کہ اپنی جان پر کھیلنے لگا..کیمرہ اداکاری اور ناموری سب کچھ بھول بھال گیا کہ پانیوں کی یخ بستگی نے میرے پاؤں کو فوراً منجمد کر کے تقریباً مفلوج کر دیا..ٹانگوں کی رگوں کو نیلا کر کے حنوط کر کے انہیں یوں لاچار کیا کہ مجھے اپنی جان کے لالے پڑ گئے..میں کسی بھی لمحے اوندھا گر سکتا تھا..اصول تو یہی ہے کہ آپ ایسی ندی میں پاؤں رکھئے اور فوراً اٹھا لیجیے تاکہ اس کی برفیلی گرفت اس پر اثر انداز نہ ہو اور اس اٹھے ہوئے پاؤں کو تھوڑی ہوا لگنے دیں اور پھر پانی میں رکھئے..ظاہر ہے اس دوران دوسرے پاؤں کا بھی کچھ خیال رکھنا ہے کہ کہیں وہ انجماد کا شکار نہ ہو جائے..تو پہلے چند قدم تو میں نے اسی اصول کے تحت..کسی ایڈونچر فلم کے جانباز ہیرو کی طرح لاپروائی سے اٹھائے تھے اور پھر جب جان کی بازی بلکہ قلابازی لگنے لگی تو میں اندھا دھند شڑاپ شڑاپ کرتا..پتھروں پر سے پھسلتا..اپنے منجمد پاؤں کو پانی میں سے زبردستی کھینچتا بڑی ہی مشکل سے پار گیا..

''زندہ باد سَر..'' کاظمی نے داد دی''ہم نے کیمرہ آپ کے پاؤں پر کلوز کیا تو وہ نیلے ہوتے باقاعدہ دکھائی دیئے..کیا بات ہے سَر..''
''اوئے میرے چہرے کو شوٹ نہیں کیا؟''
''نہیں سَر..''عمران لاپروائی سے بولا''صرف پاؤں شوٹ کرنے تھے''
میرے پاؤں واقعی نیلے پڑ چکے تھے..جرابیں پہنیں تو یوں لگا کسی اور کے پاؤں میں پہنا رہا ہوں..

اس ندی کے دوسری جانب کوئی باقاعدہ کنارا نہ تھا..چند بڑے بڑے پتھر تھے اور وہیں سے ایک باریک کنکروں اور بھربھری مٹی کی دیوار نما بلندی اونچی ہوتی جاتی تھی..اس پر ایک باریک راستہ تھا..جس پر بکری ہی چڑھ سکتے تھے..اس پر انسان اگر تازہ دم ہو..سویرے ہو تو کچھ

احتیاط سے چڑھ سکتا تھا لیکن دن ڈھلے.. ایک طویل مسافت کے بعد اور وہ بھی نیلے رنگ کے پاؤں کے ساتھ چڑھنا نہایت ہی ذلت آمیز فعل تھا.. چنانچہ خوب ذلیل ہوتے اوپر پہنچ ہی گئے..

اوپر پہنچے تو پھر نیچے بھی آئے.. ایک مٹیالی اور سلیٹی رنگ کی پانیوں کی گزرگاہ.. جس میں اِدھر اُدھر ریتلی زمین میں پانی بہہ رہے تھے.. اُن کی روانی میں نہ کمینگی تھی اور نہ کوئی شور.. اطمینان سے شریفانہ طور پر بہہ رہے تھے.. اس گزرگاہ کے دوسری جانب ایک شام کی تاریکی میں آتی ہوئی سرمئی دیوار تھی جو دُور تک چلی گئی تھی.. اور اس کے دامن میں ہماری آج کی خیمہ گاہ تھی جہاں ہم اپنے اپنے خیموں کے رنگ پہچان سکتے تھے کہ پورٹر وہاں کب کے پہنچ چکے تھے اور ہمارے خیمے ایستادہ کر چکے تھے.. کچن کی نیلی ترپال میں سے سفید دھواں اٹھ رہا تھا.. بلکہ سرد فضا میں معلق تھا..

یہ خلتر درے کا بیس کیمپ تھا..

کچھ زیادہ خوش نظر نہیں لگتا تھا..

جہاں سے دھوپ رخصت ہو چکی تھی.. سردی میں ٹھٹھرتا ایک ویران اور اداس سا مقام تھا.. جس کی اداسی کو ہمارے خیموں کے شوخ رنگ بھی زائل کرنے میں ناکام ہو رہے تھے..

لیکن یہ منزل تھی.. وہاں پہنچ کر ہم نے اپنے بوجھ اُتارنے تھے اور جو گرز اتارنے تھے اور خیموں کے اندر گھس کر لم لیٹ ہو جانا تھا..

بیس کیمپ خلتر ٹاپ!

کیا یہی وہ مقام ہے جہاں رسول حمزہ توف مر گیا تھا.. اگر وہ مر گیا تھا تو میں کیوں زندہ ہوں..

"گوشے میں پہاڑوں کے مجھے آرام بہت ہے"

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے..

مجھے نہیں تھا..

پہاڑوں کے قفس میں.. درہ خلتر کا بیس کیمپ ایک گوشے میں تھا.. لوئر شانی سے جو برف بلندیاں شروع ہوئی تھیں وہ اس درّے کے قریب پہنچ کر ختم گئی تھیں کہ ان کے آگے ایک فصیل کھڑی تھی جس کے سائے میں ہم خیمہ زن تھے..

لیکن اس گوشے میں مجھے آرام نہیں تھا..

میں سلیپنگ بیگ میں پڑا کروٹیں بدلتا تھا.. اور کروٹ آزاری ایسی تھی بدن کا ہر گوشہ دکھتا تھا.. کباب سیخ کی مانند جو جل اُٹھتا ہے یہ پہلو.. خیمے کے باہر برف سناٹے میں ٹھٹھرتی سردی تھی جو باہر تھوڑا ٹھہرتی تھی.. خیمے کے اندر آتی تھی اور میرے تھکاوٹ سے ٹوٹتے بدن میں برف کی کرچیاں بھرتی تھی..

میاں صاحب اور شاہد باہر اس عظیم دیوار کی اوٹ میں جس کے اوپر کہیں درہ خلتر براجمان تھا ابراہیم کے چولہوں کے قریب آگ کے قریب ہوتے ہانڈیوں میں ڈوئیاں چلاتے تھے.. اور نمک مرچ چکھنے کے بہانے اپنی بھوک کا بندوبست کرتے تھے..

برابر کے خیمے سے.. برابر اس لیے کہ اس خیمہ گاہ میں اتنی وسعت نہ تھی کہ خیمہ ہم سے دور لگایا جائے.. برابر کے خیمے سے گدلا اور گرد آمیز کی سرگوشیاں اور ہلکے قہقہے مجھ تک آتے تھے..

اور وہ جو آج کہیں بلند پہاڑوں میں اُچھلتے ناچتے بندر ہو گئے تھے پھر سے انسانوں کی جون میں آ گئے تھے.. خیمہ گاہ سے نیچے اتر کر اس آخری ندی کے کنارے کسی پتھر پر جا بیٹھے تھے

اور تاریکی میں مکمل طور پر روپوش تھے اور صرف جب کش کھینچا جاتا تھا اور ان کے خصوصی سگرٹ کا جگنو پل بھر کے لیے سلگتا سرخ انگارہ ہوتا تھا تو اُن کی وہاں موجودگی کا پتہ ملتا تھا.. یہ خیمہ گاہ بھی ایک چھوٹی سی یاک سرائے تھی..

میں اس سرائے میں سب سے آخر میں داخل ہوا تھا.. اور ساتھیوں کی ہیلو ہائے کے بعد سیدھا اپنے خیمے.. یعنی وہ خیمہ جو سلیم کا تھا اور میں اس کا شریک بن چکا تھا اس میں گھس کر لم لیٹ ہو گیا تھا.. لیکن میں نے خیمے کے اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا کہ سلیم خیمہ گاہ کے آس پاس منڈلاتے چرتے یاکوں کو نہایت ہی دل جمعی اور دلچسپی سے دیکھ رہا ہے کہ وہ اُس کے پہلے یاک تھے اور اسے پسند آ گئے تھے.. وہ اپنی مونچھیں سنوارتا ان پر مسکراہٹیں نچھاور کرتا ان کے قریب قریب ہو کر ان سے اٹکھیلیاں کرنا چاہتا تھا اور وہ کرنے نہیں دیتے تھے بیزار بیٹھے تھے.. بلکہ کھڑے تھے.. اور ناراض نظروں سے اُسے دیکھتے ذرا پرے پرے ہوتے تھے..

باہر رات ہو گئی.. اور مزید سردی ہو گئی.. ہم تقریباً ساڑھے بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر خیمہ زن تھے..

جب رات ہو گئی تو خیمے کا پردہ وا ہوا اور سلیم جُھکا جُھکا اندر آ گیا اور بیٹھ گیا ''سر جی یاک چلے گئے ہیں.. یہ کہاں چلے گئے ہیں؟''

''یار میں تو خیمے میں پڑا اپنی خراشیں سہلا رہا ہوں.. مجھے کیا پتہ کہاں چلے گئے ہیں''

''میں بہت دیر تک ان کے قریب بیٹھا رہا.. انہیں پچکارتا رہا.. چاکلیٹ کھلانے کی کوشش کی لیکن وہ مجھ میں دلچسپی نہیں لے رہے تھے.. پھر تاریکی ہوئی تو وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر ایک ایک کر کے کھسک گئے.. پتہ نہیں کہاں گئے ہیں.. کہاں گئے ہیں سر جی؟''

سلیم عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا.. وہ اتنی بلندی پر پہلی بار آیا تھا اسی لیے بہک گیا تھا.. ہم سب یعنی قدیمی گروپ اس بیس کیمپ سے کہیں بلند درجات پر فائز ہو چکے تھے.. کنکورڈیا میں.. بیس کیمپ نانگا پربت اور درّہ درکوت میں اور سب سے بلند سترہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند درّہ دیسپر میں.. اس لیے ہم یہاں محض ساڑھے بارہ ہزار فٹ پر بہکتے بھی تو کتنا بہکتے.. اس لیے میں نے سلیم کو اس عیاش بوڑھے کی نظر سے دیکھا جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہے اور اس کے سامنے ایک ایسا نوجوان ہے جو کسی گھاٹ سے پہلی بار پانی پی کر آیا ہے اور حیران اور خوش ہے کہ اچھا پانی ایسے ہوتے ہیں..

''سر آپ پانی پئیں گے؟''

''کون سے گھاٹ کا پانی ہے؟''

''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا ''وہی منرل واٹر ہے جو میں اسلام آباد سے لیکر آیا ہوں تاکہ پیٹ خراب نہ ہو..''

''یار میں نے تو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے اور میں کبھی پیٹ کی خرابی کا شکار نہیں ہوا.. آپ اپنے معدے کو جتنی آسانیاں دیں گے.. چھان پھٹک کر.. اُبال اُبال کر اگر پانی پئیں گے تو وہ اتنا ہی خودسر ہو جائے گا.. بے شک بر اللہ وکا پانی پیو.. جوہڑ میں سے دو گھونٹ بھر لو.. معدہ اس کا بھی عادی ہو جائے گا..''

''لیکن سر یہ تو منرل واٹر ہے..''

''مائی ڈیئر یہ جو درجن بھر ندیاں ہماری خیمہ گاہ کے برابر میں گلیشیئر میں سے بہتی آ رہی ہیں اور جن کے بہاؤ کی آواز ہمارے کانوں میں آ رہی ہے اور جن میں سے آخری ندی کے کنارے عمران اینڈ کمپنی کے سگرٹ کے جگنو دمکتے ہیں وہ بھی تو خالص منرل واٹر ہے.. کیوں نہ ہم باہر نکلیں اور ڈیک لگا کر اسے پی لیں.. چونکہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید..''

''لیکن سر.. اب میں جو یہ تین پلاسٹک کی منرل واٹر کی بوتلیں اسلام آباد سے اٹھا کر یہاں تک لایا ہوں تو ان کو بھی تو ختم کرنا ہے.. اور یقین کریں یہ ہمارے میدانوں کا پانی ہے اور اس میں تاثیر بہت ہے.. ذرا چیک کریں''

میں نے چیک کیا..

وہ برف ہو رہا تھا لیکن اُس میں کچھ پوشیدہ سی تاثیر تھی جو میری سمجھ میں نہ آئی.. شاید یہ اپنی مٹی کے پانی تھے.. اپنے میدانوں سے کشید کردہ تھے اور ان میں دراصل سرسوں کے کھیتوں کی.. مکئی کی روٹی اور سرسوں کے ساگ کی.. اور کیکر کے زرد پھولوں کی تاثیر تھی..

خیمے کی چھت سے ایک چھلّے میں بندھی ٹارچ لٹکتی تھی اور اس کی بیٹری کمزور پڑتی تھی سردی کی شدت کے باعث لاچار ہوتی تھی اور روشنی زرد ہوتی جاتی تھی.. ہم دیر تک باتیں کرتے رہے.. بلندی کے باعث بہکی بہکی باتیں کرتے رہے..

خاموشی بہت تھی..

''گڈ..'' میں نے صدا دی..

برابر کے خیمے سے سرگوشیاں یکدم منقطع ہوئیں اور ایک سرد سی "جی سائیں" کی آواز جواب میں آئی..

گدا ہمیشہ سے ہر ٹریک کے دوران میوزک سیکشن کا انچارج رہا تھا اور وہ جہاں اپنے رُک سیک میں سے عمر عیار کی پوٹلی کی مانند ہر شے برآمد کر کے پیش کر دیتا تھا وہاں کسی بھی سنو لیک یا شمشال میں آپ کی فرمائش پر کوئی بھی گیت یا غزل یا عارفانہ کلام اپنے ڈیک پر سنوا سکتا تھا.. نہ صرف ہمیں سنواتا تھا بلکہ اُس کی تال پر رقص کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا..

"یار جب سے یہ ٹریک شروع ہوا ہے تم نے موسیقی نہیں چھیڑی.. کوئی 'جانِ بہاراں رشکِ چمن غنچہ دہن' کوئی استاد جمن کی 'یار ڈاہڈی عشق آتش لائی ہے' کچھ لگاؤ کہ سناٹا بہت ہے.. کچھ چھنکو یار.."

"موسیقی کا موقع نہیں ہے سائیں.." اُدھر سے بے حد روکھا جواب آیا..

"کیوں گدا بھائی.." سلیم نے پوچھا.. "یہی تو موقع ہے.. آواز بلند کر دینا تاکہ ہم یہاں بیٹھے بیٹھے انجائے کریں"

"موقع نہیں ہے.. سائیں گرد آمیز ابھی نماز پڑھیں گے.."

"سوری گدا.." میں قدرے خجل ہو کر چپ ہو گیا لیکن چُپ ہونے سے پیشتر میں نے ایک اور صدا دی "سائیں گرد آمیز کی نماز بھی تو ختم ہو گی پھر لگا دینا.."

اب ہم دونوں آپس میں باتیں نہیں کر رہے انتظار کر رہے ہیں کہ بلندی کی اس سرد تنہائی میں ہم موسیقی کے راستے کسی جانِ بہاراں کی قربت میں جانے کے تمنائی تھے.. ایک مناسب وقفے کے بعد میں نے پھر پکارا "گدا.. اگر سائیں گرد آمیز نماز پڑھ چکے ہیں تو لگا دو سائیں جمن کو.."

"اب سائیں گرد آمیز آرام کر رہے ہیں اور یوں بھی میوزک کو ناپسند کرتے ہیں تارڑ صاحب.."

اس کورے اور روکھے جواب کی مجھے ہرگز توقع نہ تھی.. اس لیے کہ میں انسانی خصلت کو نہیں جانتا تھا.. گرگٹ ہو جانے اور رنگ بدلنے کو نہیں جانتا تھا.. تو ظاہر ہے میں مزید خجل ہوا.. بے حد شرمندہ بلکہ بے توقیر ہوا اور جواب میں کچھ نہ کہا.. جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے.. دوش میرا تھا کہ میں نے ان پتوں پر کیوں تکیہ کیا تھا.. انہیں گمنامی سے ناموری تک لے آیا تھا تو دوش میرا تھا..

سردی بڑھتی جاتی تھی..

یہ کچھ چُپ چُپ سی اکیلی ڈیشن تھی..

ہم ایک دوسرے کے ساتھ جُڑتے نہ تھے..

جُڑنے سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ ہم بغل گیر ہو کر ہمہ وقت ایک دوسرے کے ساتھ چپکے رہیں.. بوس و کنار میں مشغول رہیں.. نہیں.. بے شک آپ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ ہم کلام نہ ہوں.. اپنے آپ میں گُم رہیں اور پھر بھی ایک مشترکہ نبض آپ کے درمیان دھڑکتی رہے.. کچھ کہے بغیر ایک نظر ڈالنے سے آپ جان جائیں کہ آپ کے ہم سفر کو آپ کی ضرورت ہے.. ایک ربط.. ایک دوسرے کے لیے فکرمندی آپ سب میں مشترک ہو.. جو اس مہم کے ارکان میں نہیں تھی..

اس میں ایک بکھراؤ تھا.. ہم سب بظاہر پہلو بہ پہلو چلتے تھے لیکن ایک دوسرے سے آگاہ نہیں تھے..

شائد یہ کیفیت اُس فرقہ واریت کا ثمر تھی جو عمران اور اُس کے بندر بچوں اور دوسری جانب گدا اور گرد آمیز کی علیحدگی پسندی کے باعث ظہور میں آئی تھی..

جو کچھ بھی تھا یہ سب میرا کیا دھرا تھا.. میری ذاتی حماقت تھی.. کیونکہ میں نے ہی یہ بھان متی کا کُنبہ جوڑا تھا..

اگر میں نے یہ کُنبہ جوڑ ہی دیا تھا تو کم از کم کنبے والے ہی کچھ لحاظ کرتے جو انہوں نے نہیں کیا اور گرگٹ ہو گئے..

ہم نیلے ترپال پر بیٹھے تھے اور کھسکتے ہوئے الاؤ کے قریب ہوتے تھے تاکہ منجمد نہ ہو جائیں.. ہم الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے اس کی ناکافی بھڑک میں پلیٹ میں نظر آتے.. کبھی کبھار اس بھڑک سے نظر آتے سالن میں سے فوراً لقمہ لگا لیتے کہ وہ پلیٹ اگلے لمحے تاریکی میں ڈوب جاتی..

چُپ کا راج تھا.. سوائے الاؤ کی بھڑک کے..

"ابراہیم.." میں نے خاموشی.. اور شدید انجماد میں ٹھٹھرتی سردی میں کانپتے ہاتھوں سے خاموشی کا قفل کھولنے کی سعی کی.. اس کا لوہا اتنا سرد تھا کہ بمشکل کھلا "صبح ہم دروہ عبور کر اس کریں گے؟"

"ہاں صاحب.."

"کیسے؟"

"یہ جو دیوار ہے چٹانوں کی.. تاریک اور مہیب.. کل سویرے ہم اس پر چڑھیں گے.. یہاں سے مشکل دکھائی پڑتی ہے لیکن ہے نہیں.. آپ بھی چڑھ جاؤ گے انشاء اللہ.. اور اوپر کچھ بڑے بڑے پتھر آئیں گے.. چٹانیں اور برف آئے گی اور پھر ایک گھنٹے کے بعد ہم چوٹی پر پہنچ جائیں گے جہاں سے درّہ ہلتر سامنے آ جائے گی"

"گلیشیئر بہت بڑا ہے؟"

"بڑا تو ہے صاحب.. ان علاقوں میں یہ سب سے بڑا گلیشیئر ہے.."

"بیافو.. ہسپر اور بالتورو سے تو بڑا نہیں؟"

"نہیں صاحب.. وہ تو دنیا جہان ہے.. برف کا دنیا ہے.. اُدھر تو اُن کے اندر چلے جاؤ تو پھر قسمت سے ہی باہر آتا ہے.. ہم تو وہاں نہیں گیا.. صرف سکردو کا پورٹر.. بلتی لوگ ہی اس کے اندر جا سکتا ہے.. ہلتر ٹاپ سے تو ہم ایک دو گھنٹے میں پار ہو جائیں گے انشاء اللہ.. اگر برفباری نہ شروع ہو گیا.."

"برفباری؟" ہم سے بہت الگ.. ایک فاصلے پر.. تاریکی میں.. ایک پتھر پر براجمان کاظمی جو کھانا کھا چکا تھا اور اب اپنے آپ میں مگن کبھی ہنستا تھا اور کبھی بوتھی اٹھا کر شاہتی پیک کو گھورتا تھا.. اور جس نے شائد پوری گفتگو میں صرف "برفباری" کا لفظ ہی سنا تھا.. چونکا "کیسی برفباری؟"

عمران اپنے خیمے میں جا چکا تھا تو وہ وہیں سے بلند آواز میں بولا "اوئے کاظمی.. ویسی برفباری"

"کیسی برفباری یار.." کاظمی تقریباً جھنجھلایا..

"بس ویسی ہی برفباری جیسی کہ برفباری ہوتی ہے"

"اچھا اچھا میں سمجھا تھا کہ ویسی برفباری جیسی کہ برفباری نہیں ہوتی" یہ کہہ کر کاظمی اپنے پتھر پر شانت ہو گیا اور ہتھیلی پر تمباکو مسلتے ہوئے مزید شانتی کا بندوبست کرنے میں مشغول ہو گیا..

یہ گفتگو تقریباً ویسی ہی تھی جیسی کہ حسن صاحب نے "کیا بات ہے.. اور کونسی بات ہے" کے سلسلے میں کل لوئر شاہتی میں کی تھی..

یہ پُر مغز اور فلسفیانہ برف بار مکالمہ اختتام کو پہنچا تو میں نے پھر سے سلسلہ کلام شروع کیا

"اگر برفباری شروع ہو جاتا ہے تو پھر کیا ہو گا ابراہیم؟"

"صاحب پھر دیکھیں گے.. اگر تو کم کم برف اُترتا ہے تو آگے جائیں گے اور اگر بہت ہے اور رُکتا نہیں ہے برف پڑتا جاتا ہے تو ہم ادھر نیچے یہیں واپس اُتر آئیں گے اور اس کے رُکنے کا انتظار کریں گے.. لیکن پرواہ نہیں ہے صاحب.. پار جائیں گے انشاء اللہ"

"گلیشیئر میں دراڑ تو نہیں؟"

"نہیں صاحب.. بہت نہیں.. دو چار دس تو ہو گا.. گلیشیئر میں دراڑ تو ہوتا ہے صاحب ورنہ وہ گلیشیئر کیسا.. لیکن ادھر کوئی آسانی سے گرتا نہیں جب تک کہ اس کی اپنی مرضی نہ ہو.. درّے کے پار ہو کر ہم پھوراوادی میں اُتریں گے اور اسی نام کے گلیشیئر کے بلند کناروں پر چلتے ہوئے شام تک سُرخ پتھر تک پہنچیں گے.."

"راستہ کیسا ہے؟"

"بس مسافت ہے صاحب.."

"خوبصورت ہے؟"

"پتہ نہیں صاحب.. بہت بار ادھر آیا ہے لیکن کبھی غور نہیں کیا.. بس مسافت ہے"

جیسے مجھ سے کوئی پوچھے کہ تارڑ صاحب آپ جب اپنے گھر سے.. گلبرگ سے نکلتے ہیں اور شہر جاتے ہیں.. اپنے ناشر نیاز احمد کے پاس سنگ میل جاتے ہیں تو کیا راستہ خوبصورت ہے تو میں بھی یہی کہوں گا کہ بس مسافت ہے.. میں اُس قبرستان کو تو نہیں دیکھوں گا جہاں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی شہزادی بمباں سدرلینڈ دفن ہے.. نہر کنارے خزاں رسیدہ پاپلر زیا اُس کے پانیوں میں ڈوبتی بید مجنوں کی شاخوں پر غور نہیں کروں گا.. راستے میں پڑتی ٹریفک لائٹس پر غور نہیں کروں گا.. نہ لکشمی مینشن کو دیکھوں گا جہاں منٹو رہتا تھا.. نہ اس پوسٹ آفس پر نظر کروں گا جہاں راجندر سنگھ بیدی ہوا کرتا تھا.. نہ ہی موہنی روڈ میں امرتا پریتم کو دیکھوں گا اور نہ.. عجائب گھر کے سامنے زمزمہ توپ پر توجہ دوں گا جس پر رڈیارڈ کپلنگ کا کردار کِم براجمان ہوا کرتا تھا.. میرے لیے تو یہ ایک معمول کی.. رزق کی تلاش کے لیے.. ایک کٹھن مسافت ہو گی..

"کیسی برفباری ہوگی..ویسی جیسی کہ ہوتی ہے اور مدیحہ شاہنی"

کاظمی اپنے پتھریلے سنگھاسن پر سے اٹھا اور ہمارے قریب آ بیٹھا "سر جی اگر کل برفباری شروع ہوگئی تو ویسی ہی برفباری ہوگی ناں جیسی کہ برفباری ہوتی ہے؟" اس کی سوئی وہیں پر اَٹکی ہوئی تھی..

میں نے اس لمحے کاظمی کو بے حد پسند کیا..اس برفانی گود میں کہیں بلند پہاڑوں کی تنہائی میں وہ ہماری طرح سوگوار نہیں تھا..زندگی سے لطف اندوز ہو رہا تھا..

"جیسی کہ کونسی برفباری ہوتی ہے کاظمی؟"

"کوئی بھی برفباری جیسی وہ ہوتی ہے ویسی برفباری"

"یقین کرو یہ ویسی ہی ہوگی جیسی کہ ہوتی ہے.."

"سر جی یہ میری پہلی برفباری ہوگی تو اس لیے پوچھ رہا ہوں..آپ مائنڈ تو نہیں کر رہے؟"

"نہیں کاظمی..کوئی اور سوال؟"

"سر جی..مائنڈ نہ کرنا لیکن آپ نے کبھی برف جیسا گوراپنڈا دیکھا ہے؟" اس کے پورے دانت اندھیرے میں لشکے..

"دیکھا بھی ہو تو میں تمہیں تھوڑا بتاؤں گا..تم ایک جونیئر بچے ہو اور اپنی حیثیت کو ہمہ وقت یاد رکھو کاظمی.."

"سوری سر" اُس نے سر جھکا لیا اور اتنا ملول ہوا کہ مجھے اس پر ترس آنے لگا..

"اوئے کاظمی.." میاں صاحب بھی اکھاڑے میں اُتر آئے "بچے آج تو باندروں کی

طرح پہاڑوں میں اُچھل کود کر رہے تھے ناں..کل کرنا..کل جب گلیشیئر پر چلیں گے ناں..اور اس میں ہوتی ہیں دراڑیں..اور جب اُچھلتے ہوئے ان میں سے کسی ایک میں گر گئے ناں تب پوچھنا کہ گوراپنڈا کیا ہوتا ہے..نیچے ہر طرف برف ہی برف ہوگی اور اندھیرا ہوگا اور تم ناں کاظمی منفوں میں برف کا لازمی حصہ بن جاؤ گے"

"جانے دیں میاں صاحب"

"کہاں جانے دیں"

"کہیں بھی جانے دیں"

میاں صاحب اس جواب سے بے حد خفا ہوئے اور کاظمی سے منہ موڑ کر مجھ سے مخاطب ہو گئے۔

"یہ نامہ نیم پتہ نہیں کہاں ہے تارڑ صاحب..بات سمجھتا ہی نہیں"

"یہ وہاں ہے جہاں سے اس کو اپنی بھی خبر نہیں آتی میاں صاحب..اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں"

"ٹُن ہے؟" میاں صاحب نے نہایت رازداری سے پوچھا..

"نہیں..ٹُن تو نہیں لیکن بہرحال کچھ اور ہے.."

"بڑا نامہ نیم ہے" میاں صاحب بڑبڑائے..

"کاظمی.." عمران کی آواز خیمے میں سے برآمد ہوئی..

"یس باس" کاظمی فوراً کھڑا ہو گیا اور عمران خیمے میں لیٹے ہوئے جانتا تھا کہ کاظمی اس کے پکارنے پر کھڑا ہو گیا ہوگا اس لیے اس نے پھر آواز دی "کاظمی بیٹھ جاؤ.."

"بیٹھ گیا باس"

"اب یہ بتاؤ کہ طاہر کہاں ہے..؟"

"میرا خیال ہے وہ یاکوں کے پیچھے گیا ہے یہ جاننے کے لیے کہ یہ رات کو کدھر جاتے ہیں.."

اس پر سلیم نے مسرت کا اظہار کیا "یار یہ تو میں بھی جاننا چاہتا تھا.."

"ویسے وہ یاکوں کے پیچھے نہیں گیا" حسن صاحب بھی بالآخر اپنی شرماہٹ سے باہر آئے "وہ کسی اور حاجت کے لیے نیچے ندی کے کنارے جو پتھر ہیں ان کی اوٹ میں گیا ہے..ابھی تک وہیں بیٹھا ہے..کش لگاتا ہے تو سگرٹ نظر آتا ہے"

''کاظمی اس کا پتہ کرو کہیں ندی میں لڑھک ہی نہ گیا ہو'' عمران خیمے میں قہقہے لگانے لگا..

''باس اگر وہ لڑھک گیا ہے تو اب تک عطر کی جھیل میں جا گرا ہو گا پتہ کرنے سے فائدہ'' یہ کہہ کر کاظمی بھی اپنے باس کے قہقہے میں شامل ہو گیا..

''تارڑ صاحب'' میاں صاحب نے پھر سرگوشی کی'' یہ اس مرتبہ آپ اپنے ساتھ کیا اٹھا لائے ہیں..عجیب جانگلوس قسم کی چیزیں ہیں..''

''ہاں تو میاں صاحب جانے دیں..'' کاظمی قہقہے سے فارغ ہو کر پھر میاں صاحب سے مخاطب ہو گیا..اب مجھے بھی شک ہوا کہ وہ جان بوجھ کر یملا بنا ہوا ہے..محض باندر بنے پر تلا ہوا ہے ورنہ مکمل طور پر اپنے حواس میں ہے..

''جانے دیا..'' میاں صاحب بھی اس کی عیاری سمجھ گئے..

''لیکن سر..تارڑ صاحب..'' وہ انگلیوں سے سرد مٹی میں ایک نقشہ سا بنانے لگا'' میں اگرچہ ایک جونیئر بچہ ہوں پھر بھی آپ مجھ سے یہ تو پوچھ لیجیے کہ میں نے برف سفید پنڈے کے بارے میں کیوں پوچھا تھا۔''

''کیوں پوچھا تھا؟''

''دراصل آج جب آپ نے وہ کہیں بلند پہاڑوں والی نظم پڑھی تھی اور میں نے باس کے کہنے پر آپ کی بنیان تلے سے ہاتھ گزار کر آپ کی ٹی شرٹ کے گلے میں ٹیک مائک لگایا تھا تو اس وقت مجھے وہ گورا پنڈا یاد آ گیا تھا..''

''کس کا پنڈا؟''

ابراہیم اپنے گھٹنوں پر سر رکھے سر توڑ کوشش کر رہا تھا کہ یہ سمجھ جائے کہ ہم کیا باتیں کر رہے ہیں لیکن سب کچھ اس کے سر سے گزر رہا تھا..

محسن صاحب کے چہرے پر ایک عجیب الوہی اور پُرسکون مسکراہٹ کھیل رہی تھی اگرچہ اُس کی خراشوں میں سے ابھی تک ٹیسیں اٹھ رہی تھی جنہیں وہ ہونٹ بھینچ کر برداشت کرتا تھا..میاں صاحب بھی اس رات میں خوش تھے..کبھی اپنی عینک درست کر کے مسکراتے اور کبھی منہ بنا لیتے..

البتہ شاہد ابھی تک اپنے سفید جاسوسی ہیٹ سے جدا نہیں ہوئے تھے اور اپنی موٹی عینک کے پیچھے سے ایک متروک شدہ فلسفی اُلو کی مانند آنکھیں جھپکاتے تھے..

عمران اپنے خیمے میں تھا اور گفتگو کے دوران وہیں سے لقمے دیئے جا رہا تھا..سلیم شائد سونا چاہتا تھا اور بمشکل آنکھیں کھلی رکھتا تھا..

گدا اور گرد..شائد سو چکے تھے..شائد جاگ رہے تھے..

اس ٹریک میں ایک اور افسوس ناک بات سامنے آئی..پورٹر بھی فرقہ واریت کا شکار تھے..چنانچہ جو سُنی عقیدے کے تھے وہ الگ رات بسر کرتے تھے اور جو شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے ان کا ڈیرہ الگ ہوتا تھا..

جب میں نے کاظمی سے جو اس شب ہماری واحد تفریح تھا یہ پوچھا کہ کس کا پنڈا تو وہ بڑے اشتیاق سے بیان کرنے لگا'' سر جی آپ تو ہمیں جونیئر سمجھ کر گھاس نہیں ڈالتے..حقیر سمجھتے ہیں لیکن میں ٹیلی ویژن کا ایک نہایت ہٹ پروگرام'' لالی ووڈ'' بھی پروڈیوس کرتا رہا ہوں..اور اس دوران فلم انڈسٹری کی بڑی بڑی..بدن میں بھی بڑی بڑی اداکاراؤں کو شوٹ کرتا رہا ہوں..تو جناب عالی آپ خود میڈیا کے بندے ہیں جانتے ہیں کہ شوٹ کرنے سے پہلے آواز کے لیے ٹیلنٹ کو ٹیک مائک لگانا پڑتا ہے..کچھ خواتین تو خود ہی لگا لیتی ہیں اور کچھ کہتی ہیں کہ کاظمی بھائی..'' اور یہاں اُس نے ہی ہی کر کے کاظمی بھائی کاظمی بھائی کی گردان کی'' کہ کاظمی بھائی آپ خود ہی لگا دیں..تو تارڑ صاحب میں ایک اچھے بھائی کی طرح..نہایت ادب اور احترام کے ساتھ جس طرح آپ کو لگایا تھا تو ان کی شمیزوں اور قمیضوں وغیرہ میں ہاتھ ڈال کر ان کے گلے میں مائک لگا دیتا ہوں اور سر جی میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اکثر کے نیچے کچھ نہیں ہوتا صرف پیڈنگ ہوتی ہے..''

''اوئے ہوئے تو یہ سب جعلی کام ہوتا ہے؟'' میاں صاحب کو بے حد افسوس ہوا..

''کاظمی..تم بہک رہے ہو..تم کسی ایک برف گورے بدن کی بات کر رہے تھے''

''سوری سر..'' وہ پھر شرمندہ اور انتار نجیدہ ہوا کہ مجھے پھر اُس پر ترس آنے لگا

''تو سر آئی ایم سوری میں ذرا آف ٹریک ہو گیا..تو ایک مرتبہ وہ مدیحہ شاہ نہیں ہے؟''

''ہاں ہے شائد..''

''سر مدیحہ شاہ دیا ہوتی ہے یا نہیں ہوتی..شائد نہیں ہوتی''

''کاظمی..'' میں نے سینہ پھلا کر اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کی'' یہ جو مدیحہ شاہ ہے یہ اوّل اوّل میرے ڈرامہ سیریل'' سورج کے ساتھ ساتھ'' میں انٹروڈیوس ہوئی تھی اور اب بھی اگر اتفاقاً کہیں آمنا سامنا ہو جائے تو ایک استاد کی حیثیت سے اتنا احترام کرتی ہے کہ باقاعدہ

بغل گیر ہو کر ملتی ہے۔.کیا سمجھے؟"

"تارڑ صاحب آپ کی بغل اتنی بڑی ہے کہ وہ اس میں گیر ہو جاتی ہے۔" کاظمی نے بکواس کی۔.

"تارڑ صاحب۔.یہ نامہ نیم کہیں اور ہے۔.اس سے بچیں۔" میاں صاحب فکر مند ہو گئے۔.

"کاظمی۔.براہ کرم تمیز سے بات کرو۔.محض مدیحہ کی شمیز کی بات کرو"

"سوری سر۔" اس نے پھر معذرت کی۔.

یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ اس لمحے کہیں بلند پہاڑوں میں ایک سیاہ رات میں الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے ذرہ ملتر کے بیس کیمپ کی ٹھٹھرتی رات میں ہر کوئی ہمہ تن گوش تھا اور کاظمی کی یاوہ گوئی میں غرق تھا۔.آنکھیں نہیں جھپکتا تھا۔.

"تو سر۔.میں اپنے پروگرام کی شوٹنگ کر رہا تھا۔.اور جب میں نے ریکارڈنگ کے لیے نیک مائک کو چٹکی میں پکڑ کر کہا کہ محترمہ مدیحہ شاہ صاحب آپ اس چیز کو اپنے گلے میں کہیں بھی لگا لیں تو وہ کہنے لگی کاظمی بھائی آپ ہی لگا دیں۔.تو میں نے مجبوراً ایک پرفیشنل پرابلم کو حل کرنے کے لیے اس کی سکڑتی ہوئی اور تنگ۔.جبین پر اختی ٹی شرٹ کے اندر ہاتھ ڈالا ہے نیک مائک سمیت تو اسی لمحے اس کی والدہ محترمہ جو شائد پان لینے ذری کی ذری سٹوڈیو سے باہر گئی تھیں واپس آ گئیں اور مجھے اس عمل میں مصروف دیکھ کر کہنے لگیں "وے منڈیا۔.جدھر تم مُنتے میں ہاتھ ڈالے چلے جا رہے ہو اُدھر تک آتے آتے تو بڑے بڑے اپنے خزانے خالی کر دیتے ہیں اور تب آتے ہیں" تو تارڑ صاحب مجھے بے حد غصہ آیا کہ مائی جی میری نیت پر شک کر رہی ہیں تو میں نے ہاتھ فوراً باہر نکال لیا اور کہا اماں جی پھر یہ کام تم خود کر لو۔.اس پر اماں جی جو پتہ نہیں کتنے جہان دیدہ تھیں فوراً بولیں۔.نہیں پتر۔.میں سمجھی تم کچھ اور کر رہے ہو۔.لیکن تم تو انٹرویو کر رہے ہو۔.تو کر لو۔."

تارڑ صاحب بس کیا بتاؤں کہ کیا برف گورا چٹا تھا۔." کاظمی نے ایک ہچکی بھری اور خاموش ہو گیا۔.اس ہیجان خیز داستان نے یقیناً سب کو گرما دیا بلکہ ملتر گلیشیئر اور تین سروں والی ملتر چوٹی کی برفوں کو بھی قدرے پگھلا دیا۔.

سب کو چپ لگ گئی۔.

"ویسے۔." بہت دیر بعد سلیم نے ایک کھنگورا مارا "شاہ کی مؤنث تو شاہنی کہلاتی ہے ناں۔.تو یہ جو لوئر شاہنی ہے۔.اور اب جس اپر شاہنی کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں تو یہ کہیں مدیحہ کے نام پر تو نہیں"

"دُر فٹے منہ۔." میاں صاحب نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا "او ئے کن پوتر اور ستھری چیزوں کو کس سے ملا دیا ہے۔."

"ویسے سر۔.میں تو لوئر شاہنی سے اپر شاہنی تک مائک لے کر گیا تھا میں جانتا ہوں کہ بلندی کیا چیز ہوتی ہے۔." کاظمی نے نہایت فلسفیانہ انداز میں سر ہلایا۔.کہ وہ اس قصے کے بعد قدرے محترم ہو گیا تھا۔" سر جی۔.میں ابھی آتا ہوں۔." وہ قلانچیں بھرتا ہوا الاؤ کی روشنی سے رخصت ہوا۔.تاریکی میں اترا اور پھر اپنے پسندیدہ پتھر پر جا براجمان ہوا۔.تھوڑی دیر بعد اس تاریکی میں سگرٹ کا ایک جگنو ٹمٹمانے لگا۔.

یہ سفر اس لائق تو نہ تھا کہ اسے بیان کیا جاتا۔.لیکن اس کے کردار ایسے تھے جو بیان کے جانے کے لائق تھے۔.کیا آپ اتفاق کرتے ہیں؟

"درہ غلتر اور گلیشیئر کے پار.. ایک مجبوری برفباری"

نیلے گگن پر سفید بادل اُمڈتے تھے..
نیلے گگن کے تلے..
اور ان سفید بادلوں میں ساون کی گھنگھور گھٹاؤں ایسے کچھ بادل تھے جو نیلاہٹ پر بچھے جاتے تھے.. ایک سرمئی دُھند کی مانند..

پتھروں کے ایک وسیع ٹیلے کے اوپر.. بلندی پر.. جہاں آسمان تھا.. جب کہ میں چڑھائی چڑھتا اپنے پھیپھڑوں کی ناتوانی کو سانس سے بھرنے کی جستجو میں منہ کھولے ہانپتا تھا اور جب رُک کر اوپر دیکھتا تھا تو نیلے گگن پر سفید اور سرمئی بادل اسی رنگ کے ہاتھیوں کی مانند مستی میں جھومتے اٹھتے تھے..

تو وہاں.. مجھ سے بہت اوپر جہاں آسمان دکھائی دے رہا تھا وہاں میرے ساتھیوں کی رنگا رنگ جیکٹیں منظر میں.. ایک پتھروں سے اٹے ہوئے خشک منظر میں.. رنگ بھر رہی تھیں..

سُرخ.. نیلی اور زرد جیکٹیں.. حسن کا نیلا رین کوٹ.. گرد آمیز کی نامی نامی سُرخ پی کیپ.. وہ سب وہاں پہنچ چکے تھے اور میں پیچھے رہ گیا تھا اور اب ان کو نظر میں رکھتا اوپر آ رہا تھا..

کل کی شب اگر گزری تھی تو ظاہر ہے آج کی صبح بھی ہوئی تھی..

اور جب صبح ہوئی تھی اور میں اپنے خیمے سے باہر آیا تھا تو کچن کی نیلی ترپال کے قریب ایک پتھر کے گرد بہت سارے یاک دنگا کر رہے تھے.. لڑ جھگڑ رہے تھے آپس میں بھڑ رہے تھے اور اس پتھر پر پڑی کسی سفید شے کی چاہت میں پاگل ہوتے تھے..

معلوم ہوا کہ وہ شے.. نمک کا ایک ڈھیلا ہے..

عمران یاکوں کو نزدیک سے شوٹ کرنا چاہتا تھا اور وہ نزدیک نہیں آتے تھے تب ایک پورٹر نے بتایا کہ صاحب یاک.. نمک کے بے حد شوقین ہوتے ہیں.. نمک چاٹنے کو مل جائے تو اپنی یاکنی کو بھول جاتے ہیں چنانچہ ان کو پاس بلانے کے لیے ایک پتھر پر نمک کا ایک ڈھیلا رکھ دیا گیا تھا اور اسے چاٹنے کی جستجو میں ایک دوسرے کو دھکیلتے تھے اور عمران انہیں کلوز رینج میں شوٹ کر رہا تھا..

مجھے کچھ کچھ یاد ہے کہ آزادی سے پیشتر نسبت روڈ اور گوروارجن نگر کی دکانوں کے تھڑوں پر ہندو حضرات عبادت کے طور پر گئو ماتا کی خوشنودی کے لیے نمک کے بڑے بڑے ڈھیلے رکھ دیتے تھے.. اور گائیں سارا دن اس نمکین ضیافت سے لطف اندوز ہوتی رہتی تھیں.. ان مسلمان یاکوں کی خصلت بھی قدرے ہندو لگتی تھی کہ نمک چاٹنے کے لیے اپنے برادران اسلام کو ٹکریں مارتے تھے..

یاکوں کے اس دنگے فساد کے علاوہ میرے لیے اور دیگر ساتھیوں کے لیے آج صبح میں ایک اور دھچکا تھا..

اس خیمہ گاہ کو ہم نے ڈھلتی شام میں اور پھر تاریکی کی اُداسی میں دیکھا تھا اور اس کے آس پاس اور پس منظر میں جو کچھ تھا وہ ہماری نظروں سے اوجھل رہا تھا.. ہم اگرچہ ایک بلند اور بے روح فصیل کے سائے میں تھے لیکن ہم وہاں تھے جہاں شاہی پیک کے تینوں گنبد چھو لینے کی نزدیکی میں تھے.. نیچے ندیاں تھیں.. گلیشیئر تھے اور نہایت برفانی حیرت کدے تھے..

ہم پہاڑوں کی اوٹ میں پناہ گزیں یہ نہ جان سکے کہ ہم کہاں خیمہ زن ہیں.. صرف صبح نے.. اور سورج کی اولین کرنوں نے آس پاس کی بلندیوں پر جب اپنی روشنی نچھاور کی تو ہمیں احساس ہوا کہ ہم کہاں تھے.. اور ہم ناشکری کے مرتکب ہوئے تھے محض تاریکی اور تھکاوٹ کے باعث..

ناشتے کے فوراً بعد ہم اس چٹانی فصیل پر چڑھنے لگے جس کے دامن میں ہم نے رات گزاری تھی اور چیونٹیوں کی طرح چڑھنے اور رینگنے لگے..

یہ چڑھائی اتنی بھی آسان نہ تھی جتنی کہ ابراہیم نے بیان کی تھی.. اس میں دو چار سخت مقام بھی آتے تھے.. یہ مقام جان لیوا تو نہیں تھے لیکن بدن لیوا ضرور تھے..

اس بلند فصیل کے اوپر پتھروں کی ایک سلطنت آتی تھی..

اور یہاں ہم سب اپنے اپنے دکھ میں.. مشقت میں.. الگ الگ ہو گئے..

بلند پتھریلے کنارے تھے جن پر چلتے ہوئے آپ اپنا توازن کبھی برقرار رکھتے تھے اور کبھی نہیں رکھتے تھے..

وہاں زمین نہ تھی.. گھاس بھی نہ تھی.. محض پتھر تھے جن پر چلتے چلتے.. کہ انہی پتھروں پر چل کر.. اگر آ سکو تو آؤ.. ہم اگرچہ نہیں آ سکتے تھے لیکن آئے کہ ہم مجبور اور لاچار تھے..

اور جب میں نے ایک بار اوپر دیکھا اور نیلے گگن تلے رنگ رنگ کی چند جیکٹیں دیکھیں.. افق پر کچھ برفپوش آثار نظر آئے تو مجھے ڈھارس ہوئی کہ ہاں اوپر ایک بلند درّہ.. ایک گلیشیئر ہو سکتا ہے ورنہ ہماری خیمہ گاہ سے اوپر دیکھتے ہوئے یہی گمان ہوتا تھا کہ اوپر کچھ بھی نہیں ہے..

اوپر دیکھتے ہوئے اور پھر چڑھتے ہوئے یہی خدشہ تھا کہ جب میں ٹاپ پر پہنچوں گا تو وہاں کچھ بھی نہ ہوگا..

لیکن جب میں اُن جیکٹوں کو نظر میں رکھتے ہوئے بلند ہوتا وہاں تک پہنچا تو وہاں کچھ تھا..

وہ وہاں تھا..

پتھروں کی بادشاہی کی سنگ دلی کے بعد جب میں اوپر پہنچا تو وہ وہاں تھا..

ایک ہموار سطح پر یکدم اس کا آغاز ہو جاتا تھا.. برف زار سامنے تھے.. اور تاحد نظر تھے..

ان کا.. اس برف سفید کائنات کا کوئی انت نہ تھا.. کوئی حساب نہ تھا..

میں نے درّہ ملتر کو اپنے زعم میں.. سنولیک اور بالتورو کے بعد اتنا معمولی سمجھ لیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک کاغانی گلیشیئر ہوگا جس پر سے درجنوں جیپیں بھی آسانی سے گزر جاتی ہیں.. لیکن یہ تو ایک باقاعدہ اور معزز گلیشیئر تھا.. جس کے کناروں پر جتنی بھی بلندیاں تھیں ازلی برفوں میں ڈھکی ہوئی تھیں.. نہایت چُپ اور منجمد تھیں..

یہاں سے دائیں جانب اترنے سے آپ پھوراکے راستے پر آتے تھے اور اگر برفوں کی مسافت طے کرتے بائیں جانب رخ کرتے تھے تو حیال درّے کے پار چتور کھنڈ میں جا نکلتے تھے.. دیا نتر درّے کا راستہ بھی یہیں سے نکلتا تھا..

یہ جو وسیع گلیشیئر یکدم ہماری نظروں کے سامنے نمودار ہو گیا تھا اس میں صرف ایک ہی خوبی نظر آتی تھی کہ یہ بدن دریدہ نہ تھا.. کم از کم جہاں سے ہم اسے دیکھ رہے تھے وہاں سے نہ تھا.. اندر کے بھید ہم نہیں جانتے تھے.. جیسا کہ پہلی ملاقات میں ایک بظاہر معصوم اور نہایت نیک

خصلت دکھائی دیتی خاتون کے بارے میں آپ یہ نہیں جان سکتے کہ پوشیدگی میں اس کا بدن کیا ہے.. دریدہ ہے یا نہیں..

یہاں چائے کے لیے وقفہ ہوا..

ہم ملتر گلیشیئر کی اس وسعت کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھے..

یہ درّہ تقریباً چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا..

اگرچہ وسیع تھا لیکن اس کے باوجود ہماری نظر اس کا احاطہ کر سکتی تھی..

ہمیں دائیں جانب اترنا تھا..

ہم نے.. ہمارے پورٹروں نے اور ہم نے اس پر قدم رکھا تو اس کی برف سخت تھی.. نرم نہ تھی کہ چلنے میں دشواری ہوتی.. یہ بس ہمارے جوگرز کے نیچے آ کر کرچ کرچ کرتی اور ہمیں گزر جانے دیتی.. اس میں کوئی کھائی کوئی گہرائی نہ تھی.. یہ کسی حد تک کھیل تماشا تھا.. بلکہ پتھروں اور پگڈنڈیوں کی نسبت اس پر چلنا آسان تھا.. محض ماحول بنانے کی خاطر ہم نے اسے تشویش سے دیکھا پھر ذرا چلنے کی کوشش کی لیکن بات نہ بنی.. صرف بلندی مشکل میں ڈالتی تھی اور سانس سنبھال کر چلنا پڑتا تھا..

ہمارے دیکھتے دیکھتے نیلے گگن پر جو بادل تھے وہ گھنے ہوتے گئے اور پھر ایک دھندی چھا گئی.. موسم خراب ہو رہا تھا.. لیکن ہمیں پروا نہ تھی ہم موسم سے بھی زیادہ خراب تھے.. آہستہ آہستہ آگے پیچھے چلتے رہے.. نیچے ہوتے گئے..

اور تب جب ہم اس کے درمیان میں پہنچے ہیں اور ہمیں پتھروں کا وہ سرخ کنارہ نظر آنے لگا ہے جس پر ہم نے برف کی دنیا چھوڑ کر اترنا ہے تو.. برفباری شروع ہو گئی.. یہ کوئی باقاعدہ بھاری.. دفن کر دینے والی برفباری نہیں تھی.. مینہ کی بوندیں تھیں جو جماؤ میں آ کر سفید ہو گئی تھیں.. جم گئی تھیں اور ہمارے چہروں اور جیکٹوں پر گرنے لگی تھیں.. اور گرتے ہی پگھل بھی جاتی تھیں..

پہلا سوال ظاہر ہے کاظمی کی جانب سے آیا ''سر یہ کیسی برفباری ہے؟''

''یہ ویسی ہی برفباری ہے جیسی کہ برفباری ہوتی ہے''

''مجھے قبول ہے..'' وہ پھر سے بندر ہو گیا اُچھلتا کودتا برف کو چہرے پر ملتا وہ اپنی زندگی کی پہلی برفباری انجوائے کر رہا تھا..

ہاں زندگی کی پہلی برفباری تو ہر شخص کے لیے ایک ہیجان خیز طلسم ہوتی ہے.. جیسے پہلی

محبت میں در کھلتے ہیں.. جیسے کرسمس کی شب میں اپنے کالج کے پرنسپل کے گھر میں مدعو نوجوان طالب علم پیانو پر بیٹھی اس کی حسن آمیز بیٹی کی صرف ایک نگہہ التفات کے منتظر ہوتے ہیں تو کوئی مہمان اندر داخل ہو کر اطلاع دیتا ہے کہ.. باہر برفباری ہو رہی ہے..

یا مانچسٹر میں بھاری برفباری کے فوراً بعد ایک جنگل ہے جس کی ہر شاخ سفید ہے اور جب برف کا بوجھ بڑھتا ہے تو وہ جھک کر اسے خالی کرتی ہے تو سناٹے میں سرسراہٹ ہوتی ہے اور میری لینڈ لیڈی کا ننگنا سکاٹش ٹیریئر کنواری برف کی دبیز تہہ میں دھنسا جاتا ہے اور اس کے بالوں کے گرد برف کے گولے بن جاتے ہیں اور جب وہ چل نہیں سکتا تو میں اُسے گود میں اُٹھا کر گھر لے آتا ہوں اور آتش دان کے سامنے رکھ کر اُس کے بالوں کی برف پگھلاتا ہوں..

یا ریڈ سٹار کیمپ کی سویر میں ہماری نظروں کے سامنے سرسبز پہاڑ سفید ہوتے ہوئے کہ برفباری نے ہمیں آلیا تھا..

تو برفباری.. پہلی برفباری پہلی محبت کی مانند ہیجان خیز ہوتی ہے اسی لیے میں کاظمی کی کیفیت سے آگاہ تھا.. اگرچہ یہ کوئی خاص برفباری تو نہ تھی صرف بارش تھی جو سفید ہو کر برس رہی تھی ..میری سفید چترالی ٹوپی کی سفید اون کو مزید سفید کر رہی تھی.. میری نیلی جیکٹ پر سفید پھول گراتی تھی.. میرے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں پناہ لیے ہوئے تھے لیکن وہ میرے کانوں پر گرتی انہیں یخ کرتی تھی.. انہیں بے حسی کے قریب لے جاتی تھی.. بائیں ہاتھ پر برفپوش پہاڑ اونچے تھے اور وہاں یقیناً اس برفباری میں شدت آ چکی تھی.. ہم دائیں جانب اُتر رہے تھے..

"کیوں میاں صاحب کچھ روح میں بالیدگی پیدا ہوئی؟" میں نے میاں صاحب کو پکارا..

وہ رُک گئے سوچ میں پڑ گئے "تارڑ صاحب بہت زیادہ سوچیں تو شائد تھوڑی سی پیدا ہو جائے ورنہ یہ گلیشیئر تو مال روڈ ہے.. ہاں البتہ برفباری نے اس کی کراسنگ میں کچھ چاشنی پیدا کر دی ہے"

گلیشیئر کی ہمواری میں یکدم ایک وسیع اور چوڑی دراڑ سامنے آ گئی..

اسے دیکھ کر کسی پورٹر نے "یا ہو یا ہو" کا نعرہ نہ بلند کیا بلکہ اسے ٹاپ کر آگے چلے گئے البتہ عمران' کاظمی' طاہر اور گرد آمیز خوش ہو گئے کہ یہ ان کی زندگی کی پہلی برفانی دراڑ تھی.. وہ اس میں جھانکتے "ہوئے اوئے" کرتے پُرمسرت ہوتے تھے..

"سر جی.." کاظمی میرے پہلو میں آ گیا.. میں اس میں گرنا نہیں چاہتا.. اگرچہ اس کے اندر گر کر مجھے پتہ چلے گا کہ.. بقول میاں صاحب.. گوراپنڈا کیا ہوتا ہے لیکن میں اس میں گرنا نہیں چاہتا"

"تو نہ گرو.. ذرا اوپر چلے جاؤ جہاں اس دراڑ کا اختتام ہوتا ہے وہاں سے دوسری جانب چلے جاؤ"

"نہیں سر.. میں اسے بے جگری سے کراس کرنا چاہتا ہوں.. اسے ناپنا چاہتا ہوں.."

"پہلے تم یہ بتاؤ کہ صبح سے تم نے کتنے سگرٹ پیے ہیں؟"

اُس نے کانوں کی لویں چھوئیں "نہیں سر.. قسم لے لیں جو صبح سے ایک سُوٹا بھی لگایا ہو.."

"تو پھر ناپ جاؤ"

کاظمی نے ایک جست لگائی اور دراڑ سے کہیں آگے جا کر لینڈ کر گیا.. گرا اور کھڑا ہو گیا اور کپڑے جھاڑ کر انگلیوں سے "وی" کا نشان بناتے ہوئے نہایت فخر سے اعلان کیا "سر جی آپ اپنی کتابوں میں خواہ مخواہ دراڑوں سے ڈراتے رہتے ہیں.. یہ تو معمولی کام ہے.. بچوں کا کھیل ہے.."

اس پر میاں صاحب کو تاؤ آ گیا مڑ کر بولے "اوئے کاظمی دراڑوں کی بے حرمتی نہ کر بچے.. انہیں معمولی نہ کہنا.. بچے یہ کشتی رن کی طرح تمہیں اپنے اندر کھینچ لیتی ہیں اور تمہیں پتہ بھی نہیں چلتا.. ہم سے پوچھو ہم سے" انہوں نے اپنا مرغ بادنما سینہ تھپکا "بیافو پر کوئی قدم دراڑ کے بغیر نہیں ہوتا.. چٹی بوئی اور درکوت میں جو قہر بلائیں دراڑیں ہوتی ہیں وہ تمہارے جیسے بچے نگل کر ڈکار بھی نہیں لیتیں.. وزہ ویسپر سے نیچے اُترتے ہوئے بڑھتے والی دراڑیں ہوتی ہیں یہ بھی خالد ندیم سے پوچھنا کہ ان میں گرنے سے قبل بندے پر کیا گزرتی ہے.. یہ ذرا معصوم سی دراڑ ہے اس کے آگے متھا ٹیک اس کا شکریہ ادا کر کہ یہ اپنی بہنوں جیسی آدم خور نہیں ہے.. دراڑوں کی بے حرمتی نہ کر.."

"نہیں کرتا میاں صاحب.." کاظمی سہم گیا اور کان لپیٹ کر چلنے لگا..

برفباری کو شائد ہماری بے اعتنائی پسند نہ آئی اور وہ صرف ہمیں متاثر کرنے کی خاطر باقاعدہ اور گھنی ہو گئی.. اتنی زیادہ کہ ہمیں راستہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا.. ہر شے سفید ہو گئی.. نظروں کے سامنے جو کچھ تھا وہ سب کا سب سفیدی کے لبادے اوڑھنے لگا.. یہاں تک کہ تمام کوہ نورد بھی سنو مین دکھائی دینے لگے.. گدا اپنے گرد آمیز کو سہارا دیے گلیشیئر کے پار لے جا رہا تھا..

لیکن یہ کچھ لمحوں کا کھیل تھا.. برفباری میں کچھ کمی آ گئی..

آسمان کی نیلاہٹ اور سرد رنگت میں البتہ کمی نہ ہوئی.. جیسے سویر ہونے کو ہو.. ابھی نیلا اندھیرا ہو.. کچھ سلیٹی سی سرد اداسی ہو..

گلیشیئر کا کنارہ آ گیا.. ہم اُس پر سے اُتر کر سرخ پتھروں پر آ گئے..

پتھروں پر قدم رکھا ہے تو برف سرد یلی بارش میں بدل گئی.. جیسے وہ صرف درّہ غلتر کے لیے ہی گرتی تھی.. پتھروں پر گرنا اُسے پسند نہ تھا..

ہم سانس لینے کے لیے رُک گئے.. درّہ غلتر پر ایک آخری نظر ڈالنے کے لیے رُک گئے..

اپنے بدنی حجم کے مطابق پتھر تلاش کر کے اُن پر براجمان ہو گئے اور بارش مسلسل ہوتی چلی جاتی تھی..

عمران نے اپنے قیمتی کیمرے کو بارش سے بچانے کی خاطر ایک برساتی پہن رکھی تھی اور وہ اس میں سر دیئے ہماری تھکاوٹ اور ٹھٹھرتی بے بسی کو فلم بند کرنے میں مشغول تھا..

اس کے کیمرے کا رُخ زرد جیکٹ اور نامی پی کیپ میں ملبوس نرم اور گداز ٹیڈی بیئر گرد آمیز کی جانب ہوا "ہیلو نامی...."

گرد آمیز اپنا سانس درست کر رہا تھا.. گدا کے کندھے کا سہارا لیے ہونک رہا تھا.. اور گدا اس عزت افزائی پر کہ گرد آمیز ایسی اہم ملتانی شخصیت اس کے کندھے کا سہارا لیے ہوئے ہے نہایت پاکیزہ اور معطر محسوس کر رہا تھا..

جب گرد آمیز نے کوئی جواب نہ دیا تو عمران نے پھر پکارا کیونکہ اس کی فلم ضائع ہو رہی تھی "نامی.. گڈ بوائے نامی.. اس طرف دیکھو پلیز اور درہ غلتر کو پار کرنے کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرو.. کم آن نامی.." گڈ بوائے نامی نے کیمرے کی جانب چہرہ کیا اور ذرا شرما کر.. ذرا الجا کر کہا "یہ تو تارڑ سائیں کی مہربانی ہے اور گدا کا سہارا ہے کہ ہم ادھر آ گئے.."

"نہیں سر.." عمران نے برساتی میں سے کلام کیا "اردو میں نہیں.. انگریزی میں اپنے تاثرات ریکارڈ کروائیں ہو سکتا ہے یہ ڈاکومنٹری انٹرنیشنل سرکٹ پر چلے"

نامی نے جو تاثرات ریکارڈ کروائے وہ ایسی انگریزی میں تھے جو سراسیمگی سے جدا نہ ہوتی تھی.. لمحہ بھر کے لیے اگر جدا بھی ہوتی تھی تو پھر سے اداس ہو کر اُسے جپھا مار لیتی تھی.. دیگر ساتھیوں کی انگریزی بھی تتر بتر ہو گئی.. البتہ حسن صاحب قدرے سرخرو رہے کہ ان کی بیگم امریکیوں

کو اردو پڑھاتی ہیں اور وہ انہیں انگریزی پڑھاتے ہیں.. سلیم چونکہ یوں بھی ملٹی نیشنل تھا اس لیے وہ اس پُل صراط سے بخوبی گزر گیا.. بھلا اُس پر کون انگلی دھرے.. اور میری انگریزی کے بارے میں صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ وہ میری اردو سے بھی زیادہ کمزور ہے.. چنانچہ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کتنی کمزور ہو گی.. بلکہ جاں بلب ہو گی.. پچھلے کئی روز سے کیمرے کی خاطر انگریزی بول بول کر میرا لہجہ نرم پڑ گیا تھا.. کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی میری انگریزی پر گرفت سی اے ٹی.. کیٹ.. کیٹ معنی بلی.. اور آر اے ٹی.. ریٹ.. ریٹ معنی چوہا سے آگے نہیں بڑھی تھی..

میاں صاحب نے البتہ انگریزی کو دھوبی پٹڑہ دیا تھا اور اس کے سینے پر سوار ہو کر گویا کہتے تھے.. اوئے نامرادیم اب بول..

شاہد صاحب چونکہ ذرا خفیہ طور پر منمنا کر بات کرتے تھے اس لیے یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کونسی زبان میں گفتگو کر رہے ہیں..

اگرچہ غلتر گلیشیئر اپنے تئیں خاص معزز اور مناسب گلیشیئر تھا.. لیکن یہ ہمارا پہلا گلیشیئر نہ تھا اس لیے ہم اس کی عزت نہ کر سکے.. اگر ہوتا تو اسے عبور کرنے پر ہم اپنے آپ کو شرپا تن زنگ اور ایڈمنڈ ہلیری کے ہم پلہ ضرور سمجھتے..

ہم ذرا آرام کرنے کے بعد گلیشیئر کے پہلو بہ پہلو بڑے بڑے پتھروں.. تالابوں اور گیلی بجری پر قدم جماتے نیچے وادی میں اُترنے لگے اور پھر.. ایک مرتبہ پھر برف پر آ گئے کیونکہ غلتر گلیشیئر کی دُم وادی میں اتر رہی تھی.. اور یاد رہے کہ ہم وادی غلتر سے جدا ہو چکے تھے اس لیے ادھر یہ پھسورا گلیشیئر کہلاتا تھا.. گلیشیئر کی یہ وسیع دُم بہت دور تک جا رہی تھی.. ہم نے اسے ناپسند کیا.. یہ تو کوئی بات نہیں کہ ہم اسے عبور کر آئے تھے اور اب ایک مرتبہ پھر اس کی نوشل پر.. اُس کے سرد بہاؤ پر ہمیں سفر کرنا تھا.. یہ تو کوئی بات نہ تھی.. صریحاً زیادتی تھی..

یہ برف بالکل پتھر تھی.. اس پر بے دھیانی اور اطمینان سے نہیں چلا جا سکتا تھا.. قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا تھا.. اگرچہ ہماری پھونکوں سے وہ پگھلتی نہیں تھی..

بلندی البتہ کم ہوتی گئی..

یہاں تک کہ درّہ غلتر نظروں سے اوجھل ہو گیا.. اوپر رہ گیا..

لیکن یہ ایک عجیب اُلّو کی دُم گلیشیئر کی دُم تھی جو پوری وادی کو بھرتی تھی اور ختم نہ ہوتی تھی.. بائیں ہاتھ پر بھی برف انباروں سے ڈھکے پہاڑ تھے.. موسم گدلا اور بے لطف تھا اور جاگنوں

میں جتنی سکت تھی نچڑ چکی تھی.. درّے کو عبور کرنے کا چاؤ اور چلبلاہٹ دم توڑ چکی تھی اور تھکاوٹ اس طور زیر کرتی تھی جیسے دم نکال کر رہے گی..

کہیں کہیں اکا دکا درازیں بھی منہ پھاڑے منتظر ہوتی تھیں لیکن ہم ان کو منہ نہ لگاتے تھے..

اس برف زار پر چلتے مدتیں بیت گئیں..

درّہ خلتر محض دکھاوا تھا آزمائش تو اب شروع ہوئی تھی..

طاہر ایک ایسے سنو مین کی طرح جس کی تعمیر میں خرابی واقع ہوگئی تھی.. شپ شپ کرتا.. لمبے لمبے ڈگ بھرتا.. نہ احتیاط کرتا اور نہ یہ دیکھتا کہ آگے کیا ہے منہ اٹھائے وادی کو دیکھتا ایک ناقص روبوٹ کی مانند چلتا جا رہا تھا..

البتہ کاظمی پھر سے اداس ہوگیا تھا "سر جی.. اب برفباری نہیں ہوگی؟"

"شائد نہیں.. کیونکہ ہم بلندی کم کرتے نیچے ہو رہے ہیں"

"اور اگر ہم واپس بلندی پر چلے جائیں تو وہاں برفباری ہو رہی ہوگی؟"

"وہاں جا کر دیکھ لو.." میں نے چڑ کر کہا..

"اور سر وہاں پتہ ہے کیسی برفباری ہو رہی ہوگی.. ویسی جیسی کہ برفباری ہوتی ہے"

میں اب مسکرانے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا..

"کاظمی تم نے کبھی دریا میں قدم رکھا ہے؟"

"کیوں نہیں سر جی.. راوی میں بہت بوٹنگ کی ہے.. نہائے بھی ہیں"

"تو دریا کے پانی کبھی ایک جیسے نہیں رہتے.. جن پانیوں میں تم ایک بار اُترتے ہو دوسری بار اُترنے سے وہ پانی نہیں رہتے.. وہ گزر گئے ہوتے ہیں.. وہ ایک اور دریا ہوتا ہے.. ایسے ہی برفباری ہوتی ہے.. تم بے شک دوبارہ اوپر درّے تک چلے جاؤ لیکن اب وہاں جو برف گر رہی ہوگی وہ نہیں ہوگی جو ایک گھنٹہ پیشتر تم پر روئی کے سفید گالے اُتراتی تھی.. اب وہ سفیدی اور ہوگی وہ گالے اور ہوں گے اور تمہیں پہچان نہ پائیں گے.. تو دوبارہ اوپر جانے سے فائدہ؟"

"ہاں فائدہ.." اس نے سر ہلایا "اگرچہ میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں لیکن فائدہ.."

"برف کا ایک بگولا.. ایک واورولا.. جس کی نیلی برفوں کے کنویں میں سے میرے اباجی کی آنکھیں مجھے دیکھتی ہیں"

ہم سے کچھ فاصلے پر پورٹروں کا قافلہ رُکا ہوا تھا.. برف کی سفیدی پر ہمارا سامان ڈھیر تھا.. ایک ایک رُک سیک اور ڈرم جیسے سفید کینوس پر رنگین تصویر کی صورت میں دکھائی دیتا تھا.. میاں.. شاہد.. حسن اپنی ورکنگ سٹکس برف میں گاڑے کھڑے تھے.. نہائت اداس اور سنجیدہ جیسے کوئی ٹریجڈی ہوگئی ہو.. انہیں یوں کھڑے دیکھ کر میرا دل دھڑکا.. شائد کوئی حادثہ ہوگیا ہے.. کوئی پورٹر دراڑ میں گر گیا ہے..

میں تیز تیز چلتا اور پھسلتا قریب ہوا تو وہاں کھڑے ابراہیم نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں مجھے خبردار کیا "صاحب سیدھے مت آؤ.. ذرا اوپر سے ہو کر ادھر آؤ.."

"کیوں؟"

"ادھر برف کی کھائی ہے سر.. احتیاط کرو"

میرے آگے کوئی دراڑ نہ تھی.. البتہ پہلو میں ایک نیلی ندی تھی جو بہت دیر سے میرے ساتھ بہتی ہوئی آ رہی تھی.. گلیشیئر کی برف میں راستہ بناتی چلی آ رہی تھی.. اس کے پانی نیلاہٹ سے چُور تھے اور جن برفوں میں سے وہ گزرتی تھی ان کا رنگ بھی شفاف نیلا تھا..

تب میں نے دیکھا کہ سب لوگ شدید فکرمندی کی حالت میں اور ذرے ذرے جہاں یہ ندی گم ہوتی تھی اور وہاں جو کھائی تھی اس میں جھانک رہے ہیں.. مجھے یقین ہوگیا کہ کچھ نہ کچھ ہو گیا ہے..

میں ابراہیم کی وارننگ کے مطابق ذرا پرے ہو کر احتیاط سے قدم رکھتا آگے ہوا.. آگے ایک برف گہرائی ایک کھائی تھی جس کے دوسرے کنارے پر سب مخلوق ڈری ڈری لیکن قدرے پر اشتیاق نگتی اس میں جھانک رہی تھی..

میں دوسرے کنارے تک پہنچا تو وہ سب ایک کنویں میں جھانک رہے تھے..

برف کے ایک آبشاری کنویں میں.. اور اس کا شور بے پناہ تھا.. وہ سب جھانکتے تھے ..ایک دوسرے کو تھامے ہوئے کہ کہیں وہ اس میں گر نہ جائیں.. جھجکتے لیکن پُر شوق ہوتے.. بدن میں دوڑتے خون کے ہر ذرے میں احتیاط برتتے.. وہ ایک ایسے برفانی بھنور کے طلسم کی زد میں تھے.. کہ آنکھیں نہ جھپکتے تھے..

میں ابھی صرف ان کے چہروں پر جو عجوبہ حیرت تھی اور ہر لمحے اس کی تصویر بدلتی تھی اُسے دیکھ رہا تھا.. ابھی جس میں وہ جھانکتے تھے اُسے نہ دیکھتا تھا.. میں اور قریب ہوا..

وہ ندی جو میرے برابر میں گلیشیر کی برفوں میں نیلاہٹ کی کرچیاں بکھیرتی بہتی آ رہی تھی یکدم یہاں پہنچ کر ایک برفانی کنویں میں گرتی جا رہی تھی.. ایک آبشار کی صورت.. اس کے سرد اور برف ہوتے پانیوں کا حجم پرشور اور ہیبت بھری آوازوں کے ساتھ کنویں کی اتھاہ اور تاریک گہرائیوں میں گرتا جا رہا تھا..

کنویں کی برف دیواریں جہاں تک روشنی اترتی تھی شیشہ نیلاہٹ کے رنگ کی تھیں.. بلوریں فانوسوں کی مانند تھیں اور ان کے نیچے تاریکی تھی.. ندی کے پانی اس تاریکی میں گم ہو کر جانے کہاں جاتے تھے..

یہ ایک ایسا عجوبہ منظر تھا جو نہ تو آج تک کسی سائنس فکشن کی کتاب میں تخلیق ہوا ہے اور نہ اس نے کسی فینٹسی میں جنم لیا ہے.. یہ کسی داستان امیر حمزہ میں بھی بیان نہیں ہوا کہ.. اسے انسانی ذہن کی فینٹسی تخلیق ہی نہیں کر سکتی..

اوپر سے ذرہ ذرہ بلندی سے اُترتی برف کناروں میں مچلتی شیشہ ندی کے پانی یکدم ایک ایسی آبشار ہوتے تھے جو نیاگرا سے کہیں بڑھ کر شاندار اور دنگ کر دینے والی تھی اور یہ آبشار تقریباً بیس میٹر قطر کے ایک برفانی کنویں میں گر رہی تھی اور اس کنویں کی تہہ کہاں تھی وہ تو دکھائی نہیں دیتی تھی .. صرف اس آبشار کے گرنے کا شور تھا جو کہیں پاتال سے اٹھتا اوپر آتا تھا اور کانوں کو بہرا کرتا تھا..

کنواں بھی برف کا ہے.. پاتال بھی برف اور اس میں گرتے پانی نیلگوں شیشہ اور شور!

اس سے پیشتر میں نے بیافو گلیشیر پر ایک ایسا کنواں دیکھا تھا.. لیکن وہ بہت چھوٹا سا تھا اور اس میں پانی کی ایک چھوٹی سی نالی گرتی تھی.. یہ کیفیت نہ تھی..

میں جب آہستہ آہستہ اس کے گرد چلتا دوسری جانب گیا ہوں جہاں میرے ساتھی جھک جھک کر اسے دیکھتے تھے اور جب میں نے اس سفید خواب کنویں کی پہلی جھلک دیکھی تو بے اختیار اس میں جھانکنے کے لیے آگے بڑھا تو سلیم نے مجھے باقاعدہ جپھا مار کر پیچھے کر لیا کہ ..نہیں تارڑ صاحب.. خطرناک ہے.. اور یہ خطرناک تو تھا ایک پل میں آپ اس میں جھانکتے ہیں اور پھسل کر دوسرے پل میں اس آبشار کے ساتھ نیچے چلے جاتے ہیں تو کہاں جاتے ہیں.. کوئی گر کر واپس آئے تو بتائے کہ کہاں جاتے ہیں..

البتہ ایک مہربانی تھی.. ایک آسانی تھی کہ اس کے کنارے ایسے ڈھلوان نہیں تھے کہ انسان لُڑھک کر پھسلتے ہوئے اندر گر جائے بلکہ اونچے تھے..

میں آگے بڑھ کر اس میں نہ جھانکوں یہ تو نہیں ہونے کا.. جھانکنا تو مجھے بہر حال تھا.. بنا اس سفید مرگ میں جھانکے میں یہاں سے جانے کو نہ تھا.. میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ جو آبشار گر رہی ہے اور اس کے سرد شیشہ چھینٹے میرے چہرے پر کرچیوں کی مانند برستے اُسے یخ کرتے تھے تو کہاں تک گرتی ہے.. اس سفید بھید کی تہہ کہاں ہے.. میں نے ہر صورت یہ پتہ لگا لینا تھا.. آ برف بیل مجھے مار.. کہنا تھا.. اور بہت غور کرنے سے مجھے ایک ترکیب سوجھی "ابراہیم.."

ابراہیم میرے قریب آ گیا "جی صاحب.."

"دیکھو میں ادھر برف پر لیٹتا ہوں اور تم پیچھے سے میرے دونوں پاؤں پکڑ لو.. میں آہستہ آہستہ برف پر کھسکتا آگے ہوتا کنویں کے کنارے تک جاتا ہوں لیکن میرے پاؤں مضبوطی سے پکڑے رکھنا چھوڑنا نہیں.."

ابراہیم اگرچہ ایک اچھی روح تھی لیکن اس کنویں کی سرد موت اس کے سامنے تھی اور وہ روح اسے دیکھ کر پرواز کرنا چاہتی تھی "چھوڑیں صاحب.. خطرہ ہے"

"اگر تم میرے جوگرز کو پیچھے سے مضبوطی سے پکڑے رکھو گے تو اتنا خطرہ نہیں لیکن ابراہیم تمہیں آتش نمرود کی قسم میرے جوگرز نہ چھوڑنا.."

"کیا صاحب؟"

"کچھ نہیں.. بس میرے پاؤں نہیں چھوڑنے.."

میں نے اپنا مختصر رک سیک اُتار کر برف پر پھینکا.. پہلے اپنے جوگرز کے تسمے کھول کر دوبارہ کسے کہ کہیں ڈھیلے ہونے کی صورت میں ایسا نہ ہو کہ وہ ابراہیم کے دونوں ہاتھوں میں رہ جائیں اور میں کنویں میں گر جاؤں.. پھر میں اپنے دونوں بازو پھیلا کر برف پر سیدھا لیٹ گیا جیسے بدھ حضرات مہاتما کے مجسمے کے سامنے لیٹ جاتے ہیں یا نئے کارڈینل حلف اٹھاتے وقت پوپ کے سامنے لیٹ جاتے ہیں.. ابراہیم نے پیچھے سے میرے دونوں پاؤں اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیے اور میں رینگتا ہوا کنویں کے کنارے تک چلا گیا. صرف کنارے تک نہیں ذرا آگے یہاں تک کہ میرا چہرہ اب اُس خلاء کے اوپر تھا جس کے نیچے کنویں کے بھنور میں آبشار دھما دھم گر رہی تھی.. میری جان.. جاگرز میں اٹکی ہوئی تھی جنہیں ابراہیم نے جکڑ رکھا تھا..

گھسٹتا ہوا جب میں آگے ہوا تھا تو میرا پورا بدن ان ہتھیلیوں تک جنہیں میں ایک تیراک کی مانند برف پر چلاتا آگے ہوا تھا ایک برفیلی اور منجمد کیفیت میں چلا گیا تھا لیکن جونہی میرا چہرہ اس گہرے غار کنویں کے اوپر آیا تو آبشار کے پانیوں کے نیچے جو تھاہ گہرائی تھی وہاں سے جو کثیلی اور تند برفیلی ہوا ایک مرغولے کی طرح اٹھتی تھی یہ چہرہ اس کے راستے میں آیا تو گویا سردی سے حنوط ہو گیا..

چنانچہ میرا بدن تو برف تھا لیکن اُس میں زندگی کی رمق اور حرارت نہیں بجھی لیکن چہرہ جو تھاہ پاتال سے اٹھتی. مرغولوں کی صورت میں اٹھتی برفیلی ہواؤں کی زد میں آ کر بقیہ بدن سے الگ ہو گیا اور حنوط ہو گیا..

میرا حنوط شدہ چہرہ کنویں میں جھانکتا تھا.. ایک بے پناہ شور اور نیلی برف گہرائی میری آنکھوں تلے تھی.. آنکھیں جنہیں سرد ہوا اور چھینٹے دیکھنے نہیں دیتے تھے..

اور میں کیا دیکھتا تھا..

برف کی سنگ مرمر سفیدی میں گھڑا ہوا کہیں کہیں نیلاہٹ میں رنگا ہوا ایک برف مرغولا جس میں سرد یلی کرچیوں والے پانی گرتے چلے جاتے تھے.. گرتے چلے جاتے تھے.. اور وہ کہاں تک گرتے چلے جاتے تھے.. اس کا کوئی انت نہ تھا.. کچھ پتہ نہ چلتا تھا.. بس ایک کائناتی خلاء تھا جس میں یہ پانی گونجتے گھومتے گرتے تھے.. نیچے کوئی بلیک ہول تھا جو پانی کی کائناتوں کو اپنے اندر کھینچتا.. چوستا انہیں ہمیشہ کے لیے معدوم کر رہا تھا..

میرا حنوط شدہ چہرہ آنکھیں نہیں جھپکتا تھا.. اور یہ آنکھیں جیسے وقت کی ایک برف غار

میں اترتی جا رہی ہیں.. آبشار کے ساتھ گرتی جا رہی ہیں اور اس غار کے آخر میں کوئی روشنی دکھائی نہیں دیتی.. گھپ اور سرد اندھیرا ہے..

ابراہیم کبھی کبھار خوفزدہ ہو کر مجھے پیچھے گھسیٹ لیتا اور میں ہاتھ چلاتا پیرا کی کرتا پھر سے آگے ہو جاتا کہ برف کے اس بھنبیر سانپ نے مجھے مسحور کر رکھا تھا..

وہ کچھ کہتا تھا.. شائد یہی کہ صاحب اب پیچھے ہو جاؤ لیکن پانیوں کے بے انت شور میں کچھ سنائی نہیں دیتا تھا اور اگر میں کچھ سن بھی لیتا تو جان بوجھ کر سنی ان سنی کر دیتا کہ کون ہے جو ایک برفانی تاج محل کے اندر چلا جائے اور پھر اپنی من مرضی سے واپس آ جائے..

کون ہے جو ایک نئی کائنات کے بھید کے اندر سفر کر رہا ہو اور اپنے قدم روک لے..

اس کنویں میں سے.. برف سنگ مرمر کے گول محل میں سے ایسی سرد ہواؤں کے مرغولے اٹھتے تھے جو آج تک کسی اور کے چہرے کو نہیں چھوئے تھے.. تو میں کیسے پیچھے ہو جاتا..

مجھے یہ مرغولے اپنی لپیٹ میں لے کر کہیں کا کہیں لے جا رہے تھے..

وقت کی غار میں سفر کرتا میں کہیں کا کہیں جا رہا تھا..

ان مرغولوں میں میرے بچپن کی تصویریں گھومتی چلی آتی تھیں..

ایک فوٹوگرافر کے سٹوڈیو میں ایک اونچے سٹول پر بیٹھا ہوا ایک گول مٹول بچہ.. گیلس کے ساتھ نیکر پہنے ہوئے.. پس منظر میں پردے پر ایک پہاڑی منظر ہے.. اور بچے کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہیں.. شائد وہ کیمرے سے خوفزدہ ہے.. کتنے برس پہلے.. صرف ستاون برس پہلے..

میرے دادا جان چوہدری امیر بخش ایک سادہ دہقان اتنے ہی برس پیشتر مجھے اپنے کندھوں پر اٹھائے لاہور ریلوے سٹیشن کے قریب ایک جوہڑ تک لے جا رہے ہیں کہ وہاں کچھ بطخیں ہیں جنہیں دیکھ کر میں خوش ہو جاتا ہوں.. اور وہ سارا دن کھائے پیئے بغیر مجھے بطخوں سے کھیلتے دیکھتے رہتے ہیں اور اپنے اکلوتے پوتے کو دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں..

میرے اباجی کی نیلی آنکھیں اس کنویں کی نیلی دیواروں میں کہیں دکھائی دیتی ہیں اور پھر ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاتی ہیں.. سنو لیک پر پرواز کرنے والی تتلیاں جو کنویں کی تہہ میں سے اڑتی آتی تھیں میرے حنوط شدہ چہرے سے ٹکراتی تھیں اور وہ بھی برف کی ہیں اور کرچیوں میں بکھر جاتی ہیں.. پھر سے آبشار کے پانیوں میں شامل ہو کر نیچے چلی جاتی ہیں.. میرے چہرے کے نیچے ایک ایسا حیرت کدہ تھا کہ جو کچھ آسمانوں سے اترتا ہے اگر میں اس لمحے اس کی خواہش کرتا تو وہ میرے

لے پاتال سے الفتا مجھ پر کوئی صحیفہ نازل کر دیتا..

مجھے میرے رب نے کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا تھا جن کا میں شکر ادا نہیں کر سکتا تھا.. یہ نعمتیں آبشار کے پانیوں میں بھیگتی اوپر آتی میرے یخ چہرے کو چھوتی تھیں اور کہتی تھیں کہ تم جتنا بھی شکر ادا کرو کم ہے.. یا سلام یا مومن یا اللہ..

ابراہیم نے شاید مجھے مردہ جان لیا کہ میں حرکت نہ کرتا تھا.. اوندھا پڑا آبشار میں سے بلند ہوتے چھینٹوں میں بھیگتا بے سدھ اوندھا پڑا تھا.. اس نے زور لگا کر مجھے پیچھے کھینچ لیا لیکن میں اسی حالت میں دیر تک پڑا رہا.. برف پر برف ہوتا رہا..

عمران اسی نسخے پر عمل کر رہا تھا.. البتہ اس کا ایک پاؤں کامی کی گرفت میں تھا اور دوسرا جابر نے جکڑ رکھا تھا اور وہ تقریباً اپنا نصف بدن اس خلاء پر معلق کئے اس حیرت کدہ برف کو اپنے کیمرے میں اُتار رہا تھا..

ہم اس طلسم سے بچھڑنا تو نہیں چاہتے تھے..

چاہتے تو یہ تھے کہ اس کے کنارے پر خیمہ زن ہو جائیں.. اور آج کی شب چاند میں جتنی بھی چاندنی ہے اس میں اپنے جو گرز ابراہیم کے ہاتھوں میں جکڑوا کر نیچے دیکھیں تو سہی جھانکیں تو سہی کہ اس سے اس آبشار منظر میں کیسے معجزے جنم لیتے ہیں.. کنویں کی برف دیواروں کی کرچیاں اس کی کرنوں میں کیسے کیسے دمکتی ہیں اور آبشار کے چھینٹے ایک انار میں سے چھوٹتے شراروں کی مانند کیسے الگ دکھائی دیتے ہیں.. شب کی تاریکی میں اپنے خیموں میں لیٹے ہوئے پانیوں کا یہ گرتا شور کیسے سنائی دیتا ہے..

لیکن جدائی پر اگر اختیار ہوتا تو یہ لفظ ہی وجود میں نہ آتا..

”سُرخ پتھر.. کروئی بخت.. اور گھاس پر بچھا ایک اور تخت“

ہمیں آج ہی سُرخ پتھر تک پہنچنا تھا..

ہر ایک نے اس برفانی کنویں کو ایک مندر کی طرح پرنام کیا.. اس میں گرتی آبشار کو دل ہی دل میں سجدہ کیا اور پھر اس سے جدائی اختیار کی..

اس کے سریلے شور نے دور تک ہمارا پیچھا کیا اور جب خاموشی ہوئی تو بھی گلیشیر اختتام کو نہ پہنچا لیکن اب ہم.. اس سے جدا ہو کر ذرا اونچے ہوئے اور ایک ایسے بلند کنارے پر آ گئے جو ایک مسلسل پُل صراط تھا.. بال سے قدرے موٹا ہو گا لیکن اُسترے کی دھار ایسا تیز تھا.. دائیں جانب گلیشیر بدستور تھا..

یہ بلند کنارا دور سے ایسا لگتا تھا کہ اس پر کوئی پرندہ بھی بیٹھ نہیں سکتا یا اتنا تیز اور خطرناک تھا.. اور بہت اونچا تھا..

اس پر ایک مخدوش سی پگڈنڈی تھی.. اور اس پر ہم ہاتھ پھیلائے.. واکنگ سٹکس سے اپنے آپ کو گرنے سے بچاتے اب ایک شدید دھوپ کے گرم موسم میں چل رہے تھے..

یہ ایک عجیب اینٹی کلائمکس تھا..

ہم کوئے یار سے نکلے تھے تو سوئے دار چلے تھے..

اور سوئے دار جو بھی چلتا ہے.. ہم جیسا.. تو مجبوری اور ناتوانی میں چلتا ہے اور قدم گھسیٹتے ہوئے چلتا ہے.. ایسے ہم چل رہے تھے..

یہاں دشواریاں اتنی بڑی تھیں لیکن آسان نہیں ہوتی تھیں..

وادی جو نیچے ہی نیچے جاری تھی اُس کے تقریباً درمیان میں یہ بلند فصیل تھی جس پر ہم

چل رہے تھے.. اور اپنے آپ کو دائیں جانب گرنے سے بچاتے تھے کہ وہ کمبخت گلیشیر ابھی تک نیچے چلا آ رہا تھا.. اور بائیں جانب گرنے سے گریز کرتے تھے کہ اُدھر پتھروں کے انبار تھے..

جب کسی کو یاد آیا کہ دوپہر ہو چکی ہے.. دن ڈھلنے کو آ رہا تھا اور ہم نے ابھی تک پیٹ پوجا نہیں کی تھی۔ "ابراہیم.."

وہ کہیں آس پاس تھا حاضر ہو گیا "جی صاحب؟"

"یار لنچ کدھر گیا.. کب کرے گا.. کہاں کرے گا؟"

"صاحب اس اونچے گلیشیر کے کنارے کا جہاں خاتمہ ہو رہا ہے.. وہاں نیچے.. بہت نیچے جدھر کچھ گھاس کچھ درخت دکھائی نہیں دے رہا؟"

"نہیں دکھائی دے رہا"

"ابھی دکھائی دے گا.. تو ادھر رکے گا اور لنچ کرے گا.. ادھر تو رکنے کا کوئی جگہ نہیں۔"

یہ ایک انتہائی پُر اذیت سفر تھا..

ہر کوئی نڈھال ہو چکا تھا.. ہم صبح سے چل رہے تھے اور بدن کی توانائی خوراک کی کمی کے باعث بھی.. اور تھکن کے بوجھ سے بھی.. بڑھتی جاتی تھی..

برف کنویں کی آبشاری ٹھنڈک بدن سے رخصت ہو چکی تھی اور اب یہ جلتا تھا.. سلگتا تھا اور بھوکا تھا..

خدا خدا کرکے دائیں جانب جو واہیات اور ناپسندیدہ مطر گلیشیر اب تک چلا آتا تھا ختم ہوا.. ہم اُس اُسترا دھار کنارے سے نیچے آئے.. نیچے آئے تو سخت نامعقول پتھروں کی دنیا میں آ گئے.. قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے.. گرتے پڑتے.. سفر کی صعوبت اس لمحے ایسی تھی کہ ہم ایک روٹی کے لیے.. مٹھی بھر چاولوں کے لیے اور ایک خیمے میں استراحت کی خاطر.. اپنا عقیدہ بدل سکتے تھے..

نہ ہم چل سکتے تھے.. نہ ہم رک سکتے تھے..

اب اس جسمانی اور ذہنی اذیت کے بیان کو کیا طول دینا.. قصۂ درد مختصر کرتے ہیں تو شام کے پانچ بج رہے ہیں.. ہم لڑھکتے گرتے پڑتے.. ٹھوکریں کھاتے ایک گھاس بھری ڈھلوان تک بالآخر پہنچتے ہیں جہاں ہمارے پورٹر کب کے استراحت فرماتے ہیں اور ہمیں اس مقام پر پہنچ کر تھکن سے ڈھیر ہوتے دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں..

"صاحب لنچ بنائے گا؟" ابراہیم ہماری جانب آ گیا بلکہ ہمارے ڈھیر کی جانب آ گیا..

بنائے گا.. بنائے گا.. ہر جانب سے ان کی صدائیں بلند ہوئیں جو کہہ رہی تھیں کہ ہم ٹوٹ چکے ہیں ہمیں خوراک سے جوڑ دو.. ہم بھوکے ہیں.. ہم بھوکے ہیں..

"ہم رات ادھر کرے گا؟"

"نہیں صاحب ابھی صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر سرخ پتھر کا علاقہ ہے آپ اُدھر پہنچے گا تو خوش ہو جائے گا.. رات اُدھر کرے گا۔"

"تو ابراہیم آپ ہمیں اُدھر ہی خوش کر لینا.. ادھر لنچ بنائے گا تو رات ہو جائے گا.. چلو"

پورٹروں نے میرے اس فیصلے پر خوشی کا اظہار کیا.. کچھ ساتھیوں نے منہ بنائے اور بڑبڑائے اور ہم پھر سے چلنے لگے..

اگرچہ ابراہیم نے یہ بیان دیا تھا کہ سرخ پتھر کیمپنگ صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے لیکن اس نے ہمیں یہ نہیں بتایا تھا اس مسافت کے درمیان میں کم از کم تین چار ایسے پہاڑی نالوں کی تقریباً خشک گزرگاہیں واقع ہیں جن کے کنارے بے حد بلند ہیں اور ان میں اُترنا اور نیچے پہنچ کر دوسرے کنارے پر چڑھنا صرف اور صرف بکریوں.. اور پھر تیلی بکریوں کے بس میں ہے..

یہ ایسے نالے تھے کہ جب آپ جھاڑیوں اور درختوں میں سے گزر کر ان کے کناروں تک آتے تھے تو نیچے جانے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا کیونکہ وہاں راستہ ہوتا ہی نہیں تھا.. ایک خیالی کنکریلی سیدھی دیوار ہوتی تھی.. جس کے دامن میں آپ کو اُترنا ہوتا تھا.. آپ یہاں پورٹروں کے ہاتھ تھام کر ایک خلا میں لڑھکتے ہوئے نیچے جاتے تھے.. نالے کے پانیوں کے پار جاتے تھے تو دوسرا کنارہ عرش سے باتیں کر رہا ہوتا تھا.. اور اس کی باتیں ختم ہی نہیں ہوتی تھیں کہ آپ اس سے درخواست کریں کہ محترم ہم پردیسی لوگ ہیں ہمیں ذرا خیریت سے گزر جانے دیں آپ کی بڑی مہربانی.. یہاں بھی پورٹر ہمیں ایک ڈولی کی صورت دونوں جانب سے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر ہمیں اٹھا کر اوپر لے جاتے تھے..

پار ہوتے ہیں تو ایک گھنا جنگل آتا ہے.. شاید وہ اتنا گھنا نہ ہو لیکن شام کے اترنے سے اور آنکھوں میں تھکاوٹ کا موتیا اُترنے سے وہ گھنا ہی دکھائی دیتا تھا.. وہاں آپ سانس درست کرتے ہیں.. کچھ دور چلتے ہیں تو ایک اور نالے کے بلند کنارے پر جا معلق ہوتے ہیں..

ایک اور نالے کے بلند کنارے پر ہم تادیر کھڑے رہتے ہیں کہ وہاں سے نیچے اُترنے

کا.. پورٹروں کی مدد کے باوجود کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا سوائے اس کے کہ اس میں چھلانگ لگا دی جائے۔

ہم اگر ایک قدم آگے کرتے تو لڑھکتے ہوئے.. متعدد پتھروں سے سر پھوڑنے کے بعد نالے کے پانیوں میں گر کر جاں بحق ہو جاتے.. تو ہم تادیر کھڑے رہے کہ اب کیا کریں.. اور تب بکریوں کا ایک لاوارث ریوڑ کہیں سے آیا اور وہ نیچے اترنے لگا.. یہ ایک زندگی میں ایک بار آنے والا سنہری موقع تھا ہم سب نے اپنے اپنے حصے کی.. اور پسند کی ایک ایک بکری دبوچی اور اسے گلے لگا کر.. اسے ایک الفت بھرا جپھا مار کر.. اُس سے تقریباً لٹکتے ہوئے ایک بے خودی کے عالم میں اور اس عالم میں جس میں اپنی خبر بھی نہیں ہوتی.. دھول پھانکتے گھسٹتے نیچے نالے تک پہنچ گئے.. اور یقین جانیئے کہ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ یہ بکریاں اس والہانہ بغل گیری سے چوکنی ہو گئیں کہ اس سے پیشتر اس نوعیت کی بغل گیرین واردات اُن کے ساتھ شائد بکروں نے بھی نہیں کی تھی..

ان آفت نالوں کی گزرگاہوں کے پار.. اور ہمیں یہ علم نہ تھا یہ ایک نالہ آخری نالہ ہے کہ نہیں.. لیکن ایک آخری نالہ آیا جسے ہم نے عبور کیا..

اس کے پار کچھ درخت تھے.. اور درخت بھی برچ کے جن کے تنے اور شاخیں ڈھلتی شام میں ڈھانچوں کی سفید ہڈیوں کی مانند شام میں سفید ہوتی تھیں..

ہم جھاڑیوں اور سوکھی ہوئی ٹہنیوں سے الجھتے برچ کے اس گھنے جنگل میں سے گزرتے آگے گئے تو وہاں کروئی بخت تھی..

برچ کے سفید جنگلوں میں سبز گھاس کا ایک جزیرہ تھا ایک وسیع میدان شام میں تھا.. ہم اتنے بے بس اور تھکاوٹ کی کرچیوں کی خراشوں سے زخمی اور نڈھال تھے کہ پورٹروں نے آگے بڑھ کر ہمارے کندھوں سے رک سیک اتارے.. ہمارے ہانپتے لبوں میں پانی ڈالا.. نہ ڈالتے تو ہم فوت ہو جاتے.. اگر ہم فوت ہو جاتے تو ان کی مزدوری کون ادا کرتا.. پورٹر بڑے سیانے تھے..

"برچ کے سفید جنگل.. ایک روسٹ بکرا.. اور کوہ نوردی کی شب آخر"

"بکرا کس کا ہے؟"

"مالک کا ہے.."

"اور مالک کہاں ہے؟"

"نیچے گیا ہے.."

"نیچے کہاں گیا ہے؟"

"کیا معلوم کہاں گیا ہے.."

"کب آئے گا؟"

"کیا معلوم کب آئے گا.."

"تو پھر؟"

"دو ہزار.."

پورٹر بھی مجھ سے متفق تھے کہ بکرا دو ہزار کا ہرگز نہیں ہے اور شیخ بابا یہ جانتے ہوئے کہ یہ صاحب لوگ مجبور ہیں.. اس سے درہ ملتر یا نیچے اشکومن سے بکرا خریدنے تو نہیں جائیں گے اس لیے وہ دو ہزار پر اڑے ہوئے تھے.. اور پندرہ سو کہنے پر بھی کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے..

بالآخر میں نے پورٹر حضرات کی خدمت میں ایک تجویز پیش کی "بکرا دفع کریں.. میں آپ کو مزدوری کے علاوہ ایک ہزار روپے زائد دے دوں گا.. اسے آپس میں بانٹ لینا.. کیا یہ بہتر نہ ہوگا.."

"جی صاحب.. یہ بہتر ہے"

چنانچہ بکرا شیخ بابا کو جواب دے دیا گیا اور وہ اسی معصومیت اور بھولپن میں مسکراتا ہوا اپنے بکرے کو کھینچتا چراگاہ کے اوپر جنگل میں اپنے جھونپڑے کی طرف چلا گیا..

لیکن اس کے جانے سے ہم سب کی زندگیاں بے کیف ہو گئیں..

پورٹر اداس ہو گئے..

برچ کے جنگلوں کی سفید خوشنمائی مدھم ہو گئی..

ہوا سسکیاں سی بھرنے لگی.. صرف ایک بکرے کے چلے جانے سے..

ہمارے دلوں میں وسوسے تھے.. کیا پتہ ایک بکرا روم کے تریوی فوارے میں پھینکا جانے والا وہ سکہ ہو جس کی طفیل وہ شخص دوبارہ روم آتا ہے.. ایک بکرے کی قربانی سے.. دوبارہ بلند پہاڑوں میں آتا ہو.. آج کی شب اگر بے بکرا ہو گئی تو کسے معلوم یہ پہاڑ پھر سے ہمارے نصیب میں نہ ہوں.. پہاڑی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ایک بکرے کی قربانی ضروری ہو..

بس یہی وسوسے اور خدشات تھے جب میں نے اس نانہجار بکرے کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ "لے آؤ.."

اس پر متعدد پورٹر قلانچیں بھرتے.. اپنی زبان میں نعرے لگاتے شیخ بابا کے جھونپڑے تک گئے اور بکرے کو ایک ہیرو کی صورت نہایت الفت سے کھینچتے میرے پاس لے آئے.. اور بکرے کے ساتھ ساتھ ظاہر ہے فاتح بابا جی بھی چلے آئے.. میں ادائیگی کرنے کو تھا کہ کاظمی جو برچ کے جنگلوں میں گم تھا وہاں گاتا پھرتا تھا آگے آیا.. بکرے کا بغور مطالعہ کیا اور کہنے لگا..

"تارڑ صاحب.. ہمارے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے.. یہ وہ بکرا تو نہیں جس کا ہمیں انتظار تھا.."

"تو پھر کونسا بکرا ہے؟"

"کوئی اور بکرا ہے.. اس بکرے کے دونوں کان کالے تھے اور اس کا ایک کان کالا ہے اور دوسرا سفید ہے اور یہ اس بکرے کی نسبت ذرا لاغر بھی ہے"

جب غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ کاظمی درست کہتا تھا..

شیخ بابا نے پہلے تو ان الزامات کی بھرپور تردید کی اور جب پورٹروں نے بھی ہمارا ساتھ دیا تو کہنے لگے "میرے پاس اور بھی بکرے ہیں ہو سکتا ہے کچھ رد و بدل ہو گیا ہو"

اس پر کاظمی کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ شیخ بابا کے بکرا باڑے میں ذاتی طور پر جائے اور طے

شدہ بکرے کو تلاش کر کے لائے..

کاظمی نے نہایت احسن طریقے سے یہ فریضہ سرانجام دیا.. باڑے کے اندھیرے میں جہاں متعدد بکرا جات باں باں کرتے تھے بیٹری کی روشنی میں مطلوبہ بکرے کو ڈھونڈ نکالا اور اُسے نیچے چراگاہ میں لے آیا..

ہر طرف بہار آ گئی..

برچ کے جنگل دمکنے لگے..

ہوائیں گنگنانے لگیں..

پورٹروں کے چہروں پر رونق آ گئی.. اک تیرے آنے سے.. وہ کھوار گیت گاتے برچ کے جنگلوں میں گئے اور سوکھے تنے اور ٹہنیاں جمع کر کے لے آئے اور پھر سرخ پتھر خیمہ گاہ کے درمیان میں ایک الاؤ بھڑکنے لگا.. تاریخ میں کسی ایک بکرے نے اتنے لوگوں کو اتنی خوشی نہیں دی ہو گی..

بھوری داڑھی والا پورٹر جس نے بکرا مذاکرات کا آغاز کیا تھا پھر سے ایک مقدس سی شکل بنائے میرے پاس آیا' صاحب آپ آؤ اور بکرے پر چھری چلاؤ"

"چھری؟" میں نروس ہو گیا کیونکہ میں ایک نہایت تھڑدلا اور بزدل شخص ہوں.. میں نے آج تک اپنے ہاتھوں سے ایک مرغی بھی حلال نہیں کی بلکہ مرغی حلال کی جا رہی ہو تو میں منہ پرے کر لیتا ہوں اور میں آسانی سے دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں نے آج تک کسی مرغی یا کسی بھی جانور کو آنکھیں جھپکائے بغیر مکمل یکسوئی کے ساتھ حلال ہوتے نہیں دیکھا.. اُدھر چھری چلی اور ادھر میری نظریں آسمان پر..

"میرے پاس چھری نہیں ہے"

"میرے پاس ہے" بھوری داڑھی والے نے اپنی شلوار کے نیفے میں سے ایک خنجر نما شے برآمد کر کے میرے سامنے لہرائی..

"بھئی آپ خود ہی چلا لو.."

"یہ کیسے ہو سکتا ہے صاحب.. آپ ٹیم کا لیڈر ہو.. آپ نے مہربانی کی ہے تو چھری آپ چلائے گا.."

"شاہد صاحب.. آپ نے ذاتی طور پر اپنے آپ کو ڈپٹی لیڈری کے عہدے پر فائز کر رکھا ہے تو چھری آپ چلائیں۔"

"نہیں سر.. لیڈر کے ہوتے ہوئے میں یہ گستاخی کیسے کرسکتا ہوں.." یہ کہہ کر وہ فوری طور پر وہاں سے کھسک گئے..

"تارڑ صاحب.." عمران کیمرہ تو ڈاڑھی کھجاتا نیم تاریکی میں سے نمودار ہو گیا" یہ تو زبردست شاٹ بنے گا سر.. الاؤ کی روشنی میں ایک قدیم رواج کے مطابق کہیں بلند پہاڑوں میں آپ ایک بکرے کے گلے پر چھری پھیرتے ہوئے.. انکار نہ کریں"

میں نے پھر بھی انکار کر دیا.. پورٹر اصرار کرتے رہے کہ وہ واقعی میری توقیر کرنا چاہتے تھے.. بالآخر اس بات پر تصفیہ ہو گیا کہ میں چھری تھام کر اس پر بسم اللہ پڑھوں گا اور پھر اسے بھوری داڑھی والے پورٹر کو دے دوں گا.. اور وہ بکرا حلال کر دے گا میری جانب سے..

تصفیہ ہو گیا..

الاؤ کی تیز بھڑک بدن کو جلاتی تھی..

پکھورا گلیشیئر کی وادی میں سے اترتی برفیلی ہوا اس چراگاہ کی رات میں پھنکارتی.. بلند صدائیں دیتی آتی تھی اور ہمیں سرد کرتی تھی اور اس کے باوجود الاؤ کے سامنے جو بدن تھا وہ اس کی آتش میں جلتا تھا.. اگرچہ کمر اور پیٹھ پر وہ سرد ہوا اسے منجمد کرتی تھی..

بکرے کا خون پل بھر میں ٹھنڈا ہو گیا تھا.. میں نے اسے جان کنی کی حالت میں تڑپتے اور حلق میں سے خرخراتی آخری آوازیں نکالتے نہیں دیکھا تھا.. تب دیکھا تھا جب ایک پورٹر اس کی بے جان آنکھوں والا سر کان سے پکڑ کر الاؤ میں بھوننے لگ گیا تھا.. وہ پل بھر میں سیاہ ہو گیا لیکن اس کی آنکھیں آگ میں بھی مجھے دیکھتی ہوئی لگتی تھیں..

گدا اور گرد آمیز کا خیمہ ہم سے الگ اور آج بہت ہی طویل فاصلے پر ایک بلند کنارے کے قریب روٹھا ہوا لگا تھا اور ان دونوں نے آج کی شب ہم سے میل جول مناسب خیال نہ کیا تھا اور شاید سو چکے تھے..

الاؤ میں بھونا گیا بکرے کا گوشت سب سے پہلے مجھے پیش کیا گیا.. وہ میرے ناتواں دانتوں کے لیے قدرے سخت تھا اور جلا ہوا تھا.. اس میں کوئلے کا ذائقہ تھا.. میں نے پورٹروں کا دل رکھنے کے لیے دو چار بوٹیاں بمشکل نگلیں.. لیکن وہ اسے نہایت رغبت سے کھا رہے تھے اور کھوار گیت گاتے تھے..

بھوری داڑھی والا پورٹر ترنگ میں تھا اور الاؤ کے گرد ناچتا تھا..

"عشق کیا ہے سر.."

"لعنت ہو تم پر.." میرے منہ میں جلے ہوئے گوشت کی کڑواہٹ تھی" کیوں مجھے تنگ کرتے ہو.. کیا اس کوونوردی میں تم صرف اس لیے میرے ساتھ آئے ہو کہ یہ واہیات سوال پوچھ پوچھ کر مجھے زچ کر دو.."

"سوری سر.." سلیم کے چہرے پر افسوس کی عبارت تھی..

ہوا تیز ہوتی تو برچ کے جنگلوں میں جیسے کوئی چلنے لگتا.. الاؤ کے شرارے اڑ کر ہمارے چہروں تک آتے اور ہم آنکھیں بند کر لیتے..

"سنو شہزادے.." میں نے راکھ کریدتے ہوئے کہا کہ اب میں کہنا چاہتا تھا" اس راکھ میں بکرے کے خون کے لوتھڑے بے جان اور سرد ہیں.. یہی عشق ہے.. رائیگانی کا.. یہ جو برچ کے تنے اور شاخیں الاؤ میں دھڑ دھڑ جلتی ہیں اور ہمارے چہروں کو جلاتی ہیں.. اور درہ ظلمت سے جو برفیلی ہوائیں اس چراگاہ میں سنسناتی ہوئی آتی ہیں اور بقیہ بدن کو یخ کرتی ہیں تو یہی کیفیت ہے عشق کی.. نہ جلا کر راکھ کرتا ہے اور نہ منجمد کر کے حنوط کرتا ہے.. اور عشق.. حسد ہے.. جتنا بڑا حسد ہوتا ہے اتنا بڑا ہی عشق ہوتا ہے.. تم اس پیراہن سے حسد کرتے ہو جو اس کے بدن پر ہوتا ہے.. ہر اس ٹیلی فون کال سے جلتے ہو جو تمہارے لیے نہیں ہوتی.. اس بارش سے نفرت کرتے ہو جو اس کے چہرے پر پڑتی ہے اور پھر اپنے آپ سے بھی کرتے ہو کہ میں اس کی اتنی قربت میں کیوں ہوں.."

"تھینک یو سر.." سلیم ہنسنے لگا" بہت ہو گئی.. یہ کافی ہے"

"نہیں تم نے سنو تو اب میں اپنے آپ سے کہنا چاہتا ہوں.. ذرا اس رات میں.. اس الاؤ کے قریب بیٹھے.. ایک یکسر اجنبی مقام میں جہاں تم پہلی بار آئے ہو اور جہاں دوبارہ تم کبھی نہیں آؤ گے.. الاؤ کی راکھ اور چنگاریوں کو اپنے چہرے پر اترتے محسوس کرتے تم ذرا اوپر برچ کے ان جنگلوں کو غور سے دیکھو جن کے سفید تنے اور ٹہنیاں تاریکی میں بھی جھائی دے رہے ہیں.. تو کیا اس لمحے ان میں سے تمہاری زندگی بھر کے عشق.. حیاتی کی دیوانگیاں اور وحشتیں جھانکتی ظاہر ہوتی نظر نہیں آتیں؟" کتنی شاہ گوریاں ہیں جو دکھائی دے رہی ہیں.. اور کتنی تھیں ہیں جو تمہارے الاؤ سے تپش شدہ جلتے بدن پر اپنے پتوں کی ٹھنڈک بکھیر کر تم پر راج کرتی ہیں.. ان جنگلوں میں سے ازل کی صدائیں آتی ہیں لیکن تم سن نہیں رہے.. شاہ حسین کہہ رہا ہے کہ میں نا ہیں سب توں.. اور

تم سن نہیں رہے۔۔اور ذرا سنو کہ وارث شاہ کہہ رہا ہے کہ عشق بولدا نڈھی دے تھاؤں تھائیں۔۔یعنی عشق لڑکی کے۔۔ہیر کے بدن کے ہر حصے میں سے بولتا ہے۔۔تو یہ عشق تو تھاؤں تھائیں۔۔ہر جگہ ہر مقام پر۔۔کہیں بلند پہاڑوں میں۔۔کہیں قلعہ دراوڑ کے زیرِ زمین ایک آئینہ در آئینہ کمرے میں اور کہیں شاہ گوری کے بدن میں بولتا ہے اور تم سن نہیں سکتے۔"

یکدم جیسے ہر شے سکوت میں چلی گئی ہو۔۔چپ ہو گئی ہو۔۔پکھورا نالے کی آواز بھی گم۔۔ برج کے جنگل سناٹے میں۔۔یہاں تک کہ الاؤ کی بھڑک نے بھی اپنے ہونٹ بھینچے تھے۔۔شاید اس لیے کہ ہم سن سکیں۔۔

"کچھ نہیں سر۔"

"تم کچھ سن رہے ہو؟"

"آپ جو کہہ رہے ہیں وہ سن رہا ہوں"

"تم حافظ برخوردار کو جانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"اپنی زبان سے غفلت اور اجتناب ہمیں کیسا بدنصیب کر دیتا ہے کہ ہم اپنی آبائی دانش سے محروم ہو جاتے ہیں۔۔اس نے "مرزا صاحباں" لکھی تھی اور وہ عشق کے بارے میں کہتا ہے کہ حافظ ہاتھی عشق دا پوش کریندا پوش۔۔یعنی عشق ایک ایسا مست ہاتھی ہے کہ پوش پوش۔۔یعنی ہٹ جاؤ اس کے راستے سے ہٹ جاؤ کی وارننگ دی جاتی ہے کہ یہ تمہیں روند ڈالے گا۔۔رُکے گا نہیں۔۔تو یہ بھی عشق ہے شہزادے۔۔"

"یہ ہماری آخری رات ہے پہاڑوں میں۔" میں جان گیا کہ سلیم میری اس لایعنی خود کلامی سے بیزار ہو چکا ہے اور موضوع بدلنا چاہتا ہے۔۔

"ہاں۔۔کل رات تو پکھورا کے قصبے میں آئے گی۔۔پہاڑوں میں نہیں۔"

"تو آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟"

"تسلی نہیں ہوئی۔"

"کیا مطلب؟"

"بس لطف نہیں آیا۔۔جان کے لالے نہیں پڑے۔۔لطف بھی موت کی سرد موجودگی میں آتا ہے کہ اسے آپ جُل دے جاتے ہیں۔۔اس سے بچ نکلتے ہیں تو اس بار تسلی نہیں ہوئی۔"

"تو کیا آپ مرگ کی خواہش لے کر گھر سے نکلتے ہیں؟"

"قطعی نہیں۔۔ڈرتے ڈرتے گھر سے نکلتے ہیں۔۔دعائیں کرتے کہ یا اللہ اپنے بچوں کے چہرے پھر سے دکھانا۔۔خیریت سے واپس لانا۔۔لیکن اس کے باوجود کہیں ایک تمنا دل میں پناہ گزیں ہوتی ہے کہ موت نے آنا تو ہے تو یہیں آ جائے۔۔ایک ساٹھ لاکھ آبادی کے ٹریفک کے دھویں بھرے پُرشور شہر کے ایک کمرے میں نہ آئے۔"

"تو سر، موت کیا ہے؟"

"موت ہی۔۔عشق ہے۔۔"

الاؤ کب کا بجھ چکا تھا۔۔

پورٹر جنگل کے دامن میں اپنے بوسیدہ کمبل اوڑھے جلے بجھے بکرے کے گوشت کے خمار میں گم ہو چکے تھے۔۔

صرف ہم تھے جو راکھ کریدتے تھے۔۔

اور ہم سے اوپر برج کا جنگل سکوت ترک کر کے ایک بار پھر زندہ ہوتا تھا۔۔برج کی ٹہنیاں تھیں اور شاخیں تھیں جو سفید ہڈیوں کی مانند روشن ہوتی تھیں جیسے ان میں جان پڑتی تھی اور ان میں سے شاہ گوریاں اترتی تھیں۔۔ستولیک کی منجمد تتلیاں زندہ ہو کر پھڑپھڑاتی آتی تھیں اور کوہ نوردی کی اس آخری رات میں جب کہ الاؤ بجھ چکا تھا اور ہم دونوں تاریکی میں تھے۔۔یہ شاہ گوریاں یہ تتلیاں ہمارے چہروں کو چومتی تھیں اور کہتی تھیں۔۔بس یہی عشق ہے۔

"برچ کے سفید جنگلوں میں ایک سویر..جو دُھند میں غرق تھی.."

بہت دیر کے بعد کُھلا کہ میں خواب میں تھا..نیند میں نہیں..جاگ چکا ہوں..میں ایلس ہوں اور ایک ونڈر لینڈ میں ہوں..

ہر شے دھند میں ڈوبی ہوئی ہے..پورا جنگل ڈوبا ہوا ہے..جیسے ایک پورا شہر پانی میں ڈوب جائے..دھند میں غرق ہے اور جیسے کہیں پانی کم ہوں تو اس شہر کا کوئی برج کوئی مینار کوئی چوکھٹ نظر آ جاتی ہے ایسے کہیں دھند ہلکی ہوتی تھی تو اس میں سے کوئی ٹیڑھا میڑھا برچ کا درخت ایک اپاہج گداگر کی مانند ظاہر ہونے لگتا تھا..کوئی ایک ایسی ٹہنی دکھائی دینے لگتی تھی جس کی سفیدی دھند سے الگ ہو کر تازہ اور گیلے پینٹ کی مانند چمکتی تھی..کہیں ایک سوکھا شجر ایک آسیب کی طرح ظاہر ہونے لگا ہے..اور کبھی برچ کے جنگلوں میں بہتی کسی نیم پوشیدہ ندی کے پانی پاؤں بھگو دیتے تھے..

میں ہر قدم احتیاط سے رکھتا تھا..آنکھیں بند کر کے رکھتا تھا کہ کہیں دُھند میں ملفوف سوکھی ٹہنی ان میں نہ چُبھ نہ جائے..البتہ چلتے ہوئے یہ شاخیں اور ٹہنیاں میرے بدن کو مسلسل کریدتی تھیں..

برچ کے جنگل میں اس سے میں تنہا چلتا تھا..چلتا تھا اور گُم ہوتا تھا..اس کے پیڑ پتے جھاڑیاں اور زمین پر بچھی گھنی گھاس سب کے سب ان چھوئے تھے اور مجھے چھونے کی کوشش کر رہے تھے..کہ میں پہلا شخص تھا جو ان میں آ نکلا تھا..یوں لگتا تھا جیسے وہ آج تک کسی بھی ذی روح سے نا آشنا تھے اور ان میں تجسس تھا کہ یہ کون جانور ہے جو اس وقت..جب رات ابھی پوری طرح رخصت نہیں ہوئی..سویر ابھی ہلتر گلیشیئر پر نہیں اُتری..برفانی کنویں میں ابھی گھپ اندھیرا ہے تو یہ کون ہے جو ادھر آ نکلا ہے..

رات بھر میں نیند میں مدہوش رہا..

مدہوش او غافل لیکن سحر خیزی کی عادت نے جو الارم میرے اندر نصب کر رکھا تھا اس نے مجھے بیدار کر دیا..میں اپنے تئیں لاہور میں تھا اور مجھے اب اپنا بستر ترک کر کے..چہرے پر چند چھینٹے ڈال کر..جوگنگ سوٹ بدن پر کھینچ کر..ماڈل ٹاؤن پارک میں صبح کی سیر کو جانا تھا..کچے ٹریک پر چلتے ہوئے..دوسری جانب سے نیم تاریکی میں نمودار ہونے والے شیخ صاحب..سردار صاحب..بیگ صاحب..قاضی صاحب اور شاہ صاحب کو بلند آواز میں السلام علیکم کہتے ہوئے دو چکر پورے کرنے تھے..لیکن پھر کھلا کہ نہیں میں لاہور میں نہیں استاد محمد علی کے گُل بوٹوں سے تراشے ہوئے فیل پایہ دیار کے پلنگ پر نہیں بلکہ کہیں اور ہوں..میرے نیچے زمین سخت ہے اور بے حد سردی ہے اور میں اپنے سلیپنگ بیگ میں پیک شدہ جاگ رہا ہوں لیکن کہاں ہوں؟

ایک نامعلوم چراگاہ میں..کہیں بلند پہاڑوں میں..

میں اگرچہ پھر سے آنکھیں موند کر نیند میں غرق ہو جانا چاہتا تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا..

صرف اس لیے کہ میری درمیانی منزل میں پانیوں کا بوجھ تھا جو مجھے بے چین کرتا تھا..

مجھے ان سے نجات حاصل کرنے کی خاطر مجبوراً اٹھنا پڑا..جوگرز چڑھائے اور پھر خیمے سے باہر آ گیا..

میرے تالو میں سے ابھی تک جلے ہوئے گوشت کا ذائقہ چھوٹتا تھا..

باہر تقریباً رات تھی..

الاؤ کی سرد راکھ اور جلی بجھی برچ کی لکڑیوں کے گرد چند پورٹر مدہوش پڑے تھے..

بکرے کی کھال ایک خشک تنے سے لٹکی تھی اور شائد مجھ سے فریاد کرتی تھی کہ اے سنگدل شخص تم نے مجھے ہی کیوں چُنا تھا..میرے کسی اور سنگی ساتھی کو پسند کر لیتا تو میں اس وقت اپنے باڑے میں زندہ ہوتا اور با آ با آ کر رہا ہوتا..

میں اس لٹکتی کھال میں کبھی جو بدن تھا اس کا ذائقہ محسوس کرتا شرمندہ ہوا اور اُس سے نظریں چُرا کر بائیں جانب ایک ڈھلوان پر چڑھتا جنگل کے اندر چلا گیا..

دراصل مجھے قطعی احساس نہ ہوا کہ میں جنگل کے اندر جا رہا ہوں کیونکہ دھند ہر سو ٹھہری ہوئی تھی اور میں اس میں بھٹکتا اپنے خیمے سے ذرا دور ہو کر اپنے آپ کو ہلکا کرنا چاہتا تھا..اور جب میں فراغت حاصل کر چکا تو ظاہر ہوا کہ میں دراصل برچ کے درختوں کے ذخیرے میں اُتر چکا

ہوں.. بھٹکتا ہوں.. ٹھوکریں کھاتا ہوں.. کہ ہر سُو دُھند راج کرتی ہے.. اس کی شناخت چھین لیتی ہے.. میں فارغ ہو کر الٹے قدموں خیمہ گاہ میں واپس بھی آ سکتا تھا لیکن یوں بھٹکنا.. ایک بھید بھرے جنگل میں ٹھوکریں کھانا مجھے اچھا لگ رہا تھا.. نیند رخصت ہو چکی تھی.. آنکھیں کھلی تھیں لیکن ان کے سامنے دھند کی سفیدی کے سوا کچھ نہ تھا.. ہاں کبھی کوئی ٹہنی.. ایک شاخ ایک شجر.. اور پھر دُھند کے حرکت کرتے سفید لبادے..

البتہ ایک غلطی ہو گئی تھی.. میں اپنے تئیں صرف چند لمحوں کے لیے خیمے سے باہر آیا تھا تاکہ اپنے آپ کو ہلکا کروں اور واپس چلا جاؤں.. اور صرف ایک سویٹر میں آیا تھا چنانچہ اب میں ٹھٹھرتا تھا.. درہ ملتر سے اُترتی تمام ہوائیں اسی وادی میں شوق اترتی تھیں اور یہاں اپنے سامنے برچ کا ایک گھنا جنگل پا کر الجھ الجھ جاتی تھیں جیسے موسم بہار میں مرغان چمن کے پاؤں پھولوں میں الجھ الجھ جاتے ہیں.. اس رکاوٹ کے باوجود سردی اپنا نیلا منجمد رنگ دکھاتی تھی اور میں ٹھٹھرتا تھا..

میں نے کچھ دیر اپنے آپ کو ہنری مور کے شاہکار مجسمے "دی تھنکر" کے سٹائل میں ایک ٹیلے پر براجمان ہونا چاہا.. کچھ سوچ بچار میں گم ہونا چاہا لیکن گھاس بھی اتنی یخ تھی کہ اس پر بیٹھے رہنا برداشت میں نہ آتا تھا.. اس نے لمحوں میں میری نشست خاص کو یکسرہ منجمد شمالی کر دیا اور میں اسے سہلاتا ہوا پھر سے جنگل میں بھٹکنے لگا..

دُھند کی سفیدی اب گھلتی جاتی تھی.. اس کا گھنا پن چھدرا اور ہلکا ہونے لگا تھا جیسے گاڑھی لسی میں پانی ملانے سے اس کی گھنی سفیدی ہلکی ہونے لگتی ہے.. دہی کے ذرے الگ الگ دکھائی دینے لگتے ہیں.. یہ اس لیے ہو رہا تھا کہ دھند کی رخصتی کا لمحہ آن پہنچا تھا.. اور سویر ہونے کو تھی..

برف کے اندھے کنویں میں گرنے والے پانی کے مرغولے روشن ہونے کو تھے..

گھاس کے تنکوں میں کہیں کہیں جو اکا دکا پھول پوشیدہ تھے ان کے رنگ نظر آنے لگے تھے.. دُھند الٹے قدموں لوٹ رہی تھی.. جنگل کو خالی کر رہی تھی..

اور میں نہیں جانتا کہ وہ کونسا لمحہ تھا جب سورج کی پہلی شعاعیں برچ کے اس سفید جنگل میں نقب لگا کر داخل ہوئیں اور دھند کو چیرتی ہر بوٹے ہر شاخ اور ہر ٹہنی کو منور کرتی چلی گئیں..

یہ ایک معجزہ نما تبدیلی تھی.. کرنوں کے زرد برچھوں کے آگے دھند کی سفید گمشدگی اور تاریکی ہتھیار ڈالتی جاتی تھی اور دھوپ غالب آتی جاتی تھی..

دھوپ ہر شجر کے پہلو میں سے ہو کر نکلتی تھی..

چھوٹی جھاڑیوں، جنگلی بیلوں اور گھاس پھونس میں اپنی روپہلی شکل بھرتی ہوئی نمایاں ہوتی تھی.. میں نے طلوع آفتاب کا ایک منظر ہرات میں.. ملکہ گوہر شاد کے مقبرے سے پرے ایک ٹیلے پر ایک چرسی جرمن سیاح کے پہلو میں بیٹھے دیکھا تھا جب شعاعوں کے تیر ہم پر سے شاں شاں کرتے گزرتے تھے.. اور اب اسی.. کسی عام فرد کے تجربے میں نہ آنے والی اسی کیفیت کو یہاں برچ کے ایک جنگل میں اپنے آپ پر وارد ہوتے محسوس کر رہا تھا..

جب وہ پورے کا پورا جنگل عیاں ہو گیا.. دُھند کا لبادہ اٹھ گیا اور وہ عریاں ہو گیا.. تو اس کا سحر ریزہ ریزہ ہو گیا..

چونکہ میں بھی اب تک اس سفید پوشیدگی میں تھا اس لیے دھوپ نے مجھے بھی برہنہ کر دیا اور بے آرام کر دیا..

اب یہ محض ایک اور جنگل تھا..

اور میں محض ایک اور انسان..

اب یہاں نہ کوئی ونڈر لینڈ تھی اور نہ کوئی سنڈریلا..

چراگاہ کی جانب سے پورٹروں کی آوازیں آ رہی تھیں.. وہ جاگ چکے تھے اور ناشتہ تیار کرنے کے لیے جنگل میں سے لکڑیاں جمع کرنے کے لیے آ رہے تھے..

"جنگل کے پار ایک اور جنگل اور پیاس بھرا ایک خشک صحرا.."

ایک اور جنگل تھا..

جنگل کے پار ایک اور جنگل تھا..

لیکن یہاں ہر شے عیاں تھی..کوئی بھید کوئی پوشیدگی نہ تھی..

ہم اپنے پہاڑوں کے سفر کے آخری دن میں تھے..

آج کی شب کے بعد ہم نے پھر اپاہج ہو جانا تھا..جیپوں..کاروں..موٹر سائیکلوں اور سائیکلوں پر زندگی گزارنی تھی..اگر چلنا بھی تھا تو مجبوراً چلنا تھا خوشی سے نہیں چلنا تھا..

ہم اپنی آخری منزل پھورا گاؤں کی جانب سفر کرتے تھے..

اگرچہ اس لمحے ہم نہیں جانتے تھے کہ آج کا سفر کتنا طویل' کتنا پیاس بھرا اور بدنی اذیت سے بھرپور ہوگا..

ہم اپنی خیمہ گاہ سے..رخصت ہو چکے تھے اور پھر سے ایک اور جنگل میں آگئے تھے..

بے شک اس جنگل میں کوئی بھید نہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ مجھے اس عریانی میں بھی اپنے آپ پر فریفتہ کرتا تھا..

ایک مفروضہ ہے کہ حُسن اور کشش صرف پردہ پوشی اور پوشیدگی میں ہے..عریانی اور بے لباسی میں یہ سب کچھ زائل ہو جاتا ہے..

لیکن ایسا صرف وہ کہتے ہیں جنہوں نے محض ہوس میں مبتلا ہو کر پوشیدگی کو دیکھا ہوتا ہے..

عریانی اور بے لباسی ہی تو آپ کا امتحان ہوتی ہے..کہ آپ محض ایک ہوس گزیدہ شخص

ہیں یا اُس صنم کے سچے پجاری ہیں..

دراصل بے لباسی ہی سرمد منصور کا لباس ہوتی ہے..تب عریانی اصل ہو جاتی ہے اور اس کو ڈھکنے والا پیراہن دکھاوا ہو جاتا ہے..

عشق محض پوشیدگی سے مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ عُریانی اس کا امتحان نہ لے..میں نے اس جنگل کو آج سویرے پردہ پوش دیکھا تھا اور اب اسے برہنہ دیکھ رہا تھا تو اس کے باوجود اس کے سحر میں کمی نہ ہوئی تھی..بلکہ اس کی کشش بڑھ گئی تھی اس لیے کہ میں ہوس گزیدہ نہ تھا..

ہم اپنی خیمہ گاہ سُرخ پتھر سے رخصت ہو چکے تھے..شیخ بابا کے جھونپڑے کے برابر میں سے گزر کر برچ کے ایک اور جنگل میں داخل ہو چکے تھے اور خوش تھے کہ یہ آخری دن ان جنگلوں کی چھاؤں چھاؤں گزر جائے گا..

تقریباً دو گھنٹے کی مسافت کے بعد برچ کی چھدری چھاؤں میں..ایسے کُنج بھی تھے جو گھنے اور پُر فریب تھے..تالاب تھے..چھوٹی ندیاں تھیں اور چڑیاں اڑان کرتی تھیں..ہم جنگل کے کناروں تک آئے جن کے نیچے پھورا نالہ بہتا تھا..شور کرتا تھا..جھاگ اُڑاتا تھا..ایک پگڈنڈی نیچے پانیوں اور پتھروں تک جاتی تھی..ہم احتیاط سے اترتے نالے تک پہنچے جس پر ایک پل تھا..خوش نصیبی تھی کہ یہ ایک محفوظ پل تھا لیکن جب ہم اس کے پار گئے تو گویا خوش نصیبی پل پر ہی رہ گئی کہ اس کے پار ایک نہائت تیکھی اور بھربھری اونچائی شروع ہو رہی تھی..اور اس کے تیور اچھے نہیں تھے..ہمیں اس مقام کی اس چڑھائی کے بارے میں گلگت میں ہی خبردار کر دیا گیا تھا کہ یہاں توبہ تائب ہو کر قدم رکھے گا..یعنی ہو سکتا ہے یہ آپ کا آخری سفر ہو..

دوسرے کنارے پر کوئی کنارہ نہ تھا..

محض کنارے کا ایک اشارہ تھا..

ہم پار ہو کر اس کے نیچے کھڑے ہو گئے اور منہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگے..اس پر ایک راستے کے نشان تو تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ اسے آج تک کسی بکری نے بھی پار نہیں کیا ہوگا..

میں نے اپنے آپ کو خوب بُرا بھلا کہا کہ شریف آدمی پچھلی شب تم نے ضرور یہ بڑھ ماری تھی کہ اس ٹریک میں تسلی نہ ہوئی..قربتِ مرگ کے کوئی واضح آثار پیدا نہیں ہوئے..اب کرلو تسلی..

"میاں صاحب.." میں نے فرزند علی کو پکارا جو اس راستے کو دیکھ کر بار بار اپنی عینک

اتارتا تھا اور اسے چند حیائی ہوئی آنکھوں سے چیک کرتا تھا" اپنی روح میں بالیدگی پیدا کر لیجیے۔"

"میں نے جناب عالی جھک ماری تھی.." "میاں مذاق کے موڈ میں نہ تھا" آپ نے ضرور یاد دلانا تھا.."

اس راستے کو بھی کسی براللہ دوریا پر معلق ہی سمجھ لیجیے.. صرف اس فرق کے ساتھ وہاں آپ گرتے ہیں تو ذرا دیر کے بعد پانی میں گرتے ہیں اور یہاں آپ پھسلتے ہیں تو فوراً ہی پھورا نالے کے پانی آپ کو قبول کر لیتے ہیں..

پہلے تو متعدد ہاتھوں نے ہمیں کنارے سے گھسیٹ کر اوپر راستے پر ڈھیر کیا.. جب ہم اٹھے تو اٹھا نہ گیا.. ہم نے پھر مدد کے لیے ہاتھ کھڑے کر دیے.. کیونکہ اٹھتے تھے تو چکرا جاتے تھے.. پورٹروں کے ہاتھ تھام کر.. ان کے بدنوں پر بوجھ ہوتے.. ایک دوسرے کے سہارے لیتے.. تھوک نگلتے.. ٹانگوں میں سے جان کب کی زائل ہو چکی تھی.. انہیں گھسیٹتے.. گرتے پڑتے.. پھورا نالے کے پانیوں سے نظریں چراتے اور دل ہی دل میں ان سے درخواست گزارتے کہ بڑے بھائی ہمیں یاد نہ کر لینا.. اپنے پاس نہ بلا لینا.. اور جب اس راستے کا یکدم اختتام ہوا تو ہم ظاہر ہے حیران ہوئے کہ اگے تو ایک عرش مقام بلند ہے تو ہم نے اب کہاں جانا ہے.. لیکن ہم نے انہی بلندیوں پر فائز ہونا تھا.. اسی عرش تک پہنچنا تھا جہاں غالباً فرشتوں کے پر بھی جل سکتے تھے لیکن ہمارے پورٹر ایسے باکمال تھے کہ وہ وہاں پہنچ رہے تھے اور ان کا کچھ بھی نہیں جلا تھا..

عرش پر پہنچے ہوئے پورٹروں نے جب ہمیں نیچے فرش پر دیکھا تو جان گئے کہ ہم کوئی ایسی پاکیزہ ارواح نہیں ہیں کہ وہاں تک پہنچ پائیں چنانچہ ان میں سے کچھ نیچے اترے.. ایک زنجیر بنائی اور پھر باری باری ہمارے ہاتھ پکڑ کر ہمیں بے جان بوریوں کی مانند گھسیٹتے ہوئے اوپر لے گئے.. لیکن وہ ہمیں ایک خاص مقام تک ہی لے جا سکتے تھے اور وہاں عرش دس بارہ فٹ اونچا تھا.. اس اونچائی پر صرف ایک شخص کے چڑھنے کی گنجائش تھی.. تو اب تصویر کچھ یوں بنتی تھی کہ عرش پر کچھ پورٹر لیٹے ہوئے ہیں اور ہاتھ نیچے کیے ہوئے ہیں کہ دس بارہ فٹ کا فاصلہ بلکہ بلندی طے کر کے جو کوئی بھی آ سکتا ہے آ جائے ہم اسے دبوچ لیں گے..

میں اس مرگ صفت مقام کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ یہ کیا تھا.. کیسی آزمائش تھی.. نہ کوئی واضح راستہ تھا.. نہ کہیں پاؤں رکھنے کی جگہ تھی.. نوے درجے کے زاویے پر ایک اٹھان تھی جس پر محض پرواز کر کے بلند ہوا جا سکتا تھا.. چڑھا نہیں جا سکتا تھا..

پورٹروں کے متعدد ہاتھ تھامے.. مٹی میں ناک رگڑتے.. اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں اور "پکڑ لو.. پکڑ لو" کی فریاد کرتے ہم ایک ایک کر کے اوپر نچے ہوئے اور جانے کس نے کسے گھسیٹ کر اوپر کھینچ لیا..

یہ ایک نہایت واہیات مقام تھا.. جہاں موت واقع ہو سکتی تھی.. پر نہ ہوئی..

اس عبرت ناک مقام پر ہم کچھ دیر اپنے حواس اور قوت گویائی بحال کرتے رہے.. بہت نیچے رہ گئے پھورا نالے کو دیکھتے رہے.. رکے ہوئے سانس کو قدرے رواں کیا اور جب یہاں سے چلے تو سب کے سب ساتھی خوشحال اور خوش مزاج ہو گئے کہ.. ہم بچ گئے ہیں.. برچ کا ایک اور جنگل ہمارا منتظر تھا..

ایک اور گھنا شجر آور علاقہ سامنے آ گیا اور ہم اس میں داخل ہو گئے.. اور داخل ہوتے ہوئے بھول گئے کہ ہم ابھی ابھی کیسی موت آور بلندی کو چڑھتے تھے کہ یہ جنگل بھی قدرت کے عجائبات سے اٹا پڑا تھا.. ایک مقام پر ایک نہایت خوش نما شکل والا درخت جنگل کی گھاس پر اوندھا پڑا تھا.. اس کی جڑوں نے زمین کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ گھاس کے سبزے پر ایک سفید تصویر کی مانند جڑا ہوا تھا.. سفید ٹہنیاں بل کھاتی الجھتی تھیں اور ہم ان کے درمیان میں سے گزر رہے تھے جب میں نے بے دھیانی میں ایک چھوٹی سی ٹہنی کو توڑ کر اپنے رک سیک میں رکھ لیا..

آج یہ چھوٹی سی ٹہنی.. میری سٹڈی بیورو کے اوپر ایک گلدان میں سجی ہے.. اور میں نے ابھی تک برچ کے جنگلوں کا جو بیان کیا ہے.. جتنی تفصیل اور کیفیت لکھی ہے وہ سب.. کہ میرے پاس نوٹس نہیں ہیں صرف اس ایک ٹہنی کو سامنے رکھ کر لکھی ہے کہ یہ ایک ٹہنی برچ کے تمام جنگلوں کو بیان کرتی ہے.. خود ایک جنگل ہے..

اور ہاں کبھی کبھار جب میں صبح سویرے اپنی پڑھنے کی عینک لینے کے لیے اپنی سٹڈی میں آتا ہوں تو ایک چڑیا اس پر براجمان ہوتی ہے جو مجھے دیکھ کر اڑ جاتی ہے.. وہ بھی شاید اس میں برچ کا پورا جنگل دیکھتی ہے..

ہم اس جنگل کی چھاؤں میں سے باہر آئے تو ایک ایسی کھلی فضا میں آئے جہاں ڈھلوان پر ایک مختصر بستی تھی..

اوپر پتھروں کی چند چار دیواریاں اور جھونپڑے تھے جو برچ کے درختوں کے تھے اور نیچے جہاں ہم نکلے تھے کچھ بچے تھے.. چند نوجوان اور دو بوڑھے تھے..

انہوں نے اول اول ہمیں تشویش سے دیکھا.. ہمیں جنگل میں سے برآمد ہوتے دیکھ کر چپ رہے.. ہمیں قریب آنے دیا..

ہم نڈھال ہو چکے تھے.. اپنے اپنے رک سیک کاندھوں سے اتارے اور گھاس پر ڈھیر ہو گئے..

وہ سب ہمارے قریب ہوئے کہ کیا یہ مر گئے ہیں..

ہم اگرچہ مشقت اور اذیت سے اور موت کے خوف سے مر گئے تھے' لیکن مکمل طور پر نہیں مرے تھے..

یہ ایک گوجر بستی تھی..

انہوں نے ہمیں زندہ کرنے کے لیے دہی اور لسی پیش کی اور پھر ہمیں گھیرے میں لے لیا.. ہماری پوشاکوں اور رک سیکوں کو ٹٹولنے لگے.. ہنستے گئے.. آپس میں ہمارے بارے میں.. ہماری حالت زار کے بارے میں باتیں کرتے گئے اور ہنستے گئے اور تب بڈھے گوجر کا نزول ہوا.. وہ جو اوپر دو چار پتھریلی آماجگاہیں تھیں.. جھونپڑے تھے ان میں سے یکدم ظاہر ہوا.. اور یکدم نیچے آیا..

وہ اس بستی کا بابا آدم تھا..

یہ جو ہمیں گھیرے میں لیے ہوئے تھے.. بچے.. نوجوان.. دو بوڑھے.. سب کے سب اس کی آل اولاد تھے..

چنانچہ جب وہ نیچے آیا.. کوہ طور سے اترتے باریش موسےٰ کی مانند نیچے آیا تو وہ سب کے سب چپ ہو گئے.. اس کے احترام میں خاموش ہو گئے..

یہ بڈھا اگر لاہور میں ہوتا تو یقیناً "وحشی گوجر" اور "گوجر داویر" نامی فلموں کا پروڈیوسر ہوتا.. لیکن وہ لاہور میں نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ دوران گفتگو کھلا کہ موصوف زندگی میں صرف ایک بار گلگت گئے ہیں.. اور اس سے پرے جو بھی لاہور پشور وغیرہ تھے ان کے بارے میں لاعلم تھے..

انہوں نے بھٹے شاہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے.. علموں بس کریں او یار.. بس کر دیا تھا.. اور یہیں پھوراوادی میں بس کر دیا تھا..

عمران بڑے شوق سے گوجر بابا اور اس کی آل اولاد کے بگ بگ کلوز بناتا رہا.. اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ اوپر ان پتھریلے جھونپڑوں کی جانب کیمرے کی بوتھی کر کے زوم لینز سے زوم

ان کر کے کسی کھڑکی میں سے جھانکتی گوجر حسینہ کا کلوز اپ بنائے.. لیکن ایسا نہ ہوا.. اگر وہاں کچھ گوجر حسینائیں تھیں تو وہ بڈھے گوجر کے ڈر کے مارے کہیں کونوں کھدروں میں دبکی ہوئی تھیں اور ان کی جرأت نہ تھی کہ وہ کسی کھڑکی میں سے جھانک کر ہم پردیسیوں پر ایک نظر ڈال لیں.. چنانچہ عمران کا زوم لینز پتھروں پر زوم ان ہو کر سر ٹکراتا رہا..

اس گوجر گڑھ میں ایک مختصر قیام کے بعد ہم پھر کمر بستہ ہوئے اور برچ کے درختوں کے ایک مختصر ذخیرے میں آ گئے..

یہ برچ کی سفیدی کی آخری جھلک تھی..

"پیاس کے صحرا میں ایک آبشاری شالیمار"

ہم ایک مرتبہ پھر ایک بکری پگڈنڈی پر بکری ہوتے اُترے اور پھورا نالے کے پاس آ گئے.. یہاں اس نالے کے اوپر ایک ایسا شاندار پُل تھا کہ کہیں تھا اور کہیں بالکل نہیں تھا.. برچ کے دو چار شہتیر.. ورجن بھر ٹہنیاں جو شاید کسی انسان نے نہیں چند بکریوں نے وہاں رکھ دی تھیں.. یعنی اے مردِ مجاہد جاگ ذرا اب وقتِ شہادت ہے آیا کا بورڈ وہاں نصب ہونا چاہیے تھا.. لیکن مردِ مجاہد کی زندگی میں یہ پہلا وقتِ شہادت تو آیا نہیں تھا جو گھبرا جاتا.. تو بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق ..یعنی ہم پار ہو گئے..

پار ہوئے تو دوسری جانب ذرا ویرانی تھی.. بیابانی تھی.. چٹیل چٹانوں کی خشکی تھی جس پر گھاس اگر کہیں تھی تو بے روح اور جلی ہوئی.. کسی ایک جھاڑی کا نشان بھی نہ ملتا تھا..

ایک مختصر پگڈنڈی اس خشک چٹانی بلندی پر اٹھتی تھی جس پر ہم کبڑے عاشقوں کی مانند جھکے جھکے اُٹھنے لگے..

جب ہم پوری طرح اُٹھ چکے.. یعنی پھورا نالے سے اُٹھ کر اس ویران بلندی پر پہنچ گئے تو وہاں تیز تپتی سلگتی دھوپ ہماری منتظر تھی..

یہ تیز دھوپ گھات لگائے بیٹھی تھی.. ہمیں بہت دیر سے کھوجتی رہی تھی لیکن ہم برچ کے جنگلوں میں پوشیدہ چلتے تھے اور وہ ہمارا سراغ نہ لگا سکی تھی کہ وہاں کی گھناوٹ میں چھید کر کے ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھی.. اور اب جب ہم ایک چٹیل ڈھلوان پر چڑھ کر اوپر ایک پگڈنڈی پر آ گئے تھے تو اس کے گرم جال میں آ گئے تھے..

اُس نے بہت دیر ہمارا انتظار کیا تھا اس لیے غصیلی ہو چکی تھی.. غضب ناک ہو چکی تھی..

وہ ہم پر یوں اُتری کہ ہمارے بدنوں کو جلا کر رکھ دیا..

تاحدِ نظر ایک تنگ وادی چلی جاتی تھی..

نہ کوئی شجر تھا اور نہ کوئی سایہ.. بس دھوپ تھی.. چٹیل بلندی تھی اور نیچے پھورا نالہ تھا جو کہیں نیچے تھا.. گہرائی میں.. کبھی دکھائی دے جاتا اور کبھی ڈھلوان کی اوٹ میں غائب ہو جاتا اور صرف اس کا شور باقی رہ جاتا.. پگڈنڈی پُرخطر نہ تھی.. لیکن احتیاط پھر بھی لازم تھی کہ دائیں جانب جو ڈھلوان تھی اس پر اتفاقاً گرنے سے.. یقیناً پھورا نالے تک گرتے ہی چلا جانا تھا..

بعض مقامات پر وادی تنگ ہو جاتی.. نالے کے پار کی چٹانیں اتنی قریب ہو جاتیں کہ ہم انہیں سنگسار کر سکتے تھے.. ان پر پتھر پھینک سکتے تھے.. وہ اتنی نزدیک آ جاتیں.. اتنی کہ ہمارے اور ان کے درمیان کسی نالے کا وجود ممکن نہ لگتا..

جہاں تک ہم دیکھ سکتے تھے ایک خشک اور ویران گھاؤ نظر آتا تھا جس کے ایک جانب خشک چٹانوں میں ایک پگڈنڈی بل کھاتی کبھی نہ ختم ہونے والی بے جان کیفیت میں چلی جا رہی تھی..

کبھی اس یکسانیت میں کوئی سخت مقام بھی آ جاتا.. پگڈنڈی غائب ہو جاتی اور اس کی بجائے گہرائیوں پر ایک گیلری معلق ہوتی.. چند ٹہنیاں.. کچھ پتھر.. اور ہم سانس روکے کچھ نہ کچھ پڑھتے سانس روکے اس پر سے پھونک پھونک کر قدم رکھتے گزر جاتے.. اور پھونک بھی آہستہ سے مارتے کہ کہیں وہ گیلری ہل نہ جائے..

جہاں ہم وادی کا اختتام دیکھتے وہاں مارو مار کر کے بھوکے پیاسے پہنچتے تو ایک اور ویران وادی سامنے آ جاتی جس پر وہی لامتناہی پگڈنڈی بے تکان بل کھاتی چلی جاتی..

اگرچہ یہ ایک پہاڑی سفر تھا لیکن یہاں ایک صحرا کی مسافت ایسی پیاس تھی..

ہماری فلاسکس میں جتنا پانی تھا وہ ہم پی چکے تھے..

سورج سوا نیزے سے بھی نیچے ہو کر تقریباً آدھے نیزے تک آ گیا تھا اور ہم سے برچ کے جنگلوں میں پوشیدگی کا بدلہ لے رہا تھا..

گدا اور گرد آمیز کا فرق ہم سے الگ ہو کر آگے چلا گیا تھا اور اب نظروں سے روپوش ہو چکا تھا.. صرف ہم قدیمی تھے جو ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے تھے..

عجب لایعنی اور پُرآزار گرم مسافت تھی.. نہ آس پاس کوئی منظر تھا اور نہ کسی ہریاول کا کوئی شائبہ یا نشان.. ہم اس تنگ وادی میں قید تھے اور دھوپ کا کڑا پہرہ تھا.. ہم پیاس اور پسینے

سے نچڑتے تھے..

خیال تھا کہ کہیں پیٹ پُوجا کے لیے رُکیں گے..لیکن آج تو صرف مشقت..تھکاوٹ اور پیاس کی پوجا کا دن تھا..

دوپہر ڈھلنے لگی..لیکن یاد رہے کہ صرف دوپہر..سورج نہیں..وہ بدستور آدھے نیزے پر تھا..اُس کی تمازت اور کرنوں کی آتش نہیں ڈھلی تھی..کبھی کوئی ایسا موڑ آتا جب ہم پل بھر کے لیے سائے میں چلے جاتے تو وہاں اپنے رُک سیک اتار کر گرم چٹانوں کے ساتھ ٹیک لگا کر ہانپنے لگتے..

ہمیں یقین ہوگیا تھا کہ اس تنگ وادی کا کوئی اخیر نہیں..کوئی انجام نہیں..ہم چلتے ہی رہیں گے اور یہ یونہی ہمیں ایک لامتناہی بل کھاتی پگڈنڈی دکھاتی..جو کہ ایک آتش برساتے سورج کی ہمسائیگی میں ہے..بس جاری رہے گی..یہ دیوارِ چین کے پار ہوجائے گی..اہرامِ مصر، تاج محل اور مسجد قرطبہ کو دائیں بائیں چھوڑتی دنیا کے..یا شائد کائنات کے کسی ایسے کنارے پر جا پہنچے گی جہاں سے ہم ایک قدم آگے اٹھائیں گے تو خلاء میں گر جائیں گے..

کوہ نوردوں کے لیے اگرچہ انعام بھی بہت ہیں لیکن سزائیں کہیں زیادہ ہیں..

ایک یونانی فلسفی کا کہنا ہے کہ آپ کو زندگی میں جتنی بھی مسرت حاصل ہوتی ہے آپ کو اس کے عوض اتنی ہی اذیت بھی ملتی ہے..شائد ہمیں علترتجھیلوں..لوزشا اتی..برف کے کنویں اور برچ کے جنگلوں کی قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی..

اور جب ہم گرمیوں کی آگ برساتی..کڑکتی اور لُو تی دوپہروں میں گاؤں کی سنسان گلیوں میں کسی گندی نالی میں لوٹ کر بدن کو اس کی غلاظت میں بھگو کر تھوڑی سی آسودگی حاصل کرنے کی خواہش کرنے والے کُتّے کی مانند زبانیں لٹکائے چلتے تھے تو ایک موڑ پر مڑتے ہی چٹانوں کے خشک گھاؤ میں سے ایک آبشار اتر رہی تھی..

اس کے نیلگوں پانی ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہوئے لیکن ہم بے یقین بھی ہوئے کہ پیاس کے اس صحرا میں یہ کیسے ممکن ہے..سراب ہوگا..

اور وہ آبشار ایک آبی شالیمار کی مانند چٹانوں سے تختہ بہ تختہ اتر رہی تھی..اوپر سے گرتی آتی ہے تو چٹانوں میں ایک تالاب بناتی ہے..اور پھر اُس تالاب میں سے رُکے شفاف سرد پانی چھلکتے ہیں تو ایک دھارے کی صورت چٹانوں کی کوکھ کو بھرتے..انہیں لبریز کرکے پھر نیچے آتے

ہیں..ہماری پگڈنڈی کے قریب ہو کر فردوس بر روئے زمیں ہو کر ایک اور تالاب میں اُترتے ہیں..
اور پھر اُسے لبالب بھر کر پگڈنڈی پر سے ایک سیلاب کی طرح رواں ہو کر کہیں نیچے گر جاتے ہیں..

ہم اس آبشار کے وعدے پر اگر جیتے تو یہ جان جھوٹ جانا..کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا..

ہم نے اُس کے قریب پہنچ کر بے اعتباری میں اپنے رُک سیک اتار پھینکے..سجدہ ریز ہوئے اور اس کے سرد پانیوں میں ناکیں ڈبو کر کہ بے شک ہم بھی ڈوب جاتے..اس کے پانی پیتے رہے تا آنکہ اس کی آبی خنکی سے ہمارے پیٹ مشکیزے جو پیاس سے پچک چکے تھے..پھول گئے اور ان میں گنجائش باقی نہ رہی اور وہ چھلکنے کو آئے..تب ہم نے مجبوراً اپنی ناکیں اٹھائیں..پھر ہم نے بیتابی سے اپنے کپڑے اُتارے اور ایسے اُتارے جیسے ” جلتا ہے بدن“ گاتے ہوئے فلم کی ہیروئن اُتارتی ہے..اور اگر کسی نے انڈرویئر پہن رکھا ہے تو خیر ہے نہیں پہن رکھا تو بھی خیر ہے ہم اس کے پہلے تالاب میں کود کر رنگ رلیاں منانے لگے..کبھی شفاف اور نیلے پانیوں میں اوندھے ہو جاتے کبھی چھینٹے اُڑانے لگتے اور کبھی پتھروں میں سے نیچے گرتے پانی کے نیچے بیٹھ جاتے..کبھی ایک مختصر آبشار تلے نہاتے اور کبھی دوسری آبشار تلے سانس روک کر بیٹھ جاتے..

میاں صاحب چونکہ سنگل پسلی کے ہیں..پھرتیلے ہیں اس لیے وہ کدکڑے مارتے ہوئے پتھروں پر چڑھتے ذرا بلندی پر جو تالاب تخلیق ہو رہا تھا اس میں جا کر اشنان کرنے لگے..
کوشش تو میں نے بھی کی کہ اس آبی شالیمار کے دوسرے تختے تک پہنچ کر فرزند کے ساتھ ڈبکیاں لگاؤں لیکن میرا وجود بھاری اور نا ہنجار تھا..خدشہ تھا کہ میں اوپر جاتے ہوئے پانی میں بھیگے ہوئے پتھروں پر پھسل نہ جاؤں اس لیے میں نے پگڈنڈی کے برابر میں پہلے والے تالاب کو ہی غنیمت جانا اور اوپر سے چھینٹے اُڑاتے آتے پانیوں کی برفیلی آغوش میں سرد وصال کے مزے لوٹتا رہا..
جب کچھ زیادہ ہی مزے لوٹے گئے تو ہمارے بدن نیلے پڑنے لگے..چھینکیں آنے لگیں..ہم بے اختیار کپکپانے لگے..ٹھٹھرنے لگے..ہماری بتیسیاں بجنے لگیں..ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم سن سٹروک سے ہلاک ہونے ہونے کو تھے اور اب نمونیے سے انتقال کر جانے کا خدشہ پیدا ہوگیا..
چنانچہ ہم نہ چاہتے ہوئے بھی آبشار سے الگ ہوئے..ٹھٹھرتے ہوئے کپڑے پہنے..رُک سیک اٹھائے اور پھر سے چلنے لگے..

''وادی اشکومن میں اُترتے ہیں..اور سفر تمام کرتے ہیں''

پھر سے چلنے لگے تو تنگ وادی نے پھر سے اپنے آپ کو ایکشن ری پلے کی صورت میں دوہرایا اور لامتناہی ہوگئی..کوئی انجام نہ تھا..مشقت پھر سے شروع ہوگئی..

ہاں کچھ دیر کے لیے ہم ان بلند اور خشک چٹانوں سے اُتر کر نیچے آئے تو ہمیں نالے کے پار ایک گاؤں نظر آیا..ہریاول کا ایک ایسا جنت نظیر ٹکڑا نظر آیا کہ اسے دیکھتے ہوئے آنکھیں ہری ہوجاتی تھیں..بدن کے در و دیوار پر سبزہ اُگنے لگتا تھا..اسے گاؤں تو میں نے یونہی کہہ دیا کہ وہاں گھر نہ تھے..بس سبز چارے کے کھیت تھے اور کہیں ایک آدھ جھونپڑا تھا اور خشک چارے کے ڈھیر تھے..

یہ ''اُتر'' تھا..کھوار زبان میں ''چشمہ''..

شاید اس پر سایہ فگن چٹانوں میں سے کوئی بڑا چشمہ نکلتا تھا اور نیچے آکر اس کے کھیتوں اور کھلیانوں کو سیراب کرتا تھا..

یہ علاقہ ہریاول کا ایک سمندر تھا جو ارد گرد کی خشک چٹانوں کے بیچ ایک نیلم کی مانند دمکتا تھا..

اگرچہ ہم ابھی ابھی نہائے تھے..سردی نے بدن نیلے کر دیے تھے لیکن یہاں تک آتے آتے حالات پھر سے دگرگوں ہوگئے تھے..ہم نے جیسے کبھی کسی آبشار میں اپنے آپ کو بھگویا ہی نہ ہو ایسے خشک اور پیاسے ہوگئے تھے اور ہمارا جی چاہتا تھا کہ نالے کے اوپر کمندیں ڈال کر اس ہرے بھرے گھر کی آغوش میں پہنچ جائیں..

نہ صرف یہ کہ وہاں کوئی گھر نہ تھا بلکہ کوئی ذی روح بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا..وہاں کوئی بھی نہ تھا..اشکومن پہنچنے پر ہمیں بتایا گیا کہ لوگ یہاں سے اوپر ''چشمہ'' کو جاتے ہیں اور چارہ

کاشت کر کے پھر نیچے آجاتے ہیں وہاں قیام نہیں کرتے..

اس ہرے بھرے نظارے سے ہم آگے چلے گئے..وہ پیچھے رہ گیا اور پھر سے ویرانی اور خشکی کی کائنات شروع ہوگئی..

سورج کی حدت قدرے کم ہوئی کہ دوپہر ڈھلتی جا رہی تھی لیکن پھکورا کا کوئی نشان نظر نہ آتا تھا..درّہ نما وادی پہلے سے بھی تنگ ہونے لگی..بکریوں کے اس راستے پر چلتے چلتے ہم بکری ہوگئے..نہایت ہی لعنتی راستہ تھا..

جب ہماری جان بدن سے رخصتی چاہ رہی تھی اور ہماری نظر میں فرق آنے لگا تھا..ایک کی بجائے تین تین پتھر نظر آنے لگے..پھکورا نالے کے پانی دھندلانے لگے تو پگڈنڈی یکدم نیچے ہونے لگی اور نالے کے کنارے پر پہنچ گئی..بے حد شور تھا..ہم بات نہیں کر سکتے تھے..ظاہر ہے اگر پگڈنڈی نیچے اُتری تھی تو بلاوجہ نہیں اُتری تھی اس نے ہمیں نالے کے پار لے جانا تھا..سو ہم چلے گئے..پانیوں میں سے گزر کر نہیں بلکہ ایک پُل پر سے گرتے پڑتے گزر گئے..دوسری جانب یہی پگڈنڈی پھر سے اوپر ہوئی لیکن اس نے مہربانی کی کہ زیادہ اوپر نہیں ہوئی..نالے کی قربت میں ہی رہی..

شام ہونے کو تھی اور شور تھا..

ہم نے کسی گائیڈ بک میں پڑھا تھا کہ اس پُل کے پار پھکورا آجاتا ہے..

ہم چلتے گئے..لیکن پھکورا نے آنا نہ چاہا..

ہمارے گھٹنے آپس میں بجنے لگے..ہم گرنے لگے..گرنے لگتے تو پتھروں پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ کو سنبھالتے..ہتھیلیاں بھی چھل گئیں..ہماری نظر میں کچھ زیادہ ہی فرق آنے لگا..کبھی دھند چھا جاتی اور کبھی اس میں آبشاریں گرنے لگتیں اور کبھی پیاس کے صحرا پھیل جاتے..ہمارا جی چاہا کہ ہم سفر ترک کر دیں اور قہقہے لگانے لگیں..تب ہمیں اس دھند میں..وادی کے آخر میں ہریاول کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آیا..قریب ہوتے گئے تو وہ پاپلر کے چند درخت ہوتے گئے..اور قریب ہوئے تو وہ تیز ہوا سے جھول رہے تھے..یہ تیز ہوا ہم ساتھ لے کر آئے تھے..یہ طلتر درّے سے پھکورا کے نالے کے اوپر تنگ وادی میں تیز ہوتی شرلاتے بھرتی آتی تھی اور وادی کے اختتام پر اپنے راستے میں ان درختوں کو پا کر غضبناک ہوتی اُن کے بدن دوہرے کرتی تھی..

پھکورا کا پہلا گھر آگیا..

اب پھکورا نالہ ذرا پرے بہتا تھا اور ہم انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ایک برفانی پانیوں

والی قل یا چھوٹی سی نہر کے کنارے چلتے تھے.. چلتے تھے یا اپنے آپ کو اپاہجوں کی مانند گھسیٹتے تھے..

قل میں سے ریت نکالنے والے چند مقامی افراد نے ہمیں اپنی جانب آتے دیکھا تو اُن کے سپید چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی کہ اچھا بھلا اور بیوقوف ورّہ غلتر کو عبور کر کے ادھر آتے ہیں اور پریشان حالوں میں ہیں.. انہیں کس حکیم نے کہا تھا کہ یہ حماقت کریں.. ہمیں اُن کی یہ مسکراہٹ زہر لگی اور ہم نے ان سے کلام تک نہ کیا..

پگڈنڈی جس پر ہم چلتے تھے پہلے آزاد تھی اب آہستہ آہستہ قید ہونے لگی.. اس کے دونوں جانب گھروں اور کھیتوں کی دیواریں اُبھرنے لگیں.. کھیت میں ٹھگنا ایک نوجوان ہمیں دیکھ کر کدال اٹھائے راستے پر آ کھڑا ہوا جیسے روکنے کے لیے آیا ہو.. اُس کا منہ کھلا تھا اور چہرہ فاترالعقل لوگوں کی مخصوص ڈھیلی بناوٹ لیے ہوا تھا.. ہنستا ہوا.. وہ ہمیں دیکھ کر اور زیادہ ہنسا کہ مجھے تو ربّ نے اسی طور تخلیق کیا تھا اس میں مرا تو کوئی دوش نہیں لیکن تم جو ہو.. سمجھ بوجھ رکھتے ہوئے بھی ان راستوں پر آئے ہو تو ہم میں سے پاگل کون ہوا..

اس نوجوان سے ہم نے مختصر ڈائیلاگ کئے اور آگے بڑھ گئے..

دائیں جانب ایک قبرستان کے آثار تھے..

آثار اس لیے کہ ان بلند وادیوں میں باقاعدہ قبریں نہیں ہوتیں.. بنائی باقاعدہ جاتی ہیں لیکن برفباری اور بارشوں سے ان کے ڈھیر ڈھے جاتے ہیں اور بس کتبے رہ جاتے ہیں.. یہ پتہ نہیں چلتا کہ کونسا کتبہ کس قبر پر تھا.. تارڑ کا کتبہ شیخ صاحب کی قبر کے سرہانے اوندھا پڑا ہے اور شیخ صاحب پتہ نہیں کہاں پڑے ہیں.. اکثر قبریں گڑھوں میں بدل جاتی ہیں کبھی شیخ صاحب کی ہڈیاں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں..

ہمیں بتایا گیا تھا کہ پھسورا کی کیمپنگ سائٹ کو اسی قبرستان سے راستہ ہو کر جاتا ہے.. چنانچہ ہم اہلِ قبور سے معذرت کرتے ان کے لیے فاتحہ پڑھتے ان کے کتبوں کو پاؤں تلے آنے سے بچاتے اس قبرستان میں سے گزرے اور چند کھیتوں اور گھروں اور دیواروں کے بعد پھسورا کی خیمہ گاہ میں پہنچ گئے.. کچی چاردیواری میں گھرا ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کے ایک کونے میں چند درخت تھے..

پورٹر پہنچ چکے تھے..

گدا اور گرد آمیز بھی پہنچ چکے تھے اور اطمینان سے تاش کھیل رہے تھے.. اخروٹ کے درخت تلے ہمارا سامان اور خیمے جوں کے توں پڑے تھے..

"ابراہیم" میں نے اپنے واحد مونس و غم خوار کو پکارا "ابھی تک خیمے کیوں نہیں لگائے؟"

"گدا صاحب کہتے تھے کہ تارڑ صاحب آئیں گے تو خود لگوائیں گے"

"کھانے کا کیا بندوبست ہے؟"

"گدا صاحب کہتے تھے کہ تارڑ صاحب آئیں گے تو بتائیں گے ابھی ہم تاش کھیلتے ہیں ہمارے لیے چائے بناؤ..

میں گھاس پر گرا اور بے سُدھ ہو گیا..

کوہ نوردی کا اَن لکھا دستور ہے کہ جب کوئی ساتھی سب سے پہلے منزل پر پہنچتا ہے تو فوری طور پر خیمے نصب کرواتا ہے.. خوراک کی تیاری میں مشغول ہو جاتا ہے تاکہ بعد میں آنے والے ساتھی جو تھکن سے چور آئیں گے خیموں میں آرام کر سکیں اور پھر ان کے لیے خوراک تیار ہو.. شہرت ایک لعنتی شے ہے.. آپ اپنے ہم خیال اور مشترکہ دلچسپی رکھنے والے لوگوں سے دوستی کر لیتے ہیں.. پہلے پہل وہ آپ کی قربت پر فخر کرتے ہیں اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے کہ وہ آپ کو ناپسند کرنے لگتے ہیں کہ یہ شخص تو ہم جیسا ہے.. اس میں کوئی خاص خوبی تو نہیں تو اسے ہر جگہ اولیت اور توقیر کیوں دی جاتی ہے.. وہ آپ کے حوالے سے نامور ہو جاتے ہیں کہ آپ دوستی میں ان کی بے جا توصیف کرتے ہیں اور پھر وہ آپ کو ناپسند کرنے لگتے ہیں..

صرف میں ہی نہیں.. سلیم.. میاں.. حسن اور شاہد بھی اس خبر سے بے سُدھ گرے کہ نہ خیمے نصب ہیں اور نہ چولہا گرم ہوا ہے اور اخروٹ کے ایک گھنے شجر کے نیچے بے سُدھ گرے.. یہ صرف عمران.. کاظمی اور طاہر تھے جو ابھی تک مکمل طور پر چاق و چوبند اور پھرتیلے تھے اور ایک مرتبہ پھر بندر ہو چکے تھے..

عمران نے میرے عالم بے سُدھی میں خلل ڈالا اور نیکر ٹٹول کر بولا "سر آپ تو جُوں کی تُوں رُتے ہیں.. ٹھیک ہے عمر کا تقاضہ جو ہوا.. ہم لوگ تو دو گھنٹے پہلے پہنچ گئے تھے"

"تو مجھ پر احسان کیا ہے.." میں نے غضب ناک ہو کر کہا.. "میں پہنچ تو گیا ہوں ناں.. تم میری عمر کے ہو گے ناں تو کہیں بھی نہیں پہنچو گے.. زیادہ سے زیادہ تمہاری خاک پہنچے گی جہاں کا خمیر تھا.. نہیں سمجھے؟"

"نہیں" اس نے داڑھی کھجلا کر کہا "لیکن سر کیا گاؤں ہے یہ پھسورا کا اور کیا وادی ہے اشکومن کی.. ہم نے آپ کی آمد سے پہلے پھیرے.. کچھ گھر اور کچھ کھیت شوٹ کئے ہیں.. سر اس

وادی میں بھی ایک گھر ہونا چاہیے..کیا خیال ہے؟''

''نیک خیال ہے..میں یہاں پہلی بار نہیں آیا'' میں اپنے عالم بے سُدھی میں سے اٹھا'' میں چند برس پیشتر اس گاؤں سے گزر کر آگے امت تک گیا تھا..اور وہاں سے ''پاک سرائے'' کے ٹریک کا آغاز کیا تھا..یہ جو گاؤں کے پار ایک وسیع پھیلاؤ والا دریا ہے یہ اشکومن ہے اور اس کے پار جو بلند درّے ہیں وہ وادی یاسین میں اُترتے ہیں..کچھ کوہ نورد ملتر ٹریک مکمل کر کے اس دریا کے پار اُترتے ہیں اور پھر ان بلند درّوں کو عبور کر کے وادی یاسین میں جا نکلتے ہیں۔''

''تو کل صبح چلتے ہیں ناں سر''..کاظمی نے دانت نکال دیے..

''ہاں جی ہاں جی..طاہر نے الف لیلیٰ کے ایک ناکام جن کی مانند سر ہلایا تو اس کے کانوں کی بالیاں بھی ہلنے لگیں..

''مجھے کوئی اعتراض نہیں..''عمران بولا..

مجال ہے جوان تینوں پر اس مسافت کا کوئی اثر ہوا ہو..شائد وہ ہم سے جدا کوئی اور نسل تھے..انسان نہ تھے..بندرسے تھے..ان پر تھکاوٹ اور پہاڑی مشقت اثر نہ کرتی تھی..

''نہیں..کل صبح جیپیں ہمیں لینے کے لیے آجائیں گی..ہم گلگت جائیں گے اور وہاں سے سیدھے رُکے بغیر لاہور جائیں گے..ہم انسان ہیں تمہاری طرح بندر نہیں ہیں..نہیں سمجھے؟''

''سمجھ گیا سر..تو پھر یہ فیصلہ ہو گیا ہے کہ ٹریک کا اختتام ہو گیا ہے..تو اس صورت میں اس ڈاکومنٹری کے آخری منظر کے لیے آپ ذرا میرے ساتھ آجائیں..''

''کہاں؟''

''قبرستان میں..''

''قبرستان میں تو کندھوں پر اُٹھا کر لے جایا جاتا ہے..میں خود بخود چلتا ہوا کیسے چلا جاؤں؟''

''ویسے تو ہم تینوں آپ کو کندھوں پر اٹھا کر بھی لے جا سکتے ہیں لیکن سر مذاق الگ..میں چاہتا ہوں کہ..''

''نہ تم چاہنے والے کون ہوتے ہو..''

''میں آپ کا ہدایت کار ہوتا ہوں سر..اتنے دنوں سے مکمل تعاون کرتے رہے ہیں تو آخری شاٹ کے لیے بھی تعاون کر لیجیے..میں چاہتا ہوں کہ آپ ٹریک کے اختتام پر ایک قبرستان

میں گلے میں مائک ڈالے کسی بے نام قبر کے کتبے کو تھامے ہوئے..یعنی کسی اور قبر کے کتبے کو تھامے ہوئے کیمرے سے مخاطب ہو کر کہیں..خواتین و حضرات میں کتنا خوش بخت ہوں کہ اس خوفناک اور حیرت ناک مہم سے زندہ بچ کر آگیا ہوں..پھوراپہنچ گیا ہوں، نہ پہنچتا تو اسی قبرستان میں ہوتا..شائد اس کتبے پر میرا نام ہوتا..چلیں؟''

میں اپنے آپ پر جبر کر کے زبردستی اس بے سدھ کیفیت میں سے اٹھا اور عمران اور اس کے بغل بچوں کے ہمراہ اس قبرستان میں چلا گیا..مائک گلے میں ڈالا اور اپنی بڑھی ہوئی داڑھی اور سرخ آنکھوں سے کیمرے کو گھورتا اداکاری کرنے لگا'' خواتین و حضرات اگرچہ میری مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں کہ میں ملتر پھورا مہم کے آخر تک بخیر و عافیت پہنچ گیا ہوں لیکن یہ کتبہ جو میں نے تھاما ہوا ہے اس پر میرے نام کا امکان بہت کم کم تھا..اگر میری قسمت میں ایک گمنام قبر میں ہونا ہوتا..تو یہاں نہ ہوتا..براللدو..بیافو یا ہیسپر کی کسی بھی دراڑ میں ہونا ہوتا..میں سنولیک یا درّہ ہیسپر..چتی بوئی یا درّہ درکوت میں دفن ہوتا..یہاں نہ ہوتا..اس لیے کہ یہ ٹریک ان کی نسبت محض بچوں کا کھیل تھا..اگرچہ بچوں کے کھیل میں بھی کسی کی جان چلی جاتی ہے..تھینک یو''

''سر جی'' عمران کیمرے میں سے سر نکال کر دھاڑا'' سچ نہ بولیں..جھوٹ کی انتہا کر دیں..ڈرامہ کریں..کوئی ہولناک بات کریں..کوئی ایسی بات کریں کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں..''

''سوری..''میں نے معذرت کی..یعنی لوگ عشق کی انتہا چاہتے ہیں اور تم جھوٹ اور ڈرامے کی انتہا چاہتے ہو تو عمران مجھ سے بہتر تم اور کسی کو نہ پاؤ گے..شاٹ دوبارہ کرو''

''او کے..''عمران نے کیمرے میں سر گھسا کر مجھے اشارہ کیا'' کیو..''

''خواتین و حضرات..''میں ایک نہایت المناک شکل بنائے شروع ہو گیا'' میں اس انتہائی خوفناک مہم سے زندہ بچ کر بالآخر پھورا کے گاؤں میں پہنچ گیا ہوں جہاں کل صبح دو جیپیں آئیں گی اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو گلگت لے جائیں گی..ان جیپوں کی بجائے کل ایک تابوت بھی آسکتا تھا..میرے سائز کا..کہ یہ ایسا..دنیا کا خطرناک ترین ٹریک ہے کہ بہت کم لوگ زندہ بچ کر آتے ہیں..میں نے خود اپنی آنکھوں سے راستے میں جگہ جگہ مُردہ کوہ نوردوں کے ڈھانچے دیکھے ہیں..اب اسی قبرستان کو دیکھیے جس میں مَیں کھڑا ہوں اس میں بیشتر قبریں ان کوہ نوردوں کی ہیں جو اس ٹریک کے دوران ہلاک ہو گئے..وہ میری طرح خوش قسمت نہیں تھے..یہیں کہیں میری

قبر کا کتبہ بھی اوندھا پڑا ہوتا اور اس پر میرا نام لکھا ہوتا.. اگرچہ اشکومن کے کتبہ نویسوں کو میرا نام لکھنے میں بے حد دشواری ہوتی ’لیکن کتبوں پر درج ناموں کے ہجے کون چیک کرتا ہے.. مستنصر کو ”س“ سے لکھا جاتا یا ”ص“ سے تو کون چیک کرتا ہے.. یعنی اگر قسمت یاوری نہ کرتی میں بھی ان بے نام قبروں میں سے ایک ہوتا.. اور بے نام قبروں پر کوئی دیا جلانے بھی نہیں آتا.. آپ بھی نہ آئیے گا.. وادی اشکومن بہت دور ہے.. خدا حافظ!“

”واہ سر جی واہ.. آپ نے تو کمال کر دیا.. آج اخیر کر دی.. یہ ڈاکومنٹری ہٹ ہے سر“ عمران اینڈ کمپنی نے کیمرہ آف کیا اپنا ساز و سامان سمیٹا اور پھورا گاؤں کو شوٹ کرنے کی خاطر قبرستان سے اتر کر میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے.. اب میں ان کے لیے بیکار ہو چکا تھا.. وہ پروفیشنل لوگ تھے مجھے استعمال کرنے کے بعد وہ مجھے یکسر ترک کر گئے.. گویا کوڑے کے ایک ڈھیر پر پھینک گئے..

اب میں آپ سے.. اس قبرستان کی تنہائی میں صرف آپ سے.. اپنے پڑھنے والوں سے مخاطب ہوتا ہوں کہ آپ مجھے کبھی ترک نہیں کرتے ”خواتین و حضرات.. اگرچہ اس سفرنامے کے آغاز میں میں نے اقرار کیا تھا کہ یہ سفر اس لائق نہیں کہ اسے بیان کیا جانا چاہیے.. البتہ اس کے کچھ کردار ایسے ہیں جو اس لائق ہیں یا نالائق ہیں کہ انہیں بیان کیا جانا چاہیے.. لیکن اب اس کوہ نوردی کے اختتام پر مجھے یہ اقرار کرنا ہے کہ اگر دنیا بھر کی جھیلوں میں سے سب سے آئینہ دار اور رنگ ریز علتر جھیلوں کو بیان نہ کرتا.. سر شام لوئر شاہی کی ڈھلوانوں پر سے اترتے یاک قافلوں کی سموں سے اٹھنے والی دھول اور دھمک کو تحریر میں نہ لاتا.. تین سروں والی شاہی پیک میں سے گرتے برف کے آبشار ایولانچ کو قلم بند نہ کرتا.. کوہ قاف کے اس ہرے بھرے بلند برفانی تخت کا تذکرہ نہ کرتا جس میں یاک اور گھوڑے کھلونے تھے.. کہیں بلند پہاڑوں میں رسول حمزہ توف کی نظم ”اے عورت“ نہ پڑھتا.. برف کے کنویں میں گرتی اس آبشار میں ایک حنوط شدہ چہرے سے نہ جھانکتا جب کہ میرے جوگرز میں میری جان تھی اور انہیں ابراہیم نے جکڑ رکھا تھا.. برچ کے سفید جنگلوں میں چھید کرتی سورج کی اولین شعاعوں کو دھند میں نقب لگاتے نہ بیان کرتا.. ایک آبی شالیمار میں بدن ڈبونے کی کیفیت.. نہ تحریر کرتا.. تو کتنا بڑا گناہ کرتا.. سوہنے رب نے جو کچھ بنایا ہے اسے دیکھنا اور پھر بیان نہ کرنا کتنا بڑا گناہ ہے.. تو میں نے بیان کر دیا تو کیا برا کیا؟....

دوسرا سفر

”چٹان پر ایک لڑکی.. کچھ نہ بن سکو تو گھاس بن جاؤ“

چٹان پر ایک لڑکی...

چٹان بلند ہوتی جا رہی ہے اور جب چوٹی تک پہنچتی ہے تو وہاں ایک لڑکی...

چٹان کی چوٹی پر ایک لڑکی... براجمان!

اور چٹان حرکت کرتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ لڑکی جو اس کی چوٹی پر براجمان تھی، وہ بھی حرکت کرتی جاتی تھی... بہت تیزی سے.. جیسے میں ایک تیز رفتار ہیلی کاپٹر میں بیٹھا اس کے قریب سے گزر رہا ہوں...

چٹان پر اطمینان سے بیٹھی لڑکی سرخ لباس میں تھی۔

وہ ایک جل پری کی مانند چوٹی پر ٹانگیں سمیٹے بیٹھی تھی..

ایک سرخ جل پری بھوری چٹان کی بلندی پر ٹانگیں سمیٹے بیٹھی تھی اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ تو سامنے افق کے پار تکتی تھی نیچے نہیں دیکھتی تھی اور اگر وہ نیچے نگاہ کرتی تو دیکھتی کہ ڈوبتے سورج کی زردی میں نہاتی ایک جیپ ہے جو دھول اڑاتی ہوئی جانے والے کچے راستے پر چلی جاتی ہے اور اس کے پچھلے حصے میں رک سیک اور چند کوہ نورد ٹھنسے پڑے ہیں.. پیک ہو چکے ہیں اور وہ ہوشے کے اوپر سایہ فگن مشابرم کو تکتے ہیں اور اس کے دامن سے آنے والی سرد ہوا کو اپنے رخساروں پر محسوس کرتے مسکراتے ہیں کہ وہ نیچے سے.... پنجاب کے میدانوں سے اوپر آئے ہیں اور ابھی تک ان کے چہروں میں سے پنجاب کی گرمی پھوٹتی ہے۔ اور جیپ کی اگلی نشست پر ایک موٹے ڈرائیور کے برابر میں ایک بھوری آنکھوں والا شخص حیرت کی کیفیت میں گرفتار منہ اٹھائے اسے تک رہا ہے اور اس کی بھوری آنکھوں میں بھی ایک حرکت کرتی ہوئی بلند چٹان ہے جس پر

ایک سرخ لباس میں، ٹانگیں سمیٹے بیٹھی لڑکی ہے جو گزرتی جاتی ہے۔۔

اگر وہ نیچے نگاہ کرتی تو یہی دیکھتی۔۔

یہ پل دو پل کا منظر تھا لیکن اُس پر ابدیت نے مُہر لگا دی تھی۔۔۔

چٹان پر بیٹھی سُرخ لباس والی لڑکی بھوری آنکھوں میں ثبت ہو گئی تھی۔۔

جیسے ٹکسال میں ایک سکے پر کسی سکندر، کسی اشوک یا کسی شاہ جہان کی شبیہہ ثبت ہو جاتی ہے۔۔اور وہ سکہ سینکڑوں یا ہزاروں برس بعد جب کسی کھنڈر میں سے برآمد ہوتا ہے تو متروک ہو چکا ہوتا ہے لیکن۔۔اُس پر ثبت شبیہہ قائم ہوتی ہے۔۔۔

یوں اُس شخص کی بھوری آنکھیں بھی ایک ایسا سکہ تھیں جو لمحہ موجود میں تو دیکھ سکتی تھیں، رائج تھیں اور اُن پر چٹان کی چوٹی پر براجمان سرخ لباس والی لڑکی ٹانگیں سمیٹے بیٹھی ثبت ہو چکی تھی ایسے کہ کل کلاں جب یہ آنکھیں متروک ہو چکی ہوں گی۔۔خاک در خاک ہو چکی ہوں گی تو بھی اُس خاک میں سرخ پیراہن میں ملبوس چٹان پر بیٹھی ایک لڑکی کی شبیہہ محفوظ ہو گی۔۔۔

میں جیپ کی ونڈ شیلڈ پر نظریں جمائے ہوشے جانے والے کچے راستے کی خطرناکی سے آنکھیں چراتے سامنے مشابرم کی چوٹی کو تک رہا تھا جو شام میں جا رہی تھی اور میرے دل میں وسوسے تھے۔۔کہیں ہوشے کے راستے میں ہی رات نہ ہو جائے۔۔اگر رات ہو گئی تو خیمے کیسے اور کہاں نصب کریں گے۔۔بدن میں کلبلاتی بھوک کا مداوا کرنے کے لیے چولہا کیسے روشن کریں گے۔۔۔جب میں نے جیپ کی کھڑکی میں فریم ہوتے اُس میں سے تیزی سے گزرتے منظر کی جانب نگاہ کی۔۔

اور اُس لمحے ایک ویرانے میں خشک اور چٹانی ویرانے میں چٹانوں کی اوٹ میں اُن درجنوں گھروں کو دیکھا جو شاید اُن چٹانوں کی کوکھ میں سے جنم لے رہے تھے۔۔درجنوں کوٹھڑی نما صرف انسانی ہاتھوں کی مدد سے تعمیر کردہ گھر جو کاندے کے سیلاب میں بے گھر ہو جانے والے لوگوں نے یہاں آ بنائے تھے۔۔۔یہاں کینداس تھنگ نامی ایسے مقام پر جہاں پانی کی ایک بوند نہ تھی۔۔کاندے میں پانی نے اُن کو بہا دیا تھا اور یہاں کینداس تھنگ میں کربلا تھی۔۔پانی کا ایک گھونٹ نہ تھا۔۔۔

اسی لیے ہماری جیپ کے پچھلے حصے میں میرے ساتھیوں کو بے آرام کرتے پانی سے بھرے تین پلاسٹک کین تھے جو ہم کاندے کے فرات سے بھر کر اُن کے لیے لائے تھے۔۔

اور پھر اگلے لمحے جیپ کی کھڑکی میں سے ایک چٹان بلند ہونے لگی۔۔وہ گزرتی جاتی تھی۔ اسی رفتار سے جس رفتار سے ہماری جیپ جاتی تھی اور اس کی چوٹی پر یہ لڑکی بیٹھی تھی۔۔چٹان کے پس منظر میں جو برفپوش بلندیاں تھیں، وہ یکدم غائب ہو گئیں اور وہ چٹان اور اُس پر بیٹھی لڑکی جو جانے کس دھیان میں تھی اور جانے چوٹی تک کیسے پہنچی تھی، آسمان میں تیرنے لگی۔۔

یہ محض پل دو پل کا سماں تھا۔۔جو تیزی سے گزر گیا۔ آنکھ جھپکتے ہی گزر گیا لیکن میری یادداشت پر ثبت ہو گیا۔۔سکے پر مُہر لگ گئی۔۔۔

وہ کوپن ہیگن کی ''لٹل مرمیڈ'' کی مانند اُس چٹان پر بیٹھی تھی۔۔

کوپن ہیگن کی لٹل مرمیڈ ایک بڑے پتھر پر براجمان سمندر کو دیکھتی تھی، اُس شہر کی علامت ہوتی تھی۔۔اتنی مختصر تھی کہ قریب پہنچنے پر بھی غور کرنے سے نظر آتی تھی لیکن کینداس تھنگ کی یہ جل پری اس کی نسبت ہزاروں گنا بڑی اور بلند چٹان پر۔۔اور جانے وہاں تک پہنچی کیسے تھی، اطمینان سے بیٹھی تھی۔۔اور اُس کے سامنے سمندر نہ تھا۔ خلاء تھا۔۔۔وہ اتنی بلندی پر تھی۔۔اور اس خلاء کے کہیں نیچے دریائے ہوشے اور شیوک تھے۔۔اور بہت دور خپلو کی وادی تھی اور سیاچن جانے والے راستے تھے۔۔۔وہ ایک لیڈی گوڈائیوا تھی جو اپنے بے لباس بدن کو محض اپنے طویل گیسوؤں سے ڈھکتی ایک سفید براق گھوڑے پر سوار تھی۔۔

ایک جون آف آرک تھی جو اپنے جلائے جانے کی منتظر تھی۔۔

حضرت عیسیٰ کا وہ سفید مجسمہ تھی جو ریوڈی جنیرو کی بلند ترین پہاڑی پر ہاتھ پھیلائے کھڑا ہے۔۔

اگرچہ وہ یہ سب کچھ تھی لیکن ان سب سے افضل تھی کیونکہ وہ زندہ تھی۔۔اس کا سرخ دوپٹہ ہوا کے زور سے کبھی کبھار پھڑ پھڑا کر اٹھتا تھا اور گر جاتا تھا۔۔

''بن سکو تو پہاڑ کی چوٹی بن جاؤ''

یہ ممکن نہ ہو تو پہاڑ کی کھائی میں کھلنے والا ایک زرد پھول بن جاؤ۔۔

ایسا نہ ہو سکے تو ایک چھوٹا سا جھرنا ہی سہی۔۔

اور کچھ بھی نہ بن سکو تو گھاس بن جاؤ۔۔

ایسی گھاس جس پر کسی کے قدموں کے نشان ثبت ہو جائیں۔۔

میں کچھ بھی نہ بن سکا تھا، اس لیے وہ گھاس بن گیا تھا جس پر جیپ کی کھڑکی میں سے تیزی سے گزر جانے والی چٹان پر بیٹھی لڑکی کے نشان ثبت ہو گئے تھے..

منظر کب کا گزر چکا تھا..

سب کچھ پیچھے رہ گیا تھا..

لیکن اس کے باوجود وہی چٹان وہی لڑکی اس کی چوٹی پر ٹانگیں سمیٹے بیٹھی گزرتی رہی..

جیسے ایکشن ری پلے ہوتا جائے..

میری بھوری آنکھوں کے سکّے پر وہ بار بار ثبت ہوتی رہی...

کہیں بلند پہاڑوں میں...

ایک ٹرانگو ٹاور ایسے چٹانی مینار پر براجمان.. سرخ لباس والی لڑکی.. تیزی سے جیپ کی کھڑکی کے فریم میں سے گزرتی رہی..

چونکہ ابھی میری بھوری آنکھوں کا سکّہ رائج ہے.. اس لیے نقش بھی تازہ ہے.. ابھی ابھی ٹکسال میں ڈھلا ہے۔ اس لیے اسے میں اتنی تفصیل سے بیان کر رہا ہوں..

ایک بلند چٹان.. عرش کی قربت میں.. چوٹی پر ایک لڑکی.. سرخ لبادے میں.. تیزی سے سرکتی... جیپ کی کھڑکی میں سے گزرتی.. بلندیوں کی جل پری پاؤں سمیٹے جانے کس کی منتظر..

ہوشے کی شام میں جاتی دھول اڑاتی ایک جیپ کے عین اوپر..

چٹان پر ایک لڑکی...

"ویگن جس میں موسم، بلندیاں اور چند چہرے ٹھہرے ہوئے تھے...... واپسی!"

ویگن خاموشی کے چپ جزیرے میں سے یکدم... سکوت کے کواڑ توڑتی یکدم... شہر کے شور میں داخل ہو گئی..

لاہور شہر کے شور میں داخل ہو گئی..

ہمارے کانوں کے پردے پھٹنے کو آئے.. چہرے شور کی بوچھاڑ سے زخمی ہونے لگے..

ریڑھے، تانگے، ویگنیں، بسیں، رکشے شور مچاتے دندناتے ہمیں روندتے ہماری ویگن کے آس پاس ایک ہولناک قیامت برپا کر رہے تھے.. اور پھر لوگ... بہت ہی لوگ... شہر کے لوگ... لاکھوں لوگ بھیڑوں کے ریوڑ.. لالچ اور حماقت کے ریوڑ ایک سیلاب کی مانند ہماری ویگن کو دھکیلنے لگے..

ہم نے ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا..

دندناتی لہراتی بے قابو بے اختیار ہوتی ویگنیں ہمیں کچلنے کے لیے آ رہی تھیں.. بسیں اپنے بانٹ کھولے ہمیں ہڑپ کرنے کو تھیں.. تانگوں میں جتے گھوڑے عفریتوں کی مانند منہ کھولے ہمیں نوالہ بنانے کے لیے ہنہناتے چلے آ رہے تھے.. کاریں صرف ہمیں کچلنے کی خاطر چیختی چلاتی ہماری ویگن کی جانب بڑھتی تھیں.. اور ہم سہمے ہوئے تھے..

ہم دبکے ہوئے کھڑکی کے کھلے شیشوں میں سے ان آفتوں اور بلاؤں کو اپنے آس پاس چنگھاڑتے ہوئے دیکھتے تھے اور سہمے ہوئے تھے..

ہم مکمل طور پر ایک سٹیٹ آف شاک میں تھے..

ہماری ویگن موٹروے سے اُتر کر کالا شاہ کاکو کے قریب گرینڈ ٹرنک روڈ میں داخل ہوئی تھی اور اب لاہور شہر میں پہنچ کر اس کے گھٹے بدہیئت شور میں ڈوبتی جاتی تھی.. ہماری ویگن.. اگرچہ... بلکہ بظاہر ان تمام ویگنوں جیسی اور ان کی شکل کی تھی جو ہارن ہونکتیں ہمیں کچلنے کی نیت سے بے قابو اڑتی پھرتی تھیں لیکن شکل سے کیا ہوتا ہے، ہماری ویگن کی روح ان سے مختلف تھی۔

اس کا ڈھانچہ اور ماڈل ان جیسا تھا لیکن اس کی روح کچھ اور تھی..

ہماری ویگن کے اندر ابھی تک کچھ موسم ٹھہرے ہوئے تھے..

اور اس ویگن میں جو ہم تھے.. ہمارے رُک سیک۔ پانی کی بوتلیں۔ خیمے۔ جیکٹیں، واکنگ سٹکس اور جو ہائکنگ بُوٹ تھے، ان میں بھی کچھ موسم ٹھہرے ہوئے تھے.. بشام کی شام میں شیر دریا سندھ کی لہروں کی کروٹوں کا بہاؤ اس میں تھما ہوا تھا.. اس کی کچھ نمی باقی تھی..

برسین.. یا برزمین کی بلند تنہائی کے موٹل کے ایک کمرے میں بستر پر بچھی بے شکن چادر کی ایک یاد تھی..

رائے کوٹ پُل پر.. سُرخ ریش پورٹر شکور کا چہرہ تھا جو اوپر فیئری میڈو سے آیا تھا اور مجھ سے کہتا تھا۔ صاحب.. اوپر چلو.. فیئری میڈو تمہیں یاد کرتا ہے.. گلگت کی ایک مست شام تھی..

سکردو روڈ پر سفر کرتے ہوئے اس تنگ درّے میں.. اس کی پُر پیچ اٹھان اور اُتران میں دریائے سندھ کی گرج نے جو دل کو روکا تھا، اس ویگن میں ابھی تک اُس دل کی دھک دھک تھی.. سکردو کی وسعت میں وہ ہلکی بارش تھی جو سندھ کے بہاؤ پر گرتی تھی..

گئی رات وادی ہُوشے کی جانب سفر تھا.. شیوک ابھی تک اس ویگن میں بہتا تھا.. مچلو کی خانقاہ کے تنّی مینار اور ستارے تھے۔ کاندے کا ٹوٹا ہوا پُل تھا اور اس کے پار ایک چٹان پر براجمان سرخ لباس والی لڑکی تھی.. ہوشے تھا.. درّہ گندوگورو تک کا ایک پُراذیت سفر تھا.. شائی چُو میں اڑتی پتنگ تھی.. دل سنگ پا کی جھیل میں اُترتے ہوئے سات گلیشیر تھے اور ہسپاں تھا جہاں لیلے ہماری منتظر تھی..

اس ویگن کے اندر جو ابھی ابھی موٹروے سے جدا ہو کر اس کے سکوت کے قفل توڑ کر یکدم لاہور شہر کے شور میں داخل ہوئی تھی، بہت کچھ باقی اس لیے تھا کہ اس میں کچھ موسم ٹھہرے ہوئے تھے..

اگرچہ دور سے.. ٹریفک کی بھیڑ میں یہ ایک عام سی کوئی سی ویگن لگتی تھی لیکن اس میں چند موسم... چند بلندیاں اور چند چہرے ٹھہر گئے تھے..

ویگن کے فرش پر ابھی تک کچھ کانٹے تھے.. کسی پہاڑی پودے کے جو کسی کوہ نورد کے بوٹوں سے چپک کر اندر آئے تھے اور ہمارے ساتھ ہی شہر کے شور میں چلے آئے تھے..

نشستوں تلے رُک سیکوں میں ٹھنسے ہمارے قدموں میں پڑے اُس شاپنگ کے ڈھیر ڈبے اور کارٹن تھے اور بیگ تھے جو گلگت کی این ایل آئی مارکیٹ میں کی گئی تھی.. بچوں کے کھلونے، جوگر، ریشمی زنانہ سوٹ، بیلی کاپٹر، چینی ڈنر سیٹ اور ٹی سیٹ۔ ایک عدد ٹیلی ویژن اور بے شمار کلاک جو بے حد سستے تھے اور اب درجنوں کے حساب سے ٹِک ٹِک کیے جا رہے تھے۔

اور ہاں.. ہماری گندی جرابوں کی بہت ہی بُری بُو تھی..

ویگن میں میری شاپنگ سب سے مختصر تھی کیونکہ شاپنگ تو ہمیشہ بیٹیوں کے لیے کی جاتی ہے.. اور میری بیٹی ملک سے باہر جا چکی تھی.. اگر ایک بیٹی آپ کے پاس ہو تو کسی بھی شاپنگ سنٹر کے سارے شیلف اس کے لیے خرید کیے جا سکتے ہیں.. وہ نہ ہو تو وہاں خریدنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا.. اور بیٹے بھی اتنے بڑے ہو چکے تھے کہ میں ان کے لیے تالیاں بجاتے بندر یا بیلی کاپٹر نہیں خرید سکتا تھا..

میرے پاؤں میں سینڈل تھے اور ٹریکنگ بوٹ فرش پر پڑے منہ کھولے ہانپ رہے تھے کہ وہ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر تو آسانی سے سانس لے سکتے تھے.. برفباری کے دوران ان کے تسمے کس دینے سے وہ آرامدہ محسوس کرتے تھے لیکن لاہور کی اس حبس زدہ گرمی میں وہ چڑیا کے بچوں کی مانند منہ کھولے ہانپ رہے تھے اور ان کو سانس نہیں آ رہا تھا.. ویسے وہ یہ جانتے تھے کہ یہ شخص اگر اگلے برس تک صحت مند رہا اور زندہ رہا تو باز نہیں آئے گا اور ہم پھر اس کے پاؤں سے آشنا ہوں گے اور بلندیوں تک جائیں گے۔

ویگن سے باہر ایک ہولناک شور تھا جیسے کوئی ڈائنا سور چکوال یا بلوچستان میں اپنی ہڈیاں جوڑ کر زندہ ہو کر لاہور کے بُرج مینارے ڈھاتا شہر میں گھس آیا ہو.. اتنی افراتفری مچی ہوئی تھی۔

اگر مجھے فوراً یہیں کہیں ڈراپ کر دیا جاتا اور کہا جاتا کہ آپ سڑک کے پار چلے جائیں تو میں کبھی بھی ایسا نہ کر پاتا کہ مجھ میں کاروں، ویگنوں اور رکشوں سے بچ کر سڑک پار کرنے کی

حس مفقود ہو چکی تھی.. میں ایک ہی مقام پر بیٹھی مرغابی کی مانند شکار ہو سکتا تھا.. مجھ میں کسی گہری دراڑ کو پھلانگنے یا گلیشیر کے بلند راستے کی دھار ایسے کنارے پر چلنے کی صلاحیت تو تھی لیکن اس طوفانی شور اور زوم زوم گزرتی ٹریفک میں سے بچ کر سڑک کے پار کرنے کی صلاحیت نہ تھی..

میں ابھی تک ہسپاں میں تھا۔

لیلیٰ پیک کی آغوش میں تھا..

میرا چہرہ اور ہاتھ جلے ہوئے تھے.. بلندیوں کے اژدھے کی پھونک سے ڈسے ہوئے تھے.. اگر کوئی میرے پورے بدن کو الفت سے دیکھتا تو وہ کہتا کہ.. یہ کیا ہے کہ تمہارے بدن کے کچھ حصے نیم سفید ہیں لیکن تمہارے ہاتھ سیاہ ہیں، چہرہ جلا ہوا ہے اور ناکوں پر سیاہی کے آثار ہیں اور تمہاری جلد اکھڑ رہی ہے.. یہ کیا ہے.. اور میں کہتا کہ یہ بلندی کی ڈائن ہے جس نے میرے بدن کے کچھ حصے سیاہ کر دیے ہیں..

تو پھر کیوں کہیں بلند پہاڑوں میں جاتے ہو؟..

میں نے کہیں اپنے گاؤں کے اس جولا ہے کا قصہ بیان کیا ہے جو ایک بار سانپ سے ڈسا گیا تو پھر ایک خاص موسم میں پھر سے ڈسے جانے کے لیے بے چین اور مضطرب ہو جاتا تھا.. وہ اس سانپ کا منتظر رہتا.. اور وہ آتا اور اسے ڈس کر چلا جاتا اور وہ جولا ہا شانت ہو جاتا۔

میں بھی وہی جولا ہوں..

ایک خاص موسم میں میں بھی بے چین اور مضطرب ہوتا ہوں اور پھر خود بلندی کی ڈائن تک جا پہنچتا ہوں کہ وہ میرے بدن کے کچھ حصوں کو سیاہ کر دے تاکہ میں بھی شانت ہو سکوں..

ویگن.. شہر کے اس شور میں ڈوب رہی تھی جس سے فرار ہو کر ہم شمال کو گئے تھے..

ہم سب سہمے ہوئے تھے..

”روانگی کا دن، ڈرائیور نیم حکیم اور کلر کہار میں بریک ڈاؤن“

یہ تو کچھ روز پہلے کی بات ہے..

چند روز پہلے کا قصہ ہے..

جب ہم..

لیکن کتنے روز پہلے؟.. نہ دن یاد ہے اور نہ تاریخ.. اس قصے کو گزرے ہوئے چند صدیاں بھی ہو سکتی تھیں..

کیونکہ چند روز میں تو انسان اپنے شہر کو نہیں بھولتا.. اس میں دوبارہ داخل ہونے پر ہم نہیں جاتا.. خوفزدہ تو نہیں ہو جاتا کہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں، یہ کونسا دیار ہے.. تو یقیناً اس قصے کو چند صدیاں گزر چکی تھیں جب ایک ایسی سویر تھی جب میرے گھر کے مونگیے رنگ کے پھاٹک کے باہر ایک ایسی ویگن کھڑی تھی جس میں میرے کوہ نورد ساتھیوں کے رک سیک اور سامان لوڈ کیا جا رہا تھا.. اور پھر ہم لوڈ ہوئے تھے بلکہ ٹھنس گئے تھے کیونکہ ویگن کی چھت پر کیریئر نصب نہ تھا اور ہم اور سامان اس کے اندر ہی بمشکل پیک ہوئے تھے..

ویگن گلبرگ میں سے نکلی تو موٹر وے کی بجائے ملتان روڈ کی ایک ایسی ورکشاپ کے سامنے جا کھڑی ہوئی جس کے چھوٹے ابھی نیند میں تھے اور استاد کے نمودار ہونے میں ابھی بہت وقت تھا کیونکہ یہ صبح سویر تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ میں نے حکیم سے پوچھا..

اور یہ حکیم ہمارا ڈرائیور تھا اور عجیب و غریب حکیم تھا.. نہ کچھ بولتا تھا نہ کچھ کہتا تھا.. شاید نیم حکیم تھا.. ہم نے سفر کے آغاز میں اس سے کچھ فرینڈلی ہونے کی کوشش کی لیکن اس نے ہمیں

کچھ زیادہ لفٹ نہ کرائی صرف ''جی'' اور ''ہوں'' کے ساتھ ہمیں ٹرخا دیا.. ایک بہت ہی طویل سفر کے دوران ڈرائیور کے ساتھ فرینڈلی ہونا بلکہ کسی حد تک اس کی خوشامد کرنا بے حد ضروری ہوتا ہے.. کیونکہ شاہراہ قراقرم اور سکردو روڈ پر آپ ایک ناراض اور ناخوش ڈرائیور افورڈ نہیں کر سکتے..

''ہوں..'' اس نے جواب دیا..

''یار حکیم پلیز بتاؤ کہ کیا پرابلم ہے؟''

''ایئر کنڈیشنر کی بیلٹ آواز دے رہی ہے.. اسے چیک کراتا ہے۔'' حکیم نے اونگھتے ہوئے حکمت سے کہا۔

''پہلے کیوں نہیں چیک کی..'' حسن صاحب ذرا ناراض ہو گئے کہ یہ انہی کا بندوبست تھا۔'' آپ تو کہتے تھے ویگن بالکل برینڈ نیو ہے اور ابھی تک اس کی سیلیں نہیں ٹوٹیں۔''

''میں نے نہیں کہا تھا.. مالک نے کہا تھا..''

ایک زبردستی بیدار کیا گیا اونگھتا ہوا چھوٹا کچھ اوزار لے کر ویگن کے پیٹ کے نیچے رینگتا ہوا روپوش ہو گیا..

یہ کوئی اچھا شگون نہ تھا..

پاؤلو کوہلو کہتا ہے کہ شگونوں پر ہمیشہ دھیان دو..

لیکن ہم نے اس کا کہا نہ مانا کہ سفر کا آغاز اچھا نہ تھا۔ ایئر کنڈیشنر کی بیلٹ کا آواز دینا ایک بُرا شگون ہو سکتا تھا.. ہم اس شگون پر دھیان دیتے تو سفر کا ارادہ ترک کر دیتے۔ چنانچہ ہم نے آس پاس دیکھنا شروع کر دیا۔

اور آس پاس ملتان روڈ کا وہ علاقہ تھا جہاں شاہ نور سٹوڈیو واقع تھا.. شاہ یعنی شوکت حسین رضوی اور نُور یعنی نور جہاں دونوں مر چکے تھے لیکن ان کا سٹوڈیو ابھی زندہ اور بارونق تھا.. اس کے آس پاس اور قربت میں ایسے ''ادارے'' اور ''اکیڈمیاں'' تھیں جو ہیرو بننے، گلوکاری میں کمال حاصل کرنے کے خواہش مندوں کے لیے مینارۂ نور تھیں..

ہر جانب مختلف ''پرفارمنگ آرٹس'' کی اکیڈمیوں کے بورڈ تھے جو یقیناً ان بلند پایہ اداروں کے پرنسپل حضرات نے خود اپنے ہاتھوں سے لکھ کر وہاں لٹکائے تھے..

''شاہی بینڈ باجہ... پوپ سانگ کے ایکسپرٹ.. بلو بھائی۔''

''رائل ڈانس اکیڈمی.. استاد اچھے خان ولد ستارۂ ہند استاد تھو خان۔''

''ناچ ناچ گھر.. ہر قسم کے ناچ کی ٹریننگ..''

''ملٹری بینڈ سروس.. یہاں بگل بجانا بھی سکھایا جاتا ہے۔''

''ہائی ڈُوا کیٹنگ اکیڈمی..''

''بھائی گلو حسین بھاٹی گیٹ والے کا گٹار سکول.. اور پاکھوڈرم۔''

ہم یہ سائن بورڈ پڑھتے رہے.. اور بار بار گھڑیاں دیکھتے رہے کہ آٹھ بج چکے تھے اور ابھی تک ہمارا سفر شروع نہیں ہوا تھا۔

اور شیڈیول کے مطابق ہمیں آج شام... بشام میں ہونا تھا..

بشام... سندھ کے کنارے... ایک ناممکن آرزو ہو رہی تھی..

ویگن کے نیچے روپوش ہونے والے پہلے چھوٹے کے بعد ایک اور چھوٹا کچی نیند میں جھولتا آیا اور اس نے اپنی مردانگی ظاہر کرنے کے لیے شلوار میں ہاتھ ڈال کر ایک کھجلی کی حالانکہ فی الحال دس برس کی عمر میں وہاں کھجلانے کے لیے بہت کچھ نہ تھا اور وہ بھی ویگن کے نیچے لیٹ کر سرکتا ہوا غائب ہو گیا..

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ایئر کنڈیشنر کی بیلٹ تبدیل ہوئی.. حکیم نے حکمت سے سر ہلایا اور ہم موٹروے کے مسافر ہو گئے.. جانب اسلام آباد..

اس برس بھی میری ٹیم میں وہی آزمودہ چہرے تھے جو ہر برس میرا ساتھ دیتے تھے.. یہ وہ لوگ تھے جن کی طفیل میں ہر برس شمال کو جا سکتا تھا.. یہ میرا خیال رکھتے تھے.. میرا سہارا بنتے تھے۔ البتہ ایک چہرہ ایسا تھا جو ایک مدت کے بعد ہمارے سفر میں شریک ہوا تھا..

یہ عامر کے ٹو تھا..

عامر کے ٹو اس لیے کہ ایک عامر ہمارے ہمراہ ناراض ناراض.. روٹھا ہوا ''سنو لیک'' کے ٹریک میں چلا تھا۔

اُس عامر سے اس عامر کو الگ کرنے کے لیے یہ کے ٹو تھا جو میرے پہلے بڑے ٹریک میں... '' کے ٹو کہانی'' میں میرا ساتھی تھا..

عامر کے ٹو نیت کا بُرا نہ تھا لیکن ہر برس شدید خواہش کے باوجود اپنے کاروباری جھمیلوں کے جال میں پھنس کر رہ جاتا تھا اور ہمارا ساتھ نہ دے سکتا تھا..

اس برس بھی ہمیں یقین نہ تھا کہ وہ آخری لمحوں میں نمودار ہو گا یا نہیں.. لیکن وہ ہو گیا

یہ وہی تھا جس نے بیافو کی برفوں کے آغاز میں واقع کوردفون کیمپنگ میں یہ خواہش کی تھی کہ تارڑ صاحب ہم کبھی نہ کبھی یہاں سے کنکورڈیا جانے کی بجائے اوپر بیافو پر جائیں گے اور سنولیک تک پہنچیں گے لیکن وہ نہ جا سکا تھا.. اور آج جا رہا تھا.. اپنی یکتا جس مزاج.. اور دنیا کے بارے میں ایک الگ نکتۂ نظر رکھنے کی اہلیت اور دل کو خوشی دینے والی اپنی شخصیت کے ہمراہ.. ہمارے ساتھ جا رہا تھا۔

مجھے صرف یہ قلق تھا کہ ایک اور نہایت بلند پایہ جگت باز خان سلیم ہمارے ساتھ نہ تھا.. شائد ایک میان میں دو تلواریں.. عامر اور سلیم نہیں سما سکتی تھیں..

ایک چہرہ.. سلمان کا تھا جسے میاں صاحب ہمیشہ سُلمان کہتے تھے..

سلمان میرے ہمراہ دیوسائی کو عبور کر چکا تھا.. "سنولیک" پر گُڈی اڑانے کی کوشش کر چکا تھا لیکن پھر وہ آسٹریلیا چلا گیا۔ وہاں کے باسیوں کے علاوہ وہاں کے کنگروؤں نے بھی اسے بے حد پسند کیا۔ وہ بنجر زمینوں سے بھی پیار کشید کر لینے والا ایک گولو مولو بچہ تھا.. پھر وہ آسٹریلیا سے امریکہ سدھارا اور وہاں سے واپس آیا تو سیدھا اس بشام جانے والی ویگن میں آ بیٹھا.. بنیادی طور پر وہ ایک بچہ جاسوس تھا جو میری ہر حرکت پر کڑی نظر رکھتا تھا کہ سر جی اگر آپ ایسا کریں گے تو میں واپس جا کر بھر جائی کو رپورٹ کر دوں گا.. بتا دوں گا کہ آپ پہاڑوں میں جا کر اپنی جان کی پروا نہیں کرتے.. مسخریاں کرتے ہیں..

عامر کے تُو اور سلمان کے علاوہ اس برس ہمارے درمیان پہلی بار ایک اور نہایت اجنبی اور نا قابلِ بیان سا چہرہ بھی تھا.. بس یوں جان لیجیے کہ یہ چہرہ ایسے مجرمانہ خدوخال کا حامل تھا کہ اس کی تصویر کسی بھی تھانے میں آویزاں ہو سکتی تھی اور اس کے نیچے "موسٹ وانٹڈ" کے علاوہ دس لاکھ روپے کے انعام کی نوید "زندہ یا مردہ" کے عنوان سے درج ہو سکتی تھی.. لیکن اس چہرے پر آپ اتنی معصوم نرمی اور الفت بھی دیکھ سکتے تھے کہ وہ محض ایک کونپل کے لیے.. سندھ کے اوپر پرواز کرتے ایک راج ہنس.. برف کے ایک ذرّے اور فیئری میڈو میں کھلنے والے ایک پھول کے لیے بھی پگھل کر بہہ جاتا تھا..

یہ "مجرم" ڈاکٹر عباس برمانی تھا..

ایک زمانے میں وہ.. اپنی جناتی ہینڈ رائٹنگ میں مجھے اپنے نہایت عجوبہ سفروں کی داستانیں لکھا کرتا تھا.. اور ایسے انداز میں کہ میری خواہش تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ کتابی صورت میں بھی

لکھے.. پھر ہماری ملاقات ہوئی تو ایک فین، ایک دوست میں بدل گیا.. اس نے میری فرمائش پر "کیلاش کتھا" اور "میرا سندھو سائیں" ایسے کمال کے سفرنامے لکھے.. لیکن اس میں ایک بہت بڑی خامی تھی.. وہ نہایت نامناسب انداز میں اتنے دھیمے اور سرگوشی سے بھی کم دھیمے پن میں بولنے والا ہے کہ سننے والا صرف نہایت تگ و دو کرنے کے بعد ہی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس ڈاکٹر نے کیا کہا ہے.. کیا برمانی نے یہ کہا ہے کہ مارکس کا فلسفۂ اقتصادیات اب بھی اہمیت رکھتا ہے.. یا یہ کہا ہے کہ سائیں آپ جہنم میں جاؤ، مجھے نیند آ رہی ہے.. کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔

ایک ایسا شخص جو بیک وقت ایک سفید چوٹی اور ایک سفید گھوڑی کے عشق میں مبتلا ہو، اس کے بارے میں کیا پتہ چل سکتا ہے..

باقی وہی، آزردہ.. سالخوردہ.. اور ساتھ دینے والے چہرے تھے۔ حسن، شاہد، میاں صاحب! حسن کو اپنی بیگم سے جدا ہوئے ابھی دو گھنٹے نہ ہوئے تھے کہ وہ ان کے لیے اداس ہو گئے اور اتنی بے قراری سے کوئی پی سی او تلاش کرنے لگے جتنی بے قراری سے کوئی نہایت دباؤ میں آیا ہوا شخص ٹائلٹ تلاش کرتا ہے۔

شاہد صاحب.. سیاہ چشمے اور سُرخ پی کیپ میں اپنے گنج گراں مایہ کو چھپاتے جاسوس بنے بیٹھے تھے اور حسبِ سابق ٹیم کے حساب کتاب کے انچارج تھے.. ٹیم کا کل کیش ان کی بیلٹ کے بٹوے میں پھولا ہوا تھا اور وہ اس کی حفاظت اس طرح کرتے تھے جیسے کروسیڈز کو جانے والا کوئی شکی نائٹ اپنی بیوی یا محبوبہ کی کمر کے ساتھ ایک "چیسٹٹی بیلٹ" باندھ کر اسے مقفل کر کے اس کی چابی اپنی زرہ بکتر میں سنبھال کر ساتھ لے جاتا تھا تا کہ بیوی یا محبوبہ اس کی غیر موجودگی میں گلچھرے نہ اُڑانے لگے..

یہ الگ بات کہ گلچھرے پھر بھی اُڑ جاتے تھے..

میاں صاحب حسبِ معمول چھریرے و چھیرے.. اور اپنے لاہوری لہجے میں "ڑ" کو "ر" سے بدلتے اور "ر" کو "ڑ" بولتے.. یعنی چھڑیڑے و چھیڑے..

کلر کہار کی چڑھائی آئی تو ویگن ڈگمگانے لگی.. ہچکیاں لینے لگی اور کھڑی ہو گئی..

"اب کیا ہوا ہے؟"

"پتہ نہیں۔" نیم حکیم نے کہا..

اس نے ریڈی ایٹر کا ڈھکن کھولا تو اس میں سے اُبلتا ہوا گرم پانی ایک فوارے کی مانند

بلند ہوا. سرد اور گرم کی اطلاع کرنے والی سوئی گرم کے سرخ نشان سے بھی اوپر لرز رہی تھی.. نیم حکیم بھی ریڈی ایٹر کے ڈھکن کو سونگھتا کبھی سر ہلاتا اور کبھی کہتا کہ گیس بن رہی ہے اور خارج ہو رہی ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی..

ہم ویگن سے باہر کڑی دھوپ میں بے آسرا کھڑے رہے.. تا کہ گیس بنتی رہے اور خارج ہوتی رہے۔

ہمارے سفر کی شروعات اچھی نہ تھیں.. شگون بُرے تھے..

آغاز سفر کی نشہ آور شگون کے بُلبلے جو آج سویر ہمارے تن بدن میں سے پھوٹ رہے تھے.. ہر بُلبلا کسی ایک منزل کی نوید دے رہا تھا.. بشام۔ گلگت۔ سکردو۔ ہوشے.. تو یہ سب بُلبلے گلر کہار کی دھوپ میں ایک ایک کر کے پھٹتے جاتے تھے، ہموار ہوتے جاتے تھے۔ پہلے ایئر کنڈیشنر کی بیلٹ بدلنے کے باوجود ہمیں اس کی سرد راحت نصیب نہ ہوئی اور اب یہ ریڈی ایٹر جس کا گرم پانی ڈھکن پر زور لگاتا چھلکتا تھا اور وہ نام نہ نیم.. نیم حکیم بس اس ڈھکن کو سونگھتا تھا اور کہتا تھا ''ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔''

''تم نے تو کہا تھا کہ گاڑی بالکل برینڈ نیو ہے..''

''میں نے نہیں، مالکوں نے کہا تھا..''

میں نے بے دھیانی میں وہی سوال پھر سے کر دیا اور اس نے وہی جواب دیا جو وہ پہلے دے چکا تھا..

گلر کہار کی ڈھلوانوں پر.. موٹروے کے لیے تراشے گئے سرخ پہاڑوں کے درمیان، کاریں رینگ رہی تھیں۔ ٹرک اور بسیں چڑھائی پر بے بس تھے اور ساکت لگتے تھے.. زور لگاتے مگر ساکت لگتے تھے۔

ایسی چڑھائیوں پر مجھے سب سے زیادہ ترس فُلی لوڈڈ ٹریلروں اور ٹرکوں پر آتا ہے جو لاچار نظر آتے ہیں۔ ایک زخمی مکوڑے کی مانند بے چارے رینگتے ہیں، زور لگاتے ہیں اور ان کے پھیپھڑے پھٹنے کو آتے ہیں..

ہم تو رینگ بھی نہیں رہے تھے کڑی دھوپ میں کھڑے تھے..

گلر کہار سے بشام آن انڈس ایک دور کی آواز تھی.. ہمیں آج شام تک.. رات گئے تک بھی اس آواز تک پہنچنا تھا ورنہ کوہ نوردوں کا پورا شیڈیول درہم برہم ہو جانے کا خدشہ تھا۔ پھر کسی کو

ایمرجنسی فون کا خیال آیا جو موٹروے کے کنارے پر دکھائی دے رہا تھا.... سلمان اور برمانی نے نزدیکی فون تک کوئیک مارچ کی اور امداد کی درخواست کی.. اور ہمیں بے حد خوشگوار حیرت ہوئی جب چند لمحوں بعد نہایت سمارٹ اور مددگار قسم کی پولیس موقعٔ واردات پر پہنچ گئی۔

''تارڑ صاحب ہم آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اسلام آباد پہنچا دیتے ہیں.. ویگن بعد میں آتی رہے گی۔''

''شکریہ.. لیکن یہ ویگن آتی نہیں رہے گی کیونکہ اس کی عمومی صحت اچھی نہیں ہے اور ڈرائیور بھی نیم حکیم ہے.. اس ویگن میں ہم سب کے گھر اور اُن کی آرائش کے سامان ہیں.. اور ہمیں صرف اسلام آباد نہیں بہت آگے جانا ہے..''

بالآخر فیصلہ ہوا کہ ایئر کنڈیشنر آف کر دیا جائے.. خاموشی اختیار کر لی جائے.. دعاؤں کا ورد کیا جائے.. اور ویگن کو ہولے ہولے چلایا جائے.. ہر دو چار کلومیٹر کے بعد جب پانی زیادہ اُبلنے لگے تو اسے روک کر ٹھنڈا ہونے کا موقع دیا جائے.. چند کلومیٹر تک موٹروے پولیس ہمارے آس پاس منڈلاتی رہی اور پھر ہماری سست روی سے تنگ آ کر ہمیں سیلوٹ کر کے اباؤٹ ٹرن ہو گئی..

''راولپنڈی میں استاد زاہد کی ورکشاپ تک پہنچ جائیں تو وہ اسے ایک دن میں پھر سے چالو کر دے گا۔'' نیم حکیم نے خوش خبری دی..

یعنی آج رات راولپنڈی میں ہو جائے گی.. کہاں ٹھہریں گے.. کیا کریں گے.. اور کوہ نوردوں کا شیڈیول..

اور راولپنڈی میں نالہ لیہ کے کناروں پر ایک اداس گرم اور موبل آئل سے لتھڑی اور کاروں کے ڈھانچوں سے مزیّن ایک ورکشاپ میں ہماری ویگن ہولے ہولے ہوتی اُتری..

جہاں نالہ لیہ میں حالیہ سیلاب کی تباہ کاریاں، دروازوں اور دیواروں سے اوپر اپنے نشان چھوڑ چکی تھیں اور اس ورکشاپ کے پتھر، جھاڑیاں، چھوٹوں کے چہرے یہاں تک کہ دھول بھی موبل آئل سے سیاہ تھی..

استاد زاہد ذرا صحت مند موٹاپے والا اپنے کام کو تھرو اینڈ تھرو جاننے والا کہ وہ بھی کبھی اسی ورکشاپ میں ایک ''چھوٹا'' تھا۔ ریڈی ایٹر کا ڈھکن اٹھا کر اسے سونگھتے ہوئے بولا۔ ''ریڈی ایٹر فٹ ہے۔ صرف اس ڈھکن کے پیچ گھسے ہوئے ہو گئے ہیں اور ہوا لیک ہوتی ہے.. بس ڈھکن بدل

ویں تو ویگن فِٹ ہے جناب۔ تارڑ صاحب آپ اس کے مسافر نہ ہوتے تو ہم اس کا انجر پنجر کھولتے سارا دن لگا کر.. اور پھر چپکے سے ڈھکن بدل دیتے.. لیکن آپ تو ہمارے چاچا جی ہیں.. فِٹ ہے۔"

"کیا گلگت تک جانے کے لیے بھی فِٹ ہے؟"

"بادشاہو اسے بے شک لنڈن لے جاؤ.. فِٹ ہے۔"

"فِٹ ہے.." ٹیم ممبران نے نعرہ لگایا..

"بشام کی شام۔ برسین کی سویرا اور چلاس کا انصاف"

ویگن.. ٹیکسلا اور رواہ میں سے گزرتی جارہی تھی..

اور ہم سب دم روکے بیٹھے تھے.. چُپ تھے کہ کہیں ریڈی ایٹر پھر سے نہ اُبل پڑے لیکن ویگن واقعی فِٹ تھی..

ہم نے جو دم روکا ہوا تھا، اس دم کو لینے کے لیے ہم حسن ابدال میں رُکے.. وہاں ستانے اور باقاعدہ فروکش ہو کر کھانے کی بجائے ہم نے وہاں کے نہایت خستہ پکوڑے اور مچھلی خریدی.. گرم روٹیاں حاصل کیں اور پھر سے رواں ہو گئے کہ ہنوز بشام دور است..

ہری سنگھ کا ہری پور، ایبٹ کا ایبٹ آباد... مان سنگھ کا مانسہرہ.. اشوک اعظم کے پتھروں پر کھدے فرمان.. اور پھر "ہوٹل تنجراب" گزرا جسے دیکھ کر اکثر سیاح اس غلطی فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ بس اب تو درّہ تنجراب کہیں آس پاس ہی ہے جب کہ وہ ابھی تین روز کی مسافت پر ہوتا ہے.. بفل۔ چھتر پلین۔ چائے کے باغ، جنگل منگل..

اور جنگل منگل میں شام ہونے لگی..

ہم ابھی تک دم روکے بیٹھے تھے.. یہاں تک کہ سلمان بھی گفتگو سے پرہیز کر رہا تھا کہ کہیں ویگن کے میکانکی نظام میں کوئی اور خلل نمودار نہ ہو جائے..

شام کے بعد ظاہر ہے رات اُتری اور گہری ہوتی گئی.. اور اس کی گہرائی میں ہمارے دل ڈوبتے تھے..

پھر ایک بہاؤ کا ہلکا شور ہمارے کانوں میں اُترا.. یہ ہمارے کانوں کے لیے موسیقی تھا.. بیتھوون یا موزارٹ کی کسی سمفنی سے بڑھ کر مترنم تھا کہ یہ شیر دریا کا آرکسٹرا تھا جو ہمارے کانوں

میں بہتا آرہا تھا..

تھاکوٹ کا پُل..رات کی تاریکی میں ویگن کی ہیڈ لائٹس سے روشن ہوا اور ہم تنہا تھے جو اس کے پار جاتے تھے..

بشام دور نہ تھا..سندھ کے پار ہوئے تو بشام دور نہ تھا..

ہمیں سفر نے تو نہیں اس ذہنی اذیت نے تھکا دیا تھا جو ویگن کی خرابیوں نے ہم پر مسلّط کر دی تھی..

ہم ابھی تک چُپ تھے..دم روکے ہوئے تھے اور تب ہم نے دریائے سندھ کے اوپر بہت بلندی سے نیچے دریا کے کنارے ایک ایسے تاج محل کو دیکھا جس کی روشنیاں پانیوں میں ٹمٹماتی تھیں..

پی ٹی ڈی سی موٹل بشام..کمرہ نمبر ۲۲..

بہت سے لوگ اپنے آپ کو خوش نصیب تب گردانتے ہیں جب وہ ایک سکوٹر سے اُتر کر ایک مرسیڈس میں بیٹھ جائیں..موچی دروازے کے گھر سے ڈیفنس کے بنگلے میں منتقل ہو جائیں..شیدا قلفیاں والا کی بجائے ترقی کرتے ہوئے ملک آئس کریم پارلر کی ایک ملک گیر چین کے مالک ہو جائیں..لال کھوئی والے فیتے حلوائی کی بجائے رفیق سویٹ ہاؤس کی لاجواب برفی کے پروپرائٹر ہو جائیں یا..اپنی خالہ زاد بیوی خورشید بانو کی بجائے..بلکہ اس کے بعد آپ ایشوریا رائے جیسی کسی خاتون کے شوہر ہو جائیں..لیکن میری خوش نصیبی کے پیمانے ذرا مختلف رہے ہیں..

میں اپنے آپ کو خوش نصیب تب گردانتا ہوں جب..شاہ گوری مجھے اپنا گورا بدن دکھلا دے اور اس کی برفوں پر میری نظروں کے بوسوں کے نیل ہوں..جھیل کرومبر کے پانی مجھے آغوش میں لے لیں..یا..بشام موٹل میں مجھے کمرہ نمبر ۲۲ مل جائے..جی ہاں..یہ کمرہ نمبر ۲۲ میرے لیے ایک بڑی خوش نصیبی ہے کہ اس کی بالکونی سندھ پر یوں کھلتی ہے کہ اس کی سفید آہنی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے یہ مہران..یہ انڈس آپ کے نیچے ہولے ہولے بہتا ہے اور یوں بہتا ہے کہ اس کے پار جو پہاڑیاں ہیں، ان کے کھیتوں میں جو اِکا دُکا جھونپڑے ہیں اور ان میں سے کسی ایک جھونپڑے میں اگر ایک لالٹین یا دیا روشن ہے تو اس کی روشنی دریا کی سطح پر پڑتی ہے..دریا بہتا چلا جاتا ہے لیکن اس لالٹین اس ایک دیئے کی روشنی وہیں ایک ہی مقام پر ٹھہری رہتی ہے..

یہ منظر ایسا ہے کہ بے شک آپ کے ایئر کنڈیشنر کی بیلٹ خراب ہو جائے..ریڈی ایٹر اُبلنے لگے..آج دوپہر آپ راولپنڈی میں استاد زاہد کی موبل آئل سے لتھڑی ورکشاپ میں نااُمید اور مایوس بیٹھے ہوں..تو آپ یہ سب آفات بھلا دیتے ہیں اور کمرہ نمبر ۲۲ کے نیچے..سندھ کی سلیٹی چادر کو سرکتے..گزرتے..دیکھتے جاتے ہیں اور سب کچھ بھول جاتے ہیں۔گئی رات تھی اور کمرہ نمبر ۲۲ کی بالکونی تھی..

میرے ہمراہ حسن اور برمانی سفید آہنی کرسیوں پر براجمان تھے اور وہ بھی بھول چکے تھے کہ آج ہمارے ساتھ کیا کیا ظلم ہوئے تھے..اگر ہوئے تھے تو کن زمانوں میں ہوئے تھے..کیا یہ آج کی سویر تھی جس میں ہم شاہ نور سٹوڈیو کی قربت میں بینڈ باجوں اور ڈانس اکیڈمیوں کے اشتہار پڑھتے تھے..

اور کلر کہار میں وہ قہر انگیز دھوپ جو ہماری بے بسی کو جھلساتی تھی۔وہ آج دوپہر کی بات ہے..وہی کلر کہار جس کے آس پاس نندنا کا وہ قلعہ تھا جہاں محمود غزنوی کے سپاہیوں کی قبریں تھیں اور جہاں بیٹھ کر البیرونی نے زمین کا گھیر ماپا تھا..جہاں محض ایک ڈھکن کی خرابی کے باعث ہم بے بس اور غمگین اور لاچار ہوئے تھے..یہ تو کسی اور صدی میں ہوا تھا۔

یہ قصہ تو جانے کن زمانوں کا ہے..

ہم سب کچھ بھول چکے تھے اور کمرہ نمبر ۲۲ کی بالکونی میں بیٹھے..گئی رات تک بیٹھے دریائے سندھ کی چادر پر کسی ایک لالٹین..کسی ایک دیئے کی روشنی کو اس پر عکس ہوتے دیکھتے رہے۔

اور جب سویر ہوئی..بشام میں سویر ہوئی تو میں اپنی مختصر نیند کے بعد جاگا تو میں نے دیکھا..بالکونی میں آکر دیکھا کہ سندھ کے پار جو پہاڑیاں تھیں، وہ گہری دُھند میں گم تھیں..

میں کمرہ نمبر ۲۲ سے نکل کر..نیچے دریا تک چلا گیا..

ابھی سویر تھی اور سندھ پر دُھند تھی..

میں بہت بار اس کنارے پر اُترا تھا..پچھلے بیس بائیس برسوں میں شائد پندرہ سولہ بار..لیکن ہر بار یہی کنارا نہ تھا..یہی دریا نہ تھا..یہ ہمیشہ کسی اور منظر میں ہوتا تھا..یہ ہمیشہ مجھے ایک الگ سی خوشی دیتا تھا..

وہاں وہ بڑا پتھر تھا جس پر بیٹھ کر..بمشکل بیٹھ کر کئی برس پہلے عینی نے تصویر کھنچوائی تھی..

یہیں پر میرے بیٹے نے میری چپل کو سندھ میں پھینکا تھا کہ ابو وہ بوڑھا انتظار کر رہا ہوگا.. اور ایک پتھر ایسا بھی تھا جس پر ایک ناآسودہ تمنا براجمان تھی..

میں نے اس ناآسودہ تمنا سے دریافت کیا کہ تم کون ہو؟

تو اس نے کہا'' میں ازل سے ہوں.. کمرہ نمبر ۲۲ کی بے شکن چادر کی ایک سلوٹ بننا چاہتی ہوں.. میں شیر دریا سندھ کی روانی کو تکتی تمہارا انتظار کرتی ہوں.. میں ازل سے ہوں اور ابد تک رہوں گی..''

اور کون ابد کا انتظار کرتا ہے..

بشام سے اگلا سٹاپ ظاہر ہے داسو کے پل کے پار ناشتے کے لیے برسین موٹل میں تھا۔ دریائے سندھ کے اوپر.. شاہراہ قراقرم سے اوپر ایک ویران تنہائی میں معلق یہ برسین..

سلمان جو مکمل طور پر آسٹریلوی ہو چکا تھا.. اور اپنے تن و توش کے حوالے سے نہ کنگرو ہوا تھا اور نہ کوالا بیئر.. اپنے نئے وطن کی یاد میں جذباتی ہو کر کہہ رہا تھا۔ '' سر جی یہ برسین ہے یا برزبین..''

''برزبین؟''

''جی سر جی.. ایک تو آپ کا جغرافیہ بڑا کمزور ہے.. سر جی آسٹریلیا کا بڑا مشہور شہر ہے.. میں ایک مرتبہ وہاں گیا تھا.. وہاں بڑے زبردست رنگا رنگ طوطے ہوتے ہیں.. آبشاریں اور زرد پھول ہوتے ہیں..''

''ہوں گے۔'' میں نے بیزار ہو کر کہا.. '' لیکن تمہارا برزبین میرے برسین سے بہتر نہیں ہو سکتا.. کیا وہاں بھی میرے سندھ سا کیں ایسا کوئی دریا ہے..؟''

''دریا تو نہیں سر جی.. لیکن.. کچھ ندیاں ہیں جذباتی قسم کی..'' وہ ایک بھالو کی مانند جو کہ وہ تھا، ناراض ہو گیا..

اس برسین میں.. یا برزبین میں ہم نے حسب روایت.. پچھلے درجنوں برسوں کی روایت کے مطابق ناشتہ کیا.. اور اسی روایت کی پیروی میں.. میں نے موٹل کے ایک کمرے میں جا کر کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور پر تنہا کیا..

اور اس تنہائی میں بشام کے سندھ کنارے اُس پتھر پر براجمان ناآسودہ تمنا نے اپنی

جھب دکھلائی اور چلی گئی.. میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ دریائے سندھ کے اوپر ایک پتھریلے بنجر علاقے میں برسین کا جو موٹل ہے، اس کے کسی ایک کمرے کی تنہائی مجھے اپنا تمنائی کیوں کرتی ہے.. اُس کمرے میں ایک اچھے ہوٹل کی تمام تر سہولتیں میسر ہیں.. صاف ستھرا باتھ روم ہے، تولیے ہیں، فرش پر قالین اور بستر پر چادریں ہیں اور خوراک بھی مناسب مل جاتی ہے.. اور یہ کمرہ ایک ویرانے میں ایک پتھریلے ویرانے کی بلندی پر دنیا جہان سے کٹا ہوا ہے.. شاید یہی وجہ ہے کہ میں ایک سہولت آمیز زندگی بھی چاہتا ہوں اور ایک ویرانہ بھی.. نہ میں محض سہولت آمیز زندگی میں خوش رہتا ہوں اور نہ مجھ میں ویرانے کی سختیاں برداشت کرنے کا حوصلہ ہے تو برسین کا یہ کمرہ میری ان دونوں خواہشوں کو یکجا کرتا ہے.. شائد اس لیے.. برسین سے آگے گئے تو چلاس میں ایک وقوعہ ہو گیا..

چلاس میں بہت کم لوگ رُکتے ہیں.. رُکتے ہیں تو مجبوراً رکتے ہیں۔ اس میں جہاں اس کے گرم، ویران اور چٹیل ہونے کا عمل دخل ہے، وہاں اس کے باشندوں کے کھردرے پن اور باہر سے آنے والوں کے لیے ایک ناپسندیدگی کا عنصر بھی شامل ہے.. یوں بھی چلاس شہر شاہراہ سے اوپر کہیں واقع ہے اور اس بستی کی کوئی ایک عمارت بھی شاہراہ سے نظر نہیں آتی.. سوائے ایک بورڈ کے جو آپ کو اطلاع کرتا ہے کہ چلاس کہیں اوپر چٹانوں کی آغوش میں ہے..

چنانچہ جو کوئی بھی رکتا ہے، مجبوراً رکتا ہے.. کھانے کے لیے.. چائے کے لیے یا پٹرول یا ڈیزل حاصل کرنے کے لیے..

ہم بھی اپنی ویگن کا پیٹ بھرنے کے لیے سب سے پہلے.. ایک پولیس چوکی کے سامنے واقع پٹرول پمپ میں ڈیزل حاصل کرنے کے لیے رکے..

پٹرول پمپ کا انچارج ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹا ہوا ہمیں پمپ کے اندر آتے ہوئے ناپسندیدگی سے دیکھتا تھا کہ میں آرام کرنے کے موڈ میں ہوں اور یہ کہاں سے آ گئے ہیں۔ اس نے ایک چھوٹے کو آواز دی اور وہ چھوٹا جو بہت ہی چھوٹا تھا، نہایت بُری بُری شکلیں بناتا آیا۔ ہینڈل کو ہک سے اٹھایا اور ویگن کی ٹینکی میں فٹ کر کے اسے دبا دیا.. ہم سب نے فوراً نوٹ کیا کہ میٹر زیرو پر نہیں تھا بلکہ 17 کے ہندسے پر تھا.. ہم نے احتجاج کیا کہ بھائی آپ میٹر کو زیرو پر نہیں لائے تو وہ چھوٹا خفا ہو گیا اور کہنے لگا.. زیرو کیا۔ زیرو کیا.. اور ہم نے بھی خفا ہو کر کہا، نہیں کیا نہیں کیا.. اتنی دیر میں انچارج صاحب اپنے بدن کے مختلف حصوں میں خارش کرتے آ گئے اور انہوں نے بھی چھوٹے کا ساتھ دیا.. ہم نے چپکے سے ادائیگی کر دی۔ تقریباً تین سو روپے زائد ادائیگی

صرف اس لیے کردی کہ ہم بحث نہیں کرنا چاہتے تھے.. یہاں چلاس ایسی جگہ پر لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہتے تھے.. اپنا سفر کھونا نہیں کرنا چاہتے تھے.. لیکن یہ صریحاً بے ایمانی تھی اور ہمیں بہت دکھ ہوا.. اور جلتی پر انچارج صاحب نے تیل یہ چھڑکا کہ ہمیں بے ایمان کہتے ہو.. جاؤ جا کر پولیس کو رپٹ دے دو.. ہم نے سوچا یہاں کے پولیس والے بھی انہی کے بھائی بند ہیں۔ ہو سکتا ہے ہمیں الٹا اندر کر دیں لیکن ہم بھی تاؤ کھا گئے اور سامنے پولیس کی چوکی میں جا کر فریاد کر دی.. ڈیوٹی پر موجود پولیس والے نے حیرت انگیز طور پر ہماری بات تحمل سے سنی اور پھر ایک سادہ کاغذ پر اس وقوعے کی تفصیل لکھنے کو کہا جو ہم نے لکھ دی...

''آپ جاؤ ہم کارروائی کرے گا اور تم کو اطلاع کرے گا..''

کونسی کارروائی اور کونسی اطلاع.. ہمارے لبوں پر ایک حقارت انگیز تبسم تھا.. اس سفر سے واپسی پر.. ایک ہفتے کے بعد لاہور میں مجھے تین سو روپے کا ایک منی آرڈر وصول ہوتا ہے جس کی سلپ پر لکھا ہے۔ ''آپ کی رپورٹ پر استغاثہ مرتب ہو کر عدالت میں پیش کیا گیا تھا جہاں سے ملزم کو مبلغ ایک ہزار روپے جرمانہ کے علاوہ آپ کی زائد رقم کی وصولی بھی ہوئی تھی جس کو آپ کی خدمت میں بھیجا جا رہا ہے.. از طرف.. عبدالسعید۔ ایس ایچ او تھانہ چلاس۔ ضلع دیامر..''

میرا خیال ہے میری شدید شرمندگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے..

ہمیں انصاف وہاں سے ملا تھا اور فوری ملا تھا جہاں سے ہمیں اس کی امید نہ تھی.. کم از کم پنجاب پولیس میں تو یہ معجزہ کم کم ہی ہوتا ہوگا..

میں چلاس پولیس کا گرویدہ ہو گیا ہوں اور آئندہ جب کبھی اُدھر سے گزروں گا تو ایک عدد ''تھینک یو چلاس پولیس'' کا سلیوٹ کر کے گزروں گا۔

''رائے کوٹ جہاں دل رُکتا ہے.. شکور سے ملاقات''

چلاس کے بعد ویگن نے بہر طور رائے کوٹ پل پر رُکنا تھا اور اس کے ساتھ میرے دل نے بھی رُکنا تھا کہ اوپر فیری میڈو تھا..

اور نیچے شنگریلا کے متروک شدہ ہوٹل کے آس پاس اوپر جانے والی جیپیں تھیں۔ پورٹر اور گائیڈ تھے.. اور شکور تھا.. رزق روزگار کی آس میں بیٹھا سُرخ بالوں والا شکور تھا جو آج سے کتنے برس پیشتر.. اٹھارہ برس.. بیس برس.. جانے کتنے برس پیشتر مجھے فیری میڈو میں ملا تھا.. پھر جب میں اپنے خاندان سمیت اوپر گیا تھا تو وہ مجھے سلجوق اور ثمیر کو ناننگا پربت کے بیس کیمپ تک لے کر گیا تھا اور واپسی پر بیمار سلجوق کو کندھوں پر اٹھا کر لایا تھا.. اور پچھلے برس رحمت نبی کی کیمپنگ سائٹ میں وہ پھر مجھے خاص طور پر ملنے آیا تھا اور فیری میڈو کی فلم کا ایک اہم کردار رہا تھا..

وہ بوڑھا ہو چکا تھا اور اس کا سُرخ بالوں والا سر لرزش میں تھا.. چہرے کی جھُریاں گہری ہو گئی تھیں.. وہ ایک آئینہ تھا اور میں اس میں اپنے آپ کو دیکھ سکتا تھا.. مجھے وہ شام یاد آئی جب کئی برس پہلے وہ اپنی رائے کوٹ گلیشیر کی برفوں میں گمشدہ گائے کو پکارتا تھا اور وہ جواب دیتی تھی..

''والدہ کیسی ہیں؟''

والدہ وہ میری بیوی میمونہ کو کہتا تھا.. اور ان دنوں میمونہ نے والدہ کہے جانے پر بے حد مائنڈ کیا تھا کہ یہ بوڑھا کس سلسلے میں مجھے والدہ کہتا ہے تو اس نے کہا تھا.. بیگم صاحب میں تو آپ کے پیارے بچوں کے حوالے سے ان کی والدہ کہتا ہوں.. ماں ہونے کی حیثیت سے ماں کہتا ہوں..

''بچہ لوگ کیسا ہے صاحب؟''

میرے رُک سیک میں صرف ایک تصویر تھی.. بیٹی کی شادی کی.. اس کے برابر میں ظاہر ہے اس کا دولہا بلال براجمان تھا اور دائیں بائیں سلجوق اور ثمیر کھڑے تھے..

''اچھا..'' شکور کا منہ حیرت سے کھل گیا ''بیٹی تو بہت چھوٹا تھا، ابھی سے اس کا شادی بنا دیا..''

''تب چھوٹا تھا شکور.. پھر ڈاکٹر ہو گیا تو شادی بنا دیا..''

شکور نے بیٹی کو بے شمار دعائیں دیں جو سب کی سب میں نے سنبھال لیں اور پھر لاہور واپسی پر انٹرنیٹ پر وائس چیٹ کرتے ہوئے.. اسے آئرلینڈ وامریکہ میں پہنچا دیں کہ فیری میڈو کا انکل شکور رائے کوٹ پُل پر بیٹھا تمہارے لیے یہ یہ دعائیں کر رہا تھا...

''چناران میں رحمت نبی کا نزول اور.. محبت کے شگوفے''

گئی شام ہم گلگت میں تھے..

حسبِ روایت اور یہ روایت ٹوٹی نہ تھی ہم چناران میں تھے.. اور وہاں کرم الٰہی ویٹر ایک بھائی کی مانند میری خدمت کرتا تھا اور افسوس کرتا تھا کہ صاحب آڑو کا موسم ختم ہو گیا ہے ورنہ ضرور پیش کرتا.. مجھے معلوم ہے آپ کو گلگت کے آڑو نمک کے ساتھ بہت پسند ہیں.. ندیم تھا.. شیرستان کا جھریوں بھرا سرخ وسفید چہرہ تھا اور میری آمد کی خبر گلگت کی شب میں یوں پھیلی کہ اکرام بیگ اور فضل صاحب اپنی تمامتر مصروفیتیں ترک کر کے میرے پاس آ گئے.. اور چناران میں دوستی اور خلوص کے شگوفے پھوٹنے لگے.. اور پھر میں ایک عجیب سے احساس سے دوچار ہوا.. میں جس کمرے میں تھا، وہ کہیں میری یادداشت کی دھند میں سے باہر آ کر کچھ شناسا لگتا تھا.. یہ چناران کے اولین.. اور بجنل اور قدیم کمروں میں سے تھا.. جب یہ موٹل تعمیر ہوا تھا تو یہ کمرہ تب سے تھا.. یہ وہی کمرہ تھا جس میں پتہ نہیں کتنے برس پیشتر ''ہنزہ داستان'' کے زمانوں میں رات کے ایک بجے شاہراہ قراقرم پر اپنے پہلے سفر کے بعد تھکن اور ڈر سے شکستہ.. داخل ہوا تھا.. سلجوق کے ہمراہ اترا تھا.. اور سلجوق جو آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا اور ذرا لم ڈھینگ ہو رہا تھا، کمرے میں داخل ہوتے ہی باتھ روم میں گھس گیا تھا نہانے کے لیے.. اور اندر سے آواز دیتا تھا کہ ابو اس کا نلکا تو لیک کرتا ہے.. اور وہ نلکا اب بھی لیک کرتا تھا.. اسی کو روایت کا تسلسل کہتے ہیں..

گئی رات جب ہم سب.. حسن، برمانی اور میں نیند میں مدہوش تھے..

ایک دستک ہوئی..

''کون ہے؟'' میں نے نیم غنودگی اور بیزاری کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

دروازہ کھلا اور ایک مُشتبہ سا سایہ اندر داخل ہوا. اُس نے اندر داخل ہوتے ہی برمانی کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''تارڑ صاحب..''

برمانی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ ''سائیں کون ہو تم..''

''سوری..'' سائے نے کہا اور آگے بڑھ کر حسن صاحب کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔ ''مرشد..'' حسن صاحب بھی گھبرا گئے۔ ''بھائی جان کس کو ملنا ہے؟'' اور بجلی لیمپ روشن کر دیا..

''سوری'' سائے نے پھر معذرت کی اور پھر میرے قریب آ کر پہلے جھک کر اطمینان کیا کہ یہ میں ہوں اور پھر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''مرشد میں سلام کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں.. سوری ٹو ڈسٹرب یو..''

یہ فیری میڈو کا رحمت نبی تھا.. جو صبح کے دو بجے نازل ہو گیا تھا..

''اب میں جاتا ہوں تارڑ صاحب.. صرف سلام کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا..''

''ہمیں جگا کر اب کہاں جاتے ہو.. بیٹھو..''

''میں بھی بیٹھنے ہی آیا تھا..'' وہ ہنسنے لگا..

تمام روشنیاں آن کر دی گئیں.. برمانی اور حسن اپنے اپنے بستروں پر چوکڑیاں مار کر بیٹھ گئے۔ ویٹر کرم الٰہی کو جگا کر اس سے درخواست کی گئی کہ تازہ سلاد کی ایک طشتری اور مشروبات لے آئے اور محفل جم گئی..

اور ایسی جمی کہ کھڑکی کے پردوں میں سے صبح کے آثار روشن ہونے لگے.. اور کھڑکی کے باہر جو سیب کا ایک درخت تھا اس کی شاخوں میں پنہاں ہر سیب سورج کی پہلی کرنوں سے زرد ہونے لگا..

''کوہِ ہراموش کی سفید سسّی''

جیسے شاہراہ قراقرم پر درجنوں بار سفر کرنے سے واقفیت تو ہو جاتی ہے لیکن.. اس کی عادت نہیں ہوتی..

اس شاہراہ کی بلند خطرناکی کی عادت نہیں ہوتی، بے شک یہ آپ کا چالیسواں پھیرا ہو.. ہندو بھائی اور ہندو بہن جی اگر ایک آگ کے گرد صرف سات پھیرے لگا لیں تو ان کی شادی ہو جاتی ہے.. یہاں عمر بھر پھیرے لگاتے رہیں تو کچھ نہیں ہوتا.. ہوتا ہے تو پھر کوئی حادثہ ہی ہوتا ہے..

تو جیسے شاہراہ قراقرم کی عادت نہیں ہوتی..

ایسے سکردو روڈ کی بھی عادت نہیں ہوتی...

چاہے آپ ادھر درجنوں بار ہی کیوں نہ آئے ہوں.. اس کے پھیرے پہ پھیرے کیوں نہ لگاتے ہوں.. اور یقین کیجیے سکردو روڈ میں پھیرے بھی بہت ہیں.. آپ کی ویگن دریائے سندھ کے اوپر ایک تنگ درّے میں.. جس کی چٹانیں بس اب گری کہ اب گری کی دھمکی کے انداز میں جھکی ہوتی ہیں.. پھیرے لگاتی رہتی ہے.. ایک دو تین اور گھوم جاؤ.. ایک دو تین اور.. یعنی والز رقص کے تمام تر سٹیپس یہاں موجود ہیں.. لیکن رقص آپ نہیں کرتے آپ کی ویگن کرتی ہے اور اگر ایک بھی سٹیپ غلط پڑا تو آپ سیدھے نیچے سندھ میں پڑے اور ایسے پڑے کہ بحیرہ عرب تک آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا کہ یہاں کیوں پڑے.. یہاں تک کہ اندھی ڈولفن بھی نہیں پوچھے گی کہ وہ آپ کو قریب سے بہتا ہوا دیکھ بھی نہیں سکتی. گھومتے گھومتے آپ بھی گھوم جاتے ہیں اور پھر لاپروا اور مست ہو جاتے ہیں کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا..

سکردو کورج کی چٹانوں میں پہلی ہریاول سسّی میں نظر آتی ہے..

یہ سسّی..ایک بے آب وگیاہ چٹانی صحرا میں جانے کہاں سے بھٹکتی ہوئی آنکلی ہے..
اور یہ سسّی بھی بے خبر ہے..

کیونکہ میں یہاں سے جتنی بار بھی گزرا ہوں میں نے سوائے ایک چھوٹی سی آبشار کے..مٹی کے چند سرِراہ کھیتوں اور کچھ درختوں کے سوا کبھی کسی ذی روح کو نہیں دیکھا۔

صرف ایک ذی روح ہے اس سسّی کے عین اوپر سانس لیتا برف سے سفید ہوتا..آسمان کی نیلاہٹ میں بلند ہوتا..اور وہ ہے کوہ ہراموش!

بادلوں اور برفوں کا ایک ڈھیر جو سکردو درّے میں سسّی کے مقام پر جھانکتا نظر آتا ہے..

ہراموش تک میں جانا چاہتا ہوں..

یہ میرے مستقبل کے کوہ نوردی کے منصوبوں میں ترجیح اول ہے..

بڑھتی عمر اور گھٹتی ہمت پر تو میرا اختیار نہیں..منصوبے بنانے پر تو میرا اختیار ہے..سکردو روڈ پر سینکڑوں ایسے یکدم موڑ آتے ہیں جن پر مڑتے ہوئے اگر غیر متوقع طور پر سامنے سے ایک ویگن یا بس آجائے تو..اگر آپ اس لمحے محض سگریٹ کا ایک کش لگانے کے لیے سگریٹ منہ تک لے جا رہے ہیں تو بس اتنی دیر میں یا تو آپ اور یا سامنے سے آنے والی ویگن نیچے سندھ میں ہوں گے..اور پھر باقی رہے نام اللہ کا..یا کچھ عرصے کے لیے دریائے سندھ کا..

ایک مقام بانجھ نامی بھی راستے میں پڑتا ہے..

اور کیا باغ و بہار قسم کا مقام ہے جہاں اکثر کم کم بادوباراں بھی ہے..ہرا بھرا ہے اور سرخ اور زرد رنگ کے پھول کھلا ہے...یہ دوبارہ بچہ..یعنی بانجھ اطفال ہے جس میں سکردو روڈ کے سہمے ہوئے بنجر خوف کے مارے ہوئے بنجر مسافر داخل ہوتے ہیں تو ہرے بھرے ہو جاتے ہیں..

دریا کے پار بھی کوئی پچھر پوست کارڈ گاؤں نظر آتا ہے۔ چٹانوں سے گرتے کسی سفید ریشمی آبشار کے دامن میں..چند گھر..کچھ کھیت..پہلو میں کوہ کے ایک جھونپڑا اور یہ آبشار ایک نالے کی صورت اختیار کرتا نیچے سندھ میں گرتا ہوا..گاؤں تک ایک پُل سے سندھ کے آر پار..کبھی تو سکردو روڈ ترک کر کے نیچے اُتر کر اس پل کے پار اس گاؤں میں جانا چاہیے..اس آبشار کی پھوار سے ہٹ کر کسی ہرے بھرے کھیت میں خیمہ لگانا چاہیے اور وہاں سے یہ دیکھنا چاہیے کہ سکردو روڈ پر رینگتی کوئی ایک ویگن..بلکہ ہماری ویگن کتنی بیوقوف ڈولتی ہوئی اور بے مقصد لگتی ہے۔

درّہ کھلتا ہے۔ہر شام کھلتا ہے..منظر وسیع ہوتا ہے اور سکردو کھلتا ہے..

سندھ جو اکثر شاخوں میں بٹا..ریتلے ٹیلوں اور جزیروں میں خاموشی سے بہتا ہے۔اس برس پورے جوبن پر ہے..ٹیلوں اور جزیروں کو نابود کرتا رواں ہے..بھرا ہوا ہے..ہم از حد تھکے ہوئے ہیں..

کم از کم میں تو سب سے زیادہ تھکا ہوا تھا..کہ مجھے لاہور میں اگلی صبح کے آغاز سفر کی فکرمندی نے سونے نہ دیا..بشام میں شیر دریا کی لہریں میری نیند میں بہتی رہیں اور پچھلی شب رحمت بی نے مجھے جگائے رکھا..رات بھر طالع بیدار نے مجھے سونے نہ دیا۔اس لیے میں سب سے زیادہ تھکا ہوا تھا۔

اور میں کے ٹو موٹل پہنچ کر اپنے اس سفر کو بھول کر ایک آرام دہ بستر پر ڈھیر ہو جانا چاہتا تھا..

''کوہ مشابرم کی بجائے گندوگوروبیس کیمپ جائیں گے''

کچورا جھیل اس جانب..

ایئرپورٹ اس جانب..

گمبہ چھاؤنی میں سے گذرتے..

اور پھر سکردو کے مین بازار کا آغاز..دائیں جانب پٹرول پمپ کے برابر میں ''ہمالین ٹورز'' کا بورڈ آویزاں ہے..محمد علی چنگیزی کا سیاحتی ادارہ اور یہاں سے ہمیں آئندہ سفر کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات مل سکتی تھیں..چنانچہ تھکاوٹ اپنی جگہ لیکن معلومات اپنی جگہ..

''رُک جاؤ..''میں بہ حیثیت لیڈر حکیم کو حکم دیتا ہوں..

عجیب افیونی سا حکیم ہے..نہ بات کرتا ہے نہ مسکراتا ہے بس ویگن چلاتا جاتا ہے اور وہ بھی جیسی تیسی..نہ اسے کھانے میں دلچسپی ہے نہ اسے ہم میں دلچسپی ہے اور نہ ہی وہ اپنے آپ میں دلچسپی لیتا ہے..ایک مجنونی انداز میں..ویگن چلاتا جاتا ہے اور ہاں کبھی کبھار ذرا اونگھ بھی جاتا ہے اور ہمیں ایک پل کے لیے محسوس ہوتا ہے کہ ویگن ابھی کچھ فری سی ہو گئی تھی اور وہ پھر سنبھل جاتا ہے..ایسے موقعوں پر ہم ویگن روک کر اسے زبردستی چائے پلاتے ہیں، اور پھر اسے اونگھنے سے بچانے کے لیے لطیفے سناتے ہیں۔اس کی زندگی میں خواہ مخواہ دلچسپی لیتے ہیں۔اس کی بند بند آنکھوں کی تعریف کرتے ہیں کہ یہ لگتی تو اچھی ہیں لیکن انہیں ذرا کھولے رکھو تو تمہاری بڑی مہربانی..سکردو روڈ پر وہ پہلی بار آیا تھا اور صرف پاپی پیٹ کے لیے آیا تھا..اور اگر اس حکیم کا کوئی دماغ ہے تو وہ یقیناً سوچتا ہوگا کہ لاہور کے کسی پرائیویٹ پاگل خانے کے مریض ہیں جو فرار ہو گئے ہیں..ورنہ یہ نتھیا گلی یا سوات جاتے..اِدھر کیوں آ گئے ہیں..آ گئے ہیں تو مجھے ساتھ کیوں لے

آئے ہیں۔اگرچہ میں ایک حکیم ہوں لیکن ان کی حکمت مجھے سمجھ نہیں آتی..

تو میں نے جب ''رُک جاؤ'' کہا تو حکیم نے اس کے پورے ایک منٹ بعد ویگن روکی کیونکہ وہ یہی سوچ رہا تھا جو میں نے اوپر بیان کیا ہے..ویسے ہم جان چکے تھے کہ ہم جو کچھ بھی کہتے تھے، وہ کچھ سمجھنے میں اسے کم از کم ایک منٹ لگتا تھا..چنانچہ ہم آگے نکل چکے تھے اور جب وہ ''رُک جاؤ'' سمجھا تو پھر ویگن بیک کی اور ہم ''ہمالین ٹورز'' کے دفتر میں داخل ہو گئے..

چنگیزی موجود نہیں تھا..عقل مند تھا..اسلام آباد میں تھا..

اس دفتر میں ہم نے ''کے ٹو کہانی'' اور ''سنولیک'' کی منصوبہ بندی کی تھی اور چنگیزی نے ہمیں گائیڈ کیا تھا..ساز و سامان عطا کیا تھا..بغیر کسی معاوضے کے..شائد اسے خبر ہو گئی تھی کہ لاہوری مفت بر پھر آ رہے ہیں۔اسی لیے وہ اسلام آباد روپوش ہو گیا تھا..چنگیزی کی افواج قاہرہ میں سے دو صاحب دفتر میں موجود تھے..ایک صاحب منیجر تھے اور اتنے منیجر تھے کہ کچھ بولتے نہیں، منیجر کی کرسی پر بیٹھے سر ہلاتے رہے۔دوسرے صاحب شمال کے چپے چپے کو جانتے تھے اور انہوں نے مناسب انداز میں ہمارا سواگت کرنے کے بعد پوچھا ''تارڑ صاحب اس برس کہاں جائیں گے؟''

''ہوشے..اور وہاں سے مشابرم بیس کیمپ..''

''اب مشابرم بیس کیمپ کون جاتا ہے..''

''ہم جاتے ہیں..''

''کیوں جاتے ہیں؟''

ہم سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے کہ کیوں جاتے ہیں..

''جناب عالی سنا ہے کہ خوبصورت پہاڑ ہے..''میاں صاحب نے کھنگورا مار کر کہا..

''کیا ہے؟''

''خوبصورت پہاڑ..''

''آپ کو کس نے بتایا ہے؟''

''تارڑ صاحب نے..''

''کیوں تارڑ صاحب؟''

''مجھے بھی کسی نے بتایا ہے..''

''نہ جائیے۔''

''کیوں؟''

''آپ ہوشے سے مشابرم کے بیس کیمپ میں ڈیڑھ دن میں پہنچ جائیں گے..اور وہ ایک تنگ جگہ ہے..مشابرم کی چوٹی راستہ روکے کھڑی ہے اور بس..ایک دن میں واپس ہوشے آ جائیں گے تو کل ڈھائی دن کی ٹریکنگ کیا ٹریکنگ ہوئی..''

میں کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ وہ کیا پنجابی گیت ہے جگجیت سنگھ کا کہ..' ڈھائی دن نہ جوانی چلدی... تے کُڑتی ململ دی..' تو ڈھائی دن کی کوہ نوردی بھی بہت ہوتی ہے لیکن میں نے کہا یہ کہ... مشابرم بیس کیمپ نہ جائیں تو کہاں جائیں؟......

اس سوال کا جواب کیا آیا یہ بتانے سے پہلے میرا بہت جی چاہ رہا ہے کہ میں آپ کو اس گیت کے بارے میں ایک اور مزیدار واقعہ بتاؤں..ایک شب..ایک گئی شب جب میں اپنی سٹڈی ٹیبل پر جھکا جھک مار رہا تھا یعنی کوئی اس قسم کا سفرنامہ لکھ رہا تھا اور گرمی سے نڈھال اور پسینے سے شرابور تھا تو ایک ٹیلی فون آیا..پس منظر میں خوب شور شرابہ تھا اور شور اتنا نہ تھا جتنا شرابہ تھا کیونکہ اس میں شراب کی آمیزش تھی، کوئی صاحب اس آمیزش میں ڈوبتے بولے'' تارڑ جی..ہم تو آپ کے پجاری ہیں..چرن چھونا چاہتے ہیں..ادھر آپ کے لاہور میں مشرقی پنجاب سے آئے ہیں ایک کانفرنس کے سلسلے میں تو چرن چھونے آ جائیں؟ ویسے آپ آ جائیں تو بھاگ جاگ جائیں ہمارے..ہم کسی شاہ نور سٹوڈیو کے قریب رنگ جمائے بیٹھے ہیں..پرویز مہدی گا رہے ہیں..''

''شکریہ بہت بہت..لیکن رات کے اس پہر ذرا مشکل ہے..ویسے آپ اپنا تعارف تو کروا دیجیے کہ کیا کرتے ہیں..کون ہیں؟''

''لو جی..ہمیں تو پورا امریکہ جانتا ہے..پورا یورپ جانتا ہے۔ پورا افریقہ جانتا ہے..آپ نے جگجیت سنگھ کا وہ گیت نہیں سنا..ڈھائی دن نہ جوانی چلدی...تے کُڑتی ململ دی..سنا ہے؟''

''بالکل سنا ہے اور متعدد بار سنا ہے۔''

''تارڑ جی..وہ گیت آپ کے اس پجاری نے لکھا ہے..سناؤں؟''

اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہتا، ان صاحب نے یہ گیت الاپنا شروع کر دیا اور پس منظر میں جو شور شرابہ تھا، وہ مزید شراب ہو گیا..اور گیت کے درمیان رُک کر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے..اوئے تارڑ جی ڈھائی دن نہ جوانی چلدی..تو اڈھے کول کُڑتی ململ دی ہے کہ نہیں..نہیں تو میں پہنچا دوں..

مجھے افسوس ہے کہ میں اس شب اس عظیم گیت نگار کے درشن نہ کر سکا اور اپنی سٹڈی میں ہی قید رہا..

بہرحال یہ قصہ ململ کی کُرتی یہاں تمام ہوتا ہے اور وہ لمحہ آتا ہے جب میں نے چنگیزی کے دفتر میں بیٹھے ہوئے پوچھا کہ..بیس کیمپ نہ جائیں تو کہاں جائیں؟

''آپ جانتے ہیں کہ 93ء تک کے ٹو بیس کیمپ اور کنکورڈیا جانے والے کوہ نورد وہاں پہنچ کر واپس الٹے قدموں اسی راستے سے لوٹ جاتے تھے..اسی گورے، اردوکس اور پائیو اور کوروفون سے واپس اشکولے جاتے تھے..لیکن پھر ایک نیا راستہ دریافت ہو گیا..کے ٹو بیس کیمپ سے کوہ نورد اب مشابرم گلیشیئر کو کراس کرتے ہیں..درہ گندوگورو کو عبور کرتے ہیں اور ہوشے میں آ نکلتے ہیں تو آپ جائیں گندوگورو..جسے گورا لوگ گانڈوگورو بولتے ہیں..''

''کیا گندا مندا سا نام ہے جناب عالی..'' میاں صاحب پھر بولے اور بڑی مشکل سے بولے کیونکہ سکردو روڈ کے ڈر سے ان کا جو کچھ بول رہا تھا، وہ بند ہو چکا تھا..

''آپ اسے انگریزی میں نہ بولیں..'' سلمان نے صلاح دی۔ ''اردو میں ذرا تیز سے بولیں..''

''ہوشے سے گندوگورو بیس کیمپ تین دن کی مسافت پر ہے.....راستے میں ژل سنگ پا ہے جس کا مطلب ہے پھولوں کا کھیت..بیس کیمپ سے آپ ہائی کیمپ جائیں گے اور پھر وہاں سے آپ اٹھارہ ہزار فٹ بلند گندوگورو کی شاندار چوٹی فتح کریں گے۔''

''یعنی میں بھی فتح کروں گا..اس عمر میں؟''

''ہاں..اسے کسی بھی عمر میں فتح کیا جا سکتا ہے..ستر برس کے گورے بھی اس کے اوپر پہنچ جاتے ہیں۔ آپ کی عمر تو ایک دو برس کم ہی ہوگی..''

''کیسے..جلدی سے بتاؤ کہ کیسے؟''

''آپ ہائی کیمپ سے رات بارہ بجے نکلیں گے اور اوپر چڑھنا شروع کر دیں گے۔ ٹارچوں کی روشنی میں...برف ابھی سخت ہوگی اور آپ کے بوٹوں کے ساتھ کریمپون ہوں گے تو آسانی سے چلیں گے۔ تقریباً پانچ بجے آپ چوٹی کے دامن میں پہنچ جائیں گے اور جب آپ سر اٹھا کر اوپر دیکھیں گے تو آپ گھبرا جائیں گے کہ وہاں چوٹی تک ایک برف کی سیدھی دیوار بلند ہوتی ہے لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں، وہاں ہوشے کے کچھ ہائی پورٹر مستقل طور پر قیام پذیر ہیں

اور انہیں RESCUE ٹیم کہا جاتا ہے۔ انہوں نے چوٹی تک رسّے باندھ رکھے ہیں۔ وہ فی کوہ نورد تین سو روپے چارج کریں گے اور پھر آپ ان پورٹروں کی مدد سے رسوں سے لٹکتے برف کی دیوار پر چڑھتے صبح چھ بجے کے قریب چوٹی پر پہنچ جائیں گے۔"

"اور اگر رسّہ ہاتھ سے چھوٹ جائے تو کیا ہوتا ہے؟"

"وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے صاحب۔ لیکن اُدھر چوٹی پر پہنچتے ہیں تو صاحب وہاں سے کیا منظر ہے۔"

"کیا منظر ہے؟" عامر نے پُراشتیاق ہو کر پوچھا۔

"وہاں سورج نکل رہا ہوتا ہے اور آپ کے نیچے سے کہیں برفوں میں سے طلوع ہو رہا ہوتا ہے۔ اور اس لمحے چوغولیزا، مشابرم اور کے ٹو نظر کے سامنے ہوں گی۔"

"یعنی نظر کے سامنے جگر کے پار" سلمان چہکنے لگا۔

"ہاں جی۔ آپ کچھ دیر ٹھہریے۔ تصویریں اُتاریے۔ لیکن زیادہ دیر نہیں کیونکہ نیچے کوہ نوردوں کی ایک لائن لگی ہوتی ہے کہ آپ اُتریں تو وہ اوپر جائیں۔ تو آپ انہی رسّوں کو تھام کر نیچے آ جائیں گے۔ دیر کریں گے تو برف نرم ہو جائے گی۔"

ایک باقاعدہ اور یورپ کی سب سے بلند چوٹی ماؤنٹ بلانک سے بھی دو ہزار فٹ مزید بلند چوٹی کو فتح کرنے کے امکان نے میری ٹیم کے تنِ مُردہ میں ایک نئی نکور اور ایڈونچرس روح پھونک دی... وہ بے حد ایکسائٹڈ ہو کر ان مینڈکوں کی طرح ٹرانے لگے جو ایک طویل خشک سالی کے بعد بارش کی پہلی بوچھاڑ میں بھیگتے ہی پھر سے زندہ ہو جاتے ہیں اور ٹرا ٹرا کر جینا وبال کر دیتے ہیں۔

"دفع کریں جی مشابرم کو.. چوٹی فتح کریں۔"

"سر یہ جو باہر کے لوگ ہیں ناں، ہمارے قبیلے سے باہر کے لوگ.. تو یہ ہم سے ہمیشہ پوچھتے ہیں کہ تم جو پہاڑوں پر جاتے ہو تو وہاں جا کر نانگا پربت اور کے ٹو پر کیوں نہیں چڑھ جاتے۔ انہیں فتح کیوں نہیں کرتے.. انہیں تو معلوم نہیں کہ کوہ نوردی اور کوہ پیمائی میں فرق ہوتا ہے تو ایسے لوگوں کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کرنے کے لیے یہ گولڈن چانس ہے.. ہم اس.. کیا نام بتایا ہے چوٹی کا.. جو کچھ بھی ہے تو ہم اس پر چڑھ ہی جائیں.. واپسی پر بیان دے دیں گے کہ کے ٹو پر چڑھ کر آئے ہیں۔"

"ویسے مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن.." میاں صاحب پھر بولے۔ "چوٹی کا نام ذرا ثقیل ہے.. اب یہ چنگیزی کا آدمی اسے بار بار گنڈوگورو کہہ رہا تھا۔"

"میاں صاحب آپ مہربانی کر کے بھاٹی گیٹ لاہور سے نکل کر بلتستان میں آ جائیے پلیز.. ہر تہذیب اور ہر زبان کی صدائیں اور لہجے الگ الگ ہوتے ہیں۔" میں نے لیڈر کی حیثیت سے انہیں ڈانٹا۔ اگرچہ میں بھی نام کے بارے میں ذرا فکرمند تھا.. چوٹی کا نام کچھ اور ہوتا تو ذرا بہتر ہوتا..

"مائی لیڈر.." اور یہ واہیات طرزِ تکلم شاہد کا ہی ہو سکتا تھا جس نے اپنا سیاہ جاسوسی چشمہ ایک مدت کے بعد آنکھوں سے الگ کیا اور چندھیائی ہوئی فلسفیانہ نظروں سے سب کو دیکھتے.. بلکہ شاید نہ دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرے رُک سیک میں اتفاق سے ایک پاکستانی پرچم موجود ہے جو میں گنڈوگورو کی چوٹی پر لہرا کر پاکستان اور اسلام کا نام روشن کروں گا.. ایک مدت سے پاکستان اور اسلام کا نام روشن کرنے کی ایک خواہش دیرینہ و پارینہ میرے اندر موجیں مار رہی تھی.. مائی لیڈر.. چڑھ جائیں چوٹی پر.."

یہ "چڑھ جائیں چوٹی پر" اُس نے "چڑھ جائیں سولی پر" کے انداز میں کہا تھا۔

کم گو اور شدید مجبوری کے تحت بات کرنے والا برمانی بھی بولا "سائیں آپ تو جانتے ہو کہ میرے خیالات میں کج روی بہت ہے.. میں تو لیلیٰ پیک کو بھی دولہن کے روپ میں خوابوں میں دیکھتا ہوں اور صبح شرمندہ ہوتا ہوں تو ایک بلند برفانی چوٹی پر چڑھنا میرا خواب ہے.. مجھے چڑھ جانے دیں۔"

میں نے پہلے اپنے آپ کو دیکھا.. اس طرح دیکھا جیسے باتھ روم کے قدِ آدم شیشے میں نہانے سے پیشتر اپنے آپ کو دیکھتا ہوں اور جو کچھ میں نے دیکھا، اسے پسند نہ کیا اور پھر سلمان کے تن و توش پر نظر کی.. ہمارا مشترکہ نہ سہی الگ الگ بوجھ بھی اتنا تھا کہ اوّل تو وہ برف کی دیوار میں نصب رسّے ہمیں سہار نہیں سکتے تھے اور اگر ہم گرتے پڑتے چوٹی پر پہنچ جاتے تھے تو پوری چوٹی ہمارے وزن سے مسمار ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ بلندی کے مسائل بھی تھے کہ ہم دونوں دروِ سپر کی سترہ ہزار فٹ اونچائی کو بمشکل برداشت کر سکتے تھے.. اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اگر اوپر چڑھتے ہوئے پھسل جاتے ہیں.. گر جاتے ہیں تو پھر گر جاتے ہیں۔" اگرچہ وہاں رسّے نصب ہیں لیکن انہیں صبح کی نیم تاریکی میں برف کی دیوار کے ساتھ تھامنا اور اوپر چڑھنا تو ہم نے ہے۔ تو کیا ہم

میں اتنی ہمت ہے..اور ہمارے پاس آکس ایکس نہیں..کریمپون نہیں جن کے بغیر ہم چوٹی تک نہیں جا سکتے..''میں نے احتیاط کا طبل آہستہ آہستہ بجایا..

''تارڑ صاحب یہ سب کچھ آپ کو ہائی کیمپ میں مل جائے گا..''چنگیزی کا اسسٹنٹ ہمیں گندوگورو کی چوٹی پر پہنچانے پر تلا ہوا تھا۔شائد کہیں شرط لگا کر آیا تھا کہ میں تارڑ کو کیفر کردار تک پہنچا کر رہوں گا..''ویسے کیا آپ نے کبھی کوئی چوٹی سر کی ہے؟''

''برفانی چوٹی تو نہیں..''

''تو پھر آپ نہیں جانتے کہ پچھلے بیس برسوں کی کوہ نوردی ایک طرف اور..کسی بلند قراقرمی چوٹی پر ایک قدم رکھنا..ایک طرف..''

''یہ تو مرنے کے سامان لگتے ہیں..''

''سر جی..موت کا ایک دن معین ہے....اور آپ تو عمر کے اس حصے میں ہیں جہاں اس کا آنا جانا لگا رہتا ہے..چلتے ہیں سر..دیکھا جائے گا..''یہ بیان جانے کس نا ہنجار نے دیا تھا مجھے یاد نہیں..کیونکہ پوری ٹیم سرخوشی کی برفانی مسرت سے سرشار تھی۔چنانچہ آزادیٔ جمہور کا زمانہ آ گیا تھا..مشاہرم بیس کیمپ کا سفر ترک کر دیا گیا اور گندوگورو کو منزل بنا لیا گیا...البتہ میں نے ایک شرط رکھ دی۔''ہم گندوگورو کے بیس کیمپ پہنچ کر یہ فیصلہ کریں گے کہ کیا ہم نے وہاں سے ہائی کیمپ اور پھر چوٹی تک جانا ہے یا نہیں۔''

''کیوں نہیں جانا مائی لیڈر..چوٹی وہاں سامنے موجود ہو اور ہم نہ جائیں..پاکستان اور اسلام کا پرچم اس پر نہ لہرائیں..یہ کیسے ہو سکتا ہے..''

''شاہد صاحب..بُرا نہ مانئے گا لیکن..''یہ سلمان تھا جو بے شک بہت فرمانبردار بچہ تھا لیکن بہت بدتمیز بچہ بھی تھا..اس کا قصور نہ تھا..انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں جس نے بھی چند برس گزارے ہوں،اس کے لیے بقیہ زندگی میں باتمیز ہونا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔''آپ اگر گندوگورو کی چوٹی پر نہ بھی پہنچے تو لاہور واپسی پر ڈیکلیئر کر دیں گے کہ پہنچ گئے تھے..جیسا کہ آپ نے کنکورڈیا سے واپسی پر اعلان فرما دیا تھا کہ ہم لوگ کے ٹو کے بیس کیمپ میں جا پہنچے اور پھر میری آنکھ سے آنسو نکلا..نکلتے ہی برف میں بدل گیا اور اس برف میں کے ٹو کی تصویر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گئی..حالانکہ تارڑ صاحب نے ''کے ٹو کہانی''میں اقرار کیا ہے کہ آپ لوگ کے ٹو بیس کیمپ نہیں پہنچے تھے..''

''اے نادان بھالو...''شاہد صاحب نے نہایت الفت سے سلمان کو دیکھا۔''تم ابھی

بچے ہو..تمہارا تو صرف ابھی نکاح ہوا ہے..تم آٹے دال کا بھاؤ کیا جانو..ہم سے پوچھو..جتنا عرصہ ہمیں شادی شدہ ہوئے گزرا ہے،اس کے بعد ایک فینٹسی جنم لیتی ہے..آپ کو وہ کچھ بھی نظر آنے لگتا ہے جو نظر نہیں آتا..اور اس فینٹسی میں اگر کے ٹو بیس کیمپ نہیں بھی پہنچے تو پہنچ جاتے ہیں..یہ تو تخیل کی پرواز کے کرشمے ہیں..اب یہ ہمارے لیڈر صاحب ہیں۔ایسے ایسے منظر بیان کرتے ہیں جو ہمیں تو نظر نہیں آتے..صرف انہیں نظر آتے ہیں..''

''جناب مجھے شادی شدہ ہوئے آپ سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔اس لیے میرے تخیل کی پرواز آپ سے بھی اونچی ہے..براہ کرم اپنی لڑائی لڑیں اور مجھے معاف رکھیں..''

''اب سمجھ آئی؟''شاہد نے فاتحانہ انداز میں سر ہلایا..

''بالکل سر..''نادان بھالو نے سر جھکا لیا۔''چلیں گوندوگورو کی چوٹی پر چلیں لیکن دھیان رکھیں کہ راستے میں کہیں میں لڑھک ہی نہ جاؤں۔''

''سکردو بے وفا ہو جاتا ہے اور چلو چلو چلو چلو...''

کے ٹو موٹل نہ صرف فُل تھا بلکہ اس کے برآمدوں میں بھی اتنے ملکی اور غیر ملکی سیاح تھے کہ کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ تھی..

ہم نے اگرچہ گلگت سے فون پر اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی لیکن استقبالیہ صاحب نے نہایت احترام سے عرض کیا کہ جانے وہ فون کس نے اٹینڈ کیا تھا..موٹل میں ایک کمرہ بھی خالی نہیں ہے..بلکہ یہ جو دو گورے مجھ سے الجھ رہے ہیں، ان کی بکنگ ہونے کے باوجود ان کے لیے بھی گنجائش نہیں کیونکہ کچھ مہمان جو رخصت ہونے تھے، فلائٹ نہ ہونے کی وجہ سے رخصت نہیں ہو رہے اور کمرے خالی نہیں کر رہے..سوری سر..

باہر ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی اور موٹل کے ڈائننگ روم سے ایک ایسا سندھ نظر آ رہا تھا جس پر بادل اُترے ہوئے تھے اور شام کو نیم تاریک کرتے تھے...یہ منظر ہمیں خوشی دیتا اگر ہمیں رہائش مل جاتی اور اسے ہم اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھتے لیکن اب یہ ہمارے لیے اداسی اور اذیت تھا کیونکہ ہم بے گھر تھے..

ہنزہ کے ریاض صاحب جن سے ایک مدت سے آشنائی تھی، ان دنوں یہاں منیجر تھے..میرے بچوں سے اتنا لگاؤ تھا کہ گلگت میں موٹل کے لان میں واقع سیب کے درخت پر بنفس نفیس چڑھ کر ان کے لیے سیب اتارا کرتے تھے..لیکن وہ سکردو سے باہر تھے..اندر بھی ہوتے تو شائد تب بھی مجبور ہوتے کہ موٹل ٹھسا پڑا تھا..

البتہ واپسی پر ریاض صاحب نے ساری کسر نکال دی..خپلو سے نکل کر ہم تھوڑی دیر کے لیے سکردو رُکے تو ہم پر باقاعدہ نچھاور ہو گئے..ہم سب کے لیے لنچ کا بندوبست کیا اور ہر پانچ

منٹ کے بعد کہتے ''تارڑ صاحب..آج صبح نیچے سندھ کے کنارے سیر کرتے ہوئے پورے چھ بجکر چودہ منٹ پر میں نے آپ کو بہت یاد کیا..اپنی بدنصیبی پر تاسف کیا کہ ہائے ہائے تارڑ صاحب آئے اور میں موجود نہ تھا..پورے چھ بجکر چودہ منٹ پر...'' پھر سر ہلاتے اور کھیرے کی ایک قاش کو چٹکی میں پکڑ کر کہتے۔ ''رزق میرے ہاتھ میں ہے تارڑ صاحب..پورے چھ بجکر چودہ منٹ پر..آج صبح میں نے آپ کو یاد کیا....کے ٹو موٹل میں جو اضافے ہو رہے ہیں، ہم ان حصّوں کے نام ایسی شخصیات کے نام پر رکھ رہے ہیں جنہوں نے شمال کے لیے بہت کام کیا ہو..انشاءاللہ اگلا ونگ آپ کے نام پر ہو گا..اور تارڑ صاحب آج صبح پورے چھ بجکر چودہ منٹ پر..موٹل کے برآمدوں میں آپ کے ٹریکس کے بارے میں جو کارڈ اور پوسٹر وغیرہ چسپاں ہیں، کئی لوگ انہیں سووینئر کے طور پر خریدنا چاہتے ہیں لیکن یہ تو ہماری پہچان ہیں تارڑ صاحب..ویسے آج صبح چھ بجکر چودہ منٹ پر..''

لیکن ریاض صاحب کی یہ محبت تو ہمیں واپسی پر ملی..

ابھی تو ہم بے آسرا تھے اور ہلکی بارش ہو رہی تھی..

استقبالیہ صاحب نے یہ پیشکش بھی کی کہ آپ جھیل صدپارہ چلے جائیں وہاں دو کمرے مل جائیں گے..لیکن اس میں کچھ سخت مقام آتے ہیں۔اب شام ڈھلے پہلے تو صدپارہ جانے کے لیے جیپوں کا بندوبست کریں..اپنی ویگن یہیں کہیں چھوڑ دیں..کل صبح پھر واپس سکردو آئیں..نہیں اس میں تردد بہت تھا..

''سر آپ شیر علی کا موٹل کنکورڈیا چیک کر لیں، شائد وہاں جگہ مل جائے..''

''شیر علی تو ہمارا اپنا شیر ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا اور ہم کے ٹو موٹل سے باہر آ گئے..

لیکن کنکورڈیا موٹل میں بھی یہی حالات تھے اور شیر علی یوم آزادی کے سلسلے میں کھیلے جانے والا ایک فٹ بال میچ دیکھنے گیا ہوا تھا اور موٹل میں اُس کا ایک ''چھوٹا'' انچارج تھا جو بے حد معاون ثابت ہوا۔ ''تارڑ صاحب موٹل بالکل ہی فل ہے..لیکن فکر نہ کریں میرے پاس ایک نامکمل کمرہ ہے، وہ حاضر ہے۔ برابر میں پولیس ریسٹ ہاؤس ہے وہاں ایک کمرے کا بندوبست ہو جائے گا..اور اگر بارش زیادہ نہ ہو تو بے شک لان میں ٹینٹ لگا لیجیے..''

شیر نے یہ موٹل کے ٹو موٹل کے سٹائل میں دریائے سندھ کے اوپر بنایا تھا..

عجیب سکردوی شام تھی جس میں بارش کی اداسی اتری تھی اور ہم بے گھر تھے..رات سر پر تھی..

''غرناطہ کے ایک اندھے فقیر کو دیکھ کر کسی نے کہا تھا کہ اے عورت.. اس فقیر کو خیرات دو کہ غرناطہ ایسے خوبصورت شہر میں ہونا اور اندھا ہونا.. اس سے بڑی بدقسمتی کوئی نہیں.. تو کسی شام سکردو میں ہونا اور سر پر چھت نہ ہونا..''

نامکمل کمرے کا باتھ روم بھی نامکمل تھا.. اور کچھ بُو بھی تھی..

پولیس ریسٹ ہاؤس کا کمرہ تھا تو اطمینان بخش لیکن مجھے بے آرامی سی ہو رہی تھی.. بارش کا کچھ پتہ نہ تھا کہ تیز ہو جائے، اس لیے خیمے نصب کرنا بھی دانش مندی نہ تھی.. اور ہم میں ہمت بھی نہیں تھی خیمے نصب کرنے کی..

''ویسے سر...'' کنکورڈیا کا چھوٹا واقعی میرے لیے فکرمند تھا۔ ''ایک بات بتاتا ہوں.. ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ تو اپنی ویگن لے کر آئے ہو تو آپ خپلو کیوں نہیں چلے جاتے۔ ادھر تو نیا موٹل بنا ہے اور زبردست ہے.. اور خالی ہے..''

میں نے اس نئے موٹل کی تعریف سن رکھی تھی.. لیکن خپلو؟.....

''آٹھ بج رہے ہیں اور رات ہو چکی ہے تو.. لیکن کیا ہماری ویگن خپلو جا سکتی ہے؟ رات کو اس روڈ پر ٹریفک چلتا ہے؟''

''ادھر تو اب ٹریلر اور فوجی ٹرک بھی جاتا ہے سر.. اُدھر نہیں جائے گا تو اور کدھر جائے گا.. سیاچن کا راستہ ہے ناں.. اُدھر تو دنیا کا ٹریفک چلتا ہے۔''

''کیوں حکیم؟'' میں نے باہر آ کر حکیم سے رجوع کیا جو بار بار اپنا ازار بند اُڑستا پہلی بار سکردو کی رات میں بہتے سندھ کو حیرت سے تکتا تھا۔ ''خپلو چلیں۔''

''ہیں؟'' وہ چونک گیا۔ ''کدھر چلیں؟''

''خپلو..''

''یہ کوئی اور ہوٹل ہے؟''

''نہیں۔ یہاں سے ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر ایک وادی ہے.. راستہ تقریباً میدانی ہے اور روڈ پر ٹرک بھی چلتے ہیں.. یہاں تو رات گزارنے کے لیے کوئی بندوبست نہیں ہو رہا تو وہاں چلیں؟ تم تھک تو نہیں گئے؟''

''تھک گیا ہوں..'' اس نے فوراً ڈکلیئر کر دیا۔ ''سکردو روڈ بہت کٹا روڈ ہے سر... بہت تھک گیا ہوں۔''

''حکیم تھک گیا ہے؟'' عامر کے اندر خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ''تارڑ صاحب تھکے ہوئے ڈرائیور کو کبھی مزید ڈرائیونگ کے لیے مجبور نہیں کرنا چاہیے.. ٹھیک ہے حکیم تم تھک گئے ہو تو نہیں جاتے.. آرام کرو..''

''یہ تو آرام کرے عامر لیکن ہم کہاں آرام کریں..''

''ہاں یہ مسئلہ بھی قابلِ غور ہے۔''

''حکیم..'' میں نے لاہور سے چلنے کے بعد پہلی بار ویگن کے لیے ادا کیے جانے والے مبلغ ڈھائی ہزار روپے روزانہ.. چاہے وہ ایک ہی مقام پر ہفتہ بھر کھڑی رہے، پھر بھی ڈھائی ہزار روپے روزانہ.. پلس ڈیزل کا خرچہ، پلس ڈرائیور کے روٹی، پانی اور رہائش کا خرچہ.. ان سب خرچوں کے خرچ کرنے والے کو جتنا حق ملنا چاہیے، اس کا مطالبہ کر دیا اور آرڈر دے دیا کہ.. حکیم راستہ آسان ہے.. خپلو چلنا ہے.. چلو!

حکیم نے جس ڈھکی چھپی بدتمیزی اور بیزاری کا مظاہرہ کیا، وہ قابلِ دید تھا۔ ''یہ جو خپلو ہے.. اور سیاچن کی طرف ہے تو راستے میں برف ہی برف ہے؟''

''نہیں.. سیدھا اور سوکھا راستہ ہے.. صراطِ مستقیم ہے.. بچے بچے چلے چلو.. چلو۔''

میں اس سے پیشتر دو مرتبہ خپلو.. یعنی خپلو جا چکا تھا.. پہلی بار نظامی اور مطیع نجومی کے ہمراہ اور دوسری مرتبہ اپنے خاندان کے ساتھ.. اور راستے میں کیسے کیسے سنہری گاؤں آتے تھے جہاں دو منزلہ چوبی گھر اور گندم کے پکے ہوئے گولڈن فیلڈز تھے.. وہ مقام تھا جہاں تبت سے آنے والا شیر دریا.. اس سے بڑے دریا شیوک کو اپنی آغوش میں لے کر مدغم کر لیتا تھا..

"بھگت کبیر اور میرا بائی خپلو کے موٹل میں"

ہم گئی رات خپلو پہنچے..

راستے میں حکیم کو محظوظ کرتے رہے.. سکھوں کے لطیفے سناتے رہے۔ اس کی خوشامد اس طرح کرتے رہے جیسے وہ کوئی فوجی حکمران ہو.. اس کی بے مثل ڈرائیونگ اور نشیلی آنکھوں کی تعریف کرتے رہے تاکہ.. وہ اونگھ نہ جائے.. ہمیں انڈس کے حوالے نہ کر دے..

خپلو پہنچے اور پی ٹی ڈی سی کے نئے موٹل میں داخل ہوئے.. تو ششدر رہ گئے.. سناٹے میں آ گئے..

خپلو جہاں کچھ عرصہ پہلے تک باہر سے آنے والوں کے لیے ایک دو کمروں کا پرانا ریسٹ ہاؤس تھا، اوپر بازار میں بوسیدہ اور حشرات الارض سے رینگتے چند گندے کمبل اور کچے فرشوں کے ایک دو ہوٹل تھے، وہاں اُسی خپلو میں ایک تاج محل تھا.. جدید فن تعمیر مگر مقامی روایت سے جڑا ہوا ایک ایسا عجوبہ تھا کہ ہم ششدر رہ گئے..

لیکن انعام صاحب.. جو اس موٹل کے مینجر تھے اور میرے قدیمی دوستوں میں سے تھے اور میں انہیں ان کی سادگی اور ہمدرد خصلت کی وجہ سے قدرت کا انعام کہا کرتا تھا.. وہ وہاں نہیں تھے.. مجھے ہشام میں ہی اطلاع مل گئی تھی کہ انعام کے بال بچے گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے لیے ان کے پاس خپلو آئے تھے.. وہ اسلام آباد واپس جانے کے لیے سکردو سے ایک نئی اور قابل اعتماد ایئر کنڈیشنڈ بس میں سوار ہوئے اور مانسہرہ کے قریب اس بس کا ڈرائیور اونگھ گیا.. حادثے میں انعام کی اہلیہ ہلاک ہو گئیں اور بیٹے شدید زخمی ہو گئے.. انعام اپنی اہلیہ کو دفن کرنے کے لیے اور ہسپتال میں پڑے اپنے بیٹوں کی دیکھ بھال کے لیے وطن جا چکے تھے.. خپلو میں نہیں

تھے.. ہشام سے یہاں خپلو تک میں سوچتا رہا تھا کہ انعام ایسے نفیس شخص کو یہ کیا انعام ملا.. لیکن اس کی رضا کے آگے سر جھکانے کے علاوہ کیا کیا جا سکتا ہے..

انعام کے اسسٹنٹ ارشاد موٹل کے معاملات کی نگہبانی کر رہے تھے..

ریسیپشن ہال میں خپلو میں تعینات ایک کرنل صاحب کے شہری بچے.. غالباً اسلام آبادی بچے بوریت کے شدید عالم میں.. بیزاری کی ایک لاجواب کیفیت میں.. کہ ایک شہری بچے کو اگر زبردستی پدرانہ شفقت کے زور پر خپلو ایسی دور افتادہ وادی میں امپورٹ کر لیا جائے تو اس کا یہی حال ہوگا.. یہ بچے صوفوں پر نیم دراز ریموٹ ہاتھ میں لیے ٹیلی ویژن کے چینلز بدلتے تھے اور والد صاحب کو ناراض نظروں سے دیکھتے تھے.. کرنل صاحب ہمیں دیکھ کر نہایت خوش ہوئے، بے شک کرنل تھے لیکن بچے تھے اور باہر کی دنیا سے آنے والوں سے مل کر خوش ہوئے..

موٹل دریائے شیوک کے کناروں پر ایک شالیمار کی مانند تختہ بہ تختہ اٹھتا تھا اور سب سے اوپر والے تختے پر ہمارے کمرے تھے.. ہم ان شاندار کمروں کی بلند چھتوں اور لکڑی کے بھاری شہتیروں اور آہنی گرفت والی چھتوں کے نئے نویلے کنوار پن کی مہک والے کمروں میں داخل ہوئے تو سکردو روڈ کے خوف اور سکردو شہر کے ایک چھت سے انکار اور پھر وہاں سے رات کی سیاہی میں جو ایک طویل تھکاوٹ کا سفر تھا، اسے بھول بھال گئے..

جیسے کے ٹو کی چوٹی پر پہنچ جانے والا کوہ پیما... برس ہا برس کی ٹریننگ کی مشقت.. اپنے ملک سے اسلام آباد، پھر سکردو.. پھر اشکولے.. پائیو.. اردوکس، گورے، کنکورڈیا.. بیس کیمپ سے اوپر جو برفانی موتیں ہیں اور بلندی پر جو سانس اکھڑتا ہے اور کبھی اپاہج کر دیتا ہے اور کبھی کسی دراڑ میں دھکیل دیتا ہے اور اس کا نام "گلکی میموریل" کی چٹان پر کسی سلور کی تھالی پر کھود کر اس کا کتبہ لگا دیا جاتا ہے تو وہ اگر کے ٹو کے چوٹی پر پہنچ جاتا ہے تو یہ سب کچھ بھول بھال جاتا ہے..

ایسے ہم بھی بھول بھال گئے..

جیسے برفوں میں منجمد کسی پرندے کو آگ کے سامنے رکھنے سے اس میں جان پڑنی شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے ہم بھی زندہ ہونے لگے اور چہکنے لگے..

"یہاں تو جشن ہونا چاہیے تارڑ صاحب" حسن صاحب شرماتے ہوئے بولے کہ وہ برمانی کے ہمراہ میرے ہم کمرہ تھے..

"حسن جی.. ہم آج سویرے گلگت سے چلے تھے.. یقین تو نہیں آتا کہ گلگت سے چلے

تھے.. تقریباً پندرہ گھنٹے ہو گئے ہیں مسلسل سفر کرتے.. تو آپ تھکے نہیں.. سونہ جائیں؟''

''سر جی.. سو گئے تو گئے.. ذرا تھکاوٹ اتارتے ہیں.. کچن سے روسٹ چکن اور چپس منگواتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ میرا معدہ کمزور ہے.. میں مقامی پانی نہیں پی سکتا تو لاہور سے لایا ہوا منرل واٹر پیتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں..''

''تارڑ صاحب اس بلوچ کی بھی کوئی گزارش سُن لیں۔'' برمانی جیسے ایک ریچھ کی مانند اپنی سرمائی نیند سے بیدار ہوا.. حسب عادت سرگوشیوں میں گویا ہوا۔ ''مشورہ نہیں.. محض گزارش ہے.. یہ جو ہوشے ہے اور گندوگورو وغیرہ ہے سائیں تو اس کو فراموش کر دیں.. ہمیں اسی موٹل میں چند روز قیام کرتے ہیں.. اس کے شالیمار تختوں میں آپ کے پسندیدہ زرد پھول کھلے ہیں اور سائیں سرد ہوا میں جھومتے جاتے ہیں.. اور ذرا کمرے کی بالکونی میں جا کر دریائے شیوک کے نظارے دیکھئے اور اس کے پار پہاڑوں کی برفوں میں دھیرے دھیرے حرکت کرتے بادل دیکھئے.. ہمیں اور کیا چاہیے..''

''برمانی۔ تمہیں رات کے اس پہر.. بلکہ آدھی رات کے سے دریا پار برفوں میں دھیرے دھیرے حرکت کرتے بادل کیسے نظر آ گئے..''

''سائیں میں پہلی بار آپ کی ٹیم میں شامل ہوا ہوں.. اور میں نے نوٹ کیا ہے کہ آپ وہ کچھ بھی دیکھتے ہیں جو ہوتا نہیں.. تو سائیں آپ کا شاگرد ہوں، مجھے بھی اس بالکونی کے پار وہ کچھ نظر آ رہا ہے جو پتہ نہیں ہے کہ نہیں.. ہم بلوچ یوں بھی ویرانوں اور صحراؤں کے باسی ہونے کے ناطے سے بادلوں اور برفوں کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔''

''برمانی میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں.... کسی بھی مقام پر پہنچ کر ہم وہی کچھ دیکھتے ہیں جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ وہاں ہے یا نہیں، اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ہم خود غرض لوگ ہوتے ہیں.. ساری آبشاریں، فیری میڈو، جھیلیں، جھرنے اور بلندیاں ہمارے اندر ہوتے ہیں.. ہم گھر سے نکل کر اگر بے گھر ہوتے ہیں تو محض ان کے فوٹوسٹیٹ تلاش کرنے کے لیے..''

''بھگت کبیر کے دوہے بھی یہی کہتے ہیں اور میرا بائی کے بھجن بھی یہی سرگوشی کرتے ہیں کہ جو کچھ ہے، وہ تمہارے اندر ہے..''

''یہ بھگت کبیر اور میرا بائی خپلو میں کہاں سے آ گئے برمانی..''

''یہ تو ہمیشہ سے یہاں ہیں سائیں.. مرشد آپ نے خود ہی تو ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ

ایک آوارہ گرد یہ جان جاتا ہے.. اس کو اس بات کا عرفان ہو جاتا ہے کہ اس کا سچ ہی آخری سچ نہیں ہے.. اس کا عقیدہ اور تاریخ ہی واحد سچائی نہیں.. اور بھی سچ ہیں.. تو بھگت کبیر اور میرا بائی بھی سچ ہیں اور خپلو میں ہیں..'' برمانی اپنی سیاہ آنکھوں کے ساتھ ہنسنے لگا اور اس کی ہنسی میں ایک ہتھیار رکھوا لینے والی معصومیت تھی..

ایک اور معصومیت حسن کے چہرے پر تھی...

اگرچہ ہمارے وحشی، بے مہار جذبے تبھی تسکین پاتے تھے جب ہم راستوں اور آبادیوں کو چھوڑ کر پہاڑوں کے اندر اپنے قدموں پر سفر کرتے تھے لیکن.. وہاں تک پہنچنے میں جو منزلیں آتی تھیں.. بشام، گلگت اور آج خپلو ان میں بسر کی ہوئی شامیں بھی ایک انتخاب تھیں.. ایسی شامیں بھی نصیب والوں کے نصیب میں ہوتی ہیں۔ خپلو کی رات میں کمرے کی بالکونی کے پار... ایک چپ تاریک بہاؤ میں گم شیوک کے پار.. اگر برمانی کو برفپوش بلندیاں کے گرد بادل نظر آ رہے تھے تو یہ اس کا استحقاق تھا کہ وہ.. وہ کچھ دیکھ سکتا تھا جو وہاں نہ تھا..

اور میں.. وہاں وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا جو.. وہاں تھا..

ہاں یہ ہوا کہ دریائے شیوک کے بہاؤ کی آواز رات گزرنے سے بلند ہوتی گئی..

ہمارے کمرے پر دستک دینے لگی..

کہ اب تو سو جاؤ..

ہم شیوک کو کیسے انکار کرتے..

ہم سو گئے۔

''وہ ڈاکخانہ جہاں سے میرے لیے ایک خط پوسٹ ہوا تھا''

سلمان نے خپلو کے بازار سے ہوشے جانے کے لیے ایک جیپ ہائر کر لی تھی..

لیکن ہوشے تک کے لیے نہیں، کاندے کے گاؤں تک..اس لیے کہ اس سے آگے کاندے نالے کا پُل سیلاب سے بہہ چکا تھا..ہوشے تک براہ راست جیپ نہیں جا سکتی تھی..اور شنید تھی کہ اس نالے کے اوپر مقامی لوگوں نے چند شہتیر رکھ دیے ہیں جنہیں پار کرنے پر دوسرے کنارے پر ہوشے کے لیے جیپیں میسر ہو سکتی تھیں..

ہم آج چقچن مسجد کی زیارت کر چکے تھے..

اس بلتستان کی سب سے قدیم تقریباً چھ سو برس پرانی چٹانوں پر ایک گھونسلے کی مانند براجمان مسجد میں گیان دھیان کے لیے ایک ایسی کوٹھڑی تھی جس میں کئی برس پیشتر میں نے دنیا کو ترک کر دینے کی آرزو کی تھی..محض رومانوی ہو کر کہ ہم دنیادار لوگوں کی آرزو میں بھی کھوٹ ہوتا ہے۔

ہمیں کاندے سے جانے والی جیپ سے دو بجے موٹل کے صحن میں پہنچنا تھا..ابھی کچھ وقت تھا..

اتنا وقت تھا کہ میں اوپر خپلو کے بازار میں چند لمحے گزار سکتا..

خپلو کی طرح خپلو کا بازار بھی بدل چکا تھا..

میرے ذہن میں جو تصویر تھی، اس میں ایک بلند کوہستانی بستی کی ڈھلوان پر چند کچی پکی دکانیں تھیں اور ان پر بادل اترے ہوئے تھے..وہاں کے باسی ایک اجنبی کو دیکھ کر ٹھہر جاتے تھے..ہوا بے حد سرد تھی..چونکہ اوپر بازار تک کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی اس لیے بہت کم لوگ اوپر

جاتے۔کبھی کوئی جیپ نیچے شیوک کے کناروں سے اوپر آ جاتی....بلکہ ایک بڑا نالہ جو شیوک میں گرتا تھا، رات کے وقت جب تیز ہو جاتا تو اس کے پانی سڑک پر اتنی تندی سے بہتے کہ ریسٹ ہاؤس اور اوپر خپلو کے بازار کے درمیان رابطہ منقطع ہو جاتا..

خپلو کا وہ بازار پرانے قصے کہانیوں میں گمشدہ ایک خواب سا بازار تھا..اور یہ بازار جس میں میں آ نکلا تھا..اسے میں قطعی طور پر نہیں پہچانتا تھا..کوئی ایک دکان کوئی ایک عمارت ایسی نہ تھی جو شناسا لگتی ہو..یہاں تک کہ جو پس منظر میرے ذہن میں تھا، وہاں اس سے الگ ہی کوئی منظر تھا..دکانوں کی لمبی قطاریں تھیں۔جیپیں دندناتی پھرتی تھیں..بے شمار لوگ تھے..یہاں تک کہ ٹریفک پولیس بھی تھی..

مجھے صرف اپنے ڈاکخانے کی فکر تھی..

یہ ڈاکخانہ میں نے بہت دنوں سے اپنے اندر کھول رکھا تھا..جوانی میں انسان اداسی اور رومان کی ایک غیر حقیقی فضا میں تنہا ہونا چاہتا ہے۔یونہی اپنے آپ پر ترس کھانے کے لیے کہ کوئی مجھ سے پیار نہیں کرتا۔سب لوگ میرے خلاف ہیں اور کڑھتا رہتا ہے..عمر ڈھلتی ہے تو وہ بہت سے احساسات اور رشتوں سے الگ ہوتا جاتا ہے..بیزار اور چڑچڑا ہو جاتا ہے اور یوں تنہا ہونا چاہتا ہے..اس دوسری قسم کی تنہائی کے لیے ایک ذاتی ڈاکخانہ بے حد کارآمد ثابت ہوتا ہے..آپ سب سے کٹ کر اس میں ایک پرانے بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں اور پوسٹ کارڈوں اور لفافوں پر مہریں لگانے لگتے ہیں..ان پوسٹ کارڈوں اور لفافوں میں آپ کی حسرتوں اور محبتوں کی تحریریں ہوتی ہیں..

اس لیے مجھے اپنے ڈاکخانے کی بہت فکر تھی۔

میں نے اس ڈاکخانے کو خپلو سے پہلی ملاقات کے دوران دریافت کیا تھا..شیوک سے بلند وادی کی ڈھلوان پر بازار کی جو چند کچی دکانیں تھیں، وہاں ایک نیچی چھت کی بوسیدہ شہتیروں والی ایک کوٹھڑی تھی جس کے باہر سرد ہوا میں ہاتھ سے لکھا ہوا ایک بورڈ جھولتا تھا جس پر ''ڈاکخانہ خپلو'' کی عبارت تھی۔اس کی چوکھٹ کے اندر جاتے ہوئے ذرا جھکنا پڑتا تھا اور اندر نیم تاریک سردی میں ایک ٹوٹا ہوا بنچ تھا ایک چھوٹا سا کاؤنٹر تھا..ایک سالخوردہ آہنی جنگلے کے عقب میں ایک بلتی بوڑھا نہایت دھیرج اور اطمینان سے چند پوسٹ کارڈوں پر مہریں لگا رہا تھا..وہ ایک پوسٹ کارڈ پر مہر لگاتا اور پھر اسے بہت غور سے دیکھ کر اطمینان کر لیتا کہ مہر پ

تاریخ اور ڈاکخانہ خپلو کے الفاظ واضح ہیں یا نہیں۔ اگر اس کی تسلی نہ ہوتی تو وہ ایک اور مہر نہایت احتیاط سے اس پر ثبت کر دیتا۔۔

اس پوسٹ ماسٹر کے چہرے پر جو اطمینان تھا۔۔وہ ایک ایسے شخص کا تھا جو زندگی سے بے حد مطمئن ہو۔۔

شائد وہ یہیں پیدا ہوا تھا۔۔یہیں رہتا تھا۔۔آج تک اس چوکھٹ سے باہر نہیں گیا۔ ایسا لگتا تھا۔۔

"دن میں کتنے خط آتے ہیں؟"

"صاحب کبھی کبھار تو بیس پچیس آ جاتے ہیں۔۔ایک دو منی آرڈر بھی آتے ہیں۔"

"آپ ٹکٹیں بھی فروخت کرتے ہیں؟"

"ہاں صاحب۔ لفافے۔ پوسٹ کارڈ اور رجسٹری کے لفافے بھی۔۔ڈاکخانہ ہے۔۔"

"کوئی ڈاکیہ بھی ہے؟"

"ہاں ناں۔۔میں خود ہی ڈاکیہ ہوں۔۔یہاں سے فارغ ہو کر ڈاک بانٹتا ہوں لیکن جانے سے پہلے ڈاکخانے کو تالہ ضرور لگاتا ہوں۔۔لوگ ہنستے ہیں کہ ایسا کیوں کرتے ہو بلتستان میں تو چوری چکاری کا رواج نہیں۔۔اس لیے تالے بھی کم فروخت ہوتے ہیں تو میں کہتا ہوں، تم نہیں سمجھ سکتے یہ گورنمنٹ کا مال ہے، اس کی حفاظت ضروری ہے۔"

اس کچی کوٹھڑی سے باہر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔۔اس لمحے چھن مسجد کی بلندیوں سے اُترنے والے بادل بازار میں سفید ہونے لگے اور ان کی ہلکی دھند ڈاکخانے میں دھیرے دھیرے داخل ہونے لگی۔۔کچے فرش پر پھیلنے لگی اور پوسٹ کارڈوں اور لفافوں پر درج پتوں کو گیلا کرنے لگی۔۔

یہ ڈاکخانہ میرے اندر رہ گیا۔ اسی حالت میں۔۔کچے فرش اور اس پر پھیلتی دھند اور تنہائی اور سکون کے ساتھ۔۔میرے اندر منتقل ہو گیا۔۔اور اگلے کتنے برس تک میں اس بختی بوڑھے کی جگہ بیٹھ کر مہریں لگاتا رہا۔۔اس لیے مجھے اپنے اس ڈاکخانے کی فکر تھی۔۔

"ادھر ڈاکخانہ کدھر ہے؟" میں نے ایک خپلوی کو روک کر پوچھا۔۔

"اُدھر اوپر ہے۔"

"لیکن وہ تو یہاں تھا۔۔اس بازار میں۔۔"

"وہ تو پرانا ڈاکخانہ ہوا کرتا تھا صاحب۔۔اب تو ترقی ہو گیا ہے سیاچن کی وجہ سے۔۔اس کی جگہ تو نیا مارکیٹ بن گیا ہے۔۔اور ورکشاپ بن گیا ہے۔۔اوپر نیا ڈاکخانہ بنا ہے۔۔بالکل سکردو کے موافق۔۔۔اس میں پی سی او بھی کھلا ہے۔۔بے شک امریکہ فون کرو۔۔آپ نے کہیں فون کرنا ہے؟"

"نہیں۔"

"ڈاک کا لفافہ وغیرہ بھی ادھر ملتا ہے لیکن اب خط کون لکھتا ہے صاحب۔۔یا فون کر لیتا ہے یا ادھر سائبر کیفے بھی ہے کمپیوٹر پر بات کر لیتا ہے۔۔ترقی ہو گیا ہے۔"

ہر شخص کی زندگی میں خپلو کے پرانے ڈاکخانے کے ماحول ایسا کوئی ایک گوشہ ہونا چاہیے جس میں وہ الگ ہو کر پوسٹ کارڈوں اور لفافوں پر مہریں لگا سکے۔۔ایک مہر میرے بدن پر یوں ثبت ہوئی جیسے گھوڑے کی پشت پر سرخ جلتے ہوئے لوہے کے ساتھ ملکیت کا نشان لگاتے ہیں اور گوشت کے جلنے کی بُو آتی ہے۔۔۔۔

”باقی رہ گئے چھ...واپسی“

ویگن راوی کے پرانے پل پر تھی..

سب سے پرانے تو نہیں کہ وہ پل مخدوش قرار دیا جا چکا تھا اور اس پر سے صرف تانگے اور ریڑھے گزر سکتے تھے..

اس پل کے پار تخت لاہور تھا..

ہم اس تخت لاہور سے بیس کیمپ تک جانے کے لیے نکلے تھے اور ہو کہاں آئے؟

کیا پتہ کہاں سے ہوئے..

شہر کا شور چنگھاڑتا تھا..

ہم سہمے ہوئے بیٹھے تھے..یقین نہ کر سکتے تھے کہ صرف دو ہفتے پیشتر اس شہر پُرشور کے باسی تھے اور یہیں سے نکلے تھے..

ایسے اذیت ناک شور میں ہم کیسے رہتے تھے..اور اب کیسے رہیں گے۔

ہم تخت لاہور سے نکل کر پہاڑوں کے تخت کی جانب گئے تھے اور ان کے چرنوں میں بیٹھے تھے کیونکہ بیس کیمپ پہاڑوں کے چرن ہی تو ہوتے ہیں..ہم نے ان کو مرشد مانا تھا، ان کی مریدی اختیار کی تھی..ان کی بیعت کی تھی..

تو کیا ہمیں نروان ملا..کوئی انعام ملا..

نہیں نروان کبھی نہیں ملتا..یہ تو ایک مسلسل عمل ہے..ہر برس چرنوں تک جانا پڑتا ہے..قدموں میں بیٹھنا پڑتا ہے..ہر برس نئی بیعت ہوتی ہے..بدھ بابا تو نصیب والے تھے کہ ایک بار برگد کے سائے میں ٹک کر بیٹھے رہے..تپسیا کی اور فارغ ہو گئے..

اور ہم تو پچھلے بیس برس سے لگاتار جانے کتنے برگدوں کے سائے میں بیٹھے تھے..گیان دھیان میں گم رہے..لیکن کچھ بھی نہ ملا..کے ٹو۔ پاک سرائے۔ نانگا پربت اور سنولیک ایسے عظیم برگدوں تلے دھونی رمائی..ایسے برگد جن کی شاخیں برف کی تھیں جن کے چرنوں میں جھیلیں سرد ہوتی تھیں اور جن کی شاخوں میں سرد ہوائیں شوکتی تھیں اور موت زندگی کی پہریدار تھی..کچھ بھی نہ ملا..

راوی روڈ کی ایک ورکشاپ کے قریب میاں صاحب اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”مجھے یہاں اُتار دیں..میرے ایک عزیز کی ورکشاپ ہے..یہاں سے میں اپنے بیٹے کو فون کروں گا، وہ مجھے لینے آ جائے گا..پتہ نہیں بیگم کی طبیعت کیسی ہے..شوگر لیول کا کیا حال ہے۔“

میاں صاحب اپنا رک سیک گھسیٹتے۔ گلگت کی شاپنگ کا چینی ٹیلی ویژن اٹھاتے..کچھ کیتلیاں اور برتن سنبھالتے اُتر گئے..

باقی رہ گئے چھ!

لاہور کی گھنی ٹریفک میں ایک ویگن پہاڑوں سے واپس آئی ہے اور اس میں ابھی کچھ موسم ٹھہرے ہوئے ہیں..اور چھ کوہ نورد پہلو بدلتے ہیں..گرمی ناقابل برداشت ہے..

"مچلو میں دل مچلو مچلو.. چھیڑ خوبانیوں سے چلی جائے اسد.."

ہم بہ قائمیٔ ہوشے حواس..

نہیں..

ہم بہ قائمیٔ ہوش و حواس.. ہوشے کو جاتے تھے..

خپلو سے.. خپلو کے تاج محل ہوٹل سے ایک کھٹارا جیپ میں بمشکل سوار.. بلکہ میں اور حسن تو بہ آسانی سوار کہ ہم دونوں اگلی نشست پر قابض تھے اور بقیہ ممبران پچھلے حصے میں کوہ نوردی کے سامان اور رک سیکوں میں پھنسے ہوئے.. پیک ہوئے بمشکل سوار.. ہوشے کو جاتے تھے..

دریائے شیوک کے کنارے کنارے..

اس کے رواں پانیوں کی خاموشی دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ یہ ازل سے یونہی بہتے آئے ہیں.. اور یونہی بہتے چلے جائیں گے..

وادیٔ خپلو کے دامن میں بہتے اس دریا میں ایک عجب لاپرواشاہانہ بہاؤ ہے..

یہ اس ندیا کی مانند ہے جس سے مخاطب ہو کر کہا جاتا ہے کہ.. میرے سیاں جی اُتریں گے پار ندیا دھیرے بہو.. یہ دھیرے بہتا ہے۔ آپ اس کی بہاؤ کو تا دیر دیکھئے تو یہ آپ کو اپنے ساتھ بہا کر نہیں لے جاتا بلکہ آپ کے موڈ کے مطابق اپنا بہاؤ دھیما یا تیز کر لیتا ہے..

شیوک، سندھ کی مانند نہ تو آپ کو ڈراتا ہے اور نہ ہی ایک عظیم تہذیب کے دھارے کے طور پر پُر تکبر ہوتا ہے.. بس بہتا چلا جاتا ہے..

مجھے راستہ یاد آ رہا تھا.. کیونکہ میں خپلو سے ہوشے جا چکا تھا۔ اس لیے مجھے راستہ یاد آ رہا تھا کہ اب اس مختصر آبی جزیرے اور جھاڑیوں کے دوسری جانب شیوک کے پار جانے والے

مسافروں کے لیے ایک ایسی کشتی ہوگی جو ہزاروں برس پیشتر ایجاد ہوئی تھی.. ذوو کی کھال کو.. ایک مشکیزے کی طرح.. اُس میں تو پانی بھرتے ہیں لیکن اس میں اپنے پھیپھڑوں پر زور لگا کر منہ سے ہوا بھر کر پھلا کر.. متعدد کھالوں میں ہوا بھر کر ان کھالوں کو باندھ کر ایک کشتی تیار کی جاتی ہے جس کے ڈوبنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا.. جسے "انڈس رافٹ" کہا جاتا ہے، ایک ایسی کشتی ہوگی..

پچھلی بار میں نے اس کے ملاح سے باتیں کی تھیں جو مسافروں کا انتظار کرتا تھا.. لیکن جب ہم اس مختصر آبی جزیرے اور جھاڑیوں کے دوسری جانب گئے تو وہاں جہاں میں نے دس برس پیشتر انڈس رافٹ کو تیرتے دیکھا تھا، وہاں کچھ بھی نہ تھا.. کیا اب لوگ شیوک کے پار نہیں جاتے؟

"حسین.." میں جیپ ڈرائیور سے مخاطب ہوا جو ایک بلتی چھوکرا تھا.. وہ چپ رہا..

"حسین.." میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر ذرا بلند آواز سے کہا..

"صاحب... میں حسین نہیں ہوں، یوسف ہوں.. حسین میرا ابھرا ہے اور وہ پیچھے بیٹھا ہے۔"

"سوری.. ہمیں سب بلتی ایک جیسے لگتے ہیں.. تو یوسف یہاں ہمیشہ مشکیزوں والی ایک کشتی ہوا کرتی تھی، شیوک کے پار جانے کے لیے.."

"ہاں صاحب ہمارے بچپن میں ہوتی تھی.. پھر ترقی ہو گیا۔ سیاچین کا ٹریک شروع ہو گیا تو اب ادھر پار جانے کے لیے پل بن گیا ہے تو اس کا ضرورت نہیں ہے.."

"تو وہ ملاح اب کیا کرتے ہیں جو مشکیزوں کی کشتیاں کھے کر روزی کماتے تھے، ہزاروں برسوں سے کماتے تھے.."

"کیا پتہ صاحب.. اوپر بازار میں مزدوری کرتا ہوگا.. یا مر کھپ گیا ہوگا.."

وادیٔ خپلو کی مشکیزوں کی اس کشتی کا تذکرہ قدیم ترین سفرناموں میں بھی ملتا ہے.. یہ ہزاروں برسوں تک جب سے شیوک تھا، تب سے یہ اس کے پانیوں پر راج کرتی چلی آتی تھی.. لداخ سے آنے والے بدھ بھکشو بھی اس پر سوار ہو کر پار اترتے ہوں گے.. شاہ ہمدان نے بھی اسی پر سفر کیا ہوگا.. پار اترے ہوں گے.. یہاں تک کہ میں نے بھی دس برس پیشتر اس کے ملاح سے گفتگو کی تھی اور اب وہ کشتی وہاں نہیں تھی.. ایک قصۂ پارینہ ہو گئی تھی کیونکہ.. ترقی ہو گئی تھی.. سیاچن کی جنگ کی وجہ سے..

اور تقریباً وہیں جہاں اس "انڈس رافٹ" کا گھاٹ ہوا کرتا تھا وہاں پر ایک شاندار پل تعمیر ہو چکا تھا اور ہم اس کے پار چلے گئے۔

پار تو چلے گئے لیکن ایک ڈاکخانہ اور ایک مشکیزوں والی کشتی پیچھے رہ گئی..

شیوک کے پار ہوئے، سانگ کے گاؤں میں سے گزرے تو ہمیں کاندے کے نالے کا جو پل سیلاب میں بہہ گیا تھا، اُس کی چتا شروع ہو گئی.. کیا ہم نالے پر ایستادہ چند شہتیروں کے پل پر سے گزر جائیں گے، اگر گزر جائیں گے اور پار جائیں گے تو کیا وہاں سے ہمیں ہوشے کے لیے جیپ مل جائے گی..

اس لمحے مشابرم کی برف پوش نے ایک جھلک دکھا دی اور ہم اس کے دیدار میں محو ہو گئے کہ ہم نے اس چوٹی کے بیس کیمپ تک جانا تھا.. اور پھر فوراً ہی خیال آیا کہ نہیں جانا.. ہم نے تو سکردو میں اپنا پروگرام تبدیل کر دیا تھا اور اب ہم گندوگورو کی چوٹی پر بقول شاہد پاکستان اور اسلام کو سر بلند کرنے کے لیے اُسے فتح کرنے کو جاتے تھے..

سانگ کے بعد ایک ویرانہ آیا.. کچھ چڑھائی آئی اور پھر مچلو نظر آنے لگا..

مچلو ایک عجیب وادی تھی.. پچھلے پہر کی دھوپ میں اُٹھتی.. جرمنی کے عظیم گوتھک فن تعمیر کے کلیساؤں کی مانند.. زرد دھوپ میں اٹھتی چٹانوں کے دامن میں.. شیوک سے بلندی پر ایک ہرا بھرا.. گندم سے بھرا ایک عجیب گاؤں تھا۔ جس کی خانقاہ کا تنگ مینار اور اُس پر اٹکا ایک ستارہ دنیا کی بلند ترین چٹانوں کے پس منظر کے ساتھ ڈھلتی دھوپ کی زرد نگاہوں میں آیا ہوا ایک ایسی خوابناک تصویر تھا جو عہد موجود میں نہ تھی.. تبت اور لداخ کے گئے زمانوں میں تھی..

اسے زیادہ دیر تک دیکھنا ممکن نہ تھا..

یہ خانقاہ بھی ترقی کا شکار ہو چکی تھی.. اسی مقام پر ایک سینکڑوں برس پرانی خانقاہ کی عمارت تھی جسے ڈھا کر موجودہ خانقاہ کو نئی بنیادوں سے اٹھایا گیا لیکن کرم یہ کیا گیا کہ اس کا طرز تعمیر جوں کا توں رکھا گیا.. اس کے باوجود مجھے اس کا نیا پن کھلتا تھا..

''یوسف..''

''میں حسین ہوں سر.. یوسف پیچھے چلا گیا ہے آرام کرنے کے لیے..''

''تو حسین.. تم ظاہر ہے تمام بلتیوں کی مانند شیعہ ہو..''

''نہیں جناب۔'' اس نے احتجاج کیا۔ ''میں نوربخشی ہوں۔''

''کچھ فرق ہوتا ہے؟''

''بہت فرق ہوتا ہے سر..''

''مثلاً۔''

''مثلاً یہ کہ سر ہم سفر میں بھی روزے رکھتے ہیں.. نمازیں ملا ملا کر نہیں پڑھتے، الگ الگ پڑھتے ہیں۔ اور ہم عبادت بہت کرتے ہیں.. درویش لوگ ہوتے ہیں سر..''

''تو کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ آپ لوگ مچلو کی خانقاہ کو جوں کا توں رہنے دیتے۔ ایک تاریخی یادگار کے طور پر اور نئی خانقاہ کسی اور مقام پر تعمیر کر لیتے..''

''نہیں صاحب.. ہمارا مذہبی لوگ.. ملا لوگ کہتا ہے کہ خانقاہ کا مقام نہیں بدل سکتا..''

مچلو کے بارے میں میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اسے دیکھ کر دل مچل مچل جاتا ہے، اس لیے اس وادی کو مچلو کہا جاتا ہے.. کیونکہ مچلنے کے عمل میں ایک شور ہے۔ ایک اتھل پتھل ہے جب کہ اس وادی کو دیکھ کر انسان شانت ہو جاتا ہے..

ایک پہاڑوں کے زینے سے اُترتا تہہ در تہہ گاؤں.. سنہری کھیت۔ خوبانیوں کے باغ.. خوبصورت لوگ.. بھولے لوگ۔ نہایت قدیم تبتی بابے جیسے وادی شگر میں بھی ملتے ہیں اور اسکولے میں بھی.. کچھ بجھی ہوئی دیوانی روحیں.. خوبرو لڑکیاں جن کے رخسار خوبانیوں سے بنے ہوئے تھے اور جن کی آنکھوں میں نیلے شیوک بہتے تھے.. گڑیوں ایسے کھلونے بچے..

ایک میری عمر کے باباجی اپنی کمر پر گندم کا تقریباً آدھا کھیت اٹھائے.. جھکے ہوئے مگر پھر بھی ہمیں دیکھ کر مسکرانے سے باز نہ آئے.. مشقت میں نچتے ہونے کے باوجود ایک مسکراہٹ اور ایک سلام عطا کر کے گزرے.. خوش باش اور اپنے حال میں مست سادہ اور پیارے پیارے لوگ.. شمال میں کئی وادیاں ایسی ہیں جن کے باشندوں کے چہروں پر جو خوشی اور مسرت مسلسل چھلکتی ہے، ہم تہذیب یافتہ روحوں کو اس کی سمجھ نہیں آتی.. ایک انسان کے پاس ٹیوٹا یا ہونڈا نہیں ہے.. ڈیفنس یا گلبرگ میں گھر نہیں ہے۔ گھر میں اسپیشن کتا نہیں ہے تو وہ انسان کیسے خوش رہ سکتا ہے.. کمر پر گندم کا آدھا کھیت اٹھائے چلتا ہے.. رات کے کھانے میں شاید اسے چند خوبانیاں اور ایک روٹی ملے.. ایک کچی سرد کوٹھڑی میں ملے۔ پھر بھی وہ خوش ہو تو یقیناً فاتر العقل ہوگا.. مجھے وادی کالاش کے کافروں کی بے مہار خوشی بھی سمجھ میں نہ آئی تھی..

اور مجھے وادی مچلو کے مسلمانوں کی بے پایاں مسرت بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی.. ہونڈا، ڈیفنس اور اسپیشن کے مالکوں کے چہروں پر بھی ایسی خوشی نہ ہوتی تھی۔ ایک منظم اور قبض شدہ خوشی ہوتی تھی..

مچلو کے ساتھ یہ بے حد زیادتی تھی کہ ہم اس میں سے سرسری گزرتے جاتے تھے اور ایک نسبتاً خشک اور بے روح گاؤں ہوشے کی جانب صرف اس لیے جا رہے تھے کہ وہ مشابرم کے دامن میں تھا۔ گندوگورو کے راستے میں تھا..

بس یہی وہ کھیل ہے جسے نصیب کہا جاتا ہے..

ایک سوہنے لوگوں کے ماتھوں پر بھاگ نہیں ہوتے اور کرموں والیاں چناب میں ڈوب جاتی ہیں اور جو شکل والی نہیں ہوتیں، وہ پار اتر جاتی ہیں.. یہی وہ کھیل ہے جسے نصیب کہا جاتا ہے۔

اگر آپ نانگا پربت کے روپل چہرے کے راستے میں ترشنگ کا گاؤں ہیں۔ فیری میڈو کے چہرے کے آغاز میں تاتو ایسی خشک اور واہیات بستی ہیں تو ہر کوئی آپ کو جانتا ہے۔ کے ٹو کی پہلی منزل ہیں تو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ مشابرم کے سائے میں ہیں تو ہوش ربا ہوشے ہیں.. راکاپوشی کے راستے میں میناپن ہیں تو آپ کی دھوم ہے..

لیکن.. اگر آپ پر کسی بلند اور مشہور چوٹی کا سایہ نہیں تو بے شک آپ مچلو ہی کیوں نہ ہوں، تلس، کیرس، یا خپلو بھی ہوں تو آپ کو کوئی نہیں جانتا.. لوگ آپ میں سے سرسری گزر جاتے ہیں۔

ہم بھی اگرچہ سرسری گزرنے کے لیے گزرنے کو تھے لیکن ہمیں مجبوراً مچلو میں رکنا پڑا کیونکہ مخالف سمت سے آنے والی ایک جیپ کی کلچ پلیٹیں مچلو میں سے گزرنے والی کچی جیپ روڈ کے درمیان میں آکر جواب دے گئیں اور وہ جیپ ہمارے سامنے ایک بے بس مردہ حالت میں تھمی کھڑی تھی اور ہمارا راستہ بلاک کیے ہوئے کھڑی تھی.. چنانچہ ہمیں بھی مجبوراً رکنا پڑا..

یہ ہمارا ڈرائیور حسین تھا.. یا شاید اس کا بھائی یوسف تھا جو خپلو کے بازار میں جیپوں کا شہرۂ آفاق مکینک تھا، فوری طور پر اپنی جیپ سے اترا اور خراب شدہ جیپ کے نیچے سرک کر اس کے پیٹ کا تفصیلی معائنہ کرنے لگا..

ہم کیا کرتے.. جیپ سے اتر کر ادھر ادھر بکھر گئے..

مچلو کے کھیتوں میں کام کرتے کسان.. چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں اور خواتین ہمارے اردگرد ہو گئے اور ہمیں اپنی مسکراہٹوں اور مسرتوں سے جگمگانے لگے.. یہ سب کے سب.. جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں یونہی بے وجہ خوش تھے، چہرے گلنار کیے خوش تھے.. میں نے

ایک نہایت غیر جانب دار تجزیہ نگار کی حیثیت سے درجنوں چہروں کا بغور مطالعہ کیا اور ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس کا منہ لٹکا ہوا ہو.. ہماری طرح اس کی بوتھی بنی ہوئی ہو..

ایک دوشیزہ کمر پر شہتوت کی ٹہنیوں سے بنی ہوئی مخروطی ٹوکری بوجھ کیے.. جھکی ہوئی کہ ٹوکری تازہ کچی پکی خوبانیوں سے لبریز تھی، حیرت بھری اور بچوں کی معصومیت ایسی کھلی کھلی آنکھوں کے ساتھ ہماری جیپ کے قریب ذرا رکی تو حسین صاحب خواہ مخواہ شرمانے لگے..

"تارڑ صاحب میں کچھ خوبانیاں خرید لوں.. یہ لوگ مائنڈ تو نہیں کریں گے؟"

"یہ لوگ تو مائنڈ نہیں کریں گے کہ ہماری طرح بنیاد پرست نہیں ہیں اور ان کے دلوں میں بھی ہماری طرح کھوٹ نہیں ہے لیکن آپ کی بیگم نہ مائنڈ کر جائیں.."

"نہیں جی.. میں تو صرف خوبانیاں خریدنا چاہتا ہوں۔"

"پلیز گو اہیڈ.. بلکہ میں آپ کی تصویر اتارتا ہوں تاکہ سند رہے اور بھابھی کو بدگمان کیا جا سکے.."

اب صورت حال کچھ یوں ہوئی کہ حسن صاحب شرماتے ہوئے اس دوشیزہ کی جانب بڑھے.. ادھر دوشیزہ نے بھی جواباً شرمانا شروع کر دیا۔ مبصرین کا خیال ہے کہ اس شرماہٹ کے مقابلے میں حسن صاحب کہیں آگے نکل گئے تھے..

"حسن صاحب.." میں کیمرے کے لینز میں دیکھتا دیکھتا تھک چکا تھا۔ "خدا کے لیے اب خوبانیاں خرید بھی لیجیے.."

حسن صاحب نے اشاروں میں اس دوشیزہ کو بتایا اور ایک دو خوبانیاں اٹھا کر اسے سمجھایا کہ میں یہ.. خریدنا چاہتا ہوں۔

دوشیزہ کی آنکھوں کی چیریاں حیرت اور بھولپن سے بڑی ہو گئیں.. وہ ایک اتنی معصوم روح تھی.. آلودگی اور بری نظروں سے یکسر ناواقف کہ وہ ڈرتی.. اپنے رخسار مزید سرخ کرتی.. مسکراتی ہوئی بھی سر کو جھکاتی کبھی حسن صاحب کو دیکھتی، ایک ناسمجھی کی کیفیت میں کھڑی رہی.. حسن نے اس کی جھکی کمر پر بوجھ ٹوکری میں سے خوبانیوں کی مٹھیاں بھر بھر کر اپنی پی کیپ کو بھرا اور پھر دس روپے کا ایک نوٹ قیمت کے طور پر اس کی جانب بڑھا دیا۔

وہ دوشیزہ اس نوٹ کو دیکھ کر ایسے خوفزدہ ہوئی جیسے وہ ایک زہریلا بچھو ہو جو اسے ڈس لے گا اور سہم کر پیچھے ہو گئی..

اور یاد رہے کہ مچلو کے بہت سے لوگ.. ہماری جیپ کے ارد گرد کھڑے ہوئے لوگ.. بچے.. بوڑھے اور جوان اور خواتین اس خوبانی تماشے کو دیکھ رہے تھے اور خوب انجائے کر رہے تھے..

دوشیزہ سہم کر پیچھے ہو رہی تھی..

ہم سب نے مشترکہ طور پر ایک باباجی سے درخواست کی.. یہ باباجی گندم کا ایک گٹھا اٹھائے اُدھر آئے تھے اور اب ایک پیڑ تلے سستا رہے تھے.. کہ بزرگوار اس بچی سے کہو کہ خوبانیوں کی قیمت وصول کرلے..

باباجی بھی باغی نکلے اور سر ہلاتے ہوئے.. نہیں نہیں.. کہنے لگے.. اور ان کی مسکراہٹ میں کوئی کمی نہ آئی۔

"یوسف.."

"جی میں حسین ہوں.. یوسف تو خراب شدہ جیپ کے نیچے ہے۔"

"تو حسین پلیز اس لڑکی سے کہو کہ ہم ان خوبانیوں کی قیمت ادا کرنا چاہتے ہیں۔"

"اِدھر رواج نہیں ہے سر.. آپ مہمان ہیں۔"

"نہیں یوسف.. میرا مطلب ہے حسین.. پلیز سفارش کرو۔"

حسین نے اس دوشیزہ اور مقامی لوگوں سے طویل مذاکرات کئے اور تب جا کر نہایت جھجکتے ہوئے دوشیزہ نے وہ دس روپے کا نوٹ قبول کیا.. اور یوں قبول کیا کہ اس کی مسکراہٹ رکتی نہ تھی اور اس کے پیغمبری معصومیت والے سپید چہرے پر خوبانیوں، چیریوں اور مشاہرم کی سفیدی یک جا ہوتی تھی.. چھیڑ خوبانیوں سے چلی جائے اسد.. شنید تھی کہ نیچے میدانوں سے لوگ آتے ہیں اور ایسے چیری چہروں اور خوبانی رخساروں کو بیاہ کر لے جاتے ہیں.. میرے بیٹے بھی اگر شادی بیاہ کے معاملے میں میرے بس میں ہوتے تو میں انہیں یہیں لے کر آتا..

ہماری جیپ کے پیچھے ایک اور جیپ آرکی..

اس جیپ کی پچھلی نشست پر دو نہایت بنے سنورے صاف ستھرے ڈینڈی نوجوان براجمان تھے.. سیاہ چشموں میں۔ نیلی جینوں اور شوخ ٹی شرٹوں اور مہنگے جوگرز میں.. انہوں نے ہم دیسی کوہ نوردوں سے راہ و رسم بڑھانے کو اپنے لیے مناسب نہ جانا.. اور وہ یقیناً اپنے سیاہ چشموں کے عقب سے ہم پر ایک چشمِ حقارت ڈالتے تھے.. وہ اپنی جیپ سے باہر آئے۔ آپس میں

انگریزی میں تبادلۂ خیال کرتے ہوئے اور ہمارے ڈرائیور سے نہایت رعب سے پوچھا کہ.. اوئے تم نے ہمارا راستہ کیوں روک رکھا ہے.. جیپ آگے کیوں نہیں لے جاتے.. یوسف جو ابھی ابھی خراب شدہ جیپ کے نیچے سے بے حد خراب شدہ حالت میں برآمد ہوا تھا، ان کی اونچی ہواؤں میں قیام کرنے کو بالکل خاطر میں نہ لایا اور نہایت بدتمیزی سے کہنے لگا۔ "سامنے کا جیپ کا کلچ پلیٹ فری ہو گیا ہے.. جب تک وہ نہیں چلے گا تو ہم کیسے چلے گا.. آپ کو جلدی ہے تو اپنا جیپ آگے لے جاؤ.."

ڈینڈی خوش لباس ستھرے نوجوان نے اپنی جیپ کے ڈرائیور کو حکم دیا کہ آگے لے جاؤ..

اُن کے ڈرائیور نے جواب میں جانے کیا کہا اور مقامی زبان میں کہا کہ وہ دونوں نوجوان ٹھنڈے ہو گئے..

یہ دونوں اپنے تئیں فیشن ماڈل نوجوان ہنزہ کے باشندے تھے اور گائیڈ تھے.. اور دیگر وادیوں.. نگر.. دیامیر.. ژوبل یا بلتستان کے باشندوں کو اُسی چشمِ حقارت سے دیکھتے تھے جو انہوں نے ہمارے لیے وقف کر رکھی تھی..

ان میں سے ایک نوجوان خاصا چھیلا اور نسوانی تھا.. اگر امریکہ میں ہوتا تو کسی "گے" تحریک کا بدنی کشش کا حامل ایک نمائندہ ہوتا.. وہ بولتا تو ایک آہ بھر کر عمدہ انگریزی بولتا۔

بالآخر خراب شدہ جیپ جس کے سٹارٹ ہونے کے امکان معدوم ہو گئے تھے، اسے دھکیل کر ایک کھیت میں اُتار دیا گیا.. راستہ صاف ہو گیا.. ہم نکلے اور مچلو سے نکلے..

سفر پھر شروع ہو گیا..

"وادیٔ تلس جو مچلو کی چھوٹی بہن تھی"

"مچلو... بہت ہرا بھرا اور زرخیز ہے۔" میں نے حسین سے یا یوسف سے کہا۔۔
"ہاں صاحب.. ادھر پانی بہت ہے ناں.. اوپر تلس اس سے زیادہ خوبصورت وادی ہے لیکن اُدھر پانی کم ہے... فصل کم ہے.. گندم کم ہے۔"
تلس آیا تو وہ بھی مچلو کی ایک مچلتی ہوئی بہن تھی۔
ویسے ہی سوہنے اور خوش وخرم باشندے.. وہی معصومیت اور وہی مسکراہٹ آمیز موسم.. گھروں کی کچی دیواروں پر دھرے گملے تھے.. گھی کے خالی ٹین تھے جن میں بنفشی پھول کھلتے تھے اور بالکونیوں میں مٹی ڈال کر وہاں پیلے پھولوں کی کیاریاں بہار دیتی تھیں..
بلتستان میں پھول ایک کمزوری ہیں.. بلتیوں کو جیسے بھوک لگتی ہے، پیاس محسوس ہوتی ہے، ایسے پھولوں کی بھی طلب ہوتی ہے۔ انہیں بلتی لوگوں کو.. اگر کسی خطرناک ڈھلوان کے دامن میں کوئی ایک خوش رنگ پھول نظر آ جائے تو وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس تک پہنچتے ہیں اور اسے اپنی ٹوپی میں سجا لیتے ہیں۔ غریب ترین کچے گھروں میں بھی ایک آدھ بوٹا ایسا ہوگا جس پر پھول لگتے ہیں.. صرف ادھر بلتستان میں ہی نہیں پورے پاکستانی شمال میں یہ دیوانگی عام ہے.. زوپل میں.. جھیل کروبر کے کناروں پر.. درکوت کے قصبے میں.. ہیسپر اور اسکولے میں.. ہر جگہ گملوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلتی ہے.. ہمارے کراچی، لاہور یا اسلام آباد کے گھروں میں.. نہایت مہنگے اور شاندار گھروں میں بھی آرٹی فشل فلاورز کے گلدان تو ہوں گے لیکن تازہ پھول صرف اسی صورت میں سجائے جاتے ہیں جب کوئی مہمان ان کو لے کر آ جائے..
یہ شائد تہذیب کا فرق ہے..

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر نقل بہ مطابق اصل ہے.. اور نقل بہت برس چلتی ہے نہ مرجھاتی ہے اور نہ اس کی شکل میں فرق پڑتا ہے تو پھر اصل کو اپنے گلدانوں میں سجانے سے فائدہ.. جو ایک دو روز میں مرجھا جاتی ہے اور اس کی مہک تمام ہو جاتی ہے.. ہم لوگ گھاٹے کا سودا کرنے والوں میں سے نہیں ہیں..
میں نے کچھ گھروں میں ہر صبح نقلی پھولوں پر اُن کی اصل کے مطابق جو آرٹی فشل مہک ہوتی ہے، اس کا چھڑکاؤ ہوتا دیکھا ہے..
بس یہی.. تہذیب کا فرق ہوتا ہے..
تلس کے بعد.. جہاں پانی کم تھا اور بقول حسین یہ وادی مچلو سے بھی زیادہ پُرکشش تھی، چڑھائی شروع ہو گئی.. دریا کے پار جواب ہوشے دریا کہلاتا تھا، ہوش ربا بلند چٹانوں کی ایک مسلسل دنیا تھی جو آسمان کی قربت میں تھی.. ان چٹانوں میں پوشیدہ وادیوں اور برفانی تودوں میں سے اُترنے والے نالے تھے جو دریا میں شامل ہو رہے تھے..
یکدم یہ لینڈ سکیپ آشنا ہو گئی.. اپنی ہو گئی.. دیکھی ہوئی ہو گئی..
دس برس پہلے قلب علی کی عنایت کردہ پجارو جیپ میں ہوشے کو جاتے ہوئے.. اپنے خاندان کے ہمراہ سفر کرتے ہوئے میں اسی لینڈ سکیپ میں سے گزرا تھا.. ادھر ڈھلوان کی گھاس پر بیٹھ کر میمونہ نے تصویر اُتروائی تھی.. سلجوق نے ایک پھول دریافت کیا تھا.. عینی نے ایک ٹیونا سینڈوچ کھایا تھا..
ویسے میرا سفر ابھی شروع نہیں ہوا تھا..
میں تو ہوشے تک جا چکا تھا.. جب اس کے آگے ایک قدم اٹھے گا تب میرا سفر شروع ہوگا..
سورج ڈھل رہا تھا.. دریا پار کی چٹانیں اپنے رنگ بدل رہی تھیں..
ہوا میں بلندی کی خنکی اور اُن جھاڑیوں کی مہک تھی جو ایک خاص بلندی کے بعد جنم لیتی ہیں..

"کاندے گاؤں.. جسے سیلاب بہالے گیا.ٹوٹا ہوا پل..."

اور پھر یکدم کاندے آ گیا..

ایک مختصر سا گاؤں.. چند گھر.. ایک ہوٹل کا سائن بورڈ اور جیپ کھڑی ہوگئی..

آگے پتھروں کی دنیا کا ایک انبار تھا اور اس میں کہیں وہ نالہ وہ دریا بہتا تھا جس پر کوئی شہتیر تھا.. شائد وہ شہتیر تھے جو پل تھے.. جن پر سے گزر کر پار جاتے تھے.. لیکن یہاں سے جہاں ہماری جیپ رُکی تھی، نہ کسی دریا کی آواز آتی تھی اور نہ کوئی شہتیری پل دکھائی دیتا تھا..

جیپ کھڑی ہوئی تو اہلِ کاندے ہمارے گرد ہجوم ہو گئے.. اتنے زیادہ ہو گئے کہ میرے ساتھی ان میں گم ہو گئے.. نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز.. کاندے کی آبادی.. وہ جتنی بھی تھی ہم پر یلغار کرتی تھی.. ہمیں ملاحظہ کرتی تھی اور قدرے حیران ہوتی تھی کہ یہ کالا لوگ ادھر کیسے آ گیا ہے.. ادھر تو گورا لوگ آتا تھا.. بھی لوگ تقریباً یک آواز ہو کر ہمیں طرح طرح کے مشورے دے رہے تھے، سوال کر رہے تھے.. دوائیاں مانگ رہے تھے یا پورٹر کے طور پر ساتھ چلنے کو کہہ رہے تھے.. رات گزارنے کے لیے دو عدد ہوٹلوں کی موجودگی کی اطلاع بھی فراہم کر دی گئی..

ڈینڈی ہمزہ برادران ہم سے پہلے پہنچ چکے تھے اور پتھروں کے انبار کے آگے جا کر نالے اور پل کا جائزہ لے کر واپس آ رہے تھے..

انہوں نے مجھ سے کچھ کلام نہ کیا لیکن میں نے آگے بڑھ کر ان سے کلام کیا۔ "یہ فرمائیے کہ آگے نالے پر جو پل ہے، اس پر سے گزرا جا سکتا ہے؟"

چکیلی کمر والے گائیڈ نے ذرا مزید چک کر نہایت غیر ملکی لہجے میں انگریزی میں جواب دیا۔ "پل تو نہیں ہے۔ دو شہتیر رکھے ہوئے ہیں نالے کے اوپر اور وہ اس بوچھاڑ سے گیلے اور

پھسلن والے ہو گئے ہیں.. نیچے نہ دیکھئے کہ کیا گزر رہا ہے اور نہ پھسلئے تو آپ بھی پار جا سکتے ہیں.. لیکن اگر گرتے ہیں تارڑ صاحب.. تو پھر بس گر جاتے ہیں.. نیچے پانی بہت تیز ہے۔"

اس نے "تارڑ صاحب" کہا تو میں چونکا۔ "آپ مجھے جانتے ہیں؟"

"جی.."

"لیکن آپ نے پہلے تو ہمیں لفٹ نہیں کروائی.. بہرحال آپ تجربہ کار ہیں۔ آپ کا کیا مشورہ ہے؟"

"مشکل تو نہیں.. لیکن پھسلتے ہیں تو جاتے ہیں.. ویسے نالے کے پار دو تین جیپیں کھڑی ہیں ہوشے جانے کے لیے.."

اس دوران اقبال آ گیا..

وہ ذرا دیر سے آیا تھا کیونکہ اقبال تھا.. ایک سکول ٹیچر تھا..

"تارڑ صاحب آپ نے آگے جا کر کیا کرنا ہے.. یہاں رات کریں۔ کل میں آپ کو دریا کے پار پانامہ اور ننگ ما کی وادیوں میں لے کر چلتا ہوں.. وہ جو نالہ دریا میں گرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اوپر.. دو دن کا سفر ہے اور اس سفر کے دوران آپ کے اوپر جو چٹانیں ہوں گی وہ اتنی قریب ہوں گی کہ آپس میں ملتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ پھر ایک چراگاہ آئے گی جو گندوگورو اور مشابرم کے بیس کیمپ سے ہزار گنا زیادہ خوبصورت ہے۔ چراگاہ کے اوپر ایک چوٹی ہے جہاں سے کے ٹو اور مشابرم دکھائی دیتی ہیں اور میں نے بقلم خود اس چوٹی کو اپنے نام پر "اقبال ٹاپ" کا نام دیا ہے.. چلیں گے؟"

"نہیں.. میں نے اس سے پیشتر مشابرم کو ترک کر کے گندوگورو کا ارادہ کیا ہے، اب میرے پروگرام میں مزید تبدیلی نہیں ہو سکتی.."

"تو پھر میرا یہ کارڈ رکھ لیجیے، اگر کبھی موڈ بنے تو میں آپ کو لے کر جاؤں گا۔"

کارڈ پر لکھا تھا "اقبال قادری۔ ماؤنٹین گائیڈ اور باورچی.. وائس چیئرمین یونین کونسل مچلو.. گاؤں کاندے۔ ڈاکخانہ تھاگس۔ تحصیل مشابرم۔ ضلع گھانچے۔ سکردو، بلتستان۔ پاکستان.."

"اور صاحب آپ نے اگر ہوشے سے گندوگورو جانا ہے تو آپ کو پورٹر درکار ہوں گے، وہ کہاں سے لیں گے؟"

"ہوشے سے.."

''ہوشے میں تو گندم اور جو کی کٹائی ہو رہی ہے۔ لوگ گھاس جمع کر رہے ہیں وہاں سے تو آپ کو ایک پورٹر بھی نہیں ملے گا.. یہاں کاندے سے لے کر جائیں.. یوں بھی ہوشے والے اچھے لوگ نہیں تنگ کرتے ہیں.. ہم اچھے لوگ ہیں بالکل تنگ نہیں کرتے..''

اقبال نے اتنا کہا اور ہمارے گرد جو ہجوم تھا، وہ اقبال کے اسی اتنا کہنے کا منتظر تھا کہ پورٹر یہاں کاندے سے لے کر جائیں.. جوانوں، بچوں، بوڑھوں نے مجھے زبردستی اپنے شناختی کارڈوں کی فوٹو سٹیٹ کاپیاں تھمانی شروع کر دیں.. شمال میں شناختی کارڈ کی کاپی ایک گارنٹی ہے کہ یہ شخص جینوئن ہے اور مقامی ہے..

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن یہاں سے پورٹر لے جاؤں تو کہیں ہوشے والے فساد نہ کر دیں کہ کاندے سے پورٹر کیوں لائے ہو.. یہاں سے کیوں نہیں لیے..''

شمال میں یہ تماشا بھی اکثر ہوتا رہتا ہے..

ناتجربہ کار کوہ پیما.. کنکورڈیا جانے کے لیے سکردو سے پورٹر لے لیتے ہیں تو راستے میں شگر والے دنگا کر دیتے ہیں کہ پورٹر ہمارے ہوں گے.. شگر سے پورٹر لیں تو اسکولے میں ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے..

''نہیں صاحب میں گارنٹی دیتا ہوں کہ ہوشے والے اعتراض نہیں کریں گے۔''

''تو پھر میں یہاں سے چار پورٹر لیتا ہوں.. اگر ہوشے میں پرابلم ہوا تو واپس کر دیں گے۔''

''پرابلم نہیں ہوگا.. یہ میرا چاچا ہے اسے ضرور لے کر جاؤ.. بہت اچھا چاچا ہے۔''

یہ چاچا بے دانت کا بوڑھا چاچا.. میں ساتھ لے گیا..

کاندے گاؤں میں ایک سو تیس گھرانے ہیں اور آبادی صرف آٹھ سو تیس افراد پر مشتمل ہے.. 1997ء اور پھر 2000ء میں ایک تباہ کن سیلاب نے تقریباً پورے گاؤں کو برباد کر دیا۔ نالے کا پل بہہ گیا اور لوگوں نے یہاں سے دور کینداس تھنگ میں ایک بستی آبادی کر لی.. وہی بستی جہاں پانی نہیں ہے.. پانی حاصل کرنے کے لیے گاؤں کی خواتین ایک گھنٹہ سفر کر کے نیچے دریا تک پہنچتی ہیں جس کا پانی بے حد گدلا ہے اور مختلف بیماریوں کا باعث بنتا ہے.. ٹورسٹ ان لوگوں کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھے لیکن اب وہ نئے گھر بنانے اور پانی کے حصول میں اتنے مصروف ہو گئے ہیں کہ سیاحوں کے ہمراہ پہاڑوں میں نہیں جا سکتے اور اسی لیے مقروض ہو چکے ہیں.. یہ

معلومات ایک اور سکول ٹیچر سخاوت حسین جہانگیر کی فراہم کردہ ہیں..

ہم نے اقبال کی معرفت اپنا سامان پل کے پار لے جانے کا ڈیل تین سو روپے میں کیا..

یہاں سے جہاں ہم نے حسین یا یوسف کی جیپ چھوڑی تھی یہاں سے کاندے کا نالہ دکھائی نہیں دے رہا تھا.. آگے پتھروں کی ایک دنیا تھی.. اور اس کے اندر سے ایک آبی شور ابھرتا تھا اور ہم آہستہ آہستہ چلتے اس کے قریب ہو رہے تھے.. سامان پار لے جانے والے پورٹر اُچھل اُچھل کر پتھروں کو ناپتے ہمارے آس پاس ٹڈوں کی طرح اُچھلتے جا رہے تھے..

اوپر کہیں بلند پہاڑوں سے کاندے کے سیلاب کے دوران جو ہزاروں بڑے بڑے پتھر آئے تھے، ہم ان میں راستہ بناتے نالے کے قریب ہوئے..

اور اس نالے پر وہ پل تھا..

اور کیا پل تھا..

دو شہتیروں والا ایک پاکھنڈی پل.. اور واقعی شہتیر پانی کی بوچھاڑ سے اتنے بھیگ چکے تھے کہ ان پر بوٹوں کا ٹھہرنا محال لگتا تھا.. اور شہتیروں کے نیچے جو نالہ تھا بلکہ پرنالہ تھا اس میں بھی پتھر لڑھکتے تھے اور اس میں جو گر گیا، وہ گیا.. نیچے دریائے شیوک میں یا دریائے ہوشے میں اور پتھروں کے پاٹوں میں پستا گیا۔ گیا ہی گیا..

میں نے فوری طور پر بہادری اور جرأت کے جو چند ذرے مجھ میں تھے، انھیں سات سلام کئے اور بنا سہارے اس پر قدم رکھنے سے انکار کر دیا..

ایک نوجوان پورٹر جوان دو شہتیروں پر سرکس کے بازی گروں کی طرح کرتب دکھا رہا تھا، وہ آیا اور ہاتھ آگے کر دیا۔

اُس کے سہارے کے باوجود یہ ایک ٹانگوں کے ٹھودے میں کھلبلی مچا دینے والی کراسنگ تھی... اگلا قدم اٹھانے کے لیے شہتیروں کو دیکھتے تھے تو نظر ان کے نیچے باؤلے کتے کے منہ سے نکلنے والی جھاگ پر چلی جاتی تھی جو کاندے نالے کے پانی تھے.. سامنے دیکھتے تو پھسلنے کا خدشہ ہوتا تھا۔

اس ''پل'' کے پار ہو کر پھر پتھروں کی ایک دنیا تھی جس میں راہ بناتے ہم آگے ہوئے تو آگے درختوں کے ایک جھنڈ میں چند جیپیں کھڑی تھیں..

"مولا جٹ کی جیپ میں.. کنیداس کا چٹانی گاؤں"

ایک ریٹائرڈ حوالدار کی نہایت ہی ریٹائرڈ جیپ تھی جو ہمیں ہوشے تک لے جا رہی تھی.. جیپ میں ہمارا سامان اور کاندے کے وہ پورٹر جنہیں ہم نے ہائر کیا تھا، لوڈ ہو رہے تھے تو عامر میرے پاس آیا۔ "تارڑ صاحب وہ دونوں ہنزہ گائیڈ.. درخواست کر رہے ہیں کہ ہمیں اپنی جیپ میں ہوشے تک لے جائیں۔ اُن میں سے ایک اکرام بیگ کا کزن ہے.."

یہ کیسا حسین اتفاق تھا کہ وہ دونوں نوجوان اب تک سر پھرے اور متکبر رہے تھے.. ہم سے بات کرنا بھی مناسب نہ سمجھتے تھے اور اب اکرام بیگ کے عزیز ہوئے جاتے تھے.. ویسے تو آدھا ہنزہ بیگ کا کزن ہے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اپنی ذاتی جیپ کاندے میں چھوڑنے کے بعد یہاں سے ہوشے تک ایک جیپ ہائر کر کے اپنی جیب ہلکی نہیں کرنا چاہتے تھے اور ایک فری رائیڈ کے متمنی تھے..

شمال کی جیپ کی ایک باکمال خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک چھوٹے موٹے گاؤں کا کل سامان اور بیشتر باشندے آسانی سے سما جاتے ہیں۔ اگر ڈرائیور کی مرضی ہو تو..

"دے آر ویلکم.."

کاندے سے ہوشے تک ایک گھنٹے کی مسافت بتائی جاتی تھی..

جیپ سٹارٹ ہوئی تو میں پُرسکون ہو گیا.. مجھے شدید خدشہ تھا کہ شائد ہمیں کاندے میں ہی رکنا پڑے.. لیکن اب ہم ہوشے کو جاتے تھے، اس لیے میں پُرسکون ہو گیا..

حوالدار ادھر کا نہیں نیچے سیلنگ کا رہنے والا تھا.. ادھر ایک خیمے میں فروکش تھا.. کاندے اور ہوشے کے درمیان اپنی شخصیت کے زور پر جیپ چلاتا تھا ورنہ اس کی جیپ میں اتنا دم خم نہ تھا

کہ اپنے زور پر چلتی۔ فی پھیرا بارہ سو روپے چارج کرتا تھا.. اتنے پھیرے لگاتا تھا کہ اس کی روزانہ آمدنی کا حساب اگر ڈالروں میں بھی لگایا جائے تو بھی قابلِ رشک تھی.. البتہ جیپ کے پچھلے حصوں میں سے احتجاج کی دبی دبی آوازیں آ رہی تھیں.. اس لیے کہ وہاں متعدد پورٹروں کے علاوہ وہ ہنزہ گائیڈ ڈینڈی بچہ لوگ بھی فکس ہونے کی کوشش کر رہے تھے.. ہمارے سامان کے علاوہ وہاں پانچ کنستر ایسے تھے جن کی موجودگی بہت جگہ گھیرے میرے ساتھیوں کی ٹانگوں کو اجیرن کر رہی تھی کہ وہ ان میں پھنسے ہوئے تھے..

"حوالدار صاحب.. ان کنستروں کو تو اتار دیجیے.. میرے ساتھی نہ بیٹھ سکتے ہیں نہ کھڑے ہو سکتے ہیں.."

"صاحب انہیں بولو کہ تھوڑا گزارہ کر لو.. آگے کنیداس کے علاقے میں کاندے کے سیلاب میں تباہ ہونے والے لوگ گھر بنائے بیٹھے ہیں اور اُدھر پانی نہیں ہے.. میں یہاں سے ہر پھیرے میں اُن کے لیے پانی کے کنستر لے جاتا ہوں.. تھوڑا تکلیف ہو گا لیکن ان کے پاس پینے کو بھی پانی نہیں ہوتا۔"

یہ علاقے امدادِ باہمی کی بے مثال مثال ہیں۔

ایک جیپ ڈرائیور اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اگر چند کلومیٹر دور لوگ پیاسے بیٹھے ہیں تو وہ ان کے لیے پانی لے کر جائے.. اس طرح راستے میں کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ جیپ دیکھ کر روڈ پر آتے اور حوالدار کی جانب پلاسٹک کی بوتلیں اُچھالتے جو وہ ایک ہاتھ سے کیچ کرتا جاتا..

"صاحب یہ کاندے کے لوگ ہیں.. گھروں سے دور کھیتوں میں کٹائی کرتے ہیں تو مجھے اپنا بوتل دیتے ہیں۔ میں اُدھر آگے جا کر ان کے گھروں میں سے چائے بھروا کر لاتا ہوں اور واپسی پر اسی طرح ان کی بوتلیں کھیتوں میں پھینک دیتا ہوں.."

درخت اور جھاڑیاں کم ہو گئیں.. راستہ بے حد گرد آلود ہو گیا.. یہاں ایک مدت سے بارش نہیں ہوئی تھی..

پھر بائیں جانب بڑی بڑی چٹانوں کے ایک نہایت ہی خشک اور صحرائی سلسلے میں کچھ پتھریلے گھر نظر آئے.. وہ نئے تھے کہ جن پتھروں سے وہ تعمیر ہوئے تھے، ان پر تیشے کی تازگی کی سفیدی تھی.. کچھ تو چٹانوں کی کوکھ میں سے جنم لے رہے تھے اور باقی ویرانے میں بکھرے ہوئے تھے، انہی چٹانوں کو توڑ کر ان کے پتھروں سے یہ آماجگاہیں تعمیر کی گئی تھیں۔ چنانچہ کئی چٹانیں

ایسی تھیں جو کئی پچھلی اور بدن دریدہ تھیں.. ایک نیا سکول بھی اس ویرانے میں نمایاں تھا.. یہی کیند اس تھنک تھا جو ایک دشت تھا جہاں پانی کی ایک بوند نہ تھی.. نہ کوئی چشمہ تھا اور نہ کوئی ندی نالہ.. ہوشے دریا نیچے ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع تھا اور اس کے پانی بھی پینے کے لائق نہ تھے..

"ان لوگوں نے اس ویرانے میں گھر کیوں بنائے.. راستے میں کئی ہرے بھرے میدان تھے جہاں پانی تھا.."

"صاحب ادھر کاشت کا زمین کم ہے.. اگر کھیتوں میں گھر بنا لیتے تو زمین کم ہو جاتا.. کھاتے کہاں سے.."

حوالدار نے کنید اس کے گاؤں کے قریب جیپ روکی.. پچھلے حصے میں پڑے پانی کے کنستر اٹھا کر روڈ کے کنارے رکھے اور پھر جیپ سٹارٹ کر دی..

اُن گھروں میں سے چند افراد نکلے.. کچھ بچے روڈ کی جانب بھاگنے لگے.. ایک بوڑھی عورت جو پتھر توڑ رہی تھی، اپنی سنگ پاشی کو ترک کر کے ہتھوڑی پھینک کر چادر سنبھالتی ادھر کو آنے لگی..

ہماری جیپ بہت آگے نکل چکی تھی جب میں نے عقبی آئینے میں دیکھا کہ وہ لوگ.. بچے اور وہ بوڑھی عورت خوشی خوشی کنستر اٹھاتے ہیں اور اپنے پیاسے گاؤں کو لے جاتے ہیں.. اور ہاں اس لمحے میں نے کاندے کے بے گھر لوگوں کی اس نئی چٹانی بستی میں بلند ہوتی اس چٹان کو نہ دیکھا جو نئے گھروں میں سے نکل کر آسمانوں سے ہم کلام ہوتی تھی.. آسمان کے رخساروں پر بوسہ دینے کے لیے بلند ہوتی تھی اور جس پر ایک سرخ جوڑے میں ملبوس لڑکی ایک جل پری کی مانند ٹانگیں سمیٹے براجمان تھی.. جو میرے ذہن پر.. میری یادداشت پر ایک مہر کی طرح.. ایک سادہ دھات پر ثبت ہو جانے والی مہر کی طرح جو اسے عام دھات سے بلند کرتی اسے بدل کر ایک سکہ بنا دیتی ہے.. ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوام بخش دیتی ہے۔ بھوری آنکھوں کا سلسلہ بے شک خاک در خاک ہو جائے لیکن وہ مہر قائم رہتی ہے.. لیکن میں نے نہ اس چٹان کو دیکھا اور نہ اس جل پری کو.. کہ میں نے یہ منظر اپنی واپسی پر اسی حوالدار کی جیپ کی کھڑکی میں سے دیکھا تھا۔

شائد ابھی وہ چٹان یہاں موجود ہی نہ تھی.. اس کا ظہور نہ ہوا تھا.. جتنی مدت میں نے ہوشے سے آگے کہیں بلند پہاڑیوں میں بسر کی اس دوران یہ چٹان زمین میں سے ایک بوٹے کی مانند پھوٹی.. ابھرتی گئی.. اور اپنی زیبائش کے لیے ایک سرخ لباس والی لڑکی کو اپنی چوٹی پر

بٹھایا تا کہ واپسی پر میں اسے دیکھوں اور زندگی بھر بھول نہ پاؤں.. اس کا نقش ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جائے..

"حوالدار صاحب.. ادھر ہوشے کے راستے میں ہمارے دوست چنگیزی کی جیپ ایک حادثے کا شکار ہوئی تھی.. کسی گہری کھڈ میں گر گئی تھی.. چنگیزی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور اس کے ہمراہ جو جاپانی کوہ نورد تھی، وہ ہلاک ہو گئی تھی تو آپ جانتے ہو کہ ان کی جیپ کہاں گری تھی.."

"یہ کس برس کی بات کرتے ہو صاحب؟"

"تقریباً تین برس پہلے کی.."

"تب تو میں ادھر نہیں تھا.."

"کدھر تھا؟"

"آپ کے پنجاب میں تعینات تھا.. آہو.. میں تو آدھا پنجابی ہو چکا ہوں.. کی حال اے سوہنیو.. تواں آیاں ایں سوہنیاں!"

اگر یہ بلتی حوالدار مصطفیٰ قریشی کے "مولا جٹ" کے ڈائیلاگ اتنے ٹھیٹھ لہجے میں بول سکتا تھا تو پنجابی میں اس کی قادر الکلامی میں کوئی شک نہ تھا.. مجھے کچھ خفت سی ہوئی کیونکہ دوران سفر میں نے اس کے تن و توش کے بارے میں اپنے ساتھیوں کو محظوظ کرنے کی خاطر پنجابی میں کچھ فقرے کہے تھے.. جو ظاہر ہے اس تک پہنچے تھے لیکن وہ چپ رہا تھا..

"بڑا چنگا حال اے سوہنیو.." میں نے ہنس کر شرمندگی میں ہنس کر جواب دیا۔

"آپ ادھر پہلی بار آئے ہو؟"

"نہیں.. میں دس برس پیشتر اپنے بال بچوں کے ہمراہ ایک ڈے ٹرپ پر ہوشے آیا تھا"

"تو ہوشے تب کیسا تھا؟"

"چند ایک گھر تھے.. کچے کوٹھڑی نما گھر تھے.. ہزاروں برس سے جو کوہستانی تنہائی اور آزردگی تھی اس میں گم شدہ چند گھر تھے.. بیشتر خواتین کے چہرے دھوئیں سے سیاہ ہو چکے تھے.. ان کی مینڈھیاں جو شائد بچپن میں گوندھی گئی تھیں، پھر نہیں کھلی تھیں.. اور جو بھاری اونی لبادے انہوں نے پہنے ہوئے تھے، وہ بھی برسوں سے پہنے ہوئے تھے، بچوں کے سر استرے سے اس طور مونڈھے گئے تھے کہ درمیان میں صرف سادھو لوگوں کی مانند ایک لٹ لٹکتی تھی جو شائد ان زمانوں کا فیشن تھا.. بوڑھے اپنی سفید اونی ٹوپیوں میں ایک چرخڑی کے گرد اسے گھماتے ہوئے

اون لپیٹتے تھے..ایک ہوٹل اور ایک مشابہ رم شاپ تھی..اور ہوشے والے ہمیں دیکھ کر سراسیمہ ہو گئے تھے اور "انگریز۔ انگریز" کہتے گھروں میں گھس گئے تھے اور میری بیگم نے بے حد برا مناتے ہوئے ان کا پیچھا کر کے انہیں جا پکڑا تھا اور کہا تھا..ہم موئے انگریز نہیں ہیں..پاکستانی ہیں اور مسلمان ہیں..لا الہ..اور خبردار جو ہمیں گندے ٹائلٹ پیپر سے اپنے آپ کو پونچھنے والے انگریز کہا..تو پھر وہ سب دوست ہو گئے اور ہمارے قریب آ گئے..یہ ہوشے تھا۔

"اب وہ ہوشے نہیں رہا۔" حوالدار نے منہ میں رکھی اُس کے گالوں کو ابھارتی کسی شے کی جگالی کرتے ہوئے کہا۔ "اب تو کے ٹو کی جانب سے دنیا جہان کا ٹورسٹ ہوشے میں اُترتا ہے لیکن صاحب..ہوشے والا اب بھی نہاتا نہیں..پانی کو اپنا دشمن سمجھتا ہے، گندا رہتا ہے۔"

"ویسے تو ہماری ایک محسن میم صاحب ازابیل شاہ بھی یہی کہتی ہیں کہ ہوشے کے لوگ پورے شمال میں سب سے گندے ہیں لیکن..حوالدار صاحب آپ یہ بھی تو دیکھئے کہ وہ ہزاروں برس اس بلند تنہائی میں دنیا جہان سے کٹے رہے..سال بھر میں صرف ایک فصل ہوتی ہے اور اگر سردی شروع ہو جائے تو وہ بھی پکتی نہیں..پھلدار درخت بھی پھلتے نہیں۔ گندم، جو، شلجم اور مٹر کے چند بوٹے اور بس..انہوں نے شدید برفباری اور بھوک کی آفتیں جھیلیں..ان کے پاس تو موسم سرما گزارنے کے لیے کافی لکڑی بھی نہیں تھی اور اس کے باوجود انہوں نے اپنی وادی کو نہیں چھوڑا..اگر گندے رہتے ہیں تو اپنے گھر میں رہتے ہیں۔"

حوالدار دل کھول کر اور جبڑا کھول کر ہنسا اور اپنا پورا بوجھ سٹیئرنگ پر ڈال کر جیپ کو دائیں جانب موڑ دیا۔ "آپ تو ہوشے والوں کے طرف دار ہو گئے ہو۔"

"میں ان لوگوں کا طرفدار ہوں جو بھوک اور افلاس سہتے ہیں اور اپنے گھر نہیں چھوڑتے۔"

حوالدار میری اس گفتگو سے بور ہو گیا اور درمیان میں بیٹھے حسن سے مخاطب ہو گیا۔

"آپ اُدھر لاہور میں کیا کرتے ہو؟"

"بس جی.." حسن صاحب حسب معمول ذرا شرما گئے۔ "میں ایک بینک افسر ہوں..چھوٹا سا۔"

"کتنا بال بچہ ہے؟"

"دو بیٹے ہیں ماشاءاللہ.."

"اوئے سوہنیو.." حوالدار پھر سے ہنسنے لگا۔ "صرف دو..میرے پانچ بچے ہیں اور ابھی مزید آ رہا ہے..تو یار اردو تو بہت کم ہے اور پیدا کرو۔"

"وہ جی حوالدار صاحب۔" حسن صاحب کو تو اللہ شرمانے کا موقع دے اور یہ کیا موقع تھا" وہ..بیگم نہیں مانتی۔"

"اچھا۔" حوالدار نے مخدوش نظروں سے حسن کو دیکھا۔ "تو آپ بیگم کو پوچھ کر بچہ پیدا کرتا ہے..ہم تو نہیں پوچھتا۔"

"ہور کی حال اے حوالدار جی۔" میں نے فوری طور پر موضوع کی پٹڑی بدلنے کی کوشش کی۔ "ہوشے کتاں دور اے؟"

"زیادہ دور نہیں سوہنیو.."

شام..رات کی تاریکی کی دہلیز پر کھڑی پل دو پل کی مہمان تھی..ابھی ہیڈ لائٹس جلانے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جب ہم ذرا نیچے ہوئے..چٹانوں کی اوٹ میں چلے گئے اور نیچے ایک گہرائی میں ایک پُل تھا..

اور پھر مجھے بھی یاد آ گیا..یادداشت کی سکرین پر ایک فلم چل گئی..ہوشے کے عین نیچے ایک پُل تھا جسے پار کر کے ایک زبردست چڑھائی آتی تھی اور پھر ہوشے آ جاتا تھا..

"اس پُل کے اوپر ہوشے ہے صاحب..یہاں تک کاندے والوں کا زمین ہے اور اس پُل کے پار ہوشے والوں کا علاقہ ہے۔" اس نے پُل کے دوسری جانب جا کر سپیشل گیئر لگایا اور جیپ زبردست احتجاج کرتی..ہونکتی رُکتی پھر سے دھچکے کھاتی چڑھائی پر چڑھنے لگی..

اور اوپر جب جیپ کی ناک سیدھی ہوئی..ہم جو چڑھائی کی وجہ سے پیچھے گرے تھے، ہموار ہوئے تو ہوشے آ گیا..

"ہوشے کی گلیوں میں اُندلس کے اجنبی"

شام کے بعد..رات کی قربت میں ہم ہوشے میں داخل ہوئے..

یہ تو اب باقاعدہ ایک گاؤں تھا..

چند گھر نہیں..گلیاں تھیں اور کچے نہیں پکے گھر تھے..اور رونق تھی..

ہمیں بتایا گیا تھا کہ ہوشے میں اب تین خیمہ گاہیں تھیں اور ان میں کوئی حمزہ کیمپنگ یا لیلے پیک کیمپنگ بہترین تھی..

ہم اس کیمپنگ کے پھاٹک کے باہر رُکے تو اس کے اندر غیر ملکی سیاحوں کے اتنے خیمے تھے..کہ وہ اُبل کر ہوشے کی گلیوں میں آ رہے تھے..

اور یہ کیمپنگ سائٹ اگرچہ بہت مختصر تھی لیکن یہ سوئٹزرلینڈ کی جھیل لوگانو کے کناروں پر ایک کیمپنگ سائٹ ہو سکتی تھی کہ اس کے اندر تمام تر خیمے اور چہرے اجنبی سرزمینوں کے تھے اور میں جب لوگانو کی اس وسیع خیمہ گاہ کے گیٹ میں سے داخل ہو کر اندر گیا تھا تو استقبالیہ کلرک نے میرے پوچھنے سے پہلے بیزاری سے کہہ دیا تھا۔ "کوئی جگہ نہیں..سائٹ فل ہے۔"

"میں تنہا ہوں اور میرا خیمہ بھی بہت چھوٹا سا ہے.."

"ایک چھوٹے سے خیمے کے لیے بھی جگہ تو چاہیے..جو نہیں ہے..سوری۔"

اور یہاں ہوشے میں بھی بالکل یہی صورت حال تھی..اور آج صرف میرا چھوٹا سا خیمہ ہی نہیں تھا بلکہ میرے چھ ساتھیوں کے بھی خیمے تھے..اور جگہ نہیں تھی..

ویسے ہم نے بہت ہی ندیدے پن سے اس کیمپنگ کے اندر جھانکا کیونکہ اندر ماحول سراسر مغربی تھا اور وہ نور دخواتین پہاڑوں سے اُترنے کے باوجود بھی تنگ اپنے لباس کے بارے

میں لاپرواتھیں..

ذرا سامنے ایک اور پھاٹک تھا..جہاں کیمپنگ نمبر دو تھی اور یہ اشرف کیمپ تھی اور وہاں گھاس نہ تھی اور کچھ گھٹی گھٹی سی بھی تھی لیکن سوائے ایک چھوٹے سے خیمے کے بالکل خالی تھی.. دیوار کے ساتھ ساتھ جو پاپلر کے درخت اونچے ہوتے تھے،ان کے نیچے سورج مکھی کے چند پھول تھے..

ہوشے کی رات میں ہمارے خیمے سر اُٹھانے لگے..

اشرف کی خیمہ گاہ کے کچن میں پکوان پکنے لگے..

خیموں اور خوراک کے بندوبست میں کاندے سے آئے ہوئے پورٹر نہایت پھرتیلے ہو رہے تھے کیونکہ وہ چار کی بجائے شاید چھ سات آ گئے تھے اور اگلی صبح کو جب پورٹروں کا چناؤ ہونا تھا اس میں سے چنے جانے کے لیے پھرتیلے ہو رہے تھے۔ ان میں کچھ ہوشے کے بھی پورٹر تھے جو ہم میں گھل مل گئے تھے..ان میں ایک حسین نامی شخص بھی تھا جو پورٹر ہونے کے علاوہ ماہر باورچی ہونے کا بھی دعویٰ کرتا تھا اور لاہور کے کچھ ریستورانوں میں کام کرنے کا حوالہ بار بار دیتا تھا..اور بہت فرمانبردار اور مسکین شکل کا تھا اور ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اس بے چارے کو تو ضرور ساتھ لے کر جائیں گے..چاہے ہم افورڈ کر سکیں یا نہیں..اور پھر جب ہم اسے ساتھ لے گئے تو ٹریک کے دوران ایسا ظالم اور طوطا چشم ہوا کہ ہم سب بے چارے اور مسکین ہو گئے..

میں اس بار اپنا جونک نما خیمہ ساتھ نہیں لایا تھا اور سلمان کے آسٹریلوی خیمے کے ایک گوشے میں حسن صاحب کی رفاقت میں اپنے سلیپنگ بیگ میں نہایت پُرسکون استراحت فرما رہا تھا..

بقیہ ساتھی بھی اپنے اپنے خیموں میں کچھ نہ کچھ فرما رہے تھے..

اور باہر ہوشے کی رات تھی..مشابرم سے اُترتی رات تھی..

کچھ دیر استراحت فرمانے کے بعد میں اس خیمہ گاہ کے کچے اور کوہستانی ماحول والے ڈائننگ روم میں جا بیٹھا..گیس کی دودھیا روشنی اور کچھ انجانے چہروں میں جا بیٹھا..کچی دیواروں پر بطور آرائش کوہ پیماؤں کی تصویریں اور کارڈ چسپاں تھے اور کسی کیلنڈر سے مستعار لیے ہوئے جاپانی دوشیزاؤں کے تقریباً ہوشربا پوز تھے..تقریباً اس لیے کہ جاپانی اور چینی دوشیزائیں کوشش بسیار کے باوجود اپنی بدنی حالتوں کو برانگیختگی کے اس مقام پر نہیں لے جا سکتیں جسے مکمل طور پر ہوش رُبا کہا

جاسکے..یہ رتبہ بلند صرف امریکی، ہندوستانی اور پاکستانی دوشیزاؤں کو ہی مل سکتا تھا۔

یہاں..اس ہوشے کے کچے گیس کی روشنی میں دودھیا ہوتے ایک ہسپانوی جوڑے سے ملاقات ہوئی جو نہایت صاف ستھرے اور بے حد اہتمام سے ملبوس شدہ تھے..وہ بھی اب تازہ ترین فیشن کے مطابق اشکولے سے کنکورڈیا پہنچ کر..درۂ گندوگورو عبور کر کے ہوشے پہنچے تھے..نہ صرف ان کا لباس ستھرا تھا بلکہ وہ خود بھی متاثر کن حد تک خوش شکل تھے..

عامر انہیں دیکھ کر کہنے لگا۔’’تارڑ صاحب نہ ان کے چہروں پر کے ٹو بیس کیمپ کی ہائٹ کا اثر نظر آتا ہے..نہ ان کی جلد اکھڑی ہوئی ہے اور نہ ہی ہونٹ اور ناک سوجے ہوئے ہیں..نہ ہی ایک طویل کوہ پیمائی اور خطرناک سفر کی کچھ تھکاوٹ ہے..اور ڈریس اپ بھی ایسے ہوئے ہیں جیسے پیرس کی نائٹ کلب ’’مولن روژ‘‘ میں ڈنر کرنے کے لیے جاتے ہوں تو انہیں پوچھئے کہ کیا واقعی یہ کے ٹو بیس کیمپ سے ہو کر ادھر پہنچے ہیں؟‘‘

اور یہ حقیقت ہے کہ وہ ہسپانوی جوڑا ایک تروتازہ کھیرے کی مانند سرسبز اور ستھرا تھا۔ سورج مکھی کی مانند کھلا ہوا تھا۔

انہوں نے ڈائننگ روم کی کچی چھت پر..جہاں وہ ایک مخدوش سے زینے کی مدد سے پہنچے تھے..وہاں اپنا خیمہ نصب کر رکھا تھا تا کہ وہ ہوشے کے ’’منظر‘‘ کو انجائے کر سکیں اور ہم گہرائی میں..پاتال میں سفیدے کے درختوں تلے خیمہ زن تھے..

میں نے انہیں متاثر کرنے کی خاطر اپنی کتاب ’’اُندلس میں اجنبی‘‘ کا ذکر کیا تو وہ ضرورت سے زیادہ متاثر ہو گئے۔

’’ہم تو پاکستان کو بھی نہیں جانتے تھے..صرف کے ٹو کو جانتے تھے اور یہ تو بالکل نہیں جانتے تھے کہ یہاں کوئی ایسا شخص ملے گا جس نے سپین کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہو۔‘‘

انہیں کیا پتہ کہ ہسپانیہ ہم پاکستانیوں کے دلوں پر کہاں کہاں اثر کرتا ہے..بے شک بنیادی طور پر موریش سپین اثر کرتا ہے..ہم ان کے قرطبہ، اشبیلیہ اور غرناطہ کو ان کی نسبت کہیں زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور حرنگ چوک کو اب قرطبہ چوک کہتے ہیں..

وہ دونوں شاید میڈرڈ کے رہنے والے تھے اور بینکر تھے..شادی شدہ نہیں لگتے تھے ورنہ اتنے خوش نہ لگتے..اگلی صبح ان دونوں نے روانہ ہونے سے پیشتر میرے خیمے میں جھانکا اور اپنا کارڈ بڑھا کر مجھے میڈرڈ آنے کی دعوت دی..وہ کارڈ وہیں کہیں ہوشے میں ہی رہ گیا..

ان دونوں نے البتہ میرا کارڈ گم نہیں کیا تھا اور ایک برس بعد انہوں نے مجھے اپنے پہلے بچے کی پیدائش کی خوش خبری بھیجی..

ویسے پاکستانی شمال میں اس بار ایک عجیب تبدیلی سامنے آئی..اس کے پہاڑوں اور گلیشیئرز میں بھٹکتے جتنے کوہ نورد ملے..ان میں سے بیشتر کا تعلق ہسپانیہ سے تھا..

کھانے میں کیا تھا یہ کچھ یاد نہیں لیکن حسین کی تیار کردہ وہ سلاد یاد ہے جو نہایت سجی ہوئی اور خوش نظر تھی۔

کھانے کے بعد ہم سب ہوشے کی گلیوں میں نکل گئے..

دیواروں کو ٹٹولتے..اندھیرے میں احتیاط سے قدم رکھتے گلیوں میں نکل گئے..تاریک رات کے سائے میں نابینائی میں ان میں گھومتے رہے..

یہ ایسی گلیاں نہ تھیں جن میں انسان گم ہو جائے..کہ وہ دو چار ہی تو تھیں..ہر گلی کے بعد ایک اترائی آتی اور کھیت شروع ہو جاتے..گندم کے بوٹوں کا سنہری پن تاریکی میں بھی دکھائی دیتا تھا..

لیکن یوں بے مقصد بھٹکنے میں بھی ایک عجیب سنسنی تھی۔

اس لیے کہ ہم 7821 میٹر بلند مشابرم کی چوٹی کے دامن میں ہوشے میں تھے..اور اگر اس چوٹی کا حساب کتاب کیا جائے تو یہ دنیا میں چوبیسویں بلند ترین چوٹی تھی..یہ امریکی کوہ پیما تھے جنہوں نے پہلی بار 1960ء میں اس پر قدم رکھا..

اور ہم نے مشابرم کو آج نہیں..دس برس پہلے بھی دیکھا تھا۔

یہاں سے نہیں..اس کے پار..دوسری جانب..کنکورڈیا کی جانب چلتے ہوئے جب ہم اردوکس سے نکلے تھے تو دائیں جانب برفوں کی ایک دنیا میں سے اٹھتی ہوئی اس دانت نما چوٹی کو دیکھا تھا..اور یہ حیرت ناک حد تک سوئٹزرلینڈ کی ماؤنٹ میٹرہارن سے مشابہ تھی۔ اگرچہ اس سے بلندی میں تقریباً دوگنی تھی اور اس کے گرد بادلوں کا ایک سفید گھیرا تھا..ہم اس کے برابر میں چلتے تھے اور اس کی شکل اور بلندی سے مرعوب چلتے تھے..اس کے دامن میں جو ہیبت ناک گلیشیئر تھا، اس کے ڈر میں چلتے تھے..

ایک برفانی عجائب گھر میں چلتے اسے دیکھتے جاتے تھے..اور تب نہیں جانتے تھے کہ اس چوٹی کے اندر ایک درہ گندوگورو نام کا ہے جسے عبور کر کے ہوشے پہنچا جا سکتا ہے..کوئی بھی

نہیں.. یہاں تک کہ ہوشے والے بھی نہیں جانتے تھے اور وہ اسے ناقابلِ عبور سمجھتے تھے..

یہ درّہ دریافت ہوا تو ہوشے کی قسمت بدل گئی..

اس کی قسمت بدل گئی لیکن نہ نہانے کی عادت نہیں بدلی..

گئی رات ہم اشرف خیمہ گاہ میں لوٹے.. باہر ایک دکان کے کچے تھڑے پر چند نوجوان گا رہے تھے.. باتیں کر رہے تھے..

"کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"نوجوانی میں کیسی باتیں کرتے ہیں.. ہم لڑکیوں کی باتیں کرتے ہیں۔"

ہم تھکاوٹ سے.. بلندی کے خمار میں یوں چور ہوئے کہ خیموں میں جاتے ہی بے سدھ نیند میں اتر گئے..

کل سویرے ہم نے گندوگورو کی جانب سفر کرنا تھا..

گندوگورو.. جو بقول میاں صاحب نہایت ہی فحش نام تھا۔

"تختِ لاہور کی گلیاں اور باقی رہ گئے... پانچ"

یہ ہوشے کی گلیاں نہ تھیں جن میں ہماری ویگن ٹریفک کے شور میں.. چلتی جاتی تھی..

یہ تختِ لاہور کی گلیاں تھیں..

ساجن کی وہ گلیاں تھیں جنہیں ہم چھوڑ گئے تھے.. اور اب واپس آئے تھے تو جی چاہتا تھا کہ کاش ساجن ان تنگی ہوئی واہیات بوسیدہ اور گندی گلیوں میں نہ ہوتا.. ہوشے کی گلیوں میں ہوتا..

ساجن پر مینارِ پاکستان ایسے.. آنقل نادر کی بھونڈی نقل ایسے سٹرکچر کا سایہ نہ ہوتا.. مشابرم کا سایہ ہوتا..

اور ہوشے کی گلیاں بھی ایسی تھیں کہ ان میں ساجن کے ساتھ گھومنے پر پولیس نکاح نامہ طلب نہیں کرتی تھی.. وہاں پولیس ہوتی تو طلب کرتی..

البتہ ساجن کو لاہور سے ہوشے شفٹ کرنے میں بھی تو کچھ تکنیکی مسائل تھے..

ایک تو یہ کہ شہرِ لاہور کا عادی ساجن.. گھر سے باہر قدم رکھنے سے پیشتر میک اپ کی پوری کِٹ ختم کر دینے والا اور ہونٹوں پر ڈبل شیڈ کی لپ سٹک لگانے والا ساجن.. اوّل تو لاہور سے ہوشے جانے کے لیے راضی ہی نہیں ہوگا.. اور اگر بفرضِ محال رومینٹک ہو کر چلا بھی جائے تو چند روز میں بیزار ہو جائے گا کہ یہ کہاں آ گئے ہم چمن سے نکل کر.. اور ایسی محبت سے ہم باز آئے.... وہ موسمِ سرما کی شدید برفباریوں میں ہوشے کی کسی کوٹھڑی میں آگ پر اپنا گورا چٹا چہرہ سینکتا ساجن بہار کی آمد تک دھوئیں سے کالا شاہ ہو چکا ہوگا.. اس کا حلیہ بگڑ چکا ہوگا.. وہ گورا رنگ جس کی وجہ سے پورا پنڈ ویری ہو جاتا ہے، وہ دھوئیں کی کالک میں ایسے غائب ہوگا کہ ساجن کی صرف آنکھیں دکھائی دے رہی ہوں گی جن کے کونٹیکٹ لینز وہ لاہور میں بھول آیا ہوگا اور اب

چندھیائی آنکھوں سے ہر سُو دیکھتا ہوگا کہ.. کہاں آ گئے ہم چمن سے نکل کر..

چنانچہ ساجن کو لاہور کی گلیوں میں ہی رہنے دینا مناسب ہے..

میاں صاحب کو ڈراپ کرنے کے بعد ویگن اپنے سامنے ونڈ شیلڈ میں بادشاہی مسجد کے بے مثال گنبد و مینار اُتارتی.. شہر کے شور و غوغا میں بھیڑ کو چیرتی بھاٹی گیٹ سے مُڑ کر سول سیکرٹریٹ سے دائیں جانب ہو کر کرشن نگر کی گلیوں میں آ گئی.. وہ کرشن نگر جسے اب زبردستی اسلام پورہ کہا جاتا تھا..

زبردستی اس لیے کہ نام بدلنے سے بستی کا مزاج اور اخلاق نہیں بدلتا..

یہ محض ایک پلاسٹک سرجری ہوتی ہے جس کے نیچے چہرہ وہی رہتا ہے..

اس حساب سے تو فوری طور پر شہر لاہور کا بھی نام بدل دینا چاہیے کہ یہ رام کے بیٹے لہو کے نام سے آباد ہوا تھا۔

اس کا نام بھی لائل پور کے بجائے فیصل آباد میں بدلنے کی پاکیزہ روایت کی پیروی کرتے ہوئے کسی سعودی شہزادے کے نام پر... بے شک پرنس فہد آباد رکھ دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے.. ایک ایسا شہزادہ جو ایک سروے کے مطابق دنیا کے عیاش ترین لوگوں میں نہایت معتبر مقام پر ہے۔ قصور بھی.. جو میرا سوہنا شہر قصور ہے.. رام کے بیٹے کا ہم نام ہے۔ اسے بھی کسی اور شہزادے کے نام سے پکارا جائے تو کیا حرج ہے.. سعودی شہزادے تعداد میں اتنے کثیر ہیں کہ ہمارے شہر اور گاؤں ختم ہو جائیں گے، ان کی تعداد پھر بھی کم نہ ہوگی... بے شک آپ مان سنگھ کے مانسہرہ.. ہری سنگھ نلوہ کے ہری پور.. ٹیک سنگھ کے ٹوبہ اور رشی گودھا کے سرگودھا کے نام بھی بدل دیں.. شہزادے پھر بھی سرپلس رہیں گے۔

تو اس کرشن نگر.. اسلام پورہ کی ایک نہایت پُرسکون اور زندگی بھری گلی میں.. جہاں ایک گھوڑا بندھا تھا اور کچھ گائیں آوارہ ہوتی تھیں.. وہاں حسن صاحب اُتر گئے۔

اور کیسی بے تابی میں اُترے.. اپنے بچوں کے لیے اُداس.. بیگم کے لیے مرجھائے ہوئے.. اتنی بیتابی میں اُترے کہ ہمیں بھی بھول گئے یہاں تک کہ مجھو کی خوبانیوں والی لڑکی کو بھی بھول گئے.. اتنی بے تابی سے جیسے لنکا سے واپسی پر سیتا کو رام ملتا ہے..

ویگن خالی ہوتی جاتی تھی..

اس کے اندر جو موسم ٹھہرے ہوئے تھے، وہ بھی رخصت ہوتے جاتے تھے.. اور شہر کی

کثافت آمیز دھواں بھری ہوا اس کے اندر ٹھہرے ہوئے موسموں پر غالب آتی جاتی تھی۔

ہر ساتھی کے اُترنے کے ساتھ کچھ موسم بھی ویگن سے اتر جاتے تھے..

ہم کہاں سے آئے تھے؟

تو کرشن نگر کی اس گلی میں جہاں ایک گھوڑا بندھا تھا اور کچھ گائیں آوارہ ہوتی تھیں اور حسن اُترے تھے یہ یقین نہ آتا تھا کہ ہم کہاں سے آئے تھے۔

"وادیٔ ہوشے.. پھنگر پیک اور ٹریک کا پہلا دن"

ہر ٹریک کا پہلا قدم ہمیشہ ہیجان خیز ہوتا ہے۔

پورٹر اپنے کاندھوں پر آپ کے بوجھ اٹھائے.. آپ کے چولہے.. پریشر کُکر.. دیسی گھی.. دالیں۔ خوراک کے ٹین۔ پکوڑے تلنے کے لیے بیسن اور ٹونا مچھلی وغیرہ اُٹھائے نکلتے ہیں اور جب آخری پورٹر آپ کے قریب سے گزر جاتا ہے تب آپ سب سفر کی دعا پڑھتے ہیں.. اور بسم اللہ کہہ کر وہ پہلا قدم اٹھاتے ہیں..

دراصل پہلا قدم ہی پوری کوہ نوردی ہوتا ہے..

جیسے کہا جاتا ہے کہ ناول کا پہلا فقرہ لکھنا سب سے مشکل ہوتا ہے.. وہ لکھ لیجیے تو گویا ناول مکمل ہو گیا..

جیسے چاند پر پہلا قدم.. نسلِ انسانی کے لیے ایک عظیم جست ہوتا ہے..

جیسے سڑک پار کرتے ہوئے کسی کے ساتھ آپ کا ہاتھ چُھو جائے تو گویا ایک عشقِ خاص کا آغاز ہو جاتا ہے..

جیسے موت کے پہلے لمحے میں ہی قیامت آ جاتی ہے.. کہ آپ کی آنکھیں بند ہونے کے بعد بے شک اربوں سال گزر جائیں، جب آپ کی آنکھ کھلے گی اور قیامت ہو گی اور آپ کہیں گے کہ میں تو ابھی ابھی مرا تھا..

کچھ ایسے ہی ٹریک کا پہلا قدم.. اور آپ منزل تک پہنچ جاتے ہیں..

بس یہی پہلا قدم ہم نے ہوشے میں اٹھایا تو گویا گُنڈوگورو کے بیس کیمپ پہنچ گئے..

ہوشے کی گلیاں کہاں تک ساتھ دیتیں۔ ایک ڈھلوان پر پہنچ کر جھک گئیں، پیچھے رہ

گئیں اور ہم نیچے کھیتوں میں اُترنے لگے..

ہمارے پورٹر جو خاصے دور چلے گئے تھے یہاں سے کھیتوں میں بھٹکتے ہوئے لگتے تھے..

ہر سو سنہری راج تھا..

اس کھلے سنہری پن میں کہیں کہیں ہریاول ٹھہری ہوئی تھی..

گندم پکنے کو تھی.. اتنی نہیں پکی تھی کہ کاٹی جا سکے.. اور کچھ کھیت ایسے تھے جن میں اس کے خوشے ابھی تک ہرے تھے..

ہم کھیتوں کے درمیان میں ایک پگڈنڈی پر چلتے جاتے تھے.. تازہ دم تھے اور چہلیں کر رہے تھے.. بدنوں میں چلبلاہٹ تھی کہ وہ ابھی پسینے اور تھکاوٹ سے آشنا نہیں ہوئے تھے.. خوش تھے کہ اس ویگن سے جان چھوٹی جو چلو میں کھڑی تھی.. جیپوں کی محتاجی کا اختتام ہوا.. سب بیساکھیاں پیچھے رہ گئی تھیں اور اب ہم کسی بھی سہارے کے بغیر خود چلتے تھے، ایک پگڈنڈی پر جس پر ہم آج تک نہیں چلے تھے اور ایک پندرہ ہزار فٹ بلند درے کی جانب چلتے تھے.. جو ہمارے لیے اتنا اجنبی تھا کہ ہم نے آج تک اس کی کوئی تصویر بھی نہیں دیکھی تھی..

مخالف سمت سے کچھ پورٹر چلے آ رہے تھے..

وہ تھکے ہوئے تھے.. بوجھ تلے دبے ہوئے تھے.. یکدم انہوں نے اپنے بوجھ اُتارے اور پگڈنڈی کے برابر میں کھیتوں میں گھس گئے..

کھیتوں میں کام کرنے والی خواتین نے بالکل مائنڈ نہ کیا کہ وہ گندم کو روند رہے ہیں اور اُودھم مچا رہے ہیں بلکہ ان کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگیں کیونکہ وہ ہوشے کے تھے اور ان کے دور پار کے رشتے دار تھے..

یہ پورٹر کھیتوں میں گھس کر گندم کے سنہری بُوٹوں کے بیچ کہیں کہیں نمودار ہونے والی مٹری بیلوں کو تلاش کر رہے تھے.. وہ اُن کی پھلیاں توڑتے اور انہیں کھول کر ان میں سے سبز دانے نکال کر منہ میں رکھتے اور خوش ہوتے تھے..

وہ بس اتنی ذرا سی بات پر خوش ہوتے تھے..

بلندی سے نیچے آنے والے یہ پورٹر.. جانے کتنی طویل مسافتوں اور کتنے دنوں کے بعد نیچے آنے والے یہ پورٹر باسی روٹیاں، خشک پنیر اور ٹین بند خوراکیں کھا کھا کر بیزار ہو چکے تھے اور ان کے تالو کسی تازگی کو ترستے تھے.. تازہ کھیروں، ٹماٹروں اور پیاز کے لیے ترستے تھے اور یہاں

صرف مٹر کی پھلیاں تھیں اور تازہ تھیں تو وہ اُن کے ہرے ذائقے کو منہ میں رکھنے کے لیے بے چین ہوتے تھے اور خوش ہوتے تھے..

ہم انہیں یہ عیاشی کرتے ہوئے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

دائیں ہاتھ پر تہہ در تہہ کھیتوں کی اوپر خشک چٹانوں کی ایک دیوار چلتی تھی اور بائیں جانب بھی کھیت تھے اور ان کے آخر میں ایک گہرائی تھی جس میں ہوشے دریا بہتا تھا اور یہاں سے دکھائی نہیں دیتا تھا.. اگر ہم نے اپنے اولین منصوبے کے تحت مشابرم بیس کیمپ میں جانا ہوتا تو ہم یہیں کہیں سے نیچے اُتر کر ہوشے دریا کے پار جاتے اور اس کے ساتھ ساتھ سفر کرتے.. دریا پار ایک اور بہت بڑا نالہ بلندی سے اُترتا آرہا تھا اور اس کے آس پاس اس کے پانیوں میں سیراب ہونے والے ہرے بھرے کھیت تھے.. اسی جانب ایک ویران پہاڑ دکھائی دے رہا تھا جس پر ہوشے کی تین خواتین اور ایک مرد بکریوں کی مانند اوپر چڑھتے جاتے تھے.. وہاں نہ کوئی راستہ تھا اور نہ کوئی پگڈنڈی.. اور پھر بھی چڑھتے جاتے تھے کہ وہ اسی دنیا میں پلے بڑھے تھے.. وہ مجھ سے اتنی دور تھے کہ یہاں سے محض نقطے لگتے تھے جو کبھی کبھار حرکت کرتے تھے اور کبھی یوں ہوتا کہ میں کچھ دیر کے بعد اُدھر دیکھتا تو وہ جھاڑیوں اور گھاس میں گم ہو چکے ہوتے پھر غور کرنے سے دوبارہ نظر آتے.. وہ ایک خاص بلندی پر پہنچ کر رک گئے اور جھاڑیوں کو کاٹنے لگے۔ گھاس جمع کرنے لگے.. اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اسے کمر پر بوجھ کر کے نیچے نالے کی جانب اترنے لگے.. شائد آپ سوچ رہے ہوں کہ اتنی دوری سے جہاں سے وہ محض نقطے لگتے تھے، میں نے کیسے جان لیا کہ ان چاروں میں سے تین عورتیں ہیں اور ایک مرد.. خواتین کے پیراہن سرخ رنگ کے تھے اور وہ زیادہ آسانی سے پہاڑ پر چڑھتی تھیں..

ہم ابھی تک ہوشے کی دنیا میں تھے..

کھیتوں میں کہیں کہیں پتھریلی آماجگاہیں تھیں جن کے باسی ہماری نگاہوں سے چھپتے تھے البتہ بچے لوگ ہاتھ ہلاتے تھے..

یہ تو درست کہ پہلا قدم سب سے مشکل ہوتا ہے لیکن اس سے بڑا سچ یہ ہے اس پہلے قدم کے بعد ہی تو اصل آزمائش شروع ہوتی ہے.. سانس پھولنے لگتا ہے.. گھٹنوں میں درد ہونے لگتا ہے.. جوگرز پاؤں کو دبانے لگتے ہیں.. جرابوں میں اگر کوئی سلوٹ رہ گئی ہے تو وہ دکھ دیتی ہے اور پھر تیز دھوپ کے نیزے آپ کے بدن میں سوراخ کر کے نہ صرف پسینہ بہاتے ہیں بلکہ آپ

کو نڈھال کرتے ہیں اور آپ اپنی فلاسک کو عزیز از جان.. جانتے ہیں کہ اس میں نمکول ملا پانی ہے جس کا ایک ایک گھونٹ آب حیات ہے اور جو آپ کے بدن کو ڈی ہائیڈریشن سے بچا سکتا ہے.. پھر آپ ان ساتھیوں کو تلاش کرتے ہیں جو آگے نکل چکے ہیں جن میں برمانی بھی شامل ہے اور وہ چونکہ پہلی بار ہمارا ساتھی ہوا ہے اس لیے تازہ دم ہے اور کسی چولستانی آہوئے آوارہ کی مانند قلانچیں بھرتا نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے اور پھر ان ساتھیوں پر نظر کرتے ہیں جو آپ کے آس پاس آپ کو کوستے ہوئے پھٹ پھٹ بھاری قدموں کو بمشکل اٹھا رہے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو کوئی ایک آدھ ساتھی ایسا ہے جو یہ منصوبہ بندی کر رہا ہے کہ گندو گورو پر لعنت بھیجو، یہیں سے واپس ہوشے لوٹ جاتے ہیں..

ہوشے سے ہماری اگلی قیام گاہ تک کا راستہ آسان ہونا چاہیے تھا کیونکہ گائیڈ بکس نے یہی اطلاع فراہم کی تھی اور اس قیام گاہ کا نام متعدد بار سننے اور دوہرانے کے باوجود مجھے یاد نہ ہوتا تھا.. صرف اتنا یاد رہتا تھا کہ اس کا نام کچھ چینی سا ہے اور چین کے ایک پرانے.. ایک وسیع جھیل کے کنارے چائے کے باغوں والے شہر ہانگ چو سے ملتا جلتا تھا..

لیکن میں اس لیے ہانگ چو کو قطعی طور پر یاد نہیں کرنا چاہتا تھا..

کہ وہاں پیکنگ کی تتلی رہتی تھی..

ہوشے کے کھیتوں کا اختتام ہوا تو پتھر شروع ہو گئے.. خدا خدا کر کے وہ ختم ہوئے تو ایک دوسرا نالے راستے میں آئے.. وہ بھی بڑی چڑھائی سے سابقہ پڑا..

ہمیں یہی اطلاع دی گئی تھی کہ آج کل چار سے چھ گھنٹے کا سفر درپیش تھا اور ہمیں چلتے ہوئے چھ گھنٹے تو بیت چکے تھے اور ابھی تک لنچ کے لیے بھی قیام نہ ہوا تھا۔ پھر صنوبر کے کچھ درخت نکلنے اور چھدرے نظر آئے.. اور ان کے سائے میں کچھ بھاری اور سیاہ وجود ڈھیر نظر آئے..

میں نے جب پہلی ان ڈھیر وجودوں کو دیکھا تو ڈر گیا کہ یہ کیا ہولناک چیزیں ہیں.. پھر کھلا کہ یہ تو بھولے بھالے یاک ہیں جو دھوپ سے بچنے کی خاطر صنوبر کے سایوں تلے استراحت فرماتے ہیں..

یہاں سے ہوشے دریا کہیں مشابرم کی جانب چلا گیا تھا یا وہاں سے اُتر کر ہوشے کی جانب بہہ چکا تھا اور اب ہم چراگسا دریا کو دیکھتے چلتے تھے..

ایک آبادی.. بلکہ متروک شدہ جھونپڑے آئے جو اوڈونگستان تھا.. کچھ باڑے تھے اور

ایک کوٹھڑی مسجد تھی جس کے باہر وارننگ درج تھی کہ غیر مسلم یہاں داخل نہیں ہو سکتے.. ہم سب اگرچہ اس کے اندر جانے کے تمنائی تھے لیکن جھجک گئے کہ کیا ہم اپنے آپ کو مسلمان کہہ سکتے ہیں.. البتہ حسن صاحب بے دھڑک اندر چلے گئے کہ سرجی ہم اہلِ سادات میں سے ہیں..

"اندر کیا ہے؟" ہم نے پوچھا جب وہ باہر آئے..

"ایک چٹائی ہے اور ایک لوٹا ہے۔"

ہم پھر سے چلنے لگے.. اس ٹریک میں آسانی یہ تھی کہ ہمیں راستہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی تھی.. ایک چوڑی پگڈنڈی تھی جس پر بس چلتے جائیے..

ذرا آگے ہمارے پورٹر آرام کر رہے تھے..

صنوبر کے درختوں تلے یاکوں کی مانند استراحت فرما رہے تھے..

میں نے اپنا مختصر رک سیک اتارا اور ایک گنجے ہوتے صنوبر کے سائے میں رینگتا صرف اپنے چہرے کو دھوپ سے بچا سکا اور لیٹ گیا..

گرم سوپ.. سارڈین.. کچھ پنیر اور چائے..

لنچ ٹائم..

بائیں جانب جدھر ایک وادی دور تک جہاں تک نظر جاتی تھی، کھلتی جاتی تھی.. مشابرم تھی.. مشابرم کے برابر میں دو اور چوٹیاں تھیں جو چٹانوں میں سے جھانکتی اوپر ہوتی آسمان میں سفید ہوتی تھیں..

"یہ پھنگر پیک ہے سر." حسین نے اطلاع کی..

برمانی متجسس ہو گیا۔ "سائیں.. یہ پھنگر؟.. بلتی زبان کا کوئی لفظ ہے؟"

"نہیں سر.. انگلش میں کہتے ہیں.. پھنگر پیک.. پھنگر." اس نے انگلی کھڑی کر کے ہمیں بتایا کہ یہ والی.. پھنگر!

معلوم ہوا کہ یہ چوٹی پھنگر.. یعنی فنگر پیک اس لیے کہلاتی ہے کہ اس کی ساخت اور شکل دور سے ایک انگلی کی مانند اٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے بلکہ دو انگلیوں کی مانند کہ وہ دو چوٹیاں تھیں جو آسمان کو انگلی دیتے ہوئے کہتی تھی کہ خبردار ہم پھنگر پیک ہیں..

اس پھنگر سے یاد آیا کہ ہوشے سے نکلتے ہی، ہم متعدد پروفیشنل قسم کے بچہ لوگ کی یلغار میں آ گئے جو ہم سے بزبان انگریزی چاکلیٹ، سویٹ، ٹافی وغیرہ کی ڈیمانڈ کرنے لگے..

پروفیشنل اس لیے کہ شمال میں ہر وہ قصبہ یا آبادی جہاں سے بلند پہاڑوں کو راستے جاتے ہیں وہاں کے بچے جانتے ہیں کہ صبح سویرے غیر ملکی کوہ نوردا پر جانے کے لیے نکلیں گے اور ان کے پاس چاکلیٹ اور ٹافیاں ہوتی ہیں جو ہمارے لیے ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ ایک طے شدہ شیڈیول کے مطابق اپنا حق وصول کرنے کے لیے آپ پر حملہ آور ہو جاتے ہیں..

ہم نے ہوشے میں ایک بورڈ پر یہ عبارت پڑھی تھی کہ براہ کرم ہمارے بچوں کو ٹافیاں اور سویٹس دے کر نہ ترغیب دیجئے بلکہ انہیں کاپیاں اور پنسلیں تحفے کے طور پر پیش کیجئے تاکہ وہ تعلیم حاصل کر سکیں..

ہمارے پاس ان بچوں کو ترغیب دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم اپنے ساتھ کاپیاں اور پنسلیں لانا بھول گئے تھے.. چنانچہ انہیں ٹافیاں اور سویٹس تاوان کے طور پر ادا کر دی گئیں.. ان میں سے ایک بچے نے اپنا نام عمران خان بتایا اور دوسرے نے سینہ پھلا کر ایڑیوں پر ذرا بلند ہو کر کہا کہ میں.. مشابرم خان ہوں..

یہ مشابرم خان ابھی ایک میٹر کا بھی نہ تھا لیکن.. 7821 میٹر بلند چوٹی کی ہمسری کرنے میں کیا برائی ہے..

چنانچہ ہم آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ مشابرم کو تو ہم نے ٹافیاں کھلائی تھیں اپنے ہاتھ سے.. لنچ بریک کے دوران میں ایک تو ہم نے پھنگر پیک کو دریافت کیا اور اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس پیک کے برابر میں کوئی ایسا راستہ نکلتا ہے جو کھوبرسے میں جا اترتا ہے..

"کے ٹو کہانی" کے دوران.. پائیو اور للی گو کے بعد بالتورو گلیشیئر کے کناروں پر جو ایک خیمہ گاہ تھی.. جہاں ہم نے ایک اُمڈتے ہوئے گلیشیئر کے سامنے رات کی تھی تو وہ خیمہ گاہ کھوبرسے تھی.. اور یہ اُمڈتا ہوا گلیشیئر کھوبرسے کا تھا جو ہمارے قیام کے ایک دو برس بعد یوں اُمڈا کہ اس خیمہ گاہ کو روندتا بالتورو میں اُتر گیا.. اس سفر کے دوران ہم ہر طور کے ٹو ٹریک کے حوالے اتنے تھے.. کیونکہ.. یہاں واقعی اُدھر تم اِدھر ہم.. والا معاملہ تھا.. کنکورڈیا کو جانے والے بالتورو گلیشیئر کا وجود ان چوٹیوں کے دوسری جانب چلتا تھا..

صنوبر کے چھدرے سائے ہمیں آسودگی نہ دے سکے اور ہم لنچ نگل کر پھر سے رواں ہو گئے.. چراکسا دریا.. صنوبر کے درختوں اور جھاڑیوں سے پرے بہتا تھا.. اور پھر ہم اس کے کناروں پر آ گئے.. کناروں پر دُور دُور تک پتھر تھے اور نرم ریت تھی..

دوپہر خاصی ڈھل چکی تھی۔ لیکن ہماری منزل کا کچھ پتہ نہ تھا۔ کوئی نشان نہ تھا.. جس منزل کا نام بھی یاد نہ رہے وہ بھلا کیسے آ سکتی ہے..

تھک سب چکے تھے لیکن اقرار کوئی نہ کرتا تھا..

بے بس سب ہو چکے تھے لیکن شکایت کوئی نہیں کرتا تھا..

کہ ٹریک کے پہلے روز ہی اگر اس قسم کے شکوے شروع ہو جائیں اور یہ بھی بتایا گیا ہو کہ یہ تو دو چار گھنٹے کا آسان راستہ ہے تو پھر کوئی بھی شکوہ کر کے اپنی مردانگی مجروح نہیں کرتا.. دریا کے ہموار کناروں کے بعد اس کے پانی قریب آ گئے اور ہم موسیٰ نہیں تھے جو اس میں اپنی واکنگ سٹک پھینک کر اسے دولخت ہو جانے کا حکم دیتے اور درمیان میں سے گزر جاتے۔ اس لیے ہم دریا پر معلق چٹانوں کے اوپر چڑھنے لگے..

پہلی بار ایک قدرے مشکل راستہ قدموں تلے آیا.. جس میں اگرچہ بلندی کم کم تھی لیکن خطرناکی تھی.. یعنی اگر پاؤں پھسلتا تھا تو ہم لڑھکتے ہوئے نیچے پانیوں میں جاتے تھے..... اگرچہ یہ پانی بھی کم کم تھے نہ ہمیں بہا کر لے جا سکتے تھے نہ ڈبو دینے کی صلاحیت رکھتے تھے.. جان تو نہیں جا سکتی تھی ایک آدھ ہڈی ٹوٹ سکتی تھی لیکن یہ بھی غنیمت تھا۔ اسی لیے یہاں پہنچ کر میاں صاحب پہلی بار چہکے بلکہ خوشی سے نڈھال ہو گئے۔ "شکر ہے کہ ایسا نامہ نیم راستہ بھی آیا ہے.. واہ جی واہ.."

"کیوں واہ جی واہ.." میں نے اس راستے پر اپنے آپ کو قائم رکھنے اور نیچے نہ گرنے کی سعی میں جھنجھلا ناگواری سے پوچھا..

"سر جی.. ہوشے سے یہاں تک تو بس مشقت اور مزدوری تھی.. طبیعت آوازار ہو گئی تھی بے مقصد چلتے چلتے.. اب کچھ کچھ خطرناکی کے آثار پیدا ہوئے ہیں تو بادشاہو سواد آ گیا ہے.."

میاں صاحب کی کوہ نوردی کی منطق یہ تھی کہ جب تک کہیں بلندی سے گر کر ہلاک ہو جانے یا دریا برد ہو کر موت کے سپرد ہو جانے کے امکانات پیدا نہیں ہوتے تھے، انہیں سواد نہیں آتا تھا.. یہ نیم ہلاکت خیز راستہ بدقسمتی سے فوراً ہی تمام ہو گیا اور پھر سے صنوبر کے درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا..

ہم ایک مدت تک ان میں چلتے رہے.. ہمارے برابر میں دریا چنگھاڑتا تھا اور ہمیں مزید بہرا کرتا تھا..

"تارڑ صاحب.." عامر میرے برابر میں چلتا تھا.. کے ٹو کے بعد پہلی بار کسی ٹریک میں

چلتا تھا اور ابھی تک اس کی سختی سے مفاہمت نہیں کر پایا تھا۔ "ہمیں اس دریا کے پار جانا ہے؟"

"پتہ نہیں.."

"دریا کے پار ایک بہت بڑا گلیشیئر دکھائی دے رہا ہے جو گندوگورو ہی ہو سکتا ہے تو کیا ہم نے وہاں تک جانا ہے اور کل صبح اس کے اندر جانا ہے؟"

"پتہ نہیں۔"

"ویسے آپ کو پتہ کیا ہے؟"

"پتہ نہیں.."

اور یہ حقیقت ہے کہ مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ ہم نے آج کہاں جانا ہے.. صرف یہ پتہ تھا کہ کہیں نہ کہیں جانا ہے..

"کچھ تو پتہ ہوگا.."

"صرف یہ پتہ ہے کہ کسی ایسی جگہ جانا ہے جس کا نام چین کے شہر ہانگ چو سے ملتا جلتا ہے۔"

ہم جھاڑیوں اور بلند گھاس میں چل رہے تھے..

"اگر تو ہم نے اس دریا کے کناروں پر سفر کرنا ہے تو مجھے آگے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا اور اگر ہم نے اس کے پار جانا ہے تو یہ اس مقام پر براللدو جیسا ہے اور ہم درجن بھر پورٹروں کے کندھوں پر سوار ہو کر بھی اس کے پار نہیں اتر سکتے جب تک کہ اس پر ایک پُل نہ ہو... جو نہیں ہے۔"

"ہاں پُل تو نہیں ہے.. اگر ہوتا تو نظر آ جاتا.."

اور عین اس لمحے جب عامر نے یہ کہا کہ.. جب تک اس پر ایک پُل نہ ہو... جو نہیں ہے.. اور میں نے جواب میں ابھی یہی کہا تھا کہ ہاں پُل تو نہیں ہے.. اگر ہوتا تو نظر آ جاتا.. ایک پُل نظر آ گیا.. جھاڑیوں کی اوٹ میں سے ایک نہایت ٹیکنی کلر قسم کا پُل دکھائی دینے لگا..

"یار تم پہلے ہی کہہ دیتے کہ اس دریا کو ایک پُل کے بغیر پار نہیں کیا جا سکتا تو یہ پُل پہلے ہی نمودار ہو جاتا.."

چڑاکسا دریا کہیں پیچھے سے چلا آ رہا تھا اور سامنے جو گندوگورو کا عظیم اور ہیبت ناک گلیشیئر دکھائی دے رہا تھا، اس میں سے اسی نام کا دریا اتر رہا تھا اور یہاں دونوں دریاؤں کا سنگم تھا

اور اس پر ایک تنکنی کر یل تھا..

یہ پُل اگر کہیں اور ہوتا تو اس کے شوخے رنگ ذوق جمال کو شدید طور پر زخمی کرتے لیکن یہاں گلگت، سکردو، چیلاس اور ہوشے سے بھی کہیں آگے جہاں یاکوں کے ڈھیر صنوبر کے سایوں میں پڑے تھے.. اور مستغر پیک تھی اور چرا کسا ایسے نامعلوم دریا بہتے تھے وہاں یہ پُل ایک ورک آف آرٹ تھا..

اسے عجیب سائیکی ڈیلک قسم کے رنگوں سے پینٹ کیا گیا تھا. لگتا تھا کہ اسے پینٹ کرنے کا ٹھیکہ گل جی کو دیا گیا تھا جس نے اپنے سٹوڈیو میں جتنے بھی بچے کھچے رنگ تھے، وہ اس پر تھوپ دیے تھے..

بہرحال یہ ایک باقاعدہ پُل تھا.. کالمدے کے نالے پر رکھے دو شہتیر نہ تھے.. اگرچہ اس کا لباس ہمارے گھر میں صفائی کرنے والی اس اماں کے لباس کے اس رنگ کا تھا جو وہ کرسمس کے موقع پر چرچ جانے کے لیے زیب تن کرتی تھی..

اور یہ عیسائی اماں.. جس کا ناک نقشہ ''بہاؤ'' کی دراوڑ پاروشنی ایسا تھا.. بے حد دانا اور اَن پڑھ ہونے کے باوجود دانش رکھنے والی اماں تھی.. ایک بار میرے بچوں نے پوچھا کہ اماں آپ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتیں تو اس نے کہا۔ ''بیٹا میں مسلمان ہو جاؤں تو بھی کیا آپ مجھے اپنی چارپائی پر برابر میں بیٹھنے دیں گے.. تو جہاں مجھے برابر میں بیٹھنے دیا جاتا ہے وہیں کیوں نہ بیٹھی رہوں..''

چرا کسا اور گندو گورو دریاؤں کے سنگم پر جو تنکنی کلر پُل تھا، ذرا دیکھئے کہ وہاں لاہور میں ہمارے گھر کے فرشوں پر گھسٹتی اَن پڑھ کی پھیرتی اماں کیسے آ گئی.. اس پُل پر قدم رکھا تو نیچے سے پانیوں نے اک ہوائے سرد ہمارے استقبال کو بھیجی جس کی خوشگوار ٹھنڈک سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہم کچھ دیر اس کے درمیان میں کھڑے ہو کر لمبے لمبے سانس لیتے رہے..

برمانی اور سلمان کہیں آگے دفع ہو چکے تھے..

لیکن پیچھے میاں صاحب، شاہد اور حسن تھے..

اور ہم.. میں اور عامر پُل پر کھڑے لمبے لمبے سانس لیتے تھے..

پُل کے پار ایک معمولی سی چڑھائی تھی اور اس کے اوپر جھاڑیوں.. بے ترتیب پودوں کا ایک گمناز ذخیرہ تھا جہاں پر ہم رُک گئے..

ایک دوراہا آ گیا تھا..

ہم رُک گئے..

آس پاس کوئی نہ تھا جس سے یہ پوچھتے کہ بھائی صاحب ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ ہم نے کہاں جانا ہے.. اور جدھر بھی جانا ہے تو ان دو راستوں میں سے کونسا راستہ ہے جدھر ہم نے جانا ہے..

ہم دونوں.. دو درویش تھے.. جو ایک دوراہے پر کھڑے ہو گئے تھے..

کونسے درویش تھے؟..

شاید ''تذکرہ غوثیہ'' یا ''سکینۃ اولیاء'' میں یہ قصہ درج ہے کہ..

دو درویش ایک گھنے اور تاریک جنگل میں جا رہے تھے.. ایک بابا درویش تھا یعنی مرشد اور دوسرا بانکا درویش تھا یعنی مرید.. سامنے ایک ایسا ہی دوراہا آ گیا تو بانکا درویش رُک گیا.. بابا درویش نے پوچھا.. کیا بات ہے، رُک کیوں گئے ہو؟.. اس پر بانکے نے کہا کہ بابا میں سوچ رہا ہوں کہ اب ان دو راستوں میں سے کونسا ایک راستہ اختیار کروں..

اس پر بابا درویش نے فوری طور پر بانکے درویش کے لیے چوغے کی تلاشی لی.. اس کی اندرونی جیب میں سے ایک چونّی برآمد ہوئی جو بابا درویش نے نکال کر پھینک دی اور پھر پوچھا۔ ''ہاں بانکے.. اب بتاؤ کدھر جانا ہے.. کونسا راستہ اختیار کرنا ہے؟''

بانکے نے کہا ''اب تو کسی بھی راستے پر چل دیں، کیا فرق پڑتا ہے؟''

بانکا اسی لیے رُکا تھا کہ اس کی جیب میں ایک چونّی تھی اور وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اس راستے میں.. یا اس راستے میں ڈاکو نہ ہوں اور مجھے لوٹ نہ لیں.. میری چونّی نہ چھین لیں.. جب چونّی نہ رہی تو تمام راستے ایک جیسے ہو گئے..

ہم دونوں کی جیبوں میں بھی ایک چونّی تھی اور ہم ڈرتے تھے کہ اب کونسا راستہ اختیار کریں..

یہ چوٹی.. وہ منزل.. وہ خیمہ گاہ تھی جہاں ہم پہنچنا چاہتے تھے.. اور ہم اسے کھونا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ہم دونوں اس دوراہے سے الگ الگ راستوں پر کچھ دور.. کچھ دیر چلیں اور پھر دیکھیں کہ کونسا راستہ اس چوٹی کی جانب جاتا ہے..

میں دائیں ہاتھ ہو گیا اور عامر بائیں راستے پر چڑھنے لگا.. تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے.. پھر جھاڑیوں میں سے ہکلاتی عامر کی آواز آئی۔

"تارڑ صاحب آپ صراط مستقیم پر ہیں.. یہ والا راستہ تو آگے سے بند ہو گیا ہے۔"

میں نے بھی آواز لگائی کہ.. زندگی میں پہلی بار صراط مستقیم پر چلا ہوں.. اب تمہارا انتظار کرتا ہوں، واپس آ جاؤ..

میں نے انتظار کیا اور وہ آ گیا..

ہم چند قدم آگے چلے ہیں تو سامنے منظر یوں کھلا جیسے راضی بہ رضا محبوب کے بند قبا کھلتے ہیں..

"شائی مچو کا خیمہ شہر.. ندیاں اور صنوبر کے ٹھگنے درخت"

سامنے.. ایک جھاڑیوں بھرا.. ندیوں بھرا پھیلا میدان ہے جس کے پس منظر میں کچھ برفپوش بلندیاں ہیں جو بہت نا آشنا اور پُر فریب ہیں اور یہ میدان رنگ رنگ کے درجنوں خیموں سے بھرا ہے.. لگتا ہے کہ یہاں بھی ہوشے کی مانند ہمیں خیمے لگانے کے لیے جگہ نہیں ملے گی، یہ اتنا خیموں بھرا ہے.. ایک پتھریلی آماجگاہ بھی دکھائی دے رہی ہے جس میں گورا اور گوری لوگوں کا جمگھٹا پتہ نہیں کیا کر رہا ہے.. ہم دونوں نیچے ایک پُر شور نالے کی سطح پر آئے تو وہاں ایک بڑے پتھر پر ایک گورے کو گیان دھیان میں گم پایا.. وہ پانیوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا یعنی اپنے ہی قبیلے کا تھا، پاگل تھا.. ہم اسے دیکھتے اس کے قریب سے گزرے تو اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ ہم گزرے ہیں.. وہ بھی گزر رہا ہوا لگتا تھا..

ذرا آگے ہوئے.. ایک ندی کو پھلانگ کر عبور کیا تو اس پُر ہجوم خیمہ بستی میں داخل ہو گئے اور اس بستی کا نام اب کہیں مجھے یاد ہوا ہے.. یہ ہانگ چو نہیں شائی چو تھی..

ظاہر ہے ہم تو اس خیال میں مست تھے کہ وادی 'نمچلو' سے آگے.. مچلو اور تلس سے پرے یہاں تک کہ ہوشے ایسے دور افتادہ گاؤں سے بھی کہیں آگے ایک پیدل مسافت کے بعد جب ہم شب کے لیے کسی خیمہ گاہ میں پہنچیں گے تو وہاں ایک بڑی ویران گم صم تنہائی ہوگی.. بس ہم ہوں گے اور کوئی نہ ہوگا اور ہم آسمان سے باتیں کرتے پہاڑوں سے باتیں کریں گے.. عام طور پر تو یہی ہوتا تھا.. لیکن یہاں پہنچے ہیں تو خیموں کا ایک گاؤں آباد ہے۔ نصف یورپ کے کوہ نورد یہاں خیمہ زن ہیں.. اور گورے اتنی تعداد میں گھومتے اور مسخریاں کرتے پھرتے ہیں کہ ٹریفک جیم ہو رہا ہے.. وہ جو پتھریلی آماجگاہ ہے تو دراصل کچھ ہوٹل سا ہے جس کے برآمدے میں میم لوگ

ٹانگیں پھیلائے کافی پیتا ہے اور اپنے مدت سے ان نہائے بدنوں کو کھجلی وغیرہ کرتا ہے۔۔

ہماری آمد کو مجال ہے کسی نے بھی نوٹ کیا ہو۔۔ہوٹل کے قریب ندی کے اوپر ایک کھوکھا سا بنا ہوا تھا جس پر TWILIT لکھا ہوا تھا اور اُس پینٹر کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا جس نے گندوگورو نالے والے پُل کو پینٹ کیا تھا۔ اگر آپ کی انگریزی کمزور ہے تو آپ کی اطلاع کے لیے یہ "ٹائلٹ" لکھا ہوا تھا۔۔۔ندیوں کے بیچ کچھ ریتلے جزیرے سے ہیں جن میں مختلف گروپوں کے رہائشی ٹینٹ، ڈائننگ ٹینٹ اور کچن ٹینٹ ایستادہ ہیں۔۔اس جہان خیمہ جات میں ہم کھوسے گئے کہ ہم کدھر جائیں کہ نہ ہمیں کہیں اپنے خیمے نظر آرہے تھے اور نہ پورٹر دکھائی دیتے تھے۔۔

یہ تمام گورا لوگ اسکولے سے کے ٹو بیس کیمپ تک جا کر پھر واپس درہ گندوگورو کے راستے یہاں شائی چُو پہنچے تھے اور یہ ایک بہت ہی طویل اور سخت کوہستانی سفر کا اختتام تھا، اس لیے وہ ریلیکس کر رہے تھے۔۔مزے کر رہے تھے۔۔

ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ایک بلند قامت جرمن خاتون ٹائٹ جین اور بلاؤز میں پھنسی کھڑی ہے، سنہری بالوں والی ہے لیکن نہایت مردانہ شخصیت کی مالک ہے اور وہ اپنی آٹھ سالہ بیٹی کو۔۔جو بالکل اپنی ماں کی آٹھ سالہ ہو بہو ہے۔۔ترغیب دے رہی ہے کہ یہ ندی خود چھلانگ کر پار جاؤ۔۔بچی اپنی پونی ٹیل لہراتی بڑے مزے سے چھلانگ لگا کر دوسری جانب چلی جاتی ہے۔۔

"تارڑ صاحب۔۔" عامر پہلی بار بولا۔ "یہ بچی بھی تو گندوگورو درہ عبور کر کے آئی ہوگی۔۔رسّوں کے سہارے نیچے اُتری ہوگی۔۔تو یہ لوگ اگر اس عمر میں ہی اس قسم کی حرکتیں شروع کر دیتے ہیں تو ذرا جوان ہونے پر یہ کے ٹو یا ایورسٹ کی چوٹی پر بھی تو یونہی چھلانگیں لگاتے پہنچ جاتے ہوں گے۔۔"

"یہ لوگ ہر قسم کی حرکتیں اسی عمر سے شروع کر دیتے ہیں اور نوجوان ہوتے ہیں تو استاد ہو جاتے ہیں۔۔ہم یہ حرکتیں اوّل تو کرتے ہی نہیں، اگر کرتے ہیں تو نوجوانی کے ڈھلنے پر شروع کرتے ہیں اور پھر ہمارا وہی حال ہوتا ہے جو۔۔۔ہمارا اب ہو رہا ہے۔۔"

ہم خیمہ بستی میں سے گزرتے۔۔ندیاں۔۔بلکہ چھوٹی چھوٹی برفانی نالیاں پار کرتے بالآخر شائی چُو کے کناروں پر آ گئے جہاں ابھی سورج کی تمازت تھی اور ہمارے خیمے تھے۔۔کچن ٹینٹ قائم ہو چکا تھا اور اسحاق باورچی ایک بہت ہی شور کرتے ستوو پر آلو کے قتلے فرائی کر رہا تھا۔۔

علی موسیٰ ایک نہایت ہی غلیظ جگ میں ٹینگ کے زرد پانی گھولتا ہمارے پاس آ گیا۔۔

یہ گندا جگ۔۔چند دیگچیاں۔۔ایک کڑھائی۔۔روٹیاں گرم رکھنے کے لیے ایک غلیظ پلاسٹک کا ہاٹ پاٹ۔ کچن ٹینٹ کے لیے ترپال وغیرہ سلمان نے ہوشے سے کرائے پر حاصل کیے تھے۔۔ہم نے تب تو ان کی مخدوش بُودار حالت کو دیکھ کر نہایت ناگواری کا اظہار کیا تھا لیکن جُوں جُوں ہم بلند ہوتے گئے، یہ آلات ہمیں عزیز تر ہوتے گئے۔۔کیونکہ جگ میں ٹینگ کا زرد جوس گھولا جاتا تھا۔۔کڑھائی میں قتلے اور بالآخر پکوڑے تلے جاتے تھے اور ہاٹ پاٹ میں ہمارے پراٹھے گرم رہتے تھے۔۔سلمان بھالو اور چوٹی زریں کا تازہ دم گھوڑا بردار پہلے آ چکے تھے۔۔پھر میں اور عامر پہنچے۔۔حسن صاحب آئے اور پھر میاں صاحب اور شاہد لو برڈز کی طرح چہکتے پیار کرتے وارد ہوئے۔۔

"واہ جی واہ۔۔" میاں صاحب کے کسے ہوئے سُرخی چہرے پر ایک ایسے کوہ نوردی کی مسکراہٹ پھیلی جو دربدر ہوتا ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جس کے سامنے انجانی چوٹیوں کی برفیں بلند ہوتی ہیں اور وہ اپنی تھکاوٹ بھول جاتا ہے۔ "واہ جی واہ۔۔شاؤ چُو چُو کی کیا بات ہے۔۔"

"یہ شاؤ چُو چُو نہیں ہے میاں صاحب۔" سلمان نے ہنس کر کہا۔ "شائی چُو ہے۔"

"اوئے کُل مان۔۔تو پہلے کبھی ادھر آیا ہے؟"

"نہیں میاں صاحب۔"

"تو پھر تمہیں کیسے پتہ ہے کہ یہ شائی چُو چُو ہے یا شائی چُو ہے؟"

"ویسے شائی چُو ہے میاں صاحب۔۔" سلمان نے کھسیانے ہو کر کہا۔۔

"ہو گا شائی چُو۔۔لیکن ایسی زبردست نامہ نیم جگہ ہے کہ اس کے ساتھ ایک اور "چُو" لگا دیں تو کیا حرج ہے۔ بزرگوں کو ٹوکا نہیں کرتے۔۔بھالو بچے۔۔"

"میاں صاحب۔۔بھالو بن کر دکھاؤں؟"

"دکھاؤ۔۔"

سلمان نے ہاتھ اونچے کر کے اپنی دونوں ہتھیلیاں نیچے کر لیں جیسے ریچھ ناچتے ہوئے کر لیتے ہیں۔۔

"تم بہت اچھے بچے ہو۔۔" میاں صاحب نے نہایت محبت بھرے انداز میں داد دی۔۔

"میں بہت اچھا بھالو ہوں۔۔"

"سلمان تم مائنڈ نہیں کرتے جب تمہیں بھالو کہا جاتا ہے؟" شاہد نے نہایت سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"شاہد صاحب یہ مائنڈ کر جانے والے شعبے کے انچارج آپ ہیں.. یاد ہے جب آپ دیوسائی ٹریک کے دوران پائینچے چڑھائے جرابوں کے بغیر جوگرز پہنے میرے آگے آگے چلتے تھے اور میں نے کہا تھا کہ شاہد صاحب آپ علاقہ.. کر کے آئے ہیں تو؟"

"شٹ اَپ سلمان۔" میں نے اسے ڈانٹا۔

"سوری سر۔"

سلمان ابھی ایک جنگلی سا بھالو تھا.. اور نہیں جانتا تھا کہ سینئرز کے ساتھ اس قسم کی بے تکلفی نہیں کیا کرتے.. ہم اسے سدھانے کی پوری کوشش کر رہے تھے..

ویسے کیا ہم سب میں اتنا بڑا دل تھا کہ ہم سلمان کی طرح اقرار کر لیں کہ ہم کیا کیا تھے.. کیا میاں صاحب اپنے آپ کو ایک شاطر شتر مرغ کہہ سکتے تھے..... میں اپنے آپ کو ایک مخرب الاخلاق گدھ قرار دے سکتا تھا.. شاہد ایک عیار لومڑ ہونے کا اقرار کر سکتا تھا.. بر مانی ایک سحر انگیز آنکھوں والا کوبرا ہو سکتا تھا.. عامر کہہ سکتا تھا کہ میں ایک سوچ میں گم رہنے والا وا ہیات اُلو ہوں.. البتہ حسن صاحب کچھ بھی ہو سکتے تھے..

ہم سب میں کوئی نہ کوئی جانور ہوتا ہے لیکن ہم اقرار نہیں کرتے..

سلمان اقرار کر لیتا تھا..

ٹیم شائی ٹچو پہنچنے پر.. خوش ہو گئی تھی..

شائی ٹچو.. کسی حد تک کے ٹو ٹریک کے دوران اشکولے کے بعد آنے والی خیمہ گاہ کوروفون سے مشابہ تھا.. وہاں بیافو کی ٹوتھی، خیمہ گاہ پر معلق بادلوں اور دھند میں تھی اور اُس میں سے جو ندیاں نکلتی تھیں، وہ نیچے ریتلے میدانوں میں اُترتی اور پھیلتی تھیں اور یہاں جو ندیاں تھیں وہ گندو گورو گلیشیر میں سے نکل کر شائی ٹچو میں رواں ہوتی تھیں.. ندیاں تھیں.. جھاڑیاں اور صنوبر کے ٹھگنے درخت تھے لیکن یہاں ہجوم بہت تھا.. کوروفون میں.. کم از کم اُس شب.. صرف ہم تھے..

ہمارے خیمے شائی ٹچو کے کناروں پر.. ایک برفانی اور بہت ہی خاموش سی ندی کے کنارے اپنے رنگ رنگ وجودوں کے ساتھ ایستادہ ہو چکے تھے اور ہم گھر والے ہو چکے تھے.. اس ندی کے پار.. جدھر سے ہم آئے تھے اس جانب کسی ہسپانوی گروپ کے بے شمار خیمے تھے اور

انہوں نے ہماری آمد اور ہمارے خیموں کو ناپسند کیا کیونکہ ہم نے اُن کا منظر بلاک کر دیا تھا..

اور یہ منظر.. اجنبی اور نا آشنا برفیلی چوٹیوں کا دل کش اور سحر انگیز تھا اور اب ہمارے خیموں کے بالکل سامنے.. ایک بڑے گلیشیر اور ایک بڑی ویرانی سے پرے یوں بلند ہوتا تھا جیسے وہ صرف ہمارے لیے ہی ہو..

کچن ٹینٹ میں ہمارا نیا خرید کردہ چولہا دھڑ دھڑ جلتا تھا اور اس پر رکھی کڑھائی میں سے آلو کے گرم گرم قتلے اُتر رہے تھے جو ٹماٹو ساس کے ہلکے سے چج کے ساتھ اپنی گرمی ذرا سی بجھا کر ہمارے منہ میں اُترتے تھے اور ہم خیموں کے آگے شانت بیٹھے سامنے کے منظر کو دیکھتے جاتے تھے..

ابھی ہم سائے میں بیٹھنا چاہتے تھے اور ابھی دوپہر ڈھل گئی.. تمازت رخصت ہوئی تو اس کی جگہ ایک سرد ہوا چلنے لگی..

"کیا بات ہے شائی ٹچو چوکی.." میاں صاحب نے پھر داد دی..

میاں صاحب میں... بے لگام قدرتی اور پہاڑی منظروں کو اپنے سراپے میں وصول کرنے کی ایک ایسی حس ہے کہ وہ ان میں کھو جاتے ہیں.. اور انہیں بیان کرنے کے لیے گفتگو میں موتی پرونے کی کوشش نہیں کرتے بس ایک "واہ جی واہ" یا "کیا بات ہے" کہہ کر اپنا مکمل اظہار کر دیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب بڑے دیوسائی سے مرتضیٰ کیمپ میں اُترتے ہوئے جیپ کی اگلی نشست پر براجمان جب ہم دونوں کے سامنے یکدم چھوٹے دیوسائی کی سرسبز.. حیرت انگیز.. ایک وادی میں اُترتی سفید ندی اور اس پر سفید بادلوں کے پرے کے پرے.. اور قطعی طور پر ناقابل یقین حُسن کی دنیا دکھائی دی تو ہم دونوں نے "سبحان اللہ.. سبحان اللہ" کا ورد شروع کر دیا تھا.. اس کے سوا ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہم کیا کریں، کیا کہیں؟ تو یہاں بھی ان کا یہی کہنا کہ.. کیا بات ہے شائی ٹچو چوکی.. اس منظر کو بیان کرنے کے لیے کافی تھا..

علی موسیٰ ایک بلتی بچہ پورٹر.. میں اُس سے سوال کر رہا تھا اور وہ مجھے سامنے والے پہاڑوں کے بارے میں بتا رہا تھا.. "صاحب.. یہ جو برف والا دو چوٹی ادھر شائی ٹچو سے بہت نظر آتا ہے.. اُس پتھریلے اُبھار اور پھر ایک بڑا گلیشیر کے آخر میں.. قریب نہیں.. لیکن قریب نظر آتا ہے تو یہ کے[1] سیکس اور کے سیون کا چوٹی ہے.. بہت لوگ ادھر شائی ٹچو میں اس لیے آتا ہے کہ اُدھر ان چوٹی کے بیس کیمپ میں جائے.. صاحب ہم تو اُدھر گیا ہے بہت خوبصورت جگہ ہے ناں.."

---

[1] K7 ' K6 J

"تو کیا گندو گورو درّے کے بیس کیمپ سے بھی زیادہ خوبصورت جگہ ہے؟"

"تو اور کیا صاحب.. گندو گورو کا بیس کیمپ تو کچھ بھی نہیں.. فضول ہے.. اور پھر بھی سب لوگ اُدھر جاتا ہے۔ اُدھر کے سکس اور کے سیون کا جو بیس کیمپ ہے اُدھر جھیل ہے اور میدان ہے.. اور میدان میں یہ اتنا بڑا بڑا اونچا گھاس ہے کہ اس میں بندہ چھپ جاتا ہے.. ایسا گھاس ہے۔"

"اچھا؟" ہم میں سے کسی کا منہ کُھل گیا..

"جھیل ہے اور بہت بڑا بڑا گھاس ہے علی موسیٰ؟" کسی اور نے ایک آہ سی بھری..

"ہاں ناں.."

"تارڑ صاحب.. یہ کیسا رہے گا.. گندو گورو نہ جائیں اُدھر کے سکس اور کے سیون کے بیس کیمپ میں چلیں جدھر جھیل ہے اور لمبا لمبا گھاس ہے۔" کسی نے صلاح دی..

"اُدھر لمبا لمبا گھاس کیوں ہے؟" میں نے پوچھا..

"اس لیے صاحب کہ اُدھر تک مویشی نہیں پہنچ سکتا.. راستہ مشکل ہے تو مویشی مرجاتا ہے۔ اس لیے اُدھر لمبا لمبا دنیا جہان کا گھاس ہے۔"

"اگر اُدھر مویشی نہیں پہنچ سکتا تو ہم کیسے پہنچ سکتا ہے علی موسیٰ؟"

کوہ نوردوں کا ایمان بڑا کمزور ہوتا ہے.. انہیں پہاڑوں کا کوئی اجنبی خواب دکھا دیا جائے تو وہ فوراً بے ایمان ہو جاتے ہیں.. ایسے ندیدے بچے ہوتے ہیں کہ ایک ٹافی ہاتھ میں ہے اور دوسری دیکھتے ہیں تو رال ٹپکنے لگتی ہے... ہم نے ایک بار مشابرم کو ترک کر کے گندو گورو کو چن لیا تھا اور اب ایک مرتبہ پھر بے وفا نہیں ہونا چاہتے تھے..

ویسے اس لمحے ہمارے اردگرد شائی چو میں شام ہی شام تھی لیکن سامنے کے سکس اور کے سیون اسی شام کی آخری کرنوں کے سونے سے اپنے لیے برفانی جُھمکے، جھانجریں اور کنگن بنا رہی تھیں.. زرد رنگ کے ایسے برفانی گہنے بنا رہی تھیں کہ ہم میں سے کوئی بھی ان زرد شہزادیوں کے عشق میں مبتلا ہو کر گندو گورو جانے سے انکاری ہو سکتا تھا.. اور اگر کوئی ایک ہو جاتا تو ہم سب ہو جاتے.. اور پھر ان زرد شہزادیوں کے دامن میں ایک جھیل بھی تھی اور لمبا لمبا گھاس بھی تھا..

"نہیں نہیں پہنچ سکتا ہے صاحب.. گندو گورو سے آسان ہے.. دیکھیں ہمارے ٹینٹ کے آگے جو ایک میدان سا ہے جس کے ایک طرف دریا ہے تو اس میدان کے آگے وہ چھوٹا خشک

پہاڑی ہے ناں.. آدھے گھنٹے میں اُدھر پہنچے گا.. پہاڑی سے آگے ایک گلیشیر ہے اس پر چل کر پہلی رات کرے گا اور اس سے اگلے دن کے سکس کے بیس کیمپ پہنچ جائے گا.. یہ لمبا لمبا گھاس ہے صاحب اور جھیل ہے اور.."

یہاں پر ہم نے علی موسیٰ کی زبان بندی کر دی کیونکہ ہم پھر بے ایمان ہونے کو تھے..

کہتے ہیں جس سروے کرنے والے نے ان شمالی علاقوں کو نقشے پر لانے کے لیے یہاں کی چوٹیوں کی بلندی کا حساب کتاب کیا۔ اُس نے چوٹیوں کے ایک پورے سلسلے کا نام "کے" سے شروع کیا اور پھر اپنے تئیں جو سب سے بلند چوٹی تھی، اُسے کے ون کا نام دیا.. اس کے بعد جو کم بلندی کی چوٹی تھی اُسے کے ٹو کہا.. اور پھر تھری فور فائیو کے بعد کے سکس اور کے سیون کو شناخت ملی..

بہت بعد میں جب ذرا تفصیل سے بہتر آلات کی مدد سے بلندیاں ناپی گئیں تو معلوم ہوا کہ بلند ترین بلکہ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو تھی..

چنانچہ ہمارے سامنے زرد اور بجھتی کرنوں کے گہنوں سے لدی جو دو چوٹیاں تھیں، وہ کے ٹو کی بہنیں تھیں.. اور یہ کمبخت بہنیں اتنی سوہنی تھیں کہ اس سے اس سردیلی شام میں شائی چو کی شام میں اُن کے بلاوے آتے تھے..

کہتے ہیں کہ اُدھر سے.. مقاماتِ مقدسہ کی جانب سے بھی بلاوے آتے ہیں تب انسان اُدھر کوچ کرتا ہے یا اپنے بس کی بات نہیں ہوتی..

کے سکس اور کے سیون بھی حجرِ اسود کی مانند ایک بلاوے کی قوت رکھتی تھیں کیونکہ دونوں میں کم از کم پتھر ہونا مشترک تھا..

ہم کوشش کر رہے تھے کہ اس بلاوے پر دھیان نہ دیں.. اس لیے اُدھر دیکھنے سے اجتناب کرتے تھے۔ اِدھر اُدھر دیکھتے تھے۔ چنانچہ اس کوشش میں کسی نے دائیں جانب جو پہاڑ تھا اس کے اوپر ٹہلتے ہوئے دو یاکوں کی نشاندہی کی اور حیرت کا اظہار کیا کہ یہ کمبخت وہاں تک کیسے پہنچ گئے ہیں..

"جیسے وہ ہمیں نیچے یہاں دیکھتے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھتے ہوں گے کہ یہ کمبخت یہاں کیسے پہنچ گئے ہیں.."

شائی چو میں اگرچہ ہر طرح سے خیریت رہی لیکن ایک چھوٹا سا سانحہ ہو گیا..

میاں صاحب نے اپنے خیمے سے شاہد کو دھکیل کر باہر نکال دیا.. اس کا ساز و سامان، سلیپنگ بیگ وغیرہ باہر پھینک کر اُسے خیمے سے عاق کر دیا۔ "خان صاحب اپنا بندوبست خود کرو.. میں نوکر لگا ہوا ہوں تمہارا کہ اپنا خیمہ لاؤں.. اسے خود لگاؤں اور پھر تمہیں سلاؤں.. اور پھر تم رات کو خراٹے مار مار کر میرا اپھوس اُڑا دو.. ہوشے میں میں ساری رات سو نہیں سکا.. آج چلنے میں سب سے پیچھے تھا.. کیوں؟ صرف تمہارے نامعقول خراٹوں کی وجہ سے.."

شاہد اپنے بوریے بستر پر ایک اُداس پناہ گزین کی طرح بیٹھا تھا..

"میاں صاحب.." میں نے دخل در نامعقولات کرنے کی کوشش کی۔

"بس جی آپ لیڈر ہوں گے تو اپنے گھر ہوں گے۔" انہوں نے مجھے بھی جھاڑ پلا دی۔ "میں کل ساری رات سو نہیں سکا.. ایسی یاری مجھے وارا نہیں کھاتی جس میں خراٹے ہی خراٹے ہوں۔"

میاں صاحب واقعی جلال میں تھے کیونکہ اُن کی ہر "ز" جو تھی وہ "ژ" میں بدل رہی تھی..

"لیکن میاں صاحب آپ دونوں تو برسوں سے اکٹھے سوتے آئے ہیں.."

"وقت وقت کی بات ہے جناب.. اب برداشت نہیں ہوتا.. نہ میں جب خیمہ لگانے لگتا ہوں تو یہ اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے اور جب خیمہ تیار ہو جاتا ہے تو کہیں سے نمودار ہو کر کہتا ہے.. میاں صاحب کچھ ہیلپ کروں.. میرے تو اوپر نیچے کے بال جل جاتے ہیں یہ سُن کر.. تو جناب گذارش ہے میری طرف سے.."

"میاں صاحب کو بلندی ہو گئی ہے تارڑ صاحب.. ان کی باتوں کا مائنڈ نہ کریں۔" شاہد نے کھسیانے ہو کر ذرا سرگوشی میں مجھ سے کہا لیکن میاں صاحب نے سُن لیا اور چمک اُٹھے۔ "نہ میں تم سے کہہ رہا ہوں تو مائنڈ تم نے کرنا ہے کہ تارڑ نے.. اوئے بھائی مجھے تو کنکورڈیا میں بلندی نہیں ہوئی تھی یہاں شائی چو چو میں کیسے ہو جائے گی.... بس میری آنکھیں کھل گئی ہیں.. لیکن یاری کا معاملہ ہے، میں تمہارے لیے کچھ بندوبست کر دیتا ہوں۔"

میاں صاحب نے سامان میں سے ایک خیمہ نکالا جو برمانی اپنے ساتھ لایا تھا اور جس پر "پاکستان زندہ باد" لکھا ہوا تھا اور صرف اس مقصد کے لیے ساتھ لایا تھا کہ اگر کہیں ٹائلٹ ٹینٹ کی ضرورت پڑے تو اسے استعمال میں لایا جائے.. ورنہ وہ کوئی ایسا خیمہ نہ تھا جس میں کوئی خوددار شخص رات گزار سکے..

میاں صاحب نے وہ خیمہ نصب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا نامرد تھا کہ ایستادہ ہونے سے انکاری ہوتا جاتا تھا.. میخیں بھی پوری نہیں تھیں اور طنابیں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں اور میاں صاحب اسے زبردستی کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے تھے.. میاں صاحب اس پر پتھر رکھ کر اسے قائم رکھنے کی سعی کر رہے تھے..

"یہ تو ذرا سی ہوا کے چلنے سے گر جائے گا میاں صاحب.."

"نہیں گرتا تارڑ صاحب.. میں نے بہت سارے پتھر رکھ دیے ہیں.. اگر گر بھی جاتا ہے تو اندر سونے والا ہلاک تو نہیں ہو جائے گا۔ اس کے گرنے سے.. آپ ذرا ملاحظہ کریں کہ اب بھی اس کے لیے میں ہی خیمہ لگا رہا ہوں اور یہ.. یہ شاہد مزے سے بیٹھا مسکرائے جا رہا ہے میری ہیلپ نہیں کرتا.."

میاں صاحب فُل فارم میں تھے..

اُن سے بحث کرنا فضول تھا..

بالآخر جب وہ خیمہ کچھ نیم ایستادہ سا ہو گیا تو شاہد کو اس میں دھکیل دیا گیا.. شاہد اُس کے پردوں میں سے سر نکال کر ہمیں انتہائی حسرت سے دیکھنے لگا..

برمانی کہنے لگا۔ "لگتا ہے شاہد صاحب سیلاب زدہ ہیں اور خیراتی خیمے میں پناہ لیے ہوئے امدادی کھانے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

شاہد نے حسبِ عادت اپنے چند بال نہایت اہتمام سے سنوارے.. عینک اتاری اور چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہمیں دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "جی سر.. بڑا ظلم ہوا ہے سیلاب میں سب کچھ بہہ گیا ہے.."

اس سانحے کے دوران کے ٹو کی دونوں بہنیں اپنے زرد گہنے اُتار کر نیند میں چلی گئی تھیں.. شائی چو میں ایک سرد ہوا اُتری اور ہم اپنی گرم جیکٹیں تلاش کرنے لگے..

کھانے کے بعد.. جو بہت ہی واجبی کھانا تھا.. ہم سب اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے.. البتہ شاہد کا سر اس کے امدادی خیمے کے پردے میں سے نظر آتا رہا..

شائی چو کی خیمہ گاہ.. اور ہم تو اس کے کناروں پر مقیم تھے.. بارونق تھی.. کہیں کہیں گیس لیمپ روشن تھے اور اجنبی زبانوں کے فقرے ہوا کے دوش پر تیرتے ہمارے کانوں تک آتے تھے اور ان میں ڈھول کی تھاپ بھی رُک رُک کر آتی تھی.. جیسے کافرستان کی رات میں برون گاؤں سے

ڈھول کی آواز نیچے وادی میں رُک رُک کر اترتی ہے..

"کل ہم نے کس مقام پر پہنچنا ہے سلمان؟"

سلمان نے ایک کروٹ بدلی جو کسی بھونچال کی چھوٹی ہمشیرہ تھی اور بولا "دل سنگ پا"

"کیا؟" عجیب واہیات نام تھے اس ٹریک کے..

اُس نے پھر دوہرایا..

"دل تنگ پا؟"

"نہیں سر ہمارا دل اتنا تنگ نہیں.. یہ دل سنگ پا ہے جہاں ہم نے پہنچنا ہے اور اس کا مطلب ہے۔ "پھولوں کے کھیت" کل ہم وہاں جائیں گے.."

"واہ" میں نے کہا..

تھکا ہوا تھا.. پھولوں کے کھیت کے خیال میں گُم.. دھیرے دھیرے اس نیند میں اُترنے لگا جسے میں کبھی ایک عارضی موت سے تشبیہ دیتا تھا لیکن اب.. اس عمر میں اس کی ہمیشگی کے بھی امکانات تھے..

حسن صاحب ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگے.. وہ اتنے بلند نہ تھے کہ انہیں خیمہ بدر کر دیا جائے..

حیرت انگیز طور پر سلمان نہایت بے آواز سوتا تھا.. اور یہ ثابت کرتا تھا کہ صرف انسان خراٹے لیتے ہیں بھالو نہیں..

"مُجراان شائی چُو.. بابا فلاکت زدہ اور رقص کرتے حسن صاحب"

ڈھول کی تھاپ مسلسل آتی تھی..

اور اس کے ہمراہ کچھ نامانوس گیت تھے جو سرد ہواؤں کے ساتھ سفر کرتے آتے تھے.. میں ابھی ہوش سے آیا تھا، چنانچہ ہوش سے نیند میں مدہوش ہونے کے مراحل میں کہیں ہچکولے کھا رہا تھا جب مجھے ایک مدھم سی آواز آئی۔ "تارڑ صاحب.. تارڑ صاحب.."

خیمے کے باہر کوئی تھا..

میں نے اسی نیم مدہوشی کے عالم میں کہا۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں قادر.."

"کون قادر؟"

"سر.. اشرف امان کا کزن.. جس نے آپ کے لیے "پاک سرائے" کے سفر کے لیے وادی اشکومن تک جیپوں کا بندوبست کیا تھا.. سوری ٹُو ڈسٹرب یُو سر.."

"یار مجھے اب جیپوں کی ضرورت نہیں.. تم یہاں کیسے آ گئے ہو..؟" میں نے بیزاری سے کہا۔

"صاحب مجھے تو ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ ادھر شائی چُو میں پہنچے ہو.. میں اپنا گروپ لے کر ادھر کے ٹُوسے گندو گورو کے راستے ادھر اُترا ہوں تو.. صاحب اُدھر ہوٹل کے پاس سارے پورٹر لوگ اور گائیڈ لوگ مزا کرتے ہیں.. ڈھول بجاتے ہیں اور ناچتے ہیں تو ان کو بھی معلوم

ہو گیا کہ آپ ادھر ہو تو وہ کہتے ہیں کہ تارڑ صاحب کو درخواست کرو کہ آ جاؤ.. آ جاؤ صاحب.. مہربانی ہو گا..''

میں آنکھیں ملتا اپنے سلیپنگ بیگ میں سے کھسکتا نہایت مشقت کرتا خیمے سے باہر آیا تو اندھیرے میں ایک باریش قادر کھڑا تھا اور مسکرا رہا تھا..

''سوری سر.. آپ سو گیا تھا..؟''

''نہیں ہم کبڈی کھیل رہا تھا۔''

''جی؟''

''نہیں.. نہیں سویا تھا.. کیسے ہو قادر؟.. داڑھی میں اچھے لگتے ہو۔''

''تھینک یو سر.. تو تشریف لائے گا..''

''صرف میں نہیں پوری ٹیم تشریف لائے گا..'' میں نے سوچا اگر میری نیند برباد ہوئی ہے تو بقیہ حضرات کیوں خوابِ خرگوش کے مزے لوٹیں۔ چنانچہ میں نے ٹیم ممبران کو پکارنا شروع کر دیا۔ میری آواز پر صرف سلمان، میاں صاحب اور حسن نے لبیک کہا اور گرتے پڑتے خیموں سے باہر آ گئے۔

باہر سردی تھی..

''کدھر قادر؟'' کیونکہ اندھیرے میں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ محفل جو سجی ہے تو کدھر سجی ہے..

''میرے پیچھے آ جائیں صاحب..'' قادر اندھیرے میں ندیاں پھلانگنے لگا.. اور ہم بھی جو نیتِ امام کی کے مصداق اس کے پیچھے پیچھے اندھا دھند چھلانگیں لگانے لگے.. کبھی اندازہ نہ ہوتا تو کسی برفانی نالی کے پار جانے کی بجائے اس کے درمیان میں لینڈ کر جاتے، جو گرز بھگوتے گرتے پڑتے رقص گاہ تک پہنچ گئے..

یہ تو وہی جگہ تھی گزرے تھے ہم جہاں سے.. جہاں گوریاں ٹانگیں پھیلائے کافی پیتی تھیں اور ندی پر برا جمان ایک کھوکھے پر TWILIT لکھا تھا..

ہمارے لیے جگہ بنائی گئی.. بنچ اور کرسیاں خالی کر دیے گئے.. ان کے سامنے شائی چُو کی شب میں مردانہ مُجرا ہو رہا تھا..

پتھریلی آماجگاہ کے برآمدے میں ایک چھپر تلے کرسیاں لگی تھیں اور ان پر طرح طرح

کے ناظرین اور شائقین لگے تھے اور اُن سب کی ہتھیلیاں اُن کی آنکھوں کی سطح پر تھیں اور تالیاں بجاتی تھیں.. درجنوں پورٹر، گائیڈ، ٹور آپریٹر.. باورچی۔ ہائی پورٹر.. کوئی ہنزہ کا.. کوئی نگر کا.. گلگت کا.. وادیٔ شگر یا اشکولے کا.. سب کے سب آپس میں مقامی مخاصمت رکھنے کے باوجود اس شب شائی چُو میں مسرت سے چھلکتے تھے.. خوشی سے بے خود ہوئے جاتے تھے.. ناچتے تھے.. تالیاں بجاتے تھے۔ گاتے تھے، ڈھول بجاتے تھے.. کنستروں پر تھاپ لگاتے تھے اور شور مچاتے تھے..

دراصل آج کی شب اُن کے لیے کوہ نوردی کی مزدوری اور مشقت کی آخری شب تھی.. وہ سکردو سے چلے تھے.. اشکولے کے راستے کے ٹو بیس کیمپ تک پہنچے تھے اور پھر مشابرم گلیشیر عبور کر کے دڑہ گندہ گورو پار کرتے ہوئے نیچے یہاں شائی چُو میں پہنچ گئے تھے..

اور کل اُنہوں نے ہوشے میں ہو جانا تھا.. جہاں ان کے لیے جیپیں منتظر تھیں.. انہوں نے فارغ ہو کر.. اُجرت کے نوٹوں سے گرم جیبوں کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹنا تھا.. ان کی سرخوشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں آج طے شدہ مزدوری ادا کر دی گئی تھی کہ یہ ٹریک کا آخری پڑاؤ تھا..

تماشائیوں اور رقاصوں میں کچھ فرق نہ تھا..

ہر تماشائی کبھی نہ کبھی رقاص ہو جاتا تھا..

اس اکھاڑے کے بیچ اگرچہ ہر کوئی کود جاتا تھا لیکن ان میں سٹار پرفارمر ایک ہی ہوتا تھا جو اپنے کمالِ رقص دکھاتا سب کی توجہ حاصل کر لیتا تھا.. وہ مردِ میدان تھک جاتا تو ایک اور دھم سے اکھاڑے میں کود پڑتا.. بلکہ مردِ میدان بہت تھے اور میدان اُن کے لیے مختصر تھا..

اس اکھاڑے میں ایک ایسے صاحب تھے جو مسلسل تھے اور رقاصوں اور گویوں کو ہلاشیری دینے پر معمور تھے.. جیسے امریکی فٹ بال یا بیس بال کے میچ میں چیئر لیڈر ہوتے ہیں جن کا کام ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ عوام کو اشتعال دلاتے رہیں..

یہ چیئر لیڈر رتا اُن تھک اور روحانی مسرت سے لبریز تھا کہ اگلے دو گھنٹوں میں میں نے اُسے ایک لمحے کے لیے غیر متحرک نہ دیکھا.. نہ اُس کی چوڑی بے مُہار مسکراہٹ کو سُست کر ہونٹوں میں غائب ہوتے دیکھا اور نہ اُس کی تالیاں بجاتی ہتھیلیوں نے ایک پل بھی آرام کیا.. وہ مسلسل تالیاں بجاتا.. رقص کرتا ایک مست درویش تھا جو ہر رقاص کی آمد پر بے پناہ مسرت کا اظہار کرتا۔ اس کے رقص کی بے پناہ داد دیتا بے خود تھا.. تماشائیوں میں جو پورٹر اور گائیڈ رقص کے ماہر تھے، وہ ان کے ہاتھ پکڑ کر انہیں میدانِ عمل میں لے آتا.. اس کی سرخوشی دیکھنے کے لائق تھی.. پتہ

نہیں اس کی اس بے مہار مسرت کا سبب کیا تھا.. اس کی خوشی کس منبع سے پھوٹتی تھی.. مسلسل حرکت کرتا.. ناچتا.. کبھی ڈھول والے کو داد دیتا اور کبھی بنسری نواز کی تال پر ناچتا.. میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اتنا خوش کیسے ہو سکتا ہے..

شائد اس لیے کہ میں جس گھٹنے ہوئے بے روح معاشرے سے یہاں شائی چُو تک آیا تھا وہاں اتنی بے پناہ مسرت کا.. بلکہ بے جواز مسرت کا رواج نہ تھا..

ڈھول کی تھاپ شائی چُو پر تیرتی اس کی ندیوں اور صنوبر کے درختوں کو ہماری طرح اندھا دُھند پھلانگتی کے سکس اور کے سیون کی برفوں تک جاتی تھی.. عام پورٹر.. دریدہ دامنوں والے.. پھٹے پیراہنوں والے.. پاؤں میں کینوس شوز جرابوں کے بغیر.. وہ بھی اپنے ساتھی پورٹروں کے رقص کرنے پر ان پر نئے نوٹ بے دریغ نچھاور کر رہے تھے.. غربت میں بھی.. اتنا بڑا دل رکھنا انہی اہل شمال کا خاصا ہے.. ایک غریب مزدور خون پسینے کی کمائی کو بھی سینے سے لگا کر نہیں رکھتا.. شائی چو کی رات میں کسی اجنبی رقاص پر لٹا دیتا ہے.. وہ کسی ایک نوٹ سے اپنے لیے ایک عمدہ بوٹ خرید سکتا ہے.. چند نوٹوں سے ایک گرم جیکٹ حاصل کر سکتا ہے لیکن وہ پھٹے ہوئے بوٹوں اور چیتھڑا جیکٹ میں رہ سکتا ہے.. اپنی مسرت کے اظہار کے طور پر اکھاڑے میں ناچتے کسی شخص پر نوٹ پھینکنے سے نہیں رہ سکتا..

میں نے کہیں پہلے بھی لکھا ہے کہ اہل شمال میں رقص کی ایسی حس ہے ان کے بدن میں ایک ایسی ردھم ہے جو بقیہ پاکستان میں کم کم ہی پائی جاتی ہے اور ان کے رقص میں کہیں بھی نسوانیت کی لچک کا رنگ نہیں ملتا.. انہیں دیکھ کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ رقص تو صرف مردوں کے کرنے کی چیز ہے اور عورتوں کو اس کی اجازت نہیں ہونی چاہیے..

مسلسل تالیاں بجانے والے اور مسلسل مسکرانے والے شخص نے زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھے ہوئے ایک باباجی سے درخواست کی کہ وہ میدان میں آئیں.. باباجی نے کچھ دھیان نہ دیا.. ان سے پھر گزارش کی گئی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے بالآخر ان کی منت سماجت کی گئی اور اس کے ساتھ شائقین نے بھرپور تالیاں بجا کر انہیں مجبور کر دیا کہ وہ میدان میں اتر آئیں..

یہ باباجی نہایت فلاکت زدہ تھے..

پھٹے پرانے کپڑوں میں تھے.. بھوری آرمی جیکٹ کی سب جیبوں کی زبانیں لٹک رہی تھیں۔ کسی گورے کی عطا کردہ پتلون جو پاجامہ ہو چکی تھی، باباجی کے گھٹنوں کی نمائش کرتی

تھی.. ان کی میلی چیکٹ اُونی ٹوپی میں بھی سوراخ تھے.. یہاں تک کہ ان کے دانت بھی پورے نہ تھے.. لیکن جب وہ اُٹھے تو کُل مخلوق نے نعروں اور تالیوں سے شائی چُو کا آسمان جو بلندی کی وجہ سے نیچے آ چکا تھا اسے سر پر اٹھا لیا.. وہ کسی نہ کسی فن میں کوئی نہ کوئی کمال تو رکھتے تھے..

بابا فلاکت زدہ نے نہایت سنجیدگی سے اپنے اعزاز میں پیٹی جانے والی تالیوں کا جھک کر شکریہ ادا کیا جیسے وہ ایسے استقبال کے عادی تھے.. انہوں نے دو چھوٹے چھوٹے طبلہ نما ڈھول جو شائد انہوں نے خود بنائے تھے، اپنے سامنے رکھے اور شہتوت کی دو چھڑیوں سے انہیں جل ترنگ کی مانند بجانے لگے.. ان پر ایک خاص لے میں ضرب دینے لگے.. اور تالیوں میں مزید اضافہ اور تحسین کے نعرے.. اور پھر منہ کھول کر.. اتنا منہ کھول کر کہ ان کے بقیہ ماندہ.. اور جو چیدہ چیدہ دانت تھے، گنے جا سکتے تھے.. گانے لگے.. اب جو بابا فلاکت زدہ نے پہلی تان اٹھائی ہے تو غدر مچ گیا.. یوں جیسے اُم کلثوم سٹیج پر آ گئی ہو.. نور جہاں نے "آواز دے کہاں ہے.." شروع کر دیا ہو اور مہدی حسن نے "گلوں میں رنگ بھرے" چھیڑ دیا ہو.. ایسے غدر مچ گیا..

میرے برابر میں بیٹھے ایک باریش بزرگ جو اگر سبز چوغہ زیب تن کر کے لاہور کے کسی پاش علاقے میں دھرنا مار کر بیٹھ جاتے تو پیر سائیں ہو جاتے اور معتقدین ان کے پاؤں دھو دھو کر پیتے.. بقیہ ناظرین کی مانند مسلسل تالیاں پیٹنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر بابا فلاکت زدہ کا استقبال کیا.. وہ موسیقی اور اس کی تال سے اتنے سرکش اور سرمست ہو رہے تھے کہ دورانِ گفتگو میں نے پوچھ ہی لیا.. اور اسی لیے پوچھ لیا کہ اتنی سرمستی اور بے خودی تو نشے کی کسی بند بوتل کو کھول کر ایک ہی سانس میں چڑھا جانے کے بعد ہی ممکن ہوتی ہے کہ.. بزرگو آپ ٹُن ہو؟

بزرگوں نے پہلے تو میرے لاہوری محاورے "ٹُن" کی رمز نہ پائی اور جب میں نے ذرا کھول کر بیان کیا تو انہوں نے اپنی ہتھیلیوں کو تالیاں پیٹنے سے لمحہ بھر کے لیے فارغ کیا اور انہیں ریش مبارک پر پھیرتے ہوئے بولے "نہیں تارڑ صاحب.. اب تو نہیں.. اب تو میں نے حج کر لیا ہے۔"

"اور جب آپ نے حج نہیں کیا تھا تو.."

"رات گئی بات گئی۔" حاجی بابا ہنس کر بولے۔ "جوانی میں تو سب چلتا ہے.. اب تائب ہو چکا ہوں۔"

"تو بزرگو یہ بے حساب سرخوشی اور سرمستی ابھی تک کیسے قائم ہے؟"

"یہ تو ایامِ جاہلیت میں جو خمار ہوئے تھے، ان کا اثر ابھی تک چلا آتا ہے۔"

میں نے نوٹ کیا کہ بابا فلاکت زدہ پر بھی نوٹ نچھاور کیے جا رہے ہیں.. کبھی کوئی چاہنے والا ان پر نوٹ وار کے ہوا میں اُچھالتا تھا اور کبھی کوئی سنجیدہ شوقین ان کے ڈھول کے نیچے چپکے سے کچھ رقم رکھ آتا تھا.. بابا فلاکت زدہ البتہ اپنی دیوانگی میں بھی ہوشیار تھے اور ان نوٹوں کو سمیٹ کر اپنی جیکٹ کی جیب میں اچھی طرح سنبھال لیتے تھے.. اور کسی ایک نوٹ کو بھی آگے پیچھے نہیں ہونے دیتے تھے..

بابا اُم کلثوم عام طور پر بلتی لوک گیت گا کر داد وصول کرتے تھے لیکن کبھی کبھی کوئی چالو فلمی گیت شروع کر کے اُسے بلتی کا ری مکس بنا دیتے تھے.. جیسے "چن میرے مکھناں" کا اپنے حساب کتاب سے ری مکس کر لیا گیا ہے.. چنانچہ ایک گیت.. آپ یقین کریں یا نہ کریں.. "بیجو باورا" کا "بچپن کی محبت کو دل سے نہ جدا کرنا" سے شروع ہوا اور اس کے بعد اس کا بلتی ترجمہ پیش کیا جانے لگا۔ پھر جانے کہاں سے "ویر میرا گھوڑی چڑھیا" آ گیا اور ویر صاحب اور جس گھوڑی پر وہ چڑھے تھے بلتی زبان میں منتقل ہو گئے.. دھن وہی جاری رہتی لیکن زبان بدل جاتی.. "شہباز قلندر" کی بھی باری آئی اور وہ بھی بلتستان میں دھمال ڈالنے لگے..

میں نے پائیو میں ریشماں کا "وے میں چوری چوری" کا بلتی ری مکس بھی سنا تھا..

بابا فلاکت زدہ کہیں بلند پہاڑوں میں.. کہیں شائی چو میں ایک پاپ سٹار تھے.. لیکن یہ حقیقت تھی کہ بابا فلاکت زدہ ایک اَن پڑھ اور عام پہاڑی پورٹر ہونے کے باوجود ردھم میں تھے.. جڑواں طبلہ نما چھوٹے چھوٹے ڈھولوں کو شہتوت کی ٹہنیوں سے جل ترنگ کی طرح بجاتے بے سُرے نہیں ہوتے تھے نہ صرف یہ کہ ان کی پھٹی ہوئی جیکٹ کی جیبیں نوٹوں سے ٹھنسی پڑی تھیں بلکہ ان کی سوراخ زدہ اونی ٹوپی میں بھی نوٹ اُڑسے ہوئے تھے..

ویسے.. یہ بھی حقیقت ہے کہ جیسے وہ مگن ہو کر ڈوب کر گاتے تھے، میں نے صرف پٹھانے خان کو اتنی محویت سے "میرا عشق وی توں" گاتے ہوئے دیکھا تھا..

حسن صاحب دھڑا دھڑ تصویریں اُتار رہے تھے..

سلمان ایک بھدی سی اونی ٹوپی میں تالیاں بجا رہا تھا..

اور میاں صاحب نے اپنی آنکھ مووی کیمرے کے ویو فائنڈر سے ایک لمحے کے لیے بھی جدا نہ کی تھی..

حسن کے کیمرے میں فلم ختم ہو گئی تو وہ ہانپتا ہوا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور چونکہ وہ مقامی پانی نہیں پیتا تھا.. اپنے معدے کا خیال رکھتا تھا اس لیے ہمہ وقت اپنے بیگ میں منرل واٹر کی ایک بوتل سنبھالے پھرتا تھا۔ کہنے لگا "سر جی.. میں نے آج شام نوٹ کیا تھا کہ آپ خیموں کے نزدیک جو ندی ہے، اس میں سے اپنی اوک بھر بھر کر پانی پی رہے تھے تو سر جی.. یہاں آلودگی بہت ہے۔ آپ کا پیٹ یقیناً خراب ہو جائے گا۔ اس لیے اس منرل واٹر کے چند گھونٹ بھر لیجیے.."

میں نے بھر لیے..

"سر جی اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی اس اکھاڑے میں کود پڑوں اور بھالو ناچ کا مظاہرہ کروں؟" یہ سلمان ہی ہو سکتا تھا..

"کیسے؟"

"ایسے.." اس نے پھر اپنے ہاتھ اونچے کر کے ہتھیلیاں نیچے کر دیں اور منہ کھول کر بھالوؤں کی مانند ہانپنے لگا..

"نہیں.." مجھے اپنی ہنسی ضبط کرنے میں بہت دشواری ہوئی.. سلمان اتنا فربہ نہ تھا جتنا کہ وہ اپنے آپ کا.. اپنی فربہی کا مذاق اُڑاتا تھا..

اور تب قادر میدان میں آیا.. پہلے میرے سامنے جھک جھک کر آداب بجا لاتا، سلام کرتا آیا اور پھر کسی جنوبی ہندوستان کی رقاصہ کی مانند تھرکتا.. ہاتھ بلند کر کے گردن دائیں بائیں جھٹکاتا.. کمر مٹکاتا میدان میں آیا..

قادر کے سٹیج پر آنے پر بھی ایک مرتبہ پھر غدر برپا ہو گیا.. اس کے رقص کے انداز میں کبھی وجنتی مالا دکھائی دیتی اور کبھی وحیدہ رحمان کا رنگ نظر آتا.. اور کبھی تو وہ امراؤ جان ادا ہو جاتا.. جس نے آوارگی میں زمانے کی سیر کی تھی..

"سر جی.." سلمان نے چپکے سے اپنا بٹوہ کھول کر اس میں سے کچھ نوٹ برآمد کیے اور چپکے سے مجھے تھما دیے.. "لاہوریوں کی عزت بے عزتی کا سوال ہے.. آپ بھی ذرا ویل دینی شروع کر دیں.. قادر پر کچھ نوٹ لگا دیں.. بہت ضروری ہے۔"

چونکہ نوٹ سلمان کے تھے، اس لیے میں بھی بے دریغ اُٹھا اور اکھاڑے میں جا کر چند نوٹ حسبِ دستور قادر کے ناچتے قدموں میں ڈالے.. کچھ اس کے سر پر وارے اور بقیہ ہوا میں اُچھال کر واپس ہونے کو تھا کہ شائی چو کی اس وجنتی مالا یعنی قادر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تارڑ صاحب.. رُک جائیں۔"

اب میں وہاں رُکا ہوں تو حسن اور سلمان بھی میری مدد کے لیے میدان میں آ گئے اور اپنی اپنی اوقات کے مطابق: ایک بڑے ڈھول کی تال پر.. ایک بنسری کی لے پر.. بابا فلاکت زدہ کی تانوں پر.. اور اُس کے جڑواں ڈھولوں کی ردھم پر.. جھومنے لگے..

ہم تینوں کا استقبال.. قادر اور بابا فلاکت زدہ کی میدان میں آمد سے کم نہ تھا.. یوں نعرے لگائے گئے.. تالیوں کا شور اُٹھا جیسے ہم سب مہاراج کتھک ہوں.. حالانکہ مجھ میں رقص کی کوئی رمق باقی نہ تھی۔ چالیس برس پیشتر جو ایسے قدموں میں اعتدال تھا وہ مضمحل ہو چکا تھا.. اور میرا موجود وجود چند قدم اٹھانے سے بے وجود ہو جاتا تھا اور ہانپنے لگتا تھا..

حسن صاحب ہاتھ فضا میں بلند کئے ایک چترالی ٹوپی میں.. کسی ایسی انجانی ردھم پر رقص کرتے تھے جو کہیں اور تو نہیں شاید کرشن نگر لاہور میں کہیں رائج تھی اور سلمان.. جوانی کے خمار میں تھا.. یہ خماری دنیا کی سب سے بڑی ردھم تھا.. اس عمر میں تو جو قدم اٹھتا ہے گرم خون کی گردش میں آیا ہوا سر میں اٹھتا ہے.. اور یوں بھی وہ اس ٹریک پر آنے سے چند روز پیشتر نکاح شدہ ہوا تھا اور ایک منکوحہ ردھم میں رقص کرتا تھا.. اس نے ناچتے ناچتے میرے قریب ہو کر کہا.. "سر جی میں بھالو بن کر دکھاؤں؟" میں اور سلمان تو اپنی ڈیوٹی دے کر فوراً ہی واپس آ گئے.. اور ہاں مجھ پر بھی کچھ نوٹ.. جو زیادہ تر قادر کی جیب میں سے برآمد ہوئے تھے، نچھاور کئے گئے.. لیکن حسن صاحب اپنی سرمستی میں مست الست رہے اور ناچتے رہے..

اور وہ اس شب بابا فلاکت زدہ کے ہمراہ سٹار آف دی ایوننگ تھے.. ان کی چترالی ٹوپی میں سو سو کے متعدد نوٹ بہار دکھا رہے تھے اور یہ ان کے متعدد مداحین نے ناچتے ہوئے ان کی ٹوپی میں اُڑسے تھے..

بابا فلاکت زدہ البتہ حسن کو قدرے ناپسند کر رہے تھے کیونکہ وہ ان کے نوٹوں میں شریک ہو گئے تھے..

اس لمحے مجھے ایک نادر خیال آیا.. کہ اگر کبھی ٹیم کی مالی حالت بالکل دگرگوں ہو جاتی ہے.. کیش کم ہو جاتا ہے تو ہم اس کیش کی کمی کو پورا کرنے کے لیے آسانی سے حسن صاحب کو نچا سکتے ہیں..

اس رات میں.. شائی چُو کی اس رات میں.. ایک لمحہ آیا..

ایسا لمحہ جب یکدم میں اس منظر، اس مقام اور اس رات سے الگ ہو گیا..

آوازیں۔ تالیاں۔ ڈھول کی تھاپ.. بابا فلاکت زدہ کی آواز سب کے سب معدوم ہو گئے.. ایک مکمل چُپ کا سناٹا چھا گیا جس میں وہ شام.. بابا فلاکت زدہ اور پورٹر اور گائیڈ اور ہم سب تو تھے کوئی آواز نہ تھی.. جیسے ایک خاموش فلم چل رہی ہو.. اس سناٹے میں.. میں تنہا تھا.. میرا آس پاس خالی ہو گیا.. صرف میں تھا جو ایک بنچ پر بیٹھا اس رات میں تنہا اور خاموشی میں تھا.. اور اس چپ میں سے ایک آواز آئی "تم کہاں ہو؟"

"پتہ نہیں.."

"تم شائی چُو میں ہو.."

"ہانگ چُو میں؟"

"نہیں.. تم وہاں نہیں ہو جہاں پینگنگ کی پتلی تھی.. وارث شاہ کی پُتلی پھینکے دی تھی.. یہ تو ہوشے سے آگے ایک مقام ہے جس کا نام تمہیں یاد نہیں رہتا.."

"یہ اچھا ہے کہ مجھے مقام یاد نہیں رہتے.. صرف کیفیت یاد رہتی ہے.. اک گونہ بے خودی کے دن رات میں کیا فرق پڑتا ہے کہ انسان کہاں ہے۔"

"فرق تو پڑتا ہے.. آج شب جب تم خیمے میں اپنے پہلے دن کی مشقت کے بعد بے سُدھ پڑے تھے تو تمہارے خیمے کے پردے کے پار.. بالکل سامنے.. K_6 اور K_7 کی چوٹیاں جب غروب کی کرنوں میں زرد ہوتی تھیں تو تم بے سُدھ پڑے تھے اور تم نہیں جانتے تھے کہ ان چوٹیوں پر سونا پگھل رہا ہے.."

"میں اتنا بے سُدھ بھی نہیں تھا.. میں جانتا تھا کہ وہاں جھا تجربیں اور بازو بند تخلیق ہو رہے ہیں.. میرے اندر بھی تو ایک سونے کی شہزادی تھی جو کبھی پگھلتی تھی اور کبھی شاہ گوری کی برفوں کی مانند منجمد ہو جاتی تھی.. میں اتنا بے سدھ نہیں تھا۔"

"سنو.. تم نصیب والے ہو کہ ابھی تک سُدھ بُدھ میں ہو.. تم میں ابھی تک اتنی شکتی ہے کہ تم شائی چُو تک پہنچ جاتے ہو.. اپنے رب کا شکر ادا کرو.."

مجھ میں.. میرے بدن میں شکرانے کی ایک عجیب سنسناہٹ نے جنم لیا اور پھر یکدم اس خاموش سناٹے میں بے پناہ تالیوں اور ڈھول کی آواز نے ایک ایسی دراڑ ڈالی کہ میں پھر سے شب شائی چُو میں تھا..

جہاں بابا فلاکت زدہ اپنے جڑواں ڈھولوں پر شہتوت کی چھڑیوں سے ضرب دیتا گاتا تھا.. منہ کھولے اپنے چند دانتوں والے منہ کو کھولے گاتا تھا..

اکثر شب تنہائی میں.. کچھ دیر پہلے نیند سے..
اکثر شب شائی چو میں.. کچھ دیر پہلے نیند سے..
کچھ دیر پہلے نیند سے.. اس شب.. جیسے کے ٹکس اور کے سیون کی چوٹیاں میرے خیمے کے کھلے پردوں میں سے اندر آئیں اور میرے ساتھ میرے سلیپنگ بیگ میں سو گئیں.. ان کی برفیں میرے پہلو میں خوابیدہ ہو گئیں.. ان کے دامن میں جو بلند گھاس تھی جہاں مویشی نہیں پہنچ سکتے تھے اور ایک جھیل تھی.. تو اس گھاس کی ہریاول میرے نتھنوں میں آتی تھی اور جھیل کے پانی مجھے بھگوتے تھے.. گیلا کرتے تھے.. برفیں، گھاس، پانی.. مجھے بلندی کی ایک لوری سنانے لگے..
کچھ دیر پہلے نیند سے..
اور کچھ دیر بعد میں نیند میں چلا گیا..

''شائی چو سے آگے جہاں اور بھی ہیں..''

شائی چو گندوگورو گلیشیئر کے دامن میں آباد تھا..
جیسے کوروفون بیافو گلیشیئر کے اختتام پر.. ندیوں، ریت اور گھنگے درختوں میں روپوش تھا.. ہم شائی چو سے اٹھے اور ظاہر ہے صبح سویرے اٹھے اور پھر ناشتے کے بعد اٹھے اور گندوگورو کا جو بلند جھاڑیوں اور درختوں سے ڈھکا کنارہ تھا اس پر اٹھنے لگے..
مجھے شائی چو تو یاد ہو گیا تھا لیکن اب یہ یاد نہیں ہو رہا تھا کہ اگلے پڑاؤ کا کیا نام ہے.. دل شکن پایادار جیلنگ شاتھم کا کوئی مقام تھا جہاں ہمیں شام تک پہنچنا تھا..
گلیشیئر کے کنارے تک پہنچے تو شائی چو نیچے رہ گیا تھا کہ ہم اس سے کہیں بلند ہو چکے تھے.. سامنے جو پہاڑ تھا اس پر وہ دو یاک ابھی تک دکھائی دے رہے تھے.. پتہ نہیں سوئے ہوئے تھے یا جاگ رہے تھے..

پہلا دھچکا تو ہمیں ہوشے میں لگا جب ہم نے اس اپنے تئیں دور افتادہ اور سوئے ہوئے گاؤں کو یوں جاگتے ہوئے پایا کہ اس کی خیمہ گاہیں غیر ملکیوں سے چھلکی پڑتی تھیں..
دوسرا دھچکا شائی چو میں لگا جہاں ایک دنیا آباد تھی..
اور تیسرا.. اور یہ آخری نہیں تھا ہمیں گندوگورو کے کناروں پر چڑھتے درختوں اور جھاڑیوں میں جو راستہ تھا اس پر چلتے ہوئے لگا..
ہم تو یہی سمجھتے تھے ناں کہ شائی چو سے نکلتے ہیں تو اب ایک نادیدہ اور اجنبی جہان کے اندر جا رہے ہیں.. ایک ایسی بلند ویرانی میں جہاں کسی اور ذی روح کے قدم کہاں پہنچے ہوں گے.. اس کی ان چھوئی تنہائی میں صرف ہم ہی ہم ہوں گے اور ہمارے اردگرد جو برف اونچائیاں۔

ندیاں، جھرنے اور پتھر ہوں گے وہ ہمارے اعزاز میں جھک جھک جائیں گے.. ندی نالے تھم جائیں گے اور کہیں گے.. تھینک یو تارڑ جی۔ آپ نے یہاں قدم رنجہ فرمایا، ہم اتنی مدت سے آپ ہی کے منتظر تھے.. اور یہ تیسرا دھچکا یوں لگا کہ اوپر سے درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں غیر ملکی کوہ نورد دھڑ دھڑ اترتے آتے تھے.. ایک بے قابو ریوڑ کی مانند یلغار کرتے آتے چلے جاتے تھے.. ہمیں ان کو راستہ دینے کے لیے رکنا پڑتا ورنہ وہ ہمیں روند کر اتر جاتے.. پہلے پہل تو ہم بے حد خوش مزاجی سے انہیں گڈ مارننگ وغیرہ کہتے لیکن ان میں سے اکثر ہمیں لفٹ نہ کرواتے اور ہمیں راستے کے پتھر جان کر پھلانگتے جاتے.. کوئی ایک آدھ نمونہ ایسا ہوتا جو جواب میں گڈ مارننگ وغیرہ بڑبڑا دیتا ایسے جیسے ہم پر احسان کر رہا ہو.. وہ ہمیں باقاعدہ دھکیلتے ہوئے گزر جاتے..

ان گوروں نے ہماری انا کو شدید طور پر مجروح کیا..

وطن ہمارا تھا اور دندناتے یہ پھرتے تھے..

یہ سایہ دار راستہ اختتام کو پہنچا تو آگے ایک پتھروں سے بھرا میدان تھا.. گندوگورو گلیشیئر کے دامن میں.. گلیشیئر اب نظر نہیں آتا تھا کیونکہ ہم اس کے دامن میں تھے.. بلکہ میں اس کے دامن میں تھا کیونکہ غیر ملکی کوہ نوردوں کی یلغار نے ہمارے ڈسپلن کا ستیاناس کر دیا تھا اور ہم تتر بتر ہو چکے تھے.. برمانی کا بے مہار شتر پورٹروں کے ہمراہ کہیں آگے جا چکا تھا اور جب میں نے اسے ایک بار ٹوکا تھا کہ وہ ذرا آہستہ خرام ہو جائے اور بقیہ ٹیم کے ہمراہ خراماں خراماں چلے تو اس نے اپنے دفاع میں یہ دلیل دی تھی کہ "تارڑ صاحب یہ میری قدرتی چال ہے۔ اگر میں اپنے آپ کو روک کر چلتا ہوں، بریکیں لگا کر چلتا ہوں تو پھر میں یکدم ڈھے جاؤں گا.. مجھے یونہی بے مہار چلنے کی اجازت دیجیے.."

"اجازت ہے.." میں نے مغلِ اعظم کے انداز میں ایک گہری گونج دار آواز بناتے ہوئے کہا تھا..

پہاڑوں میں.. کہیں بلند پہاڑوں میں وہاں جانا جس کا نام آپ جانتے ہوں.. مشکل ہوتا ہے..

اور پہاڑوں میں وہاں جانا جس کا نام آپ نہ جانتے ہوں، بہت مشکل ہوتا ہے..

پتھروں کے انبار پھلانگنے کے بعد ایک بہت وسیع میدان سامنے آیا.. ریتلا اور خشک.. کہیں کہیں سوکھ چکی ندیوں کی گزرگاہیں تھیں.. دائیں ہاتھ پر کچھ فاصلے پر جو چٹانیں تھیں، ان کی آغوش میں

سے ایک خشک ہو چکے نالے کے پتھر پورے علاقے میں پھیلتے تھے..

چند پتھریلے گھر بھی دکھائی دے رہے تھے..

دراصل یہ گندوگورو تھا..

کیسے تھا؟

گندوگورو کا درّہ تو ابھی دو روز کی مسافت پر تھا تو یہ گندوگورو کہاں سے آ گیا..

یہ ایسے تھا کہ گئے زمانوں میں.. یہ میدان اور چراگاہ ہی گندوگورو کہلاتے تھے اور یہاں سے اوپر دو دن کی مسافت پر جو ایک درّہ تھا، اس کا کوئی نام نہ تھا کہ وہ شمال کے درّوں میں کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا..

اور جب وہ درّہ اہم ہو گیا تو اس کا نام اس چراگاہ کے حوالے سے گندوگورو رکھ دیا گیا.. اس لیے یہی اصلی اور بڑا گندوگورو تھا جسے میں نے بمشکل طے کیا کیونکہ یہاں کوئی سایہ نہ تھا.. کڑی دھوپ کا سفر تھا اور یہ میدان ختم ہونے میں نہ آتا تھا..

کل ہوشے سے شائی چونگ کے سفر میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی تھی کیونکہ راستہ تقریباً ہموار تھا اور ہر صبح ماڈل ٹاؤن پارک کے ٹریک پر چھ کلومیٹر چلنا میرا معمول تھا.. لیکن آج شروع سے ہی چڑھائی کا سامنا ہو گیا اور چند قدم اٹھانے کے بعد ہی میرا ابولو رام ہو گیا.. ظاہر ہے ایک بنیاد پرست مسلمان ہونے کے ناطے سے میں یہ نہیں جانتا تھا کہ رام کیسے بولتا ہے.. جیسے بھی بولتا تھا بس ویسے ہی بولتا ہو گا جیسے چڑھائی چڑھتے ہوئے آس پاس کہیں بولا تھا..

میں اپنی حیاتی کے اس برس میں.. جو پچھلے برس سے ایک برس زیادہ تھا.. اور میں اس پچھلے ایک برس میں کچھ مزید زوال پذیر ہوا تھا.. مجھ میں ہمت کم ہوتی تھی اور چہرے پر کم از کم ایک جھری کا اضافہ ہوا تھا تو میں اپنے اندر ایک جھجک رکھتا تھا کہ کیا پتہ یہی وہ آخری برس ہو جب مجھ سے ہمت چھن جائے.. میں ایک ایسا قدم اٹھاؤں جو اٹھ نہ سکے اور میری کوہ نوردیوں کا اختتام ہو جائے.. لیکن اس برس بھی کہیں نہ کہیں وہ ہمت موجود تھی.. میں اسے ہمت مرداں تو نہیں کہوں گا کیونکہ مردانگی کے محض چند برس ہوتے ہیں، اس کے بعد پسپائی شروع ہو جاتی ہے..

اگرچہ چڑھائی چڑھتے ہوئے بولو رام ہو گیا تھا لیکن اب وہ رام خاموش تھا اور مجھے چلنے میں دقت نہیں ہو رہی تھی..

البتہ میاں صاحب کے ٹخنے میں موچ آ گئی تھی اور وہ اس پر ایک پٹی باندھ کر قدرے

آہستگی سے چلتے تھے..

میاں صاحب نے صرف پچھلی شب شاہد کو اپنے خیمے سے بے دخل کر دیا تھا بلکہ پوری ٹیم کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے سستے سے جوگرز تبدیل کرنے پر رضامند نہ ہوئے تھے جو انہوں نے دس برس پیشتر کے ٹو ٹریک کے لیے خرید کیے تھے.. یا شائد اس سے پہلے خرید کیے تھے..ان کا کہنا تھا کہ یہ جوگر.. جن کے تلے گھس چکے تھے اور جن کی شکل پژمردہ چوہوں جیسی ہو چکی تھیں..یہ جوگر..جوگر نہیں رہے تھے بلکہ ان کے پاؤں ہو چکے تھے جن کے ساتھ وہ پاک سرائے اور یہاں تک کہ سنولیک ٹریک کے دوران بھی سرخرو ہوئے تھے..اس لیے اس بچے ٹریک کی ان کے سامنے کیا حیثیت تھی..

ویسے یہ حقیقت ہے کہ وہ ان جوگرز میں نہ کبھی پھسلے نہ گرے اور ہمیشہ بہت اچھا چلے..ہم میں سے جو لوگ نہایت قیمتی اور امپورٹڈ ایڈی ڈاس اور نائکے وغیرہ میں چلتے تھے،اُن سے کہیں بہتر چلے..

شنید تھی کہ وہ بھاٹی گیٹ کے کسی ایکسپرٹ موچی سے ان جوگرز کی تجدید کرواتے رہتے تھے..بلکہ شاہد صاحب کا بیان تھا کہ اوریجنل جوگر تو کب کے غائب ہو چکے تھے اور میاں صاحب اب جوگرز کے نام پر جو کچھ بھی پہنتے تھے،وہ بھاٹی گیٹ کے موچیوں کا کمال تھا..

عامر کے تن کا وزن پہلے سے بڑھ چکا تھا..ایک آسودہ اور آرام طلب صنعتی زندگی کی آسائش کے بعد وہ اتنے برسوں کے بعد پہاڑوں میں آیا تھا تو اسے چلنے میں کچھ دشواری پیش آ رہی تھی جسے وہ اپنی جوانی کے زور سے زیر کرتا چلا جاتا تھا..اور حسن صاحب کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ چل بھی رہے ہیں یا نہیں..وہ ایک عجیب روبوٹ انداز میں واکنگ سٹک ٹیکتے ٹپ ٹپ چلتے جاتے تھے اور کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاتے تھے..

شاہد کی حالت بھی دگرگوں تھی لیکن وہ حسب عادت نہ مانتا تھا نہ اقرار کرتا تھا اور اکیلا چلتا جاتا تھا..اپنے آپ میں گم..اپنے آپ کو دوسروں سے پوشیدہ رکھتا ہوا..تنہا چلتا جاتا تھا..

اور میں..اب اکیلا چل رہا تھا..

چل کیا رہا تھا..ایک اپاہج کی مانند اپنے آپ کو گھسیٹتا آگے آگے ہوتا جاتا تھا کہ اب سورج تباہ کرتا تھا..پیاس فنا کرتی تھی..پسینہ بہتے بہتے بدن کو خالی کرتا تھا..اور بلندی اپنا اثر دکھاتی تھی..سانس نہیں لینے دیتی تھی..

بائیں ہاتھ پر ایک بلند کنارے کے نیچے گندو گورو تھا..برف ہی برف تھی لیکن وہاں سے کوئی سرد سندیسہ نہیں آتا تھا اور دائیں ہاتھ پر میدان کے پار چٹانی بلندیاں تھیں جو دھوپ میں بہت ہی برہنہ اور بے حیا لگ رہی تھیں..میری واٹر بوتل میں نمکول ملا پانی کم ہو رہا تھا..

نیچے ہمارے میدانوں میں یہ معمہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی بلندی پر برفوں اور اونچائیوں پر اتنی تیز دھوپ کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ جلا ڈالے یا بدن خشک کر کے مار ڈالے..جیسے آپ ایک صحرا میں ہوں..

لیکن بلندی کی دھوپ صحرا کی دھوپ سے کہیں بڑھ کر جان لیوا ثابت ہوتی ہے..ہوا کی باریکی..آکسیجن کی کمی اور الٹراوائلٹ شعاعیں آپ کے بدن میں سے نمی کا آخری قطرہ بھی خشک کر دیتی ہیں..

چنانچہ آپ اپنا سر لپیٹ کر چلتے ہیں..نمکول ملے پانی کے گھونٹ بھرتے جاتے ہیں..

میں چلتا جاتا تھا..

اور ایک مقام پر اس بلندی اور دھوپ نے مجھ پر کچھ اثر کیا اور مجھے خدشہ ہوا کہ نہ تو کوئی میرے پیچھے آ رہا ہے اور نہ کوئی مجھ سے آگے نکل گیا ہے اور میں بالکل تنہا ہوں۔ایک وسیع دھوپ بھرے ویرانے میں..

گورا لوگوں کے جو غول اوپر سے اُترتے تھے،وہ سویرے سویرے اُتر چکے تھے اور اب آگے کوئی ذی روح نہ تھا..بس ایک بڑی تنہائی تھی..

"کچھ دیر بعد ممی آ گئی...اور مجھے پار لے گئی"

اور اس تنہائی اور دھوپ کی یکسانیت سے جب میں اکتا چکا تھا تب ایک نالے کا شور میرے کانوں میں اُترا..

جو مکمل سکوت میرے آس پاس خیمہ زن تھا اس میں کسی آبی گزرگاہ کی روانی کا شور سنائی دینے لگا..

میرے کان ایسے شور کے عادی تھے اور فوری طور پر چونکنے ہو جاتے تھے کہ شور سے قطعی طور پر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ آگے ورگوتھ کی مرگ صداؤں والی ندیاں ہیں یا کوئی معصوم سا دل ربا نالہ ہے جس کے پار جانا.. بچوں کا کھیل ہے، بہر طور ایسا آبی شور ایک مرتبہ تو آپ کے قدموں تلے سے زمین نکال دیتا ہے اور پھر وہی رام بولنے لگتا ہے..

لیکن میں ناحق ڈر کے سناٹے میں آ گیا تھا.. آگے.. ایک بلند کنارے کے نیچے جو نالہ شور و غوغا کرتا تھا، نہایت ناتواں تھا.. اس کے پانیوں میں بہت سے ایسے پتھر تھے جن پر قدم رکھتے ہوئے آپ آسانی سے پار اتر جاتے تھے..

چنانچہ میں آسانی سے پار اُتر گیا..

ابھی کچھ دور اور چلا ہوں.. اور اپنے بچے کھچے سانس سمیٹتا ہوا، تنہا چلا ہوں تو پھر میرے کانوں میں ایک نالے کی آہ وزاری بلند ہونے لگی..

ورگوتھ کی ندیوں کے بعد مجھے کسی اور ندی نالے کا خوف نہیں رہا تھا.. بقیہ نالے تو نومولود بچہ لوگ تھے..

پل صراط پر سے گزر جانے والے نالہ پلکھو یا کوہ سلمان کی راکھی ندی پر جو پل ہیں،

ان کو کیا خاطر میں لائیں گے..

لیکن جب میں اس آہ وزاری کے منبے کے قریب ہوا ہوں.. چلتا ہوا ایک بلند کنارے پر جا پہنچتا ہوں تو اس تنہائی اور بلندی پر نیچے کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت پرخشونت.. اور پروحشت نالہ جھاگ اڑاتا ہے اور جھاگ بھی اس کی باچھوں سے بہتی ہے کہ وہ پاگل ہے.. آس پاس کوئی نہ تھا..

کچھ آگے نکل گئے تھے اور کچھ پیچھے رہ گئے تھے..

میں اور یہ آبی آفت آمنے سامنے تھے..

میں بلند کنارے سے نیچے اُتر کر اس کے آبی شور کے قریب ہوا تو وہ کان بہرے کرتا تھا.. میں اسے بہت دیر تک ایک مبہوت حالت میں تکتا رہا کہ اسے کہاں سے اور کیسے پار کروں..

نہیں یہاں سے نہیں.. یہاں یہ اپنے پورے زور میں ہے.. پانیوں میں سے کوئی ایک پتھر بھی نہیں اُبھرتا جس پر پاؤں رکھ کر پار جایا جا سکے..

یہاں سے نہیں تو اس کے بہاؤ کے نیچے جا کر چیک کریں کہ وہاں کوئی ایسا مقام ہو جہاں سے سیاں جی بخیریت پار اُتر سکیں..

میں بہت نیچے تک گیا لیکن اُترائی پر تو اس کا زور بڑھتا جاتا تھا..

میں پھر اوپر اس جگہ پر واپس آ گیا..

بہت ہی غور و فکر کے بعد ایک مقام مناسب لگا.. یہاں نالے کے کنارے سے کچھ پرے پانیوں میں ایک پتھر اُبھرا ہوا تھا.. اگر انسان اس پر جا کھڑا ہو تو وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک اور تر چھا سا پتھر پانی میں سے کبھی کبھار نمودار ہوتا تھا تو اس پر چھلانگ لگا دی جائے.. اور اگر نہ پھسلا جائے تو.. اگر پھسلا جائے تو لاہور واپسی کھٹائی میں پڑ سکتی تھی کہ اس نالے کے پانی سیدھے گندو گوروی برفوں میں جا گم ہوتے تھے..

میں ایک مرتبہ پھر نہ صرف اس پہاڑی نالے کا بلکہ کسی بھی ایسے بدتہذیب نالے کا محل وقوع گوش گزار کرنا چاہوں گا..

یہ نالہ کبھی بھی دور سے دکھائی نہیں دیتا.. قریب ہونے پر سنائی دیتا ہے کہ ہمیشہ گہرائی میں ہوتا ہے.. اونچے کناروں کے درمیان بہتا ہے.. چنانچہ آپ اپنے راستے پر چلتے ہوئے اس کے کنارے پر آتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ اپنے آپ کو سنبھالتے.. اپنے جوگر جماتے نیچے

اُترتے ہیں اور اس کے پانیوں تک پہنچتے ہیں تو دنیا جہان سے کٹ جاتے ہیں.. کیونکہ آپ ایک کنارے سے نیچے گہرائی میں آتے ہیں اور نالے کے پار بھی ایک کنارہ بلند ہو رہا ہے اور آپ ان دونوں کناروں کے درمیان ایک پاتال میں حیران، پریشان اور جنگل بیابان میں کھڑے ہیں اور صرف پانیوں کا پاگل جھاگ اڑاتا شور ہے اور ان میں گزگزاتے بہتے پتھروں کی گونج ہے.. پانیوں کی نمی ہے جو ہوا میں شامل ہے اور آپ کے چہرے کو بھگوتی مرگ بوسے دیتی ہے.. اور اس کیفیت میں اگر آپ بالکل تنہا ہیں تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے..

اور اس عمر میں میرا سونا جو پیتل کا ہو چکا تھا اس پر بھی سہاگہ ہو رہا تھا..

چنانچہ میں نے قدم بڑھا کر اپنے آپ کو اس پتھر پر کھڑا کیا جس کے آگے نالے کا ایک تند اور منہ زور حصہ جھاگ اڑاتا تھا اور اس کے پار اس پتھر کو تادیر غور سے دیکھا جس پر مجھے چھلانگ لگا کر پہنچنا تھا اور وہ پتھر کبھی زیر آب چلا جاتا تھا اور کبھی اس کی گیلاہٹ سورج کی کرنوں سے چمکتی تھی.. اُس پتھر کا زاویہ ایسا تھا، اس پر لینڈ کرنے والا جو گرا سانی سے پھسل سکتا تھا..

میں نے بہت حساب کتاب کیا.. ناپ تول کیا کہ اگر میں جست بھرتا ہوں تو کیا اس پتھر تک جا بھی سکتا ہوں یا نہیں.. اگر جا سکتا ہوں تو پھسلنے کے کیا امکانات ہیں.. کافی دیر غور و خوض کرنے کے بعد فیصلہ ہوا کہ نہیں بھائی جان تمہارے پھسلنے کے امکانات بہر طور ہیں.. اگر پھسل کر نالے میں گرتے ہو تو خود سے تو اٹھنے اور باہر آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس مکمل تنہائی میں آس پاس کوئی بچانے والا بھی نہیں تو بہتر یہی ہے کہ بے شک بقیہ عمر اس کنارے پر گزار دو لیکن یہ رسک نہ لو.. جب تک کہ کوئی ساتھی پیچھے سے نہیں آ جاتا.. اور ساتھی بہت پیچھے تھے اور سورج کی تمازت میرے بدن کو پسینے سے بھگوتی تھی اور اس پسینے میں کبھی کبھار نالے کا سرد چھینٹا پڑتا تھا..

میں نے اپنی واٹر بوتل میں سے ایک اور گھونٹ بھرا.. وہی بوتل جو شاید سلجوق یا سمیر کے سکولوں کے دنوں کی یادگار تھی.. ایک گھونٹ بھرا اور ایک پتھر پر بیٹھ کر امدادی پارٹی کا انتظار کرنے لگا..

میں بہت دیر بیٹھا رہا..

اس نالے کی شوق شور شرابے والی تنہائی میں دنیا سے کٹا ہوا ایک ایسے بچے کی مانند اداس اداس اور بے بس بیٹھا رہا جس کے سکول میں کب سے چھٹی ہو چکی ہے.. دیگر تمام بچوں کے

والدین انہیں لے جا چکے ہیں اور صرف وہ باقی رہ گیا ہے.. گلے میں بستہ ڈالے آبدیدہ ہونے کو ہے کہ جانے میری ممی مجھے لینے کب آئے گی..

کچھ دیر بعد ممی آ گئی..

یہ ممی ایک پورٹر کی صورت میں سامنے کے کنارے سے نیچے اُتری.. اس پورٹر نے نالے کے کنارے پر پہنچ کر پانیوں کا ایک جائزہ لیا.. یہ جانچا کہ اسے کہاں سے عبور کیا جا سکتا ہے اور پھر وہ بھی اسی مقام پر پہنچا جہاں میں کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد پسپا ہو گیا تھا.. اس نے ان دونوں پتھروں کو پُل بنا کر ایک چھلانگ لگائی اور پھر میرے پاس لینڈ کر گیا.. ذرا سنبھلا.. مجھے ایک نظر دیکھا اور سلام دعا کئے بغیر کنارے پر چڑھنے لگا.. یکدم مجھے خیال آیا کہ یہی تو وہ اتفاقی ممی ہے جو مجھے گھر لے جا سکتی ہے۔ "ہیلو.. اوئے بھائی.. بھائی جی ذرا سنئے.."

وہ رُک گیا..

میں نے اشارے سے اسے پھر سے نیچے آنے کو کہا..

وہ آ گیا..

"بھائی ذرا امداد کرو.. ہم ذرا ڈرپوک اور موٹا ہے.. نالے کے پار جاتا ہے۔"

"آپ پاکستانی ہو؟" وہ ذرا حیرت زدہ ہوا..

"آہو.. یار امداد کرو.. ہم فریاد کرتا ہے۔"

شمال میں فریاد کرنے کا مطلب ہے کہ ہم تمہارے پاؤں پڑتا ہے.. منت سماجت کرتا ہے..

"پاکستانی ہو تو ادھر کیسے آ گیا.. ادھر تو صرف گورا لوگ آتا ہے۔"

"یار غلطی سے.. پھر نہیں آئے گا.."

اب وہ پھر سے پانیوں کو پھلانگتا دوسری جانب چلا گیا اور اس پتھر پر کھڑا ہو گیا جو میری پہنچ سے باہر تھا.. اور ہاتھ آگے کر کے کہنے لگا۔ "آ جاؤ۔"

میں پھر اسی پتھر پر کھڑا تھا اور اس نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھا رکھا تھا لیکن میں نے جو ہاتھ بڑھایا وہ اس کے ہاتھ سے ایک فٹ کے فاصلے پر رہ گیا.. اور اس ایک فٹ کی دراڑ کے نیچے نالے کے پانی منہ کھولے جھاگ اڑاتے تھے..

"نہیں یار.. میں نہیں آ سکتا.."

''آسان ہے آ جاؤ.. ہم پکڑے گا.. آ جاؤ..''

''اور اگر گر گیا تو..''

''وہ تو اللہ کا مرضی ہے..''

میں پھر سے حساب کتاب لگانے لگا کہ کیا کروں.. چھلانگ لگاؤں یا نہ لگاؤں.. اگر اس کا ہاتھ میرے ہاتھ کی گرفت میں نہیں آتا تو کیا یہ اتفاق اور عارضی ممی مجھے نالے کے پانیوں میں سے نکال لے گی..

قطعی طور پر نہیں نکال لے گی، چاہے یہ ممی مجھ سے کتنی ہی محبت کیوں نہ کرتی ہو کیونکہ میں تو پل دو پل میں کہیں کا کہیں بہہ جاؤں گا.. گندوگورو گلیشیر میں اُتر جاؤں گا.. میں تو دریا ہوں، سمندر میں اُتر جاؤں گا..

اس حساب کتاب اور غور و خوض کے دوران ایک مسئلہ ہو گیا کہ اس پتھر پر کھڑے کھڑے نالے کی دہشت اور چنگھاڑ کے خوف سے میری ٹانگیں لرزنے لگیں.. میرے قابو میں نہ رہیں.. اب اگر میں فوری طور پر چھلانگ نہیں لگاتا تو آٹومیٹک طور پر یوں بھی ڈھے کر غرق نالہ ہو جاتا ہوں چنانچہ میں نے مجبوراً چھلانگ لگا دی.. لیکن اللہ اللہ کرتے ہوئے..

شمالی علاقوں میں کوہ نوردی کا ایک روحانی پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ اللہ کرنے کے مواقع اکثر و بیشتر ملتے رہتے ہیں اور انسان پارسا ہو جاتا ہے لیکن صرف چند لمحوں کے لیے.. وہ لمحے گزر جاتے ہیں تو پھر سے رند ہو جاتا ہے کہ یہی حضرت انسان کی خصلت ہے..

بہرحال یہ عارضی پارسائی میرے کام آئی اور دوسرے پتھر پر کھڑے پورٹر کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا.. میرے جوگر گیلے پتھر پر اگرچہ پھسلے اور یہ ثابت ہو گیا کہ اگر میں اپنی بہادری کے زعم میں یہاں خود سے چھلانگ لگا دیتا تو منزل ما.. دور نیست تھی.. پورٹر ممی میری ڈرپوکی سے اتنا بیزار ہو چکا تھا اور اسے آج ہی شائی چو بھی پہنچنا تھا کہ اس نے مجھے شکرگزار ہونے کا موقع بھی نہ دیا اور فوراً عازمِ سفر ہو گیا..

''موت چٹانوں کی صورت ہمارے سروں پر معلق تھی''

میں بھی دوسرے کنارے پر چڑھ کر اوپر گیا اور چند منٹ کے لیے ہی عازمِ سفر ہوا تھا کہ میں نے سامنے ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں چند جھاڑیوں کے ناکافی سائے میں ایک شکر دوپہر میں اپنے سامان کو بکھرا دیکھا.. پورٹروں کو بے سدھ سوتے دیکھا اور ان میں ایک پتھر سے ٹیک لگائے ہوئے برمانی کو بڑھی ہوئی داڑھی کھجلاتے اور اس کے علاوہ بہت کچھ کھجلاتے دیکھا..

یعنی ہم پر قیامت گزر گئی ہے اور یہ لوگ یہاں جنت کے مزے لوٹتے ہیں..

میں نے اپنی اس کوہ نوردی کے دوران پہلی بار اپنے بلڈ پریشر کو وحشی ہو جانے دیا اور ان پر برس پڑا.. پہلے پورٹروں پر برسا ''شائی چو سے چلتے ہوئے میں نے سب کو بولا تھا کہ راستے میں جہاں کہیں بھی دشواری ہوگی آپ لوگوں نے ٹھہرنا ہے.. ہماری مدد کے لیے رُکنا ہے.. اگر راستے میں کوئی بڑا نالہ آتا ہے تو وہاں ہمارا انتظار کرنا ہے.. کیوں نہیں کیا؟''

پورٹروں میں ایک ایسا حسین تھا جسے بے شک پیاسا ہو پھر بھی کبھی پانی نہیں دینا چاہیے تھا۔ یہ ایسا حسین تھا۔ یہ وہی حسین تھا جو ہوشے میں نہایت مسکین اور درخواست گزار تھا اور بے حد منت سماجت سے ہماری ٹیم میں شامل ہوا تھا.. کہ صاحب ہم تو پورٹر بھی ہوگا اور آپ کا باورچی بھی.. ہم کو ساتھ لے جاؤ.. ہم نے آپ کے لاہور میں چینی، جاپانی اور پاکستانی ریستورانوں میں باورچی کا کام کیا ہے.. آپ کو یہ سب کھانا کی ورائٹی کھلائے گا.. اور پورٹر بھی ہوگا، ہمیں ساتھ لے چلو..

لیکن یہاں وہ کوئی اور حسین تھا.. باغی ہو گیا تھا اور مجھے ایک طوطے کی چشمِ حقارت سے دیکھتا ہوا کلام کرتا تھا.. کیوں؟

صرف اس لیے کہ کاندے کا اسحاق بھی ہمارے ہمراہ تھا.. یہ اسحاق شروع میں تو نہایت شوخا اور بدتمیز تھا.. نہایت لچر گفتگو کرتا تھا اور بے حد فرینک ہوتا تھا.. پھر میں نے اسے فوری طور پر فارغ کر کے ہوشے واپس بھیجنے کی دھمکی دے کر سیدھا کر لیا تھا.. یہ اسحاق بھی کسی حد تک باورچی تھا.. اور حسین جو کہ ہوشے کا تھا، اس کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا کہ اس کے کچن ٹینٹ میں کاندے کے کسی باورچی کا عمل دخل ہو.. اس نے آج صبح یہ ڈکلیئر کر دیا تھا کہ صاحب ایک تو آپ نے کل رات مجھے سوکھے چاول کھلائے.. اور یہ سوکھے چاول چکن پلاؤ تھا.. اور دوسرے یہ اسحاق ادھر کچن ٹینٹ میں کیوں آتا ہے.. تو میں نے ایک نہایت خوشامدانہ تقریر کی تھی کہ حسین بھائی میں تم سے معافی مانگتا ہوں کہ پچھلی شب تمہیں سوکھے چاول کھانے کو ملے.. آئندہ تم پہلے کھاؤ گے اور پھر ہم.. اور جہاں تک اسحاق کا سوال ہے تو یہ محض ایک پورٹر ہے.. ٹیم کے سرکاری باورچی تم ہو لیکن.. اسے اپنے ساتھ مدد کے لیے رکھو تو کیا حرج ہے..

حسین کو یہ بھی گوارا نہ تھا اور اس کی عزت نفس اتنی مجروح ہوئی تھی کہ مجھے کسی بھی پہاڑی نالے کے پانیوں میں برد ہوتے دیکھتا تو مسرت سے تالیاں بجاتا..

تو یہی حسین.. ایک مجروح اور آنکھیں بدل لینے والا حسین کہتا ہے۔ ''صاحب ہمارا کام بوجھ اٹھانا ہے.. آپ کا پدر کرنا نہیں ہے۔'' اور وہ بدستور ایک پتھر سے ٹیک لگائے مکمل بیگانگی سے بیٹھا رہا..

میرا بلڈ پریشر تمام حدود عبور کر گیا اور مجھے حیرت ہے کہ اس لمحے میرے دماغ کی کوئی رگ کیوں نہ پھٹ گئی..

میں نے اس لمحے یہ محسوس کیا کہ مجموعی طور پر کاندے کے پورٹرز زیادہ سادہ اور ہمدرد تھے جب کہ ہوشے سے جتنے بھی پورٹر بھرتی کیے گئے وہ قدرے لاپروا اور بیگانے تھے.. کوہ نوردوں کی بے پناہ آمد نے ان کا دماغ خراب کر دیا تھا..

''برمانی..'' حسین پر جب کچھ اثر نہیں ہوا تو میں ڈاکٹر پر حملہ آور ہو گیا۔ ''تم ان پورٹروں کے ساتھ تھے.. میرے منع کرنے کے باوجود قلانچیں بھرتے ہوئے آگے نکل گئے تھے تو تم نے اس نالے کے کنارے بقیہ ساتھیوں کا انتظار کیوں نہیں کیا..''

برمانی پہلی بار مجھے اس حالت غضب میں دیکھ رہا تھا۔ ''سر.. میں نے حسین کو کہا تھا کہ یہ نالہ خطرناک ہے.. وہ لوگ مدد کے بغیر اس کو پار نہیں کر سکتے.. تم یہاں ٹھہرو.. لیکن یہ وہاں

نہیں ٹھہرے.. کہتے تھے جب ٹیم ادھر تک آئے گی تو ہم پھر آ جائیں گے.. اور یہ یہاں آ کر لیٹ گئے۔''

''اور پھر تم بھی بھول گئے کہ پچھواڑے کے پیچھے ابھی اس نالے پر اتریں گے اور اسے دیکھ کر اپنی جان کو روئیں گے کہ پار اترنا ممکن نہ ہوگا.. یہ لوگ اگر یہاں آ کر لیٹ گئے تھے تو تم بھی کیوں لیٹ گئے تھے.. تمہارا فرض تھا کہ تم وہاں رک کر ہمارا انتظار کرتے.. ڈیم اٹ برمانی میں مرتے مرتے بچا ہوں.. اگر میری ممی وہاں نہ آ جاتی تو میں ابھی تک یا تو دوسرے کنارے پر بیٹھا اپنی قسمت کو کوس رہا ہوتا یا ڈوب چکا ہوتا..''

''آپ کی ممی سر؟'' برمانی، ڈاکٹر تھا.. جان گیا کہ میرا بلڈ پریشر کے ٹو سے بھی اونچا ہو چکا ہے.. اور میرے دماغی خلیوں میں کھلبلی مچ چکی ہے۔ ''میں آپ کو جوس پلاتا ہوں۔''

''تم موضوع بدلنے کی کوشش مت کرو برمانی.. تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اس نالے کو ایک ممی کے سہارے کے بغیر پار کر سکتا تھا..''

''ہرگز نہیں تارڑ صاحب..''

''تو پھر بیٹھے میرا منہ کیا دیکھتے ہو.. پورٹروں کو ساتھ لے کر فوراً نالے کے نیچے پہنچو.. بقیہ لوگ آتے ہی ہوں گے..''

''ویسے تارڑ صاحب آپ نے کمال کر دیا.. سب سے پہلے پہنچ گئے۔''

''میری خوشامد کرتے ہو؟'' میں نے چمک کر کہا۔ ''مجھے الو کا پٹھا سمجھتے ہو؟''

''بالکل نہیں..''

برمانی نے نہایت تحمل کا مظاہرہ کیا.. اپنی بلوچی رگ کو ذرہ بھر پھڑکنے نہ دیا اور پورٹروں کو ہانک کر نالے کی جانب چلا گیا..

مجھے نگیر، خوشحال، امت اور صد پارہ کے علی جیسے پورٹر یاد آنے لگے جو بھائیوں کی طرح ہمارا خیال رکھتے تھے.. کہیں کوئی راستہ ذرا خطرناک اٹھان رکھتا تھا تو ٹھہر جاتے تھے.. کہ صاحب آئے گا تو اسے مشکل نہ ہو.. کوئی نالہ آتا تھا تو مجھے اپنے جوگر اتارنے نہ دیتے تھے اور اپنے کندھوں پر اٹھا کر پار لے جاتے تھے.. شام ہوتی تھی تو زبردستی بدن دباتے ہماری تھکاوٹ اتارتے تھے اور پھر الاؤ کے گرد رقص کرتے گیت گاتے دوستوں سے بڑھ کر دوست ہو جاتے تھے.. اور کسی بھی معاوضے یا لالچ سے برتر ہو کر.. ایک نفیس اور شاندار انسان کی صورت میں..

ہر کوہ نوردی کی مہم میں جو پورٹر ہائر کئے جاتے ہیں، ان میں بقول منیر نیازی کچھ خبیث روحیں ہوتی ہیں اور کچھ طیب..

پورٹروں میں بھی یہی دو قسمیں پائی جاتی ہیں..

ابھی تک تو ہمیں خبیث روحوں سے پالا پڑا تھا.. لیکن وزہ گندو گورو کے بیس کیمپ تک پہنچتے پہنچتے دو تین طیب پورٹر بھی ظاہر ہو گئے..

جب میری بقیہ ٹیم.. برمانی اور پورٹروں کی مدد سے نالے کے پار ہوئی اور وہ سب مجھ تک پہنچے تو میرا ایلڈ پریشر کے ٹو سے اُتر کر میدانی علاقے کی سطح پر تو نہیں البتہ نانگا پربت.. جو دنیا کی نویں بلندترین چوٹی ہے.. وہاں تک اُتر چکا تھا..

ہم نے بڑے پتھر کے سائے میں خوراک کے نام پر کچھ زہر مار کیا اور کچھ دیر اونگھتے ہوئے آرام کیا..

اس بڑے پتھر کے برابر میں.. یہ ایک بلند کنارا تھا تو اس کے نیچے گندو گورو کا گلیشیئر کروٹیں بدلتا تھا.. اور اس کی برفوں سے جدا ہو کر جو پتھر پاتال میں گرتے تھے، ان کی آواز ہم تک پہنچتی تھی اور لگتا تھا کہ ہم ایک بڑبڑاتے ہوئے آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہیں.. بلکہ اونگھ رہے ہیں..

وہاں سے چلے تو ذرا مشترکہ طور پر چلے.. ایک دوسرے کو نظر میں رکھتے ہوئے چلے..

شائی چو سے چلتے ہوئے علی موسیٰ نے ہمیں اطلاع دی تھی.. اور یہ وہی علی موسیٰ تھا جس نے ہمیں بدگمان اور بے ایمان کر کے گندو گورو کی بجائے کے سکس اور کے سیون کی بڑی بڑی گھاس اور جھیل کی جانب لے جانے کی کوشش کی تھی تو اسی ٹین ایج پورٹر نے ہمیں اطلاع کی تھی کہ صاحب راستہ ویسے تو آسان ہے.. آگے میدان ہے.. صرف ایک تھوڑا چڑھائی آئے گا۔

چڑھائی آئے تو آجائے.. ہم نے سوچا تھا.. آخر کتنا چڑھائی ہوگا.. کیا یہ نوخیز مرد ناداں نہیں جانتا کہ ہم "سنولیک" کے دوران ہیسپر گلیشیئر کے کناروں پر چلتے ہوئے تین عظیم برفانی گلیشیئرز کے کناروں سے اُتار کر انہیں پار کر کے دوسرے کناروں پر چڑھ چکے ہیں جہاں صرف چیونٹیوں اور مکوڑے ہی چڑھ سکتے تھے تو اُن کے مقابلے میں یہ کیا چڑھائی ہوگی.. اور کتنی ہوگی..

لنچ کے زہر مار کے بعد ذرا آگے گئے ہیں تو سطح بالکل ہموار ہوگئی.. اور ہمیں چلنے میں دشواری پیش آنے لگی.. کیونکہ ہمیں چڑھائی کی ایسی عادت ہوگئی تھی کہ میدان میں ہمارے پاؤں

بے ربط ہوتے جاتے تھے.. دائیں ہاتھ پر.. جہاں ہم چلتے تھے.. وہاں سے خاصے فاصلے پر ایک عظیم چٹان سر بلند تھی اور اس کے دامن میں چند خیمے نصب تھے..

چٹان کے ایک بڑے اور وسیع دامن میں دوپہر کی دھوپ میں جلتے خیمے تھے..

ان خیموں میں جو مکین تھے اور ظاہر ہے غیر ملکی تھے۔ انہوں نے شاید خیموں کے پردے اٹھا کر ہمیں وہاں سے گرتے پڑتے چلتے دیکھا ہوگا.. اور ان مکینوں میں سے کوئی ایک مسکراتا ہوا.. بلندیوں سے ڈسے ہوئے ایک چہرے کے ساتھ مسکراتا ہوا میرے پاس آگیا۔

"سر.. آپ یہاں بھی آگئے؟"

میں اس سوال سے اگرچہ تنگ آچکا تھا.. مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا تھا کہ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا.. میں نے یہاں آکر گستاخی کی ہے.. لیکن اس کے باوجود میری انا کو تسکین بھی ہوتی تھی کہ... میں یہاں بھی آگیا ہوں۔ "آپ کون ہیں؟"

"میں ایک غیر ملکی ٹیم کے ہمراہ رابطہ افسر کے طور پر آیا ہوں۔ کیپٹن.. ہم لوگ گشابرم فور کر کے آئے ہیں.. کنکورڈیا میں.. اور اب گندو گورو سے اُتر کر یہاں پہنچے ہیں.. میں اپنے خیمے سے باہر کھڑا تھا۔ جب آپ کو دیکھا تو دور سے پہچان گیا کہ یہ آپ ہی ہو سکتے ہیں.."

"کیسے؟" میں نے مسکرا کر دریافت کیا..

"ادھر تو آپ ہی ہو سکتے ہیں سر.. اور کون ہو سکتا ہے۔"

یہ نوجوان کپتان ڈھکے چھپے انداز میں مجھے فاترالعقل ہی تو کہہ رہا تھا..

چٹان کے بڑے سائے میں جو خیمہ گاہ تھی، اس سے ذرا آگے گئے تو گر گئے.. اور گر گئے... سے مراد یہ ہے کہ.. یہ میدان جب ایک چٹانی سلسلے کی رکاوٹ سامنے پا کر اختتام پذیر ہوا اور ہم ذرا بائیں جانب ہوئے کوئی راستہ تلاش کرنے کے لیے تو کنارے کی بلندی سے نیچے جھانکا تو نیچے گندو گورو گلیشیئر کی وسیع برفانی گزرگاہ سانس لیتی تھی..

اور ہمیں اس گزرگاہ میں اُترنا تھا..

اور اس گزرگاہ تک ایک ایسی اترائی اُترتی تھی جس پر اترا نہیں بس گرا جا سکتا تھا.. اس لیے ہم گر گئے..

شائد یہ وہی اترائی تھی جس کے بارے میں ہمیں خبردار کیا گیا تھا کہ صاحب آگے ایک چڑھائی ہے.. لیکن یہ تو واپسی پر چڑھائی ہوگی.. اب تو یہ ایک اُترائی تھی.. اور یہاں سے نیچے جانے

کے لیے ایک بنگی چھلانگ ہی کارآمد ہو سکتی تھی..

بنگی چھلانگ جس میں ایڈونچر کے رسیا لوگوں کے پاؤں میں ایک رسّی باندھ کر انہیں بلندی سے دھکیل دیا جاتا ہے..

باری باری ایک دوسرے کے سہارے، پورٹروں کے سہارے..لڑھکتے..گرتے پڑتے..پھسلتے..رولر سکیٹنگ کرتے..کبھی بے بسی سے مسکراتے اور کبھی خوف کے آنسو روکتے نیچے پہنچ گئے..گلیشیئر کے قریب پہنچ گئے لیکن اس پر اُترے نہیں، اس کے برابر میں جس کنارے سے ہم گرے تھے، وہاں ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے..گلیشیئر کے ساتھ ساتھ!

چونکہ ہم کھلے میدان اور بڑے آسمان سے نکل کر گلیشیئر کی گہرائی میں آ گئے تھے اور یہاں صرف برفیں تھیں اور اس کے بلند کنارے تھے جن کی تہہ میں ہم چلتے تھے تو یہاں بھی ایک دنیا جہان سے کٹی ہوئی تنہائی تھی جس میں ہم ایک ڈھلوان کنارے پر گلیشیئر کے برابر میں اپنے آپ کو سنبھالتے چلتے جاتے تھے..یہاں بھی دو چار سخت مقام آئے لیکن انہوں نے جی کو خوش نہ کیا کیونکہ پھسلنے کی صورت میں ہم محض چند گز نیچے گر کر گلیشیئر پر جا گرتے اور بخیریت رہتے..تب میں نے پہلی بار اپنے اوپر دیکھا..اور اوپر موت کا ایک منظر دیکھا جو معلق تھا..

چٹانی تودے اور جہازی سائز کے پتھر بلند کنارے کی مٹی میں یوں اٹکے ہوئے تھے جیسے ذرا سی ہوا کے چلنے سے ہم پر لڑھکتے ہوئے نازل ہو جائیں گے..عین ہمارے سروں کے اوپر وہ چٹانیں جانے وہاں کیسے قائم تھیں..کچی مٹی میں پھنسی وہ کسی معجزے سے قائم تھیں اور ذرا سا سانس لینے پر نیچے گر سکتی تھیں..بلکہ گرنے کو تھیں اور ذرا سوچ میں پڑ گئی تھیں کہ اب فوراً گریں یا اپنے نیچے مزے سے چلتے ان بے وقوفوں کو چند لمحے اور جینے کے عنایت کر دیں..وہ چٹانیں ایسے ڈائناسورس تھیں جن کی صرف دُمیں مٹی میں پھنسی ہوئی تھیں اور وہ زور لگا کر باہر آنے کو تھیں..ان سینکڑوں پتھروں اور معلق چٹانوں میں سے کوئی ایک بھی گر کر ہمیں اجل کا سرمہ بنا سکتی تھی..

بہتر یہی تھا کہ سر اٹھا کر اوپر دیکھا ہی نہ جائے..صرف اپنے سامنے دیکھیں اور ایک عالم جذب میں سر ہلاتے چلتے جائیں..

بائیں ہاتھ پر گندوگورو کی برفانی دنیا کی اونچ نیچ میں سے کوئی پتھر کسی برف کی دیوار میں سے جدا ہو کر کہیں نیچے کھائیوں میں گہری گونج سے گرتا تو ہم چونکے ہو کر فوراً اوپر دیکھتے کہ کہیں یہ پتھر اوپر سے تو نہیں آ رہا..کہیں موت کا دن تو معین نہیں ہو گیا..

از ابنل شاہ نے اسی راستے کے بارے میں خبردار کیا تھا کہ اس کی ہولناکی بیان سے باہر ہے..اس کے اوپر جو چٹانیں معلق ہیں وہ کسی وقت بھی نیچے آ سکتی تھیں اور آپ کو ملیامیٹ کر سکتی تھیں..ہم نے شائی چو سے چلنے کے بعد اب تک تیز دھوپ کو کوسا تھا اور اب وہی دھوپ اور بن بادل کا آسمان ہمارے لیے باعثِ رحمت تھا..یہاں اگر بارش کے چند چھینٹے بھی پڑ جاتے تو اس کچی مٹی کی گرفت ڈھیلی کر کے ان چٹانوں کو ہم پر دھکیل دیتے..ہم نے یہاں اپنے بے قابو سانس درست کرنے کے لیے بھی ذرا سا رک جانا مناسب خیال نہ کیا اور چلتے رہے..اور ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر چلتے رہے..خاموشی سے دم سادھے چلتے رہے کہ لے سانس بھی آہستہ..کہ نازک ہے بہت کام..

پتھریلی موت کے دامن میں یہ مسافت جب اختتام کو پہنچی تو نیچے ایک نالہ اس طرح گرتا تھا جیسے ہم کنارے سے گرے تھے..نالہ گرتا تھا اور نیچے گلیشیئر کی کسی دراڑ میں گم ہوتا تھا..

ہم نے اسے نہایت آسانی سے اور رغبت سے پار کیا..

اس کے پار ایک کچا راستہ..تقریباً سیدھی ڈھلوان پر..عرش کو اٹھتا تھا..اس پر پرواز کر جانا تو ممکن تھا اس پر قدم رکھ کر چلنا اور چڑھنا..لانا تھا جوئے شیر کا..یا شائد جوئے شیر تو صرف ایک تیشے کے مسلسل استعمال سے لائی ہی جا سکتی ہے لیکن یہاں وہ تیشہ بھی بیکار ہو جاتا تھا..چنانچہ فرہاد ہو جانا بھی کارآمد نہ تھا۔ اس لیے میں نے دو پورٹر طلب کئے اور ان کے بازوؤں پر جھولتا..یونہی کارروائی کے طور پر اپنے پاؤں ہلاتا ان کے سہارے سہارے اس عرش تک جا پہنچا اور شانت ہو گیا کہ وہ چڑھائی جس کا ڈراوا ہمیں شائی چو سے چلتے ہوئے دیا گیا تھا بالآخر طے ہو گئی لیکن پھر وہ شانتی ایک ایسے ہراس میں بدلی جس میں ماتھے پر یکدم خوف کے پسینے نالوں کی صورت میں بہنے لگے..اور دل جو پہلے سے ہی پریشر میں تھا ایک دھک کر کے تادیر رُکا رہا اور پھر اس نے بہت دیر بعد ایک اور دھک کی اور پھر رک گیا کیونکہ سامنے..سامنے تو نہیں اوپر وہ چڑھائی تھی جس کے بارے میں ہمیں خبردار کیا گیا تھا..

پہلے جو کٹھنائیاں آئی تھیں وہ تو محض ٹریلر تھے، اصل فلم کا تو اب آغاز ہوا تھا..میں نے بہت سی تو نہیں..لیکن دس بارہ ایسی آسمانی سیڑھیوں پر قدم رنجہ فرمایا تھا..لیکن سیڑھیاں ایسی جن کا کوئی زینہ سلامت ہو..کبھی ورگوتھ کی ندیوں سے پہلے اور کبھی سنولیک کے دوران کسی گلیشیئر کی دیوار پر چڑھتے ہوئے..لیکن اس چڑھائی کی شان ہی الگ تھی..

دیگر چڑھائیوں میں تو پھر کہیں اخلاقیات کی کوئی نہ کوئی رمق موجود تھی.. لیکن یہ چڑھائی ایسی واہیات تھی کہ اس کا کوئی کردار نہ تھا.کوئی اخلاق نہ تھا اور نہایت مخرب الاخلاق تھی..

ہم بُھربُھری مٹی اور پتھروں سے تقریباً ناک لگائے کھڑے تھے اور جب بمشکل اوپر نظر کرتے تھے تو وہاں ہمارا ایک پورٹر آسمان میں نقب لگائے کھڑا نظر آتا تھا..

یہ کمبخت کا بچہ وہاں پہنچ کیسے گیا.. یقیناً کسی اور راستے سے وہاں پہنچا ہے۔ ادھر کوئی راستہ ہوتا تو ہمیں دکھائی نہ دیتا..

اور ہاں میں ابھی یہ اعتراف کرلوں کہ درہ گندوگورو کی اس مہم کے دوران یہ آسمانی چڑھائی.. جہاں ایک محتاط اندازے کے مطابق کوئی معمولی درجے کی روح بھی پرواز نہیں کرسکتی تھی.. بدترین تھی اور مرگ ترین تھی..

ہم اس پر آگے پیچھے چڑھتے.. نہیں چڑھ سکتے تھے.. ہر ایک کو باری باری.. اس سولی پر چڑھنا تھا.. اور یہاں بھی یہ کہا جاسکتا تھا کہ بچے چڑھ جا سولی رام بھلی کرے گا.. لیکن ہمارا تو پہلے ہی بولو رام ہوگیا تھا، اب وہی رام کیسے بھلی کرسکتا تھا..

چنانچہ پہلا بچہ جو شاید سلمان تھا پہلے سولی چڑھا.. بلکہ اوپر اٹھتا گیا اور پھر ہماری نظروں سے غائب ہوگیا.. لیکن تنہا نہیں بلکہ پورٹروں کے بازوؤں میں لٹکتا ہوا.. اب یہ کھلا کہ ہم نے باری باری اوپر کیوں جانا تھا.. دو پورٹروں اور ایک سلمان کے پاؤں جب بوجھ سے لدے خچروں کی طرح پتھروں پر بے اختیار پڑتے تھے تو وہ گیندوں کی مانند اچھلتے ہوئے نیچے وہاں تک آتے تھے جہاں ہم گھبرائے ہوئے کدوؤں کی مانند ڈرے بیٹھے تھے..

اور یہ پتھر سکڈ میزائلوں کی مانند.. شہاب ثاقب کی مانند شوٹ کرتے آتے تھے.. پھر خبر آئی کہ سلمان پہنچ گیا ہے.. پتہ نہیں کہاں پہنچ گیا ہے کہ وہ ہمیں نیچے سے دکھائی نہیں دے رہا تھا.. لیکن ہمیں تسلی ہوئی کہ اگر ایک بھالو اوپر پہنچ سکتا ہے تو ہمارا بھی کچھ چانس ہے.. اور ہم بھول گئے کہ بھالوؤں کا تو کام ہی لڑھکنا اور چڑھنا ہے اور ہم انسانی جانور تھے.. چوپائے کی بجائے دوپائے تھے..

اور یہی ہماری غلط فہمی تھی کہ ہم اپنے آپ کو اب تک اشرف المخلوقات کی فہرست میں رکھتے تھے کیونکہ ہم سب اوپر جاتے ہوئے چوپائے ہوگئے.. تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے.. بلکہ سبھی بھالو ہوئے..

یہ داستان الم مختصر کردوں تو بہتر ہے..

میں بھی ایک معلق حالت میں ہوا میں پاؤں چلاتا.. ہتھیلیوں پر رینگتا.. دو پورٹروں پر اپنا ناروا بوجھ ڈالتا شدید سراسیمگی کی حالت میں اوپر جاتا تھا اور اپنے آپ پر لعنت بھیجتا تھا کہ آخر کار میں یہاں.. کسی شائی نچو سے چل کر کسی دل سنگ پا وغیرہ کو جاتا ہوں تو کس لیے جاتا ہوں.. میں اس بیہودہ مقام پر کیا کر رہا ہوں۔ لاہور میں ہوتا تو کسی ادبی یا بے ادبی فنکشن کی صدارت کر رہا ہوتا اور بعد میں چائے کی میز پر چند نابالغ مداحوں میں گھرا.. کچھ حسین اور زیادہ تر غیر حسین خواتین کو آٹوگراف دے رہا ہوتا تو میں یہاں کیا کر رہا ہوں..

داستان الم نہ صرف مختصر کرتے ہیں بلکہ مختصر ترین کردیتے ہیں..

اوپر.. آسمانی سیڑھی کے اختتام پر ہر کوئی ایک بڑے پتھر کی قربت میں ڈھیر ہورہا تھا..

میں بھی ہوگیا..

اور جب نفری مکمل ہوگئی.. تو پھر بھی ہم کچھ دیر کے لیے ڈھیر رہے.. خاصی دیر کے بعد اس ڈھیر میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے اور ہم پھر سے چلنے لگے..

"دل سنگ پا.. پھولوں کا کھیت، جہاں کوئی پھول نہ تھا"

ہم چلے.. دائیں ہاتھ پر کہیں نیچے گندوگورو رہ گیا تھا جب ہم چلے..

ہمارے آس پاس.. برفانی نالیوں اور ندیوں کی سوکھی ہوئی گزرگاہیں تھیں.. مرجھا چکی جھاڑیاں اور بُوٹے تھے.. ایسے جن پر کبھی پھولوں کے ڈھیر کھلے ہوں گے اور اب وہاں ان کے خزاں رسیدہ پتوں پر ان کے ڈھل باقی تھے... جیسے دیوسائی میدان کی بہار چندروزہ ہوتی ہے اور جو کوئی موسم گل کے بعد وہاں سے گزرتا ہے تو یقین نہیں کر سکتا کہ یہاں قافلہ ہائے رنگ و بُو بھی ٹھہرے تھے..

ازابیل نے ... وزیک کا سب سے خوبصورت حصہ قرار دیا تھا.. اسے پھولوں کی وادی کہا تھا..

اس لیے کہ "دل سنگ پا" کے لغوی معنی "پھولوں کے کھیت" کے ہیں.. لیکن پھولوں کا یہ کھیت ویران ہو چکا تھا..

جیسے گندم کی کٹائی کے بعد کھیت میں بُوٹوں کے کھردرے ٹنڈ رہ جاتے ہیں.. اُن کی جڑیں باقی رہ جاتی ہیں اور انہیں دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ کبھی ان پر سنہری خوشے جھومتے تھے.. ایسے یہ پژمردہ بوٹے اور جھاڑیاں تھیں.. گھاس میں.. ڈھلوان پر اور ہمارے راستے میں بکھری ہوئیں کہ انہیں دیکھ کر یہ گمان بھی نہ گزرتا تھا کہ یہاں کبھی صرف رنگوں کی بادشاہت ہوگی..

خشک گزرگاہوں کو دیکھ کر یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ ان میں برفانی اور سورج کی روشنی سے پارہ ہوتے لشکتے پانی بہتے ہوں گے..

ہمیں پچھلے ماہ یہاں آنا چاہیے تھا جب یہ اندازے.. یہ گمان اور یہ خیال جھوٹے ہوتے..

کہیں بلند پہاڑوں میں.. ان کے اندر جانے کے لیے موزوں ترین مہینہ جولائی کا ہے.. مئی کے مہینے میں برف پگھلتی ہے.. دھوپ تیز ہوتی ہے.. جون میں غدر مچ جاتا ہے.. ندی نالے پُرشور ہو جاتے ہیں.. گلیشیئر کے کناروں پر جو وادیاں ہوتی ہیں، ان میں آبشاریں اُترتی ہیں.. گھاس بلند ہونے لگتی ہے اور پھول کھلنے لگتے ہیں.. چشمے جاری ہو جاتے ہیں اور جھرنے چٹانوں کی کوکھ میں سے پھوٹنے لگتے ہیں.. ڈھلوانوں پر جہاں برف ہوا کرتی تھی، وہاں ہریاول کی چادر بچھنے لگتی ہے.. اور جولائی میں قافلہ ہائے رنگ بُو جوبن پر آ جاتا ہے.. لیکن اگست کے شروع میں بلندیوں پر پھر سے ٹھنڈک اُترنے لگتی ہے.. دھوپ میں تمازت نہیں رہتی.. ہلکی برفباری شروع ہو جاتی ہے اور ندی نالے سوکھنے لگتے ہیں.. وہ دن کی بہار کے بعد جھاڑیوں اور بوٹوں پر جو پھول کھلتے تھے وہ اپنی زندگی پوری کر لیتے ہیں.. رنگ و بو کا قافلہ کوچ کر جاتا ہے..

اور ہم یہاں اگست کے تیسرے ہفتے کے آغاز میں پہنچے تھے..

اب یہاں محض پرچھائیاں تھیں.. آثار تھے کہ کبھی یہاں سے کوئی قافلہ گزرا تھا..

"پھولوں کا کھیت" اُجڑ چکا تھا..

آسمانی سیڑھی سے آگے.. ہم زیادہ دیر نہیں چلے جب ہم ذرا اونچے ہوئے.. ایک بلند کنارے پر آئے تو یکدم نیچے.. دل سنگ پا دکھائی دیا..

ایک ویران میدان.. گلیشیئر کے بلند کناروں کی اوٹ میں.. چٹانوں کے دامن میں شام کی سرد چھاؤں میں آ رہا تھا.. ایک جانب ایک مختصر پانیوں والی جھیل جس میں شام اُترتی تھی..

اور دوسری جانب گلیشیئر کی دیوار کے اس پار مشابرم سربلند.. درّہ مشابرم کی انبار برفیں.. اور ان کے آس پاس بے شمار.. بلکہ چھ سات بڑے بڑے گلیشیئر برفانی دریاؤں کی مانند بہتے اُترتے.. لیکن منجمد کیفیت میں.. ٹھہرے ہوئے.. دل سنگ پا پر اُمڈتے ہوئے..

اور ان برف زاروں کی اوٹ میں دل سنگ پا کی ویران پناہ گاہ..

کسی نے بتایا تھا کہ دل سنگ پا کی رات میں اتنی ہی سردی ہوتی ہے جتنی کنکورڈیا میں۔

4150 میٹر یا 13600 فٹ کی بلندی پر دل سنگ پا..

مشابرم چوٹی اور مشابرم درّے کے سامنے پھولوں کا کھیت جس میں کوئی ایک پھول بھی نہ تھا..

''لاہور کی بھیڑ میں.. باقی رہ گئے پانچ''

لاہور کی بھیڑ بڑھ گئی تھی..

صرف دو ہفتے پیشتر جب ہم یہاں سے نکلے تھے تو یہاں اتنی کاریں.. اتنے ریڑھے تانگے، رکشا، بسیں اور لوگ تو نہیں تھے..

یہ کہاں سے آ گئے..

ہماری ویگن کی ونڈسکرین میں سے کوئی دندناتی ہوئی بس ہماری جانب آتی تو ہمیں یقین ہو جاتا کہ یہ ونڈسکرین کو پاش پاش کرتی ویگن کے اندر آ جائے گی اور ہم اپنی نشستوں میں دبک جاتے..

بھاٹی گیٹ سے آگے میرے بچپن کے دن ایک فلیش کی صورت گزرے..

یہاں.. جہاں اب جوس کی دکانیں ہیں یہاں اپنے نعیم بخاری کے دادا ڈاکٹر طفیل کا کلینک ہوا کرتا تھا اور وہ گورے چٹے نہایت پیارے بھالو ڈاکٹر میری پسلیوں میں سٹیتھوسکوپ لگاتے تھے تو میں آسمان سر پر اٹھا لیتا تھا کہ میں ایک چھ برس کا کانو مالنو بچہ ہوا کرتا تھا..

ذرا آگے مسلم ماڈل ہائی سکول کی عمارت نظر آنے لگی جہاں میں ایک معمولی لیاقت کا طالب علم ہوا کرتا تھا اور ماسٹر رحمت خاں، رفیق صاحب، نادر خاں اور ہیڈ ماسٹر عبدالعزیز صاحب کے ستم کا نشانہ ہوا کرتا تھا.. اور پھر اس کے برابر میں گورنمنٹ کالج کے گوتھک برج منارے تھے جن کے سائے میں میری جوانی کے دو برس پل بھر میں بیت گئے..

وہی گورنمنٹ کالج جہاں میرے بدن میں کوہ نوردی کے پہلے جراثیم انجیکٹ کئے گئے.. ''وادی کشن گنگا'' مہم کے ایک ممبر کی صورت میں اور وہاں سے واپسی پر ہر لڑکے کو

بلاتخصیص کالج کا کوہ پیمائی کا کلر عطا کر دیا گیا تھا.. اور اسی حادثے کی بنا پر کے ٹو کی چوٹی پر پہنچنے والا پہلا پاکستانی اشرف امان مذاق میں مجھے اپنا استاد کہتا تھا..

تو یہیں اس کالج کے وکٹورین برآمدوں میں.. اوول گراؤنڈ میں.. اس دیوانگی کوہ نوردی نے جنم لیا تھا.. میں اگر آج کہیں بلند پہاڑوں سے لوٹتا تھا تو اس کا بیج یہیں بویا گیا تھا..

گورنمنٹ کالج گزرا تو لوئر مال پر ''سنگ میل پبلی کیشنز'' کا بورڈ نظر آیا..

پہاڑوں سے واپسی پر یہ بورڈ ہمیشہ نظر آتا تھا..

لیکن اس بار اس بورڈ کے حروف دھندلے اور بجھے بجھے سے تھے..

وہاں اب اعجاز نہ تھا.. صرف جوان بیٹے کی یکدم ہمیشہ کے لیے رخصتی کے دکھ میں دکھی ڈھے چکے نیاز صاحب تھے اور وہ بھائی تھا جو تنہا رہ گیا تھا۔ اس کی جوڑی ٹوٹ گئی تھی اور اس کی کمر پر زندگی بھر کی تنہائی اور رنج کی دھوپ تھی.. ایک بھاری پتھر تھا جو اس کے بدن کی جھیل کی تہہ میں تھا..

سول سیکرٹریٹ کے آگے ہوئے.. اور ہماری ویگن میوگارڈن میں داخل ہو گئی..

سلمان کے گھر کے آگے جا رکی..

وہ اترنے سے پیشتر ذرا جھجکا اور پھر اتر گیا..

باقی رہ گئے.. پانچ!

"پانچ گلیشیئر..میرا خیمہ اور 13600 فٹ بلند سرد رات"

ہم دل سنگ پا میں اُترنے لگے..

گندوگورو کے کناروں سے نیچے اُترنے لگے..

اس کے پہلو میں اجڑا ہوا پھولوں کا کھیت تھا، اس میں اُترنے لگے..

گھاس کم کم تھی..ریت بہت تھی..

دائیں ہاتھ پر چٹانوں کے دامن میں ایک کم پانیوں والی جھیل تھی..اتنے کم کہ اس میں جابجا پتھر اُبھرے ہوئے تھے..وہیں کہیں سے ایک چشمہ اس میں شامل ہوتا تھا اور یہ ہماری واٹر سپلائی تھا..شکر ہے ابھی تک چل رہا تھا خشک نہیں ہوا تھا..

ریتلے میدان سے ذرا بلند ایک پتھریلی چاردیواری دکھائی دے رہی تھی جس کی جانب ہمارے پورٹر ایک تیر کی مانند گئے اور لمحوں میں پتھروں کے اوپر کچن ٹینٹ کی ترپال آویزاں کر کے آسودہ ہو گئے..

دل سنگ پا میں اُترنے سے پیشتر میں نے بائیں جانب ایک سرسبز گھاٹی کے دامن میں دو پتھریلے جھونپڑے دیکھے تھے جن میں بقول ازابیل شاہ ہوشے کی کچھ ایسی خواتین کو ہونا چاہیے تھا جو یہاں مویشیوں کی نگہبانی کرتی ہیں، دودھ دوہتی ہیں اور پنیر بناتی ہیں..وہ پتہ نہیں اب تک وہاں تھیں یا نہیں کیونکہ میں نے آس پاس کسی مویشی کو نہیں دیکھا تھا..

اور اس منظر نے میری توجہ اس لیے حاصل کی کہ ان جھونپڑوں کی جانب ہمارے دو پورٹر کمبل اٹھائے جا رہے تھے..وہ یقیناً اس بلندی پر تن تنہا قیام پذیر خواتین کے عزیز رشتے دار تھے اور ایک چھت تلے رات گزارنے کے لیے ادھر جاتے تھے..وہاں ایک چھت کے علاوہ انہیں پینے

کو دودھ اور کھانے کو پنیر ملنے کی امید تھی..

ہم تو اسی خیال میں تھے کہ شائی چُو کی مانند ادھر دل سنگ پا میں بھی غیر ملکیوں کے خیموں کی ایک دنیا ہوگی لیکن وہاں کوئی نہ تھا..اگرچہ ہم تنہائی کے تمنائی تھے اور ہمیں خوش ہونا چاہیے تھا لیکن ہم ذرا ڈر گئے کہ ہم اتنی بڑی اور مکمل تنہائی کے بھی تمنائی نہ تھے..

ہر جانب گلیشیئر دندناتے ہوئے اُترتے تھے..

لیکن وہ دیوار کے پار رُک جاتے تھے..

برف بلندیاں تھیں اور ان برفپوش حسیناؤں میں سب سے گورے اور ٹھنڈے اور بلند قامت والی مشابرم تھی..ہم نے اس سے بے وفائی کی تھی اور اس کے بیس کیمپ میں جانے کی بجائے ادھر آ نکلے تھے..

ویسے ہم کسی حد تک کنکورڈیا ٹریک کے متوازی چل رہے تھے..

پھنگر پیک کی جانب سے ایک راستہ کھوبرے کی خیمہ گاہ میں جا اُترتا تھا..

شائی چُو سے پرے وہ گلیشیئر شروع ہوتا تھا جو مونالیزا چوٹی چوغولیزا تک چلا جاتا تھا..چلا جاتا تھا یا وہاں سے اُتر کر نیچے آتا تھا اور چوغولیزا گلیشیئر کہلاتا تھا..

اس مشابرم کے پار وہ برفانی عجائب گھر تھا جس سے اگلا سٹاپ گورے ٹُو کا تھا..اور گندوگورو درے کے پار کنکورڈیا اور کے ٹُو تھا..

گویا ہم سب کنکورڈیا ٹریک کے اس جانب چل رہے تھے..دیوار کے اس پار تھے..

اس لیے یہاں دل سنگ پا میں بھی وہی موسم تھے..آئے موسم برفیلے سہانے..ہم خیموں کے باہر میٹرس پر استراحت فرمانے کی کوشش کرتے تھے لیکن سردی کرنے نہ دیتی تھی..کبھی کبھار کسی گلیشیئر پر سے کوئی ایولانچ گرنے سے ایک گہری دل کو ہلا دینے والی گونج دل سنگ پا کی تنہائی میں امڈتی ہوئی آتی..سنائی دیتی..اور جتنی دیر میں ہم اس برفانی تودے کو گرتے ہوئے دیکھنے کی آرزو میں اسے متعدد گلیشیئرز پر نظریں دوڑاتے تلاش کرتے وہ تو وہ گر چکا ہوتا اور اس کی گونج گم ہو چکی ہوتی..

پورا دل سنگ پا..مشابرم کی چوٹی..اس کا برفانی وزہ اور متعدد گلیشیئر کم از کم آج کی شب ہماری جائیداد تھے..ان کی رجسٹری ہمارے نام ہو چکی تھی، بے شک ایک شب کے لیے ہی سہی..

ہم وہ نظام سقے تھے جو برف کے سکے چلا سکتے تھے..اپنے تخیل کی ٹکسال میں پوری مشابرم کو ڈھال

سکتے تھے..

عمومی طور پر ٹیم ممبران کی بدنی حالت مناسب تھی..اگرچہ ٹیم لیڈر کی پنڈلیوں اور رانوں میں ایسی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے..یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے نہیں..بلکہ یہ ٹیسیں اور درد کہاں سے نہیں..کہاں کہاں سے اٹھتا ہے..بہرحال مجموعی طور پر صورت حال انڈر کنٹرول تھی..

"تارڑ سائیں" برمانی گھوڑا میرے پاس آ بیٹھا..

"جی سائیں.."

"میں بے حد مایوس ہوا ہوں.."

"دل سنگ پا سے؟"

"نہیں سائیں، اس کی تنہائی نے تو میرا دل موہ لیا ہے۔"

"تو پھر کس سے؟"

"آپ کی ٹیم سے.."

"ہاں..یہ ایک عجیب ناقابلِ فہم قسم کی مسخری ٹیم ہے..جس میں ہر قسم کے تحفے پائے جاتے ہیں..اور تم تازہ ترین تحفہ ہو۔"

"سائیں یہ ٹیم تو "سنولیک" والی ٹیم نہیں ہو سکتی..اُسے تو سپرفٹ ہونا چاہیے.. "سنولیک" تک پہنچ جانے والی ٹیم ایسی ان فٹ کیسے ہو سکتی ہے..بشمول آپ کے۔"

"ہم تو بس ایسے ہی اول جلول قسم کے لوگ ہیں ڈاکٹر..بے شک دور سے ہم کوہ نوردی کی بجائے اپاہج فقیر لگتے ہیں جو گھسٹتے ہوئے چلے آتے ہیں اور سب سے پیچھے یہ فقیر پُرتقصیر چلا آتا ہے لیکن میں تمہیں کیا بتاؤں کہ سوہنے رب کا کوئی ایسا کرم ہے ہم پر کہ ہم آج تک ناکام نہیں لوٹے..جہاں پہنچنا ہوتا ہے وہاں کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جاتے ہیں..ماتم کرتے روتے پیٹتے گھسٹتے..آنسو بہاتے..پہنچ ہی جاتے ہیں..یوں بھی سنولیک کا ٹریک کئے ہوئے پانچ برس ہونے کو آئے ہیں تو اس دوران بدنی ہمت میں فرق تو پڑ گیا ہے ناں..عمر کے زوال پر تو ہمارا بس نہیں۔"

"میرا خیال ہے آپ یوں بھی اپنے ساتھیوں کو ذرا زیادہ پروجیکٹ کرتے ہیں.."

"ہاں شائد..کیونکہ وہ میرے ساتھی ہیں..میرا ساتھ دیتے ہیں۔ میرا خیال رکھتے

ہیں..میں ان کے بغیر شاید اتنے ٹریک نہ کر سکتا..لیکن کبھی کبھار اوور پروجیکشن بھی ہو جاتی ہے اور میرا کوئی ساتھی گھمنڈ میں آ جاتا ہے اور مجھے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے..کوئی ایک ساتھی گدا ہو جاتا ہے..ویسے تم فکر نہ کرو، میں تمہیں بھی پروجیکٹ کروں گا۔"

برمانی ہنسنے لگا..اور وہ اپنے بیٹے تیموری مانند ایک معصوم بچے کی طرح ہنستا تھا..

ویسے برمانی کی ہنسی اس بات کی مظہر تھی کہ دل سنگ پا ایک ایسا مقام ہے جہاں اس جیسا خاموش انسان بھی ہنسنے پر..خوش ہونے پر..مجبور ہو جاتا ہے..

چنانچہ دل سنگ پا اُس شب ہماری سلطنت تھا..

ہم اس پر حکمرانی کرتے تھے..

یہ جو چھ سات عظیم برفانی تودے ہمارے دائیں بائیں اُترتے تھے، یہ ہماری ریاستیں تھیں..ان کے اوپر جو چوٹیاں برف بھار سینوں والی اُمڈتی تھیں، یہ ہماری کنیزیں تھیں..مشابرم ہماری رکھیل تھی..یہ سب ہمارے تابع تھے..صرف اس لیے کہ ہم یہاں تک پہنچ گئے تھے..

جیسے "پاک سرائے" کے دوران پورٹر نظیر نے کہا تھا کہ صاحب وادی اُس کی ہوتی ہے جو وہاں تک پہنچ جائے..اور ہم پہنچ گئے تھے..

میں نے اگرابھی ابھی یہ بیان دیا تھا کہ عمومی طور پر ٹیم ممبران کی بدنی حالت مناسب تھی تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ ہر کوئی ڈربی ریس کے گھوڑے کی مانند بگٹٹ بھاگ رہا تھا اور سپر فٹ تھا..حسن قدرے ڈھیلا اور بے ربط ہو رہا تھا۔ میاں صاحب کا ٹخنہ سوج کر کُپا ہو رہا تھا اور پاؤں میں چھالے تھے..عامر کے پیٹ میں گڑبڑ تھی..سلمان بھی فکرمند تھا اور میں اپنی حالت زار تو بیان کر ہی چکا ہوں..البتہ شاہد صاحب حسب عادت نہ اقرار کرتے تھے نہ انکار کرتے تھے..اگرچہ ڈاؤن ڈاؤن لگتے تھے..

دل سنگ پا 13600 فٹ کی بلندی پر براجمان تھا..ہم زیادہ دیر تک خیموں سے باہر براجمان نہ رہ سکے کہ ہم باہر بیٹھے رہتے تو اگلی صبح ہم بھی برفانی عجائب گھر کے سفید سفید مجسمے ہوتے..

کھانے کے فوراً بعد خیموں میں پناہ گزیں ہو گئے..

جوں جوں رات اُترتی تھی توں توں 13600 فٹ کی بلندی اپنے کرشمے دکھاتی تھی..ہڈیوں میں برف کے جل ترنگ بجاتی تھی اور سانس میں ہوا کی بجائے برف کی کرچیاں

بھرتی تھیں اور سونے نہیں دیتی تھیں.. بچپن میں فلم "پرچھائیں" کا لتا منگیشکر کا گایا ہوا گیت "کٹتے ہیں دکھ میں یہ دن.. پہلو بدل بدل کے" مجھ پر بہت اثر کرتا تھا.. اب کھلا کہ لتا نے یہ گیت دل سنگ پا کی اس رات کو مدِنظر رکھتے ہوئے گایا تھا.. یہاں بھی یہ رات دکھ میں کٹتی تھی اور کروٹ بدل بدل کے..

دل سنگ پا کی شام میں ہم جن گلیشیرز کو اپنی رعایا تصور کر رہے تھے اور جن چوٹیوں کو اپنی کنیزیں سمجھ رہے تھے، وہ اس کی سرد رات میں ہم پر حاوی ہو کر ہم پر حکمرانی کرنے لگیں.. اس سے ہمارا سکہ کھوٹا ہو گیا اور ہم بادشاہ سے پھر سے غلام بنے ہو گئے..

رات کے کسی پہر مجھے مجبوراً خیمے سے باہر آنا پڑا..

ایسی شدید سردی میں اگر خیمے میں آگ بھی لگ جائے تو بھی میں اپنے سلیپنگ بیگ سے باہر نہ آؤں.. لیکن یہ مجبوری آگ سے بھی زیادہ مجبوری تھی..

مجھے کوہ پیمائی کی کسی کتاب میں اس کا حل نہیں ملا.. بلکہ ایک بار شاندیوسائی کے درّہ برجی لا کی اُس رات میں جب برفباری تھمتی نہ تھی تو میں نے سوچا تھا کہ انسان کے پاس ایک ربڑ پائپ ہونا چاہیے کہ اس میں فٹ ہو کر خیمے کے اندر ہی اندر فراغت ہو جائے..

اگر یہاں دل سنگ پا میں میرے پاس کوئی پائپ ہوتا تو میں ہرگز باہر نہ جاتا..

لیکن یہ نہ تھی ہماری قسمت.. اس لیے مجھے مجبوراً باہر آنا پڑا.. کہ میرے مثانے پر جو شدید دباؤ تھا، وہ خیمے میں آگ لگ جانے سے کہیں زیادہ جان لیوا تھا..

بہرحال میں اس دباؤ کو دبانے کی کوشش کرتا.. سلیپنگ بیگ سے باہر آیا.. رینگتا ہوا خیمے سے باہر آیا.. لیکن باہر آنے سے پیشتر اپنی سنو جیکٹ پہن لینے کو نہ بھولا.. اگر بھول جاتا تو برفانی عجائب گھر میں ایک مجسمہ ہو جاتا..

میں باہر آیا.. اور جب میں اپنے آپ کو ہلکا کرنے کے بعد ایک عجب بالیدہ رُوح کے ساتھ خیمے میں جانے کو تھا تو میری نظر آسمان پر گئی..

اور وہاں کوئی اور آسمان تھا..

اور یہ وہ آسمان تو نہ تھا جو پچھلے ساٹھ برس سے میرے سر پر ایک خیمے کی مانند تنا رہا تھا..

میں اپنا آسمان کہیں بھول آیا تھا..

یہ درست کہ ایک آسمان اپنے کیکشاں کے دوپٹے کے ساتھ دریائے سندھ میں اُترا تھا اور

اس میں اپنے ستارے ڈبوتا اور جھلملاتا تھا.. ایک اور آسمان فیئری میڈو پر اُترتا تھا اور ہم الاؤ بجھا دیتے تھے تاکہ اس کے ستارے نزدیک آ جائیں..

لیکن یہ.. دل سنگ پا کی رات کا آسمان کوئی اور آسمان تھا..

اس آسمان کے ستارے الگ الگ نہ تھے بلکہ ایک کہکشاں کی صورت میں بچھے ہوئے روشن تھے..

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے!

اور وہ 13600 فٹ کی بلندی پر اتنا قریب تھا کہ میں اس کا روشن دوپٹہ ذرا ہاتھ بڑھا کر اُتار کر سکتا تھا اور اوڑھ سکتا تھا..

ستاروں کے جھمکے تھے جو مشابرم کی چوٹی سے لپٹتے جاتے تھے.. روشن شراروں کی مانند اس کی برفوں میں دفن ہوتے جاتے تھے لیکن بجھتے نہ تھے اور اس کی برفوں کے ناخنوں تلے لَو دیتے تھے..

میرے آس پاس.. ہر سو چپ تھی.. دل سنگ پا پر لاکھوں ستاروں کی روشنی بچھی ہوئی تھی..

یہ ستاروں کی کیسی بارات اُترتی تھی..

میں پوری شب جب تک کہ ستاروں کی یہ بارات رخصت نہ ہو جاتی وہاں خیمے سے باہر جب سارا عالم سوتا تھا، میں منہ اٹھائے اس بارات کو تکتا رہتا لیکن سنو جیکٹ اور گرم جرابوں کے باوجود میرا بدن سردی کو سہارتا نہ تھا اور بری طرح کپکپانے لگ گیا تھا..

اُن چھ سات گلیشیرز کی قربت مجھے منجمد کرنے کو تھی..

مجھے اپنے خیمے میں لوٹنا تھا..

خیمے کا پردہ اٹھانے سے پیشتر میں نے ایک بار پھر دل سنگ پا کے آسمان پر نظر کی.. پھولوں کے اس برفانی اجڑ چکے کھیت پر نگاہ کی..

وہ... 13600 فٹ کی بلندی پر ایک گھنا اور روشنی بھرا ستاروں کا کھیت تھا جس میں میرے تخیل اور آرزوؤں کے ہل چلتے تھے.. دل سنگ پا کی صرف یہ رات بھی اس لائق تھی کہ.. لاہور سے.. بشام۔ گلگت۔ سکردو۔ خپلو۔ ہوشے اور پھر شائی چو سے کہیں آگے صرف اس کے لیے سفر کیا جائے..

یہ ایک ایسا منظر تھا..

منظروں کا یہی وہ دانہ تھا جو سو ہنارب کبھی ترشنگ میں.. کبھی کرومبر میں.. شمشال۔ ملتر کی جھیلوں۔ بیافو ہسپر کی سنولیک اور کبھی ماشو اور کبھی اشکولے میں ڈال دیتا تھا اور ہم ناتواں پرندے اپنے اپنے آشیانے چھوڑ کر اس دانے کو چگنے کے لیے آ جاتے تھے..

یہی وہ برفانی اور بلند دام تھا جس میں شکار ہونے کی خاطر ہم بے اختیار اپنے گھروں سے نکل آتے تھے..

اس دام سے.. اس جال میں پھنس کر اگرچہ ہم اپنی ناتوانی میں پھڑ پھڑاتے اپنے آپ کو زخمی بھی کر لیتے تھے لیکن اس کے باوجود اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہونا چاہتے تھے..

دل سنگ پا کا یہ آسمان بھی.. ایک ایسا ہی دانہ تھا.. دام تھا.. جال تھا.. کیا ہر ایک کے نصیب میں ایک مختلف آسمان ہو سکتا ہے..؟

نہیں.. ہرگز نہیں!

بیشتر لوگ ایک ہی آسمان تلے نہایت کامیاب زندگیاں گزار دیتے ہیں.. بلکہ اپنی زندگی میں دو ایک آسمان بھی کم کم ہی دیکھتے ہیں..

صرف کوہ نوردوں کے نصیب میں مختلف آسمان ہوتے ہیں!

اور دل سنگ پا کے آسمان ہوتے ہیں..

"چپلو کا بلتی نگتی.. اور اُجڑا ہوا پھولوں کا کھیت"

سورج کے رتھ نے دل سنگ پا کے آسمان پر بکھرے ستاروں کو اپنی روشنی سے روندکر معدوم کر دیا تھا اور اب وہاں اس کا راج تھا.. جب میں اپنے خیمے سے باہر آیا..

نایاب قسم کی تصویر کشی کے آرزومند میرے ساتھی جھیل کے مختلف پانیوں میں سویر کی روشنی میں عکس ہونے والی مشابرم اور دوسری برفانی چوٹیوں کی تصویریں اُتارنے میں محو تھے.. جھیل سے ذرا اوپر ایک چشمہ چٹانوں میں پھوٹ کر ایک چھوٹی سی ندی کی صورت نیچے اُترتا تھا، جھیل کا حصہ بن جاتا تھا.. میں نے اس ندی کے کنارے بیٹھ کر شیو کی اور اس احتیاط سے کی کہ آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنا آپ نہ دیکھا جائے کہ وہاں دیکھنے کے لیے سوائے ایک مجنوں بابا جی کے اور کچھ نہ تھا..

شیو کے بعد میں نے اپنا پہاڑی اشنان کیا..

چاہے ہم کتنی ہی بلندی پر فائز کیوں نہ ہوں.. دنیا کے طویل ترین گلیشیرز پر ہی خیمہ زن نہ ہوں، میں ہمیشہ یہ اشنان کرتا تھا.. یعنی شیو کے بعد جیکٹ اُتارتا تھا۔ سویٹر اُتارتا تھا، ٹی شرٹ اور بنیان اُتارتا تھا اور پھر تقریباً تیس سیکنڈ کے اندر اندر اپنے بالائی دھڑ پر پانی کے چھینٹے مار کر اسے تولیے سے خشک کر کے فوراً ہی تو اُترے اپنا سب کچھ پہن لیتا تھا.. ورنہ ہسپر کی ٹاپ پر پانی نہ تھا تو برف سے کام چلا لیا.. میرے ساتھی ہمیشہ مجھے اس اشنانی عمل میں مصروف پا کر تشویش سے دیکھتے تھے کہ بابا جی اتنی سردی میں یوں پیرس کے کسی نائٹ کلب کی سٹرپ ٹیز ڈانسر کی مانند اپنا اوپر والا حصہ عریاں کر رہے ہیں تو نہیں ڈبل تو کیا ٹرپل نمونیا ابھی ابھی ہو جائے گا.. لیکن میں باز نہ آتا تھا کہ یہ اشنان مجھے نیا نکور کر دیتا تھا اور میرا بدن.. کم از کم بالائی بدن کھلنے لگتا تھا.. زیریں بدن میں

کھٹکنے کی صلاحیت یوں بھی کم کم رہ گئی تھی..

شاہد صاحب کیمرے کو اتنی سنجیدگی سے آپریٹ کرتے تھے جیسے وہ پہلے ایٹم بم کو ڈی ٹونیٹ کرنے کو ہوں..اُن کا خاصا تھا کہ وہ نہایت اہتمام سے اور دھیرج سے سلوموشن میں کیس میں سے کیمرہ نکالتے پھر تادیر روشنی، دھوپ اور سائے کا اندازہ لگاتے..اپرچر۔ سپیڈ اور پتہ نہیں کیا کیا سیٹ کرتے اور پھر ایک عجیب سازاویہ بنا کر بہت سوچ سمجھ کر کیمرے کا بٹن دباتے.. جیسے داد طلب کر رہے ہوں کہ بچو آج تک کبھی کسی نے تمہاری ایسی نایاب تصویر اُتاری ہے..اس احتیاط اور اہتمام کا نتیجہ یہ نکلا..کہ لاہور واپسی پر جب انہوں نے اپنی آٹھ فلمیں پرنٹ کروائیں تو تصویروں میں ہر جانب تاریکی ہی تاریکی تھی..کچھ سائے تھے..کچھ ہیولے تھے اور یا پھر ان کی احتیاط تھی..

حسن کا کیمرہ ملتر چھورا ٹریک کے دوران ایک ندی میں منہ کے بل گر گیا تھا..وہ ذاتی طور پر خود ہی تو نہیں گر گیا تھا، اُس کے ساتھ حسن صاحب تھے، اس لیے اب وہ ایک نیا نکور کیمرہ نمائش کرتے پھرتے تھے جو انہوں نے اپنی بیگم کی معاونت سے خریدا تھا اور اس کے نتائج بعد میں حوصلہ افزا برآمد ہوئے..

اور سلمان اس زعم میں تھا کہ جناب یہ کیمرہ تو آسٹریلیا سے آیا ہے..یہ بری تصویر کھینچ ہی نہیں سکتا..

صرف میں اپنے محبوب اشائی چونکس کے بغیر تھا..

میں منظروں کو فلم پر نہیں اپنے بدن پر کھینچتا چلا جاتا تھا..

آج..ہمیں درہ گندوگورو کے بیس کیمپ تک پہنچنا تھا اور پھر اس کی چوٹی پر یلغار کرنا تھی..خیمے زمین بوس ہونے لگے..

"آج کا سفر کیسا ہے؟" میں نے حسب عادت اور روایت اسحاق سے پوچھا..

"اِدھر نکلے گا تو سامنے تھوڑا اچڑھائی ہے..پھر گلیشیئر پر اتر جائے گا..آسان ہے.."

"گلیشیئر پتھریلا ہے؟"

"ہاں ناں.."

"سفید ہے یا سیاہ ہے؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے صاحب!"

"بہت فرق پڑتا ہے اسحاق..سیاہ گلیشیئر مادہ کہلاتا ہے اور سفید کو نر کہا جاتا ہے تو میں سیاہ گلیشیئر پر چلنے کی پریکٹس رکھتا ہوں.."

"تھوڑا سیاہ ہے اور تھوڑا سفید ہے.."

"اور آج ہم کہاں پہنچیں گے؟"

"گندوگورو کے بیس کیمپ میں.."

"اور اس بیس کیمپ کا نام کیا ہے؟"

اسحاق نے ایک عجیب وغریب ہسپانوی قسم کا نام لیا..

میں پہلے بھی اقرار کر چکا ہوں کہ اس ٹریک کی منزلوں کے نام بہت الگ تھے اور مجھے یاد نہیں ہوتے تھے..مشکل سے شائی چو اور دل سنگ پا یاد کیا تھا اور اب یہ کچھ اور آ گیا تھا..چنانچہ میں نے محض سر ہلا دیا کہ نام میں کیا رکھا ہے..

ہمارے خیمے سمٹے جا رہے تھے..

میں اپنی میٹرس پر بیٹھا اپنے نئے ہائی ٹیک بُوٹوں کے تسمے باندھ رہا تھا اور مجھے بے حد لطف آ رہا تھا..میں خوش تھا..

جی ہاں ایک کوہ نورد کی خوشیاں بہت الگ ہوتی ہیں..

ایک کوہ نورد کے لیے یہ بھی ایک خوشی ہوتی ہے..ایسے نئے نکور ہائکنگ بوٹ پہننا جو آپ کے پاؤں کو پسند کر لیں اور پھر ان کے تسمے اور وہ بھی نئے نکور..کس کر یوں باندھنا کہ آپ کے پاؤں ان میں محفوظ محسوس کریں..یوں کہہ لیجیے کہ ایسے تسموں کو باندھنے میں وہی سنسنی محسوس ہوتی ہے جو ایک رقاصہ نئے گھنگھرو باندھتے ہوئے محسوس کرتی ہے..گویا رقص کوہ نوردی سے پیشتر بوٹوں کے تسمے ہمارے گھنگھرو ہوتے ہیں..

یہ نئے بوٹ پہننے کے بعد میں نے جامنی رنگ کی نارتھ فیس جیکٹ پہنی تو یہ ایک اور نئی ایکسائٹمنٹ تھی..

جامنی رنگ کی نارتھ فیس جیکٹ..

یہ جہلم سے آئی تھی..

کیسے آئی تھی، اس کا ذکر کرنا میں بھول گیا تھا..

یہ میں نے ایک گلگتی سردار سے حاصل کی تھی..

خپلو کے بازار میں یہ عامر تھا جس نے وہاں ایک ایسی دکان دریافت کر لی تھی جس کے کاؤنٹر کے پیچھے ایک گلگتی کھڑا تھا... ہمارے لیے یہ نہایت اچنبھے کی بات تھی کہ آخر بلوچستان سے چل کر بلتستان میں آ کر ایک گلگتی پرانے جوتے.. کپڑے.. لالٹینیں اور ٹائلٹ پیپر کے رول وغیرہ کیسے بیچ رہا ہے.. بہر حال ان گلگتی صاحب کے ہاں کسی غیر ملکی مہم کے گوروں کے بدنوں کی اُترن کچھ نہایت شاندار جیکٹیں اور ونڈ چیز بچے تھے اور تھے بھی نارتھ فیس برانڈ کے جو کوہ نوردی کا سامان بنانے والی نہایت معتبر اور معروف فرم ہے.. ہم نے پہلے یہ طے کر لیا تھا کہ واپسی پر یہ کسی کو نہیں بتائیں گے کہ ہم یہ جیکٹیں خپلو کے لنڈے بازار سے خرید کر لائے ہیں تا کہ عزت سادات اگر تھی تو محفوظ رہے.. اور یقین جانئے کہ یہ راز آج تک ایک راز ہے.. بہر حال جیکٹیں وغیرہ خریدنے کے بعد.. اگرچہ یہ سائز میں اتنی بڑی تھیں کہ ہم انہیں پہن کر مست ملنگ لگتے تھے اور دور سے پہچانے جاتے تھے کہ ان لوگوں نے دراز قد گورا لوگوں کی اُترن زیب تن کر رکھی ہے.. لیکن ہم ان کے رنگ اور ڈیزائن سے اتنے مبہوت ہو چکے تھے کہ رہ نہ سکے.. تو انہیں خریدنے کے بعد ہم نے گلگتی صاحب سے دریافت کیا کہ سائیں آپ خپلو کب اور کیسے تشریف لائے.. تو انہوں نے پُر تبسم ہو کر فرمایا کہ صاحب ہم تو پیدا ہی ادھر ہوا ہے..

اس پر ٹیم کے پہلے بلوچ ممبر برمانی نے بے پایاں مسرت کا اظہار کیا کہ یہ تو ایک نئی تحقیق کا در کھل گیا ہے کہ وادی خپلو میں بھی بلوچ اور گلگتی پائے جاتے ہیں.. لیکن برمانی کی یہ بے پایاں مسرت پایاں ہو گئی جب اُن صاحب دکان نے بڑے فخر سے بتایا کہ صاحب ہم تو خالص بلتی ہیں.. لیکن قصہ کچھ یوں ہے کہ میرے والد صاحب قبلہ نہایت رعب دار شخصیت کے مالک تھے.. سیاہ چشمہ پہنتے تھے اور بڑی بڑی مونچھیں رکھتے تھے تو اہل خپلو انہیں چھیڑتے تھے کہ تم تو گلگتی لگتے ہو.. چنانچہ وہ گلگتی ہو گئے.. اور وہ ہو گئے تو ہم بھی ہو گئے.. اب ہمارا چھوٹا بچہ لوگ بھی گلگتی ہے..

تو گلگتی بھائی سے خرید کردہ جامنی رنگ کی.. اپنے سائز سے کہیں بڑی نارتھ فیس کی جیکٹ پہنے.. قدرے پُھدکتا ہوا میں اپنی میٹرس پر بیٹھا تھا کہ عامر بھی ایک ایسی ہی جامنی جیکٹ میں لہراتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ ”تارڑ صاحب.. ایک مسئلہ ہے.. آپ کو معلوم ہے کہ حسن صاحب کچھ ٹھیک نہیں ہیں.. کل شام تو اُن کا چہرہ سوجا ہوا بھی لگتا تھا اور انہیں بخار بھی تھا.. اور یہ بلندی کی بیماری کے آثار لگتے ہیں۔ آج ہم مزید پونے دو ہزار فٹ اوپر جائیں گے.. تو کیا انہیں

سارا دن چلانا.. گلیشیر پر.. اور انہیں اتنی بلندی تک لے جانا.. پندرہ ہزار فٹ کی بلندی تک.. لے جانا مناسب ہو گا.. کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔“

پچھلی شب میں نے بہت دیر حسن کے بارے میں فکرمندی کی تھی.. واقعی اس کی حالت کچھ غیری ہوئی جاتی تھی لیکن وہ ایک بہادر شخص تھا.. معصومیت سے مسکراتا چلتا جاتا تھا اور پوچھنے پر کہتا تھا.. جی آپ فکر نہ کریں..

”تو پھر کیا کریں عامر..“

”میرا خیال ہے کہ اس حالت میں انہیں سارا دن چلانا اور اتنی بلندی تک لے جانا خطرناک ہے.. راستے میں یا وہاں پہنچ کر ان کی طبیعت مزید خراب ہو گئی تو کیا کریں گے.. بہتر یہی ہے کہ انہیں یہیں دل سنگ پا میں چھوڑ جائیں.. کسی پورٹر کے ساتھ یا ہم میں سے کوئی ایک ٹھہر جائے.. کل شام تک کی تو بات ہے.. ہم واپس آ جائیں گے..“

کسی بھی ٹریک کے دوران چھوٹے موٹے سانحے تو ہوتے رہتے تھے لیکن کبھی اس قسم کی صورت حال کا سامنا نہیں ہوا تھا..

یوں تو ٹیم کے بھی ممبران ہمیں پیارے تھے لیکن حسن صاحب تو نہ صرف ہمیں پیارے تھے بلکہ راج دُلارے تھے اور ہم ان کے بھولپن کا خاص خیال رکھتے تھے..

”ایسا کرتے ہیں کہ برمانی سے مشورہ کرتے ہیں.. وہ انہیں میڈیسن بھی دیتا آیا ہے.. تو وہ بہتر طور پر فیصلہ کر سکتا ہے کہ حسن صاحب سفر کے قابل ہیں یا نہیں.. اگر نہیں تو انہیں یہاں چھوڑ کر نہیں جائیں گے.. ہم سب یہیں ٹھہر جائیں گے.. آگے جا کر ایک ایسے مقام پر حسن صاحب کے بغیر جا کر کیا کرنا ہے جس کا نام بھی ہمیں معلوم نہیں.. آج کا دن یہیں ریسٹ کریں گے اور پھر واپس..“

برمانی کو طلب کیا گیا.. وہ دل سنگ پا کی جھیل کے کناروں پر ڈُبکی لگا رہا تھا اور بے چین تھا کہ کب سفر کا آغاز ہو اور وہ قلانچیں بھرتا وہ سامنے والی بلندی پر چڑھ جائے اور وہاں سے ہمیں ہاتھ ہلا کر SEE YOU کہہ کر غائب ہو جائے..

”ہاں.. کل شام تو حسن صاحب کا چہرہ قدرے سوجا ہوا تھا.. ہلکا بخار بھی تھا.. موشن بھی آ رہے تھے لیکن میں نے ابھی ابھی ان کا چیک اپ کیا ہے.. وہ بہت بہتر ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ آہستہ آہستہ چل سکتے ہیں، کوئی خطرہ نہیں۔“

"آر یو شیور.."

"بالکل.. لیکن حسن صاحب سے بھی پوچھ لیا جائے تو بہتر ہے۔"

حسن صاحب سے پوچھا گیا..

"نہیں جی.." حسن صاحب شرماتے ہوئے بولے "آج تو اللہ کا فضل ہے.. پاٹیاں بھی بند ہوگئی ہیں.. بخار بھی نہیں.. تھوڑی سی کمزوری ہے تو میں آہستہ آہستہ چلوں گا.."

اُن کے اس بیان پر اگر تو میں احتیاط پسند ہوتا اور بے حد ایماندار ہوتا تو یہی کہتا کہ.. نہیں حسن صاحب.. ہم یہ رسک ہرگز نہیں لے سکتے۔ زندگی موت کا معاملہ ہے، ہم سب یہیں ٹھہریں گے اور کل واپس.. لیکن میں نے تھوڑی سی بے ایمانی کی.. کہ میں جسے انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ ان مائی ہارٹ آف ہارٹس.. یعنی اپنے دلوں کے دل میں یہی چاہتا تھا کہ ہم ہر صورت گندوگورو بیس کیمپ تک جائیں.. اس لیے میں نے کہا.. کہ بس جی فیصلہ ہوگیا.. ٹیم ڈاکٹر نے بھی او کے کر دیا ہے اور حسن بھی معترض نہیں تو انشاء جی اب کوچ کرو..

بہر حال ایک شرط تھی.. کہ برمانی چولستانی ہرن ہو جانے سے باز آجائے اور حسن صاحب کے ہمراہ رہے.. ان کی نبض چیک کرتا رہے.. گولیاں کھلاتا رہے..

دل سنگ پا کو چھوڑتے ہوئے مجھے اُس پر بڑا ترس آیا..

کیونکہ وہ ہماری روانگی سے ویران ہوگئی تھی.. بیوہ ہوگئی تھی..

یہ شائی پُوکی خیمہ گاہ نہ تھی جسے ہماری روانگی سے کچھ فرق نہ پڑا تھا اور وہاں جو میلہ لگا ہوا تھا، اُسے احساس بھی نہیں ہوا تھا، کچھ میلہ گھومنے والے آئے تھے اور چلے گئے..

دل سنگ پا کو بہت فرق پڑا تھا..

اُس کی جھیل کے پانی پژمردہ ہو گئے تھے اور اُس کے آس پاس جو درجنوں گلیشیر اُترتے تھے اور مشابرم کی برفیں.. سب کے سب بے وقار ہو گئے تھے..

کیونکہ کوئی بھی چہرہ یا منظر تبھی باوقار ہوتا ہے جب اسے دیکھنے والے ہوں.. دیکھنے والے ہی نہ رہیں تو وہ چہرے اور منظر کسی کام کے نہیں رہتے.. بیکار اور تنہا رہ جاتے ہیں..

ہم دل سنگ پا کو بیکار کر کے.. اس کی تنہائی میں سے نکل کر ایک بلند کنارے پر پہنچے اور ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے..

"برف کے صحراؤں میں بھٹکتی ایک لیلے.."

دائیں ہاتھ پر وہی گندوگلیشیر ہمارا ساتھ دیتا تھا اور اس میں بہت سے برفانی وجود اتر رہے تھے..

یہاں بھی گلیشیر کے دامن میں ہریاول پھول اور ندیاں رخصت ہو چکے تھے.. اُن میں چلتے ہوئے ایک مرتبہ پھر احساس ہوا کہ ہم دیر سے آئے تھے.. ہمیں پچھلے ماہ ادھر سے گزرنا چاہیے تھا..

حسب معمول سامنے سے غیر ملکی کوہ نوردوں کے ریوڑ اتر رہے تھے.. دندناتے ہوئے اتر رہے تھے اور ہم ان کے گزرنے کے لیے جگہ بناتے تھے..

پتہ نہیں یہ کافر کے بچے آج صبح کتنے بجے گندوگورو کے بیس کیمپ سے چلے تھے کہ ہم نے ابھی اپنے سفر کا آغاز کیا تھا اور یہ دل سنگ پا کی قربت میں پہنچ رہے تھے..

کنارا جس پر ہم چلتے تھے.. ذرا اونچا ہوا.. کچھ پتھریلا ہوا اور پھر یکدم یہ اختتام پذیر ہو گیا اور آگے گندوگورو راستہ روکے کھڑا تھا..

ہمیں بہر طور نیچے اُتر کر گلیشیر پر چلنا تھا..

نہایت احتیاط سے اُترتے ہوئے گلیشیر تک پہنچنا تھا.. جو ہم پہنچ گئے..

نیچے ہر گلیشیر کے شروع میں ہمیشہ بڑے بڑے پتھروں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے.. اور پھر دراڑیں ہوتی ہیں.. ان پتھروں پر آپ کو بہت دیکھ بھال کر قدم رکھنے ہوتے ہیں.. ان پر آپ چہل قدمی نہیں کرتے.. چلتے نہیں بلکہ چھوٹی چھلانگیں لگا کر آگے جاتے ہیں.. ایک چٹان پر سے کود کر دوسری کو پہلے سے جانچتے ہیں کہ اس پر قدم کہاں پڑنا چاہیے اور ان دونوں چٹانوں کے درمیان جو

خلاء ہے۔اس میں اگر لینڈ کریں گے تو ٹانگ خلاء میں جائے گی اور ٹوٹ جائے گی۔۔بس اتنا خیال رکھنا پڑتا ہے۔۔

اور یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اگلا قدم جس پتھر پر رکھنا ہے تو وہ پتھر ہی ہے ناں۔۔کہیں بجری سے ڈھکی ہوئی سخت برف تو نہیں جس پر قدرے بے احتیاطی سے پڑنے والا بوٹ یوں پھسلتا ہے کہ آپ ایک مختصر سی قلابازی کے بعد بھی اٹھ بیٹھتے ہیں، ہائے ہائے کرتے ہیں اور کبھی نہیں بھی اُٹھتے اور آپ کے ساتھی ہائے ہائے کرتے ہیں کہ ہائے ہائے عجب آزاد مرد تھا۔۔

کنارے کے ان پتھروں پر چلتے چلتے ہم گلیشیئر کے درمیان میں پہنچ گئے جو سیاہ رنگ کا تھا اور یعنی مادہ تھا اور اس پر چلنا آسان تھا۔۔اس کی دراڑوں کی شکلیں بھی ایسی تھیں کہ دور سے پتہ چلتا تھا کہ یہ مادہ ہی ہے۔۔

ہم اس گندو گورو گلیشیئر سے زیادہ متاثر نہ ہوئے یعنی ہم میں سے جو سنو لیک کے سفر کے دوران دنیا کے طویل ترین گلیشیئر پر قدم رنجہ فرما چکے تھے۔اگر ہم نے ان قدم رنجوں کے دوران رنج بھی بہت اٹھائے تھے۔۔ان کے مقابلے میں تو یہ ایک بچہ گلیشیئر تھا۔لیکن احتیاط پھر بھی لازم تھی۔۔

یہیں پر گندو گورو پر چلتے ہوئے دائیں جانب لیلے نے پہلی بار اپنے وجود کی سفید عریانی کو ہم پر ظاہر کیا۔۔

وہ پہلے تو وہاں نہیں تھی۔۔

شائد اس نے ابھی ابھی میری پسلی سے ایک اماں حوا کی طرح جنم لیا تھا اور دائیں ہاتھ پر بلند ہو گئی تھی۔۔

اس صحرائے برف میں بھٹکتی ہوئی اچانک کہیں سے آنکلی تھی۔۔

متعدد برفانی بلندیوں میں سے قد نکالتی ہوئی۔۔چھریرے بدن کی ترچھی تکون کی صورت اختی لیلے۔۔جس کی چوٹی اس تکون کی ایک ایسی نوک تھی جس پر کوئی دودھ پیتا مجنوں تو نہیں جا سکتا تھا۔۔

ہمارے کوہستانی سفر کے دوران کے سکس۔کے سیون اور مشابرم ہم پر ظاہر ہوئیں۔ ہم اُن سے مرعوب بھی ہوئے اور مسحور بھی لیکن وہ محض برف تھیں۔چٹانیں تھیں لیکن لیلے۔۔گوشت پوست کی بنی لگتی تھی۔۔بدن ابھاروں اور گرم جذبوں سے سلگتی چوٹی لگتی تھی۔۔زندہ لگتی تھی۔۔یہ ایسی لیلے تھی۔۔

میں چلا تو گلیشیئر پر تھا لیکن گردن ٹیڑھی کر کے دائیں جانب بس اسے مسلسل دیکھتا جاتا تھا اور اگر یہ کوئی نامراد گلیشیئر ہوتا تو میں کب کا بے دھیانی میں کسی دراڑ میں گر چکا ہوتا۔۔

مجھے خدشہ ہوا کہ مسلسل اس کی جانب دیکھتے دیکھتے میری گردن میں بل آجائے گا۔ اس لیے میں نے اپنا دھیان سامنے کیا جہاں برمانی تھا۔۔اس لمحے حسن کا ہاتھ تھامے شائد اس کی نبض چیک کرتا چلا جا رہا تھا۔۔

"برمانی۔۔"

"جی۔۔"

"یار یہ کیسی لیلے ہے؟"

"جی؟" برمانی بھی شائد شاہد صاحب کی مانند ذرا اونچا سنتا تھا۔اس لیے یکدم سوال کرنے پر ہمیشہ چونک جاتا تھا اور ایک لمبی "جی ای ای" کرتا تھا۔۔

"میں اس پیک کی بات کر رہا ہوں۔۔لیلے پیک۔۔کیا چوٹی ہے۔۔لیلے برمانی۔"

"سبحان اللہ سائیں آپ نے جو اس چوٹی کو لیلے برمانی کہا ہے تو میرا دل موہ لیا ہے۔"

میں کچھ پزل سا ہو گیا۔"کیا مطلب؟"

"لیلے کے نام کے ساتھ ہمارا نام برمانی لگا کر بولے ہو جیسے یہ ہماری منکوحہ ہو تو ہمارا دل خوش ہو گیا ہے سائیں۔۔"

برمانی میری نظروں میں کچھ مشکوک ہو گیا۔"بھئی۔۔یہ تو۔لگتا ہے کہ ابھی ابھی یہاں ایک خلاء تھا اور یکدم یہ وجود میں آگئی ہے۔۔اب دکھائی دی ہے۔"

"سائیں آپ تخت لہور کے باشندے ہو شہر کے شور اور میدانوں کے باسی ہو تو آپ کو یہ اب دکھائی دی ہے۔۔ہم صحرا کے مکینوں کو تو یہ ایک مدت سے دکھائی دے رہی ہے۔"

"برمانی تم براہ کرم ایک مرتبہ فیصلہ کر لو کہ تم ہو کیا؟۔۔کبھی تم سرائیکی بولنے لگتے ہو۔۔کبھی تم بلوچ ہونے کا دعویٰ کرتے ہو۔۔کبھی کوہ سلیمان سے رشتہ جوڑ کر مرد کوہستان ہو جاتے ہو اور کبھی صحرا کا باسی ہونے کا دعویٰ کرتے ہو۔۔اور اس کے ساتھ سندھ سائیں کے پجاری ہونے پر بھی فخر کرتے ہو۔۔تو تم ہو کیا؟"

"سائیں آپ کے اور ہمارے بلھے شاہ نے کہا تھا کہ کی جاناں میں کون اُو بلھیا۔۔کی جاناں میں کون۔۔"

"یار اتنی بلندی پر تو اس مجلسی دانشوری کی مار نہ دو.."

"نہیں سائیں توبہ توبہ، دانشوری کا دعویٰ کس بدبخت کو ہے لیکن سچ کہتا ہوں کہ میں ابھی تک واقعی یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ میں کون ہوں.. کبھی مجھے اذان سنائی دیتی ہے اور کبھی تنی سرور کے مزار کے باہر وہ مقام بلاتا ہے جہاں شو لنگ ہوا کرتا تھا اور کبھی میں کالاش کافروں کے قبیلے میں شامل ہو جاتا ہوں تو مجھے نہ پوچھئے کہ میں کون ہوں.. لیکن میں جو کوئی بھی ہوں، اس لیلے کے عشق میں فنا ہو چکا ہوں۔"

"جانے دو برمانی.."

"سچ کہتا ہوں سائیں.."

"تمہارا کیا ہے برمانی.. تم تو نانگا پربت کے سامنے جو لالی پکٹ پیک ہے، اس پر بھی لٹو ہو گئے تھے اور وہ تمہیں خواب میں ایک سفید لباس میں ملبوس دولہن کی صورت میں جلوے دکھاتی تھی.. تمہارا کیا ہے تم تو سفید گھوڑیوں کے وصل کی خواہش میں بھی گم رہتے ہو۔"

"سچ کہتا ہوں سائیں.." اور وہ حسن کو سہارا دیتا آگے بڑھ گیا..

برمانی ہم سب سے ایک الگ طبیعت ایک الگ طبع کا شخص تھا..

ہم سب اگرچہ خصلتیں مختلف رکھتے تھے لیکن ہمارا سانچہ ایک ہی تھا.. ہمارے عقیدے، اخلاقیات اور سوچ تقریباً ایک ہی سانچے میں ڈھلتے تھے لیکن برمانی ہم سے الگ کسی اور ہی سانچے سے وجود میں آیا تھا.. میں نے اس کے لیے "طبع" کا لفظ وارث شاہ سے مستعار لیا ہے کہ.. طبع ہالی وی حرص تیں نہ باز آئی.. تو برمانی کی یہ طبع ہم سے بہت مختلف تھی.. بے حد حریص تھی جو برفانی چوٹیوں اور سفید گھوڑیوں کے وصال کی خواہش کرتی تھی..

ویسے تو مجھ پر بھی برف بلندیاں، جھیلیں اور جنگل کچھ الگ انداز میں اثر کرتے تھے.. جیسے وہ زندہ ہوں.. اُن کے بدنوں میں بہاؤ میں حرارت اور زندگی ہو.. چاہے وہ شاہ گوری ہو جس کی سفیدی پر بوسوں سے نیل پڑتے تھے یا جھیل کرومبر ہو جس کے پانیوں میں اُترتے ہوئے میں ان کی تہہ کو چھوتا تھا تو وہ آہ بھرتے تھے.. یا فیری میڈو کے جنگل ہوں جن کا ہر شجر.. چاہے وہ سر بلند اور زندہ ہو اور چاہے برسوں سے زمین بوس ہو چکا ہو، مجھے آغوش میں لینے کے لیے بے قرار ہو..

کچھ اسی طور یہ لیلے تھی..

یہ تکون آسمان میں چھید کرتی ہوئی.. قدرے ترچھی ایک ایسی ہی چوٹی تھی جو دل میں جگہ بناتی دل کش ہوتی بدن میں اُترتی تھی..

میں جب تک کندو گورو گلیشیر پر چلتا رہا.. ایک نظر سامنے ڈالتا اور دوسری نظر اُٹھاتا اور لیلے پیک پر رکھ دیتا..

جس زاویے سے وہ مجھے نظر آ رہی تھی وہاں سے اس کی ترچھی تکون چڑھائی ایسی تھی کہ اس پر کسی کوہ پیما کے قدم تو کیا کسی پرندے کے پنجے بھی ٹھہر نہ سکتے تھے..

اس کا چٹانی برفانی وجود آسمان سے اپنی نوک چھوتا ہم سے بہت غافل اور الگ تھلگ تھا اور ہم خواہ مخواہ اس کے عشق میں مبتلا اس میں اپنی لیلاؤں کو دیکھتے تھے.. خیر ہو تیری لیلاؤں کی.. آج کی شب جب دیے جلائیں اونچی رکھیں لو..

"میں لیلےٰ کے عشق میں.. گھوڑا ہو گیا"

تنہا اور الگ صرف لیلےٰ تھی.. گندو گورو گلیشیئر نہ تھا.. یہ مال روڈ بنا ہوا تھا..

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کے ٹو جانے والے جتنے بھی کوہ نورد تھے، وہ الٹے پاؤں اشکولے جانے کی بجائے درّہ گندو گورو پار کر کے اب ادھر اُترتے تھے اور شائی چُو کے راستے ہوشے کو منزل بناتے تھے..

ایک ایسی ہی غیر ملکی مہم کے چند افراد جھکتے ہوئے سامنے سے چلے آ رہے تھے.. اُن کا پاکستانی گائیڈ ان بھیڑوں کو راستہ دکھاتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا.. میرے قریب آیا تو ایک نظر مجھ پر ڈالی.. اور نہایت ڈھٹائی سے کہا۔ "تارڑ صاحب ہیں ناں؟"

"جی.."

"پھر آ گئے ہو.."

میں رُک گیا کہ اس شخص نے مجھے پہچان لیا ہے تو اب کچھ گپ شپ کرے گا لیکن پتہ نہیں کون نامعقول شخص تھا کہ وہ رُکا نہیں.. بس یہ کہہ کر کہ "پھر آ گئے ہو" چلتا گیا.. میں نے پیچھے مڑ کر بھی دیکھا لیکن وہ رُکے بغیر چلتا جا رہا تھا..

اس "پھر آ گئے ہو" میں کچھ حیرت تھی اور بہت سی تضحیک..

میں ابھی اس "پھر آ گئے ہو" کے شاک میں تھا جب گلیشیئر پر اُترتا ایک اور غیر ملکی گروپ نمودار ہو گیا..

میں نے پہلے بھی اپنی اس حیرت کا اظہار کیا تھا کہ نامعلوم وجوہات کی بنا پر ان علاقوں میں اس برس بیشتر کوہ نورد ہسپانیہ سے تعلق رکھتے تھے.. اور یہ گروپ بھی ہسپانوی تھا اور حسبِ معمول

ان کو راہ دکھانے والا ایک پاکستانی گائیڈ تھا.. اور یاد رہے کہ آج میں گھوڑا ہو چکا تھا..

کیسے ہو چکا تھا اس کا احوال اس ہسپانوی گروپ کے گزر جانے کے بعد آپ کی خدمت میں عرض کروں گا..

تو حسبِ معمول یہ پاکستانی گائیڈ جو ان ہسپانوی سیاحوں کو راہ دکھا رہا تھا میرے قریب آیا.. گلیشیئر پر چلنے کے لیے ایک مخصوص راستہ یا پگڈنڈی ہوتی ہے اور آپ اُس سے انحراف نہیں کرتے کیونکہ آس پاس کھائیاں اور دراڑیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہر کوئی ایک ہی راستے پر چلتا ہے اور جو کوئی بھی سامنے سے آئے گا تو اس سے آپ کی ملاقات بہر طور ہوتی جائے گی..

یہ پاکستانی گائیڈ اپنی غیر ملکی بھیڑوں کو ہانکتا میرے قریب آیا تو.. نُور حیات تھا.. میں ایک قدرے غیر معروف گلیشیئر پر اپنی بھیڑوں کو ہانکتے ہوئے ایک گائیڈ کو کیسے جانتا تھا؟ وہ 1990ء میں کے ٹو پر جانے والی امریکی مہم کے رابطہ افسر کیپٹن مبشر حسین تارڑ کا ساتھی اور پورٹر تھا.. جو براللدو دریا کی ایک تنگی اور بلند چٹان پر ہانپتے پیاسے مبشر کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال کر کہیں نیچے دریا تک لڑھکتا ہوا گیا تھا اور اس کے لیے پانی لے کر آیا تھا..

اور پھر "کے ٹو کہانی" کے زمانے میں وہ کنکورڈیا کے راستے میں مجھے مل گیا تھا اور اس نے مجھے نہایت اعلیٰ ذائقے کا پلاؤ کھلایا تھا..

یہ وہی نُور حیات تھا..

وہ جو انگریزی میں کہتے ہیں ناں کہ.. اِٹس اے سمال ورلڈ.. تو واقعی یہ ایک چھوٹی سی دنیا تھی.. پاکستانی شمال کی چھوٹی سی دنیا تھی.. جس میں آشنا اور دوست چہرے کہیں نہ کہیں آمنے سامنے آ جاتے تھے.. نور حیات کے نتھنے اب بھی پھڑکتے تھے اور وہ بھی زمانے کے گزرنے کے نشان اپنے چہرے پر لکیروں کی صورت رکھتا تھا..

مجھے دیکھ کر اس کے سفید.. خوش شکل چہرے پر ایک زبردست حیرت اور مسرت کی مسکراہٹ پھیل گئی.. اس نے میرا حال احوال پوچھا.. مبشر کے بارے میں استفسار کیا اور پھر پوچھا کہ صاحب کدھر سے آ رہے ہو اور کدھر جا رہے ہو؟.. اور ابھی تک اس عمر میں بھی آ جا رہے ہو.. پھر اپنے گروپ کے کوہ نوردوں کے ساتھ میرا تعارف کروایا..

میں نے نوٹ کیا کہ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے یہ ہسپانوی خواتین و حضرات کچھ عجیب انداز میں مسکراتے تھے.. ایسے مسکراتے تھے جیسے میں ان کے سامنے نہ ہوں چارلی چپلن ہوں، اپنے

چھاتے.. ڈھیلی پتلون اور پھڑکتی ہوئی مونچھوں کے ساتھ..

''نور حیات یہ حضرات مجھ سے مل کر کچھ ضرورت سے زیادہ خوش ہو رہے ہیں اور بے وجہ مسکرا رہے ہیں تو کیوں..''

نور حیات قدرے پریشان اور پشیمان ہو گیا اور اپنی پھڑکتی ہوئی ناک کھجا کر کہنے لگا

''صاحب ایک چھوٹی سی بدتمیزی ہو گئی ہے..''

''کیسی بدتمیزی؟''

''دراصل ہم لوگ.. گائیڈ لوگ.. جب بھی غیر ملکی کوہ نوردوں کو لے کر پہاڑوں اور گلیشیئرز میں جاتے ہیں تو ہمیشہ ایک ہی سوال پوچھا جاتا ہے کہ تمہارا شمال اتنا یونیک اور زبردست ہے اور یہاں صرف غیر ملکی آتے ہیں، تمہارے ملک کے باشندے کیوں نہیں آتے.. آپ کے نمودار ہونے سے چند لمحے پہلے یہی سوال پھر اٹھایا گیا تھا کہ ہم نے پورے ٹریک کے دوران کوئی پاکستانی کوہ نورد نہیں دیکھا.. اور تب آپ نظر آ گئے.. آپ کے ساتھی دکھائی دینے لگے.. آپ دور سے پہچانے تو نہیں جا رہے تھے لیکن آپ کی بے ڈھنگی چال سے اندازہ ہوتا تھا کہ جو بھی یہ شخص ہے سخت مشکل میں ہے اور پاکستانی ہے.. تو میں نے نہایت فخر سے اعلان کیا کہ سینور.. سینور تیا.. آپ شکایت کر رہے تھے کہ ان پہاڑوں میں کوئی پاکستانی نہیں آتا تو لیجیے سامنے سے ایک پاکستانی آ رہا ہے اور اس کا نام تارڑ ہے.. کتابیں لکھتا ہے اور ٹیلی ویژن پر میزبانی کرتا ہے.. تو انہوں نے دریافت کیا کہ اتنی دور سے صرف ایک جامنی رنگ کی جیکٹ نظر آ رہی ہے تو تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ وہی شخص ہے جس کا تم نام لے رہے ہو.. تو میں نے وہی چھوٹی سی بدتمیزی کی اور کہا.. پاکستان میں صرف ایک ہی تنہا پاگل شخص ہے تو وہی ہو سکتا ہے.. ہم قریب آئے تو آپ.. میرا مطلب ہے کہ وہ وہی تھا.. اس لیے آپ سے ہاتھ ملاتے ہوئے یہ لوگ مسکرا رہے تھے..''

''تھینک یو.. نور حیات.. عجیب سا کومپلی منٹ دیا ہے تم نے.. لیکن تھینک یو..'' میں نے نور سے اور اس کے ساتھی کوہ نوردوں سے باری باری ہاتھ ملایا اور آگے بڑھ گیا۔

شمال بہت بڑا ہے.. ایک کائنات ہے.. اور اس کائنات میں میری حیثیت ایک ذرے سے بھی کم ہے.. لیکن.. پچھلے بیس برس سے ہمیشہ یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ میں بے شک ''پاک سرائے'' کی وادی سوخترآباد میں خیمہ زن ہوں یا ''سنولیک'' کی برفوں میں کسی برفانی پل صراط پر چلتا ہوں تو

پورے شمال کو خبر ہو جاتی ہے کہ میں اس برس کہاں دیکھا گیا ہوں..

دیوسائی ٹریک کے دوران جب مجھے بتایا گیا کہ پورے دیوسائی میں صرف بیس بائیں ریچھ ہیں تو مجھے یقین نہ آیا کیونکہ موسم گرما میں پورے سکردو میں ریچھوں کی دھوم ہوتی تھی.. ہر دوسرا شخص گواہی دیتا تھا کہ دیوسائی پر تو اتنے ریچھ ہیں کہ ان کو چلنے پھرنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے.. یا تو ہر ایک نے ریچھ دیکھا ہوتا تھا اور یا پھر اسے بتایا گیا ہوتا تھا کہ جناب میں نے خود دیکھا ہے.. چنانچہ مجھے یقین نہ آیا کہ دیوسائی پر صرف بیس بائیس ریچھ رہائش پذیر ہیں.. پھر جنگلی حیات کے رفیق راجپوت نے یہ مسئلہ حل کر دیا..

''تارڑ صاحب دیکھیں.. اگر روزانہ بیس یا پچیس جیپیں دیوسائی سے نیچے سکردو میں اترتی ہیں اور کسی روز کوئی ایک ریچھ روڈ کے آس پاس ٹہلتا نظر آ جاتا ہے تو گویا پچیس جیپوں میں سوار تقریباً دو سو افراد نے اس ایک ریچھ کو دیکھا.. اب وہ دو سو افراد اپنے دو ہزار جاننے والوں کو بتاتے ہیں کہ ہم نے خود دیوسائی پر ریچھ دیکھے ہیں.. اور وہ دو ہزار افراد مزید لوگوں کو یہی کہانی سناتے ہیں اور یوں ریچھ صرف ایک ہوتا ہے لیکن تاثر یہ ابھرتا ہے کہ جانے والے وہاں ہزار ریچھ ہیں..''

شمال میں میری موجودگی کی دھوم بھی اسی کلیے کے مطابق ہوتی تھی..

تارڑ صاحب ایک ہوتا تھا اور..

اور ہاں اب وہ قصہ کہ میں اس روز گھوڑا ہو گیا تھا..

یہ نہایت یونیک تھیسس ڈاکٹر عمر نے ''کے ٹو کہانی'' کے دوران پیش کیا تھا..

یعنی.. کوہ نورد کا پہلا دن جب وہ اپنی جیپ سے بچھڑ کر ان ویرانوں میں قدم رکھتا ہے جہاں صرف قدم ہی جاتے ہیں تو وہ دن پُرمشقت اور اذیت والا ہوتا ہے.. اس کی بے بسی اور تھکاوٹ عروج پر ہوتی ہے.. پھر دوسرا دن آتا ہے تو وہ ذرا بہتر چلنے لگتا ہے۔ اگرچہ نڈھال ہوتا ہے اور پاؤں میں چھالے ابھرتے ہیں اور رانوں میں خراشیں ہوتی ہیں لیکن وہ گرتا پڑتا اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

لیکن تیسرے دن وہ گھوڑا ہو جاتا ہے..

اور واقعی کے ٹو ٹریک کے تیسرے دن میں گھوڑا ہو گیا تھا..

شائد اس میں ڈاکٹر عمر کی عطا کردہ ان وٹامن گولیوں کا بھی کمال ہو جو میں نے صبح سویرے پھانک لی تھیں اور مجھے شک ہے کہ ان میں کچھ سٹیرائڈ کی آمیزش تھی لیکن میں ایک بہت

ہی چھریرا اور دراڑوں کو پھلانگ جانے والا اُن تھک گھوڑا ہو گیا تھا.. لیکن ایک عجیب سانحہ ہو گیا.. کے ٹو ٹریک کے بعد میں نے جتنے بھی ٹریک کئے، میں نے ہمیشہ تیسرے دن کا بے تابی سے انتظار کیا کہ آہا جی آج تو ہم گھوڑے ہو جائیں گے اور ہم کبھی بھی نہ ہوئے.. ہمیشہ وہ ناکارہ خچر ہی رہے جنہیں بیکار جان کو گولی ماردی جاتی ہے۔ چنانچہ قابل فہم طور پر ڈاکٹر عمر کے اس تھیسس پر سے میرا ایمان اُٹھ گیا.. لیکن آج.. گندو گورو ٹریک کے تیسرے دن یہ معجزہ ہو گیا تھا..

میں نے اپنے تمام ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اور بگٹٹ چلتا جاتا تھا.. نہ میرے بدن میں کوئی زیادہ تھکاوٹ تھی اور نہ بلندی مجھ پر کوئی خاص اثر کرتی تھی اور میں ملکھا سنگھ ہو گیا تھا..

ملکھا سنگھ جسے "فلائنگ سکھ" کا نام دیا گیا تھا.. دنیا کے بہترین دوڑنے والوں میں سے تھا.. ایشین اولمپک میں گولڈ میڈل جیت چکا تھا اور کہتے ہیں کہ انڈین ریلوے میں ٹکٹ چیکر ہوا کرتا تھا.. ایک روز اس نے ایک بے ٹکٹ مسافر کو چیک کیا تو وہ مسافر بھاگ اٹھا.. ملکھا سنگھ کو بڑا غصہ آیا کہ کیسا احمق ہے مجھ ایسے چمپئن سے بھاگ جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے مسافر کے پیچھے دوڑ لگا دی.. جب ملکھا سنگھ پلیٹ فارم پر زقندیں لگاتا سٹیشن سے باہر آ کر کھیتوں میں دوڑتا چلا جا رہا تھا تو کسی نے پوچھا، سردار جی وہ بغیر ٹکٹ والے مسافر کو پکڑ لیا ہے یا نہیں تو ملکھا سنگھ نے کہا "بادشاہو ہم تو دوڑ میں اس کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔"

تو میں بھی دوڑ میں اپنے ساتھیوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا..

شائد یہ لیلے پیک کی قربت کا اثر تھا جس نے میرے پژمردہ بدن پر اپنا برف ہاتھ رکھ کر کوئی سحر پھونک دیا تھا.. ایک دم جیسے پھونک دیا تھا اور میری مُردنی.. زندگی میں بدل گئی تھی..

ویسے مجھے کچھ کچھ شرمندگی بھی تھی کہ عمر کے اس حصے میں جب انسان باوقار اور معزز بزرگ سا ہو جاتا ہے، میں گھوڑا ہو گیا تھا.. یہ کوئی قابل فخر بات نہ تھی لیکن اس پر میرا کوئی اختیار نہ تھا..

میرا خیال ہے کہ میں ایک آدھ بار ہنہنایا بھی..

کہیں بلند پہاڑوں میں.. پتھروں کی دنیا میں.. بے انت برفوں میں عام طور پر کوئی واضح راستے نہیں ہوتے.. بس اندازے ہوتے ہیں کہ عمومی رخ یہ ہے بس چلتے جاؤ.. ان حالات میں آپ اپنی حماقت کو بروئے کار لاتے ہیں.. عقل کو اس لیے نہیں کہ وہ تو آپ میں ہوتی نہیں.. اگر ہوتو ادھر ذلیل وخوار ہونے کے لیے کیوں آئیں.. تو اس کوہ نوردی کی حماقت کو بروئے کار لا کر آپ اپنے راستے کا تعین کرتے چلے جاتے ہیں.. مثلاً کے ٹو ٹریک کے دوران جب ہم

بھٹک جاتے تھے تو بیافو گلیشیئر پر خچروں کا گوبر تلاش کرتے تھے کہ یہ خچر پاکستانی فوج کا سامان رسد ڈھوتے تھے تو جہاں جہاں ان کا گوبر کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا تو.. یقیناً یہی راستہ ہوگا.. ہوشے سے شائی چو اور پھر ول سنگ پانگ سوئس اور چاکلیٹ کے وہ چھلکے اور بدذا ہر کام آئے جو بدتمیز کوہ نورد پھینکتے گئے تھے.. ان واضح نشانیوں کے علاوہ "ہّق" کوہ نوردوں کے لیے ایک مینارۂ نور ہوتی ہے.. پیچیدہ برفانی راہ گذاروں اور پتھریلے علاقوں میں کسی بڑے پتھر پر چھوٹے چھوٹے پتھروں اور کنکروں سے ایک "ہّق" یا مینار سا بنا دیا جاتا ہے.. جیسے "پٹھو گرم" کھیلنے کے لیے بچے کنکریوں کو اوپر تلے جوڑ کر ایک مینار سا بنا دیتے ہیں..

آپ پتھروں کی سلطنت پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور بہت غور سے دیکھتے ہیں تو کہیں نہ کہیں یہ نشانی نظر آ جاتی ہے جو کبھی تو دو تین کنکروں پر مشتمل ہوتی ہے اور کبھی خاصے تردد سے دس بارہ چھوٹے چھوٹے پتھروں کو اوپر نیچے رکھ کر یہ نشانی بنا دی جاتی ہے۔ یہ نشانی کبھی تو کوہ نورد بناتے ہیں اور اکثر پورٹر اپنی سہولت کی خاطر بناتے چلے جاتے ہیں تاکہ ان کے پیچھے آنے والے ساتھی بھٹک کر کسی اور جانب نہ نکل جائیں.. اگر راستہ واضح نہ ہو جو کہ وہ کبھی بھی نہیں ہوتا تو ہر کوہ نورد یا پورٹر کا یہ فرض ہوتا ہے کہ کسی بڑے پتھر پر یہ نشانیاں بنا کر آگے بڑھتا جائے..

اگر "ہّق" موجود ہو تو ہر کوہ نورد یہ کوشش کرتا ہے کہ اس رہنما مینار پر ایک اور پتھر بیلنس کر کے سرخرو ہو جائے۔

یہ نشان محض ایک سرسری نظر ڈالنے سے نظر نہیں آتے..

میں بہت غور سے دیکھتا ان چھوٹے میناروں کو تلاش کرتا.. جن میں سے بیشتر پیسا کے جھکے ہوئے مینار کی مانند گرنے کو لگتے تھے.. ان کی جانب قدم اٹھاتا چلتا جاتا تھا.. اور اپنے بوٹوں کو دراصل اپنی نعلیں گرداناتا تھا جو میرے سُموں میں ٹھونک دی گئی تھیں اور ان میں سے شائد چنگاریاں بھی اُڑتی تھیں کہ میں گھوڑا ہو چکا تھا.. شائد اس بلندی پر میرے نتھنوں میں سے بھاپ بھی خارج ہوتی تھی.. مردوں نے اپنی تسلی کی خاطر جو وہ انتہائی لایعنی محاورہ گھڑ رکھا ہے کہ مرد اور گھوڑا کبھی بوڑھے نہیں ہوتے.. تو میں تو بوڑھا بھی تھا اور گھوڑا بھی..

میں جب کبھی سر اٹھا کر لیلے پیک کو دیکھتا تو بے اختیار جی چاہتا کہ ہنہنانے لگوں.. ایسی ہی کرتا، اُس کے قدموں میں لوٹنے لگوں.. لیکن میں نے اجتناب کیا.. اس حرکت سے یقیناً لیلے پیک کا دل دکھے گا کہ میں تو مجنوں کی منتظر تھی اور میرے حصے میں یہ گھوڑا آ گیا ہے..

گندو گورو گلیشیئر اب تک سیدھا چلا جا رہا تھا۔ اب دیکھتا ہوں تو وہ بل کھا کر دائیں ہاتھ کہیں پہاڑوں کے اندر گم ہو رہا ہے۔ اس موڑ کے عین اوپر جو بلند کنارا تھا، اس پر ہمارے پورٹر براجمان تھے اور مجھے بے تحاشا اشارے کر رہے تھے۔ کوئی وارننگ دے رہے تھے.. پہلے تو مجھے ان کی یا اشارہ بازی پلے نہ پڑی اور پھر بہت غور کرنے پر انکشاف ہوا کہ وہ مجھے گلیشیئر کے درمیان چلتے جانے سے منع کر رہے ہیں اور اشارے کر رہے ہیں کہ بائیں ہاتھ ہو جاؤ.. کنارے کے ساتھ لگ کر چلو..

ان کی وارننگ بروقت تھی.. اگر میں اسی انداز میں گلیشیئر کے درمیان میں چلتا جاتا تو آگے ایک بہت چوڑی دراز منہ پھاڑے حائل تھی جسے پار کرنا ممکن نہ تھا.. نہ صرف ایک دراز تھی بلکہ برف کا ایک کنواں بھی ایک برفانی ندی کو اپنے آپ میں گراتا گھمن گھیریاں کھا رہا تھا..

یہ طلسم گلیشیئر والے کنویں کے حجم اور گھیر کا نہ تھا کہ وہ تو ایک عجوبہ تھا لیکن بہر طور ایک اندھا برف کنواں تھا جس کے آس پاس سے گزرنا صحت کے لیے انتہائی مضر ثابت ہو سکتا تھا..

پورٹروں کے اشاروں نے مجھے ان ہر دو آفتوں سے بچا لیا تھا..

کنارے کے اوپر ایک بھربھری بلندی کے اوپر ہمارے پورٹر بیٹھے تھے اور مجھے اشارے کر رہے تھے کہ یہاں سے اوپر آ جاؤ..

میں نے گلیشیئر راستے کو ترک کیا اور اس کنارے پر چڑھتا ان تک پہنچ گیا..

یہ بیان تو میں نے اپنی مختصر نویسی کے شوق میں دے دیا ہے کہ میں بس میں اس کنارے پر چڑھتا ان تک پہنچ گیا ورنہ اس چڑھائی میں جو برفانی پھسلن تھی اور لڑھکتے ہوئے پتھر اور کھسکتی ہوئی گیلی بجری تھی جس کے نیچے سخت برف پوشیدہ تھی، اس سے نبرد آزما ہوتے ہوئے جو میرا حال ہوا.. سانس جو بے قابو اور بے ربط ہوا اور انتہائی بلند پایہ بوٹوں کے باوجود جو میں پھسلتا پھسلتا بچا ہوں اور نیچے گلیشیئر پر قلابازیاں کھاتے گرنے سے جو بچا ہوں تو اس کا احوال کیا کہوں..

بے شک میں ایک گھوڑا ہو چکا تھا..

لیکن ایک بُردبار اور شریف گھوڑے کو بھی تو ایک ریس کورس چاہیے.. ایک صحرا یا کوئی میدان چاہیے.. اس کے سامنے اگر ایک اس قسم کی چڑھائی آ جائے تو وہ اسے دیکھ کر محض ایک بار حسب عادت ہنہنائے گا اور شکایت آمیز لہجے میں کہے گا کہ معاف کیجیے میں ایک گھوڑا ہوا کرتا ہوں.. ایک دھک کوڑا یا چوہا نہیں ہوں جو اس بلند دیوار کے ساتھ چمٹ کر رینگتا ہوا اوپر پہنچ جاؤں..

بہر طور میں ایک گھوڑے اور ایک کوڑے کے کمبی نیشن کے ساتھ اوپر پہنچ ہی گیا.. اپنے

مختصر رک سیک کو کندھوں سے اتارا اور لیٹ گیا.. لیٹ گیا تو کھسکنے لگا کیونکہ ڈھلوان تھی اور بجری تھی، اس لیے اٹھ کر بیٹھ گیا.. اٹھ کر بیٹھ گیا تو برابر میں رکھا رک سیک لڑھکنے کو آیا.. اسے سنبھالا دیا اور پھر اپنے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگا..

بہت دیر کے بعد ہمیں بہت نیچے برف کی سلطنت کی سفیدی میں کیڑے مکوڑے رینگتے دکھائی دیے جو میرے ساتھی تھے.. حسن بیمار تھا.. شاہد سُست ہو رہا تھا۔ میاں صاحب کا تختہ سوچ چکا تھا اور وہ پاؤں پر پٹیاں باندھ کر چلتے تھے۔ عامر کے پیٹ میں کچھ پرابلم تھی.. سلمان اپنے بھاری بھالوپن سے عاجز آیا ہوا تھا اور برمانی اگرچہ پہلے دن سے ہی گھوڑا تھا اور بگٹٹ بھاگنا چاہتا تھا لیکن وہ حسن کی صحت پر نظر رکھنے کی خاطر اپنی باگیں کھینچتا چلا آتا تھا.. لیلیٰ پیک یہاں سے ایک عجیب منظر دکھاتی تھی..

اس بلندی سے وہ ایک بے مثال درشن دیتی تھی..

لیلیٰ.. تبت کے مقدس کوہ کیلاش کی مانند پُرتقدس اور قابل پرستش دکھائی دیتی تھی..

کوہ کیلاش کے بارے میں کہنا ہے کہ اس کے چرنوں کو چھونے کی خواہش کرنے والے پجاری چلتے ہوئے اس کے دامن تک نہیں جاتے بلکہ اپنے گھٹنوں پر گھسٹتے ہوئے وہاں تک پہنچتے ہیں.. یا راستے میں ہی رہ جاتے ہیں..

کسی بھی شے کو مقدس کر لیں.. پرستش کے لائق کر لیں تو بڑی خواری ہوتی ہے.. کوئی پتھر خدا ہو جاتا ہے اور کوئی حجرِ اسود..

لیلیٰ کی نوکیلی چوٹی کی تیز دھار برچھی نیلگوں آسمان میں پیوست جیسے عرش پر مقیم کسی خدائی کو چیلنج کرتی تھی..

لیلیٰ کا یہ روپ میرے لیے تو کوہ کیلاش سے کہیں برتر اور بلند تھا.. اگر وہ قابل پرستش تھی تو پہاڑوں کے کسی نہ کسی مذہب میں اسے چھوڑ جانے کی سزا.. ایک مرتد کی سزا ہو گی..

ہم چونکہ اندر سے کافر تھے.. مسلمان نہ ہوئے تھے، اس لیے لیلیٰ ہمیں ترکِ اسلام کی ترغیب دیتی تھی.. لیکن ہم کہاں اس ترغیب میں آنے والے تھے کہ ہم بہت بلیاد پرست تھے۔ اگرچہ بنیاد پرست وہی ہو جاتا ہے جس کے اندر کفر ابھی زندہ ہوتا ہے اور وہ اسے مارنے کے لیے.. آنکھیں بند کر لیتا ہے اور تلوار نکال لیتا ہے..

لیلیٰ او لیلیٰ..

"گونگے شاہ مجھے ہسپاں لے جا رہا ہے یا ہسپانیہ"

اس سے پیشتر کہ میں لیلےٰ کی جانب دیوانہ وار لپکتا اور مذہب عشق اختیار کرتا علی موسےٰ نے پوچھا "صاحب آگے نہیں جائے گا۔"

"جائے گا۔"

"تو پھر جاؤ۔"

"آگے گندوگورو کا بیس کیمپ ابھی کتنا دور ہے؟"

"تھوڑا دور ہے۔"

"اور جدھر ہم پہنچے گا تو اس جگہ کا نام کیا ہے علی موسےٰ؟"

اس بدبخت نے پھر وہی ہسپانوی قسم کا ہسپاں سا نام لیا.. اور میں اسے روک روک کر ایک ایک لفظ کو بار بار دوہراتے جب اس نام سے آگاہ ہوا تو وہ.. ہسپاں... ہی تھا.. اسی لیے ہسپانوی سا لگ رہا تھا..

"اور یہ کدھر ہے؟"

"صاحب ادھر سے نیچے اُترے گا.. جدھر ایک ندی بہتا ہے.. پھر اوپر جائے گا پھر نیچے۔"

"میں جاتا ہوں.." میں نے ایک برتری کی نظر اپنے نڈھال ساتھیوں پر ڈالی اور سینہ پُھلا کر کہا "بیس کیمپ پہنچ کر خیمے لگواتا ہوں اور پھر آپ کا انتظار کرتا ہوں.. میں جاتا ہوں۔" میں چلنے لگا تو خیال آیا کہ جانا کس طرف ہے..

"کدھر ہے یہ بیس کیمپ کا راستہ.."

"آپ کے ساتھ یہ پورٹر جائے گا صاحب.. راستہ دکھائے گا"

اور یہ پورٹر ایک سیاہ ریش لُٹا پُٹا پریشان حال گُنگ سا بابا پورٹر منہ کھولے مجھے دیکھ رہا تھا۔ "یہ آپ کو ہسپاں لے جائے گا.. ہم آپ کے ساتھیوں کو لے کر پیچھے پیچھے آئے گا۔"

میں پھر سے رواں ہو گیا..

دو تین بلندیاں اور ڈھلوانیں ہنہناتے ہوئے طے کیں.. ندیوں میں چھینٹے اڑاتا پار گیا، پتھروں کو پھلانگتا اور برفوں پر بے خطر چلتا گیا.. اس لیے بھی کہ میرے ساتھی مجھے دیکھ رہے ہیں اور میں ان کے سامنے ڈینگیں مار کر آیا تھا۔ جونہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئے، میں نے ایک پتھر سے ٹیک لگا کر ہانپنا شروع کر دیا بلکہ زبان باہر نکال کر اس کو بھی ہوا لگوائی تاکہ تھوڑی بہت آکسیجن اس کے مساموں میں جذب ہو کر مجھے تازہ دم کرنے میں معاون ثابت ہو.. لیکن ثابت یہی ہوا کہ میں اتنا گھوڑا بھی نہ تھا.. ایک جعلی سا گھوڑا تھا..

دراصل لکڑی کا وہ گھوڑا تھا جس میں سپاہی چھپا کر اسے ٹرائے کے شہر میں دھکیل کر لے جایا گیا تھا تاکہ ہیلن ایسی بے وفا حسینہ کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے.. میں پھر سے چلا.. اور اس سیاہ ریش پریشان حال گُنگ بابے پورٹر کے تعاقب میں چلا اور تھوڑی ہی دیر میں پھر سے ہانپنے لگا..

اب وہ پتھروں کی دنیا چھوڑ کر ایک اور سفید گلیشیئر پر اُتر چکا تھا اور انتظار نہ کرتا تھا کہ میں اس سے جا ملوں.. وہ رُکتا تو تھا کسی پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر لیکن جونہی میں اس کے قریب پہنچتا وہ مجھ سے بات کیے بغیر پھر سے چالو ہو جاتا تھا.. چلنے لگتا تھا..

میں نے متعدد بار آوازیں دے کر اسے روکنا چاہا لیکن وہ سنتا ہی نہ تھا.. پیچھے مُڑ کر دیکھتا اور اپنی سیاہ ریش میں پوشیدہ مسکراہٹ سے مجھے نواز کر پھر سے شوٹ لگا دیتا..

عجیب اول جلول اور اخلاقیات سے عاری پورٹر تھا..

میں آوازیں دیتا.. ہانپتا ہوا آوازیں دیتا کہ ہیلو.. بابا جی.. بابیو.. بزرگو.. پورٹرو.. ذرا رک جاؤ.. مجھے سانس تو لینے دو لیکن شاید وہ بہرا تھا.. سُنی اَن سُنی کرتا چلتا جاتا تھا.. اور میں اسے کھو دینے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ اس پتھریلی اور برفانی ریاست میں بھٹک سکتا تھا..

اور پھر حسب روایت ایک اور ہسپانوی ٹیم سے آمنا سامنا ہو گیا..

ان میں ایک ایسی بزرگ خاتون تھی جو پاکستان میں ہوتی تو پوتے پوتیوں کو کھلاتی اللہ اللہ کرتی موت کی منتظر ہوتی.. ایک ڈھیلی جین اور ہائکنگ بوٹس میں کولہوں پر ہاتھ رکھے شکایتیں کر

رہی تھی۔۔ "تمہارے ملک میں ایسی شاندار وادیاں اور چوٹیاں ہیں جو دنیا بھر میں اور کہیں نہیں ہیں اور تم لوگ ان کا خیال نہیں رکھتے۔۔ہم یہاں جس بھی خیمہ گاہ میں پہنچے ہیں وہاں گندگی اور فضلے کے ڈھیر ہوتے ہیں۔۔تم لوگ اپنی اس جنت کو صاف کیوں نہیں رکھتے۔۔ہم لوگ جو باہر سے آتے ہیں، ہم دس بیس ڈالر فی کس ادا کرنے کو تیار ہیں تاکہ اس رقم سے آپ ان خیمہ گاہوں اور منزلوں کو ستھرا رکھ سکیں۔تمہارا سیاحتی محکمہ کیا کر رہا ہے۔۔"

"وہ سیمینار اور فیسٹیول منعقد کروا رہا ہے میڈم۔۔چین نیچے قراقرم ہائی وے کے آس پاس۔۔جہاں فائیو سٹار سہولتیں میسر ہیں۔۔انہیں واقعی یہ خبر نہیں کہ ادھر ہوشے سے آگے درہ گندوگورو کے دامن میں کوئی ہسپاں یا دل سنگ پا بھی ہے۔۔ویسے تو مجھے بھی خبر نہیں تھی۔۔" میں نے ہنس کر کہا۔۔

"کتنی شرم کی بات ہے۔۔" میڈم بھی خوش دلی سے ہنسی اور میں نے نوٹ کیا کہ اس کے بیشتر دانت مصنوعی ہیں جنہیں باقی ماندہ دانتوں پر ایک "برج" بنا کر سہارا دیا گیا ہے۔۔

میڈم کے ہمراہ جو کوہ نورد تھے، وہ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے رکن تھے اور ادھر جانے کس سلسلے میں آ نکلے تھے۔۔

"دیکھیں میڈم ہم تو ہسپانیہ سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے کئی گلیشیرز کے نام بھی ہسپانوی میں رکھے ہوئے ہیں۔۔"

"واقعی؟"

"ہاں۔۔آپ لوگ بُل فائٹنگ کے دوران ہے تورو۔۔کے نعرے لگاتے ہیں تو ہم نے کے ٹو کے راستے میں پڑتے عظیم گلیشیر کا نام بال تورو رکھ دیا ہے۔۔اور اس کی لے میں گندوگورو ہے۔۔اور جس کیمپ کا نام بھی ہسپانوی ہے یعنی۔۔ہسپاں۔۔"

"کیا واقعی؟"

"ہاں واقعی۔۔اگرچہ نام رکھنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ ہسپانوی سے ہیں۔۔"

میڈم نے دل کھول کر اپنے مصنوعی اور چند اوریجنل دانتوں کی نمائش کی اور بہت خوش ہوئی۔۔

"آپ میری ٹانگ کھینچ رہے ہیں۔۔"

"بالکل نہیں۔۔" میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔۔بھلا مجھے اس عمر کی خاتون کی ٹانگ کھینچنے سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔۔"اب مجھے اجازت دیجیے میڈم۔۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں ایک بار پش پورٹر کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا جب آپ کی خاطر رک گیا اور اب دیکھئے کہ وہ بہت دُور نکل گیا ہے اور مجھے اس کمبخت کو نظر میں رکھنا ہے۔اس لیے۔۔آ دیوس۔۔خدا حافظ۔۔"

بابا پارپش بہت دُور جا چکا تھا۔۔اور وہ صرف اپنی سیاہ داڑھی کی وجہ سے سفید برفوں میں نمایاں ہو رہا تھا۔۔

داڑھی کے بھی کتنے فوائد ہیں، یہ ہم نادان نہیں جانتے۔۔

اُس کی بے اعتنائی اب بھی جاری تھی۔۔

میں نے اب اُسے پکارنا ترک کر دیا تھا کیونکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ پیدائشی طور پر بہرا ہے۔۔

پھر وہ ایک مقام پر رُکا۔۔برف کے ایک تودے کے ساتھ ٹیک لگا کر ستانے لگا اور جب حسب معمول میں اپنی رفتار تیز کر کے اس کے قریب پہنچا تو وہ حسب معمول مجھے ٹھینگا دے کر چمپت ہونے کو تھا۔جب میں نے ایک چپکیلے ریپر والی ٹافی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے میں بھینچ کر لالچ کے ایک جھنڈے کے طور پر بلند کر دی۔۔اس نے خلاف معمول چمپت ہو جانے کا ارادہ ترک کیا اور اس ٹافی کو رغبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔۔مبہوت سا ہو گیا یہاں تک کہ میں اس کے پاس جا پہنچا۔۔اس نے ٹافی وصول کرنے کے لیے نہایت بے دلی سے ہاتھ آگے کیا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "اوئے تم رُکتے کیوں نہیں۔۔بہرے ہو۔۔"

اُس کی داڑھی میں سے ایک لاچار قسم کی مسکراہٹ برآمد ہوئی اور میڈم کی مانند اس کے بیشتر دانت بھی غائب تھے۔۔

"میرا انتظار کیوں نہیں کرتے؟" میں نے ذرا بلند آواز میں کہا تو بلندی کی وجہ سے سانس پھولنے لگا۔۔

اس پر اس نے ٹافی سے نظریں ہٹائے بغیر غوں غاں کرتے اشاروں کی زبان شروع کر دی۔۔کبھی آسمان کو تکتا اور انگلی اٹھا کر بے چارگی سے سر ہلاتا اور کبھی برف پر نگاہ ڈال کر گلے میں سے کوئی عجیب سی آواز نکالتا۔۔پھر اُس نے منہ کھول کر زبان نکالی اور سر ہلانے لگا۔۔

وہ بہرا نہیں گونگا تھا۔۔

"تم گونگے ہو؟" میں نے بھی اپنی زبان نکال کر اشارہ کیا۔۔

"غاں غاں۔۔" اس نے زور زور سے سر ہلایا۔۔

تب ہم دونوں نے پُر مسرت ہو کر اپنی اپنی زبانیں دہن میں واپس کیں کہ میں جان چکا

تھا کہ وہ گونگا ہے اور وہ جان گیا تھا کہ میں جان چکا ہوں کہ وہ گونگا ہے.. تو اب سفر آسان ہو گیا..

جب اپنے لیڈر کے بارے میں علم ہو جائے کہ وہ گونگا ہے تو اس کی پیروی کرنا آسان ہو جاتا ہے.. ورنہ آپ آوازیں ہی دیتے رہتے ہیں کہ لیڈر جی ہمیں بھی ساتھ لے کر چلو.. اور اس کی ٹافیوں سے رغبت بھی میرے بہت کام آئی.. جونہی وہ اپنی رفتار تیز کرتا، میں ٹافی کا پرچم بلند کر کے اسے روک لیتا.. اس کے دانت کم ہونے کا باعث شائد یہی ٹافیوں کے لیے رغبت تھی.. شائد وہ غیر ملکی ٹیموں کے سامان سے ٹافیاں اور چاکلیٹ چُرا چُرا کر کھاتا رہا تھا، اس لیے اپنے دانت کھو بیٹھا تھا..

ہم پتھروں سے اَٹے گلیشیر سے آگے ہوئے اور ایک برف سفید گلیشیر پر اُتر گئے.. اور اس کی سطح پر کرچ کرچ چلنے لگے کہ جوگر کے نیچے دبتی برف میں سے اعصاب پر سوار ہو جانے والی یہی آواز مسلسل آتی تھی.. اسی آواز کرچ کرچ نے سنولیک کے سفر کے دوران ہمیں زچ کر کے رکھ دیا تھا..

میں نے پیچھے نگاہ کی.. دُور دُور تک میرے ساتھیوں کا کچھ پتہ نہ تھا اور میں نے انہیں یوں مات دینے پر ایک انتہائی کمینی خوشی محسوس کی اور ذرا ہنہنایا..

اور جب میں ذرا ہنہنایا ہوں تو گونگا بابا رُک گیا.. اور میری جانب ڈری ڈری نظروں سے دیکھا.. اگرچہ وہ گونگا تھا اور بہرا بھی ہو سکتا تھا لیکن اس کے باوجود ایک ہنہناہٹ تو سُن سکتا تھا..

چنانچہ میں نے شرمندہ ہو کر مزید ہنہنانے سے گریز کیا اور چپکے سے اس کے پہلو میں چلنے لگا.. بائیں جانب ایک خشک چٹانی سلسلہ چلتا جا رہا تھا اور جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے توں توں اس کے عقب میں سے برفپوش بلندیاں اور چوٹیاں ظاہر ہو رہی تھیں اور سرکتی ہوئی سامنے کے منظر میں داخل ہو رہی تھیں..

میں نے آج کے سفر کے لیے تین سگریٹوں کا کوٹہ طے کر رکھا تھا.. میں کسی ایک مقام پر تھوڑی دیر کے لیے سانس درست کرنے کے لیے رکتا، فلاسک میں سے گلوکوز کی آمیزش والے پانی کے دو گھونٹ بھرتا پھر سگریٹ سلگا کر پورے چار کش کھینچنے کے بعد اسے پیکٹ میں بند کر کے دم پخت کر دیتا.. یوں ایک سگریٹ تین بار میرے کام آتا.. میں تمباکو کی غلامی سے آزاد ہونا چاہتا تھا لیکن نکوٹین کی ملکہ نے مجھے پوری طرح اپنے دام میں جکڑ رکھا تھا..

سفید گلیشیر کا بھی انجر ہوا اور ایک بار پھر اس کی سطح کو پتھروں، بجری اور سنگریزوں نے مکمل طور پر ڈھک لیا..

ٹافیوں کا رسیا گونگا پہلوان ایک بلندی پر پہنچا اور اپنی لاچار اور باریش مسکراہٹ بکھیرتا مجھے اوپر آنے کے لیے اشارے کرنے لگا..

میں اپنے ٹوٹتے بکھرتے سانسوں سے اندازہ لگا رہا تھا کہ ہم بلند سے بلند تر ہوتے جا رہے ہیں.. نامعلوم انداز میں اونچے ہو رہے ہیں.. بڑی مشکل ہے.. ہر لحہ اپنے بلڈ پریشر کا خیال رکھتے.. یہ خیال رکھتے ہوئے کہ اس عمر میں اتنی بلندی پر کہیں دل کی شریانوں میں کوئی رکاوٹ نہ آ جائے.. دھیرے دھیرے اس سانس کو جو تن بدن سے نکلا جاتا تھا منت سماجت کر کے اسے روکتا سنبھالتا اوپر بالآخر گونگے شاہ کے پاس پہنچ ہی گیا..

اور اس کے خشک بلندی سے پرے غوں خاں کے اشارہ کرنے سے پہلے ہی میری نظر اس منظر تک سفر کر گئی..

"درّہ گندوگورو کے دامن میں چار خیمے..ٹکی باسٹرڈز"

وہ جو مقدّس کتابوں میں کہا جاتا ہے کہ Lo & Behold..

تو یہاں بھی... Lo & Behold...سامنے ایک پیالہ نما میدان تھا..خشک بلندی سے نشیب میں..برف آلود برف پہاڑوں کے دامن میں ایک پیالہ نما میدان تھا جس پر دھند کے آثار تھے..ایک پُرشورندی تھی جو اس میدان میں اُترتی تھی لیکن ابھی یہاں سے اس کا شور سنائی نہیں دیتا تھا..برفوں میں سے اُتر کر نیچے آ رہی تھی تو یقیناً پُرشور تھی..میدان کے اوپر ڈھلوان پر کچھ پتھریلی آماجگاہیں تھیں جن کے آگے نیلے ڈرموں کی قطاریں تھیں اور ان کی نیلاہٹ پورے منظر میں سے الگ اور شوخ دکھائی دیتی تھی..

اور اس پیالہ نما وسیع میدان میں..برف زاروں کی گود میں..دھند میں..پُرشورندی کے پیچھے..اس میدان میں جس پر بے پناہ برفیں ہر جانب سے جھکتی جاتی تھیں اور برفیلی ندیوں کے پانی چلتے تھے..وہاں ایک وسیع خیمہ گاہ تھی..جس میں ہر رنگ اور ہر نسل اور ہر سائز کے بے شمار خیمے ایستادہ تھے..اگرچہ یہاں سے وہ خیمے نہیں، خیموں کے کھلونے لگ رہے تھے..رنگوں کے دھبے لگتے تھے..ایک دنیا وہاں آباد تھی..

یہی ہسپاں تھا..

مجھے اتنی آبادی کی توقع نہ تھی..

اور اس ہسپاں کے اوپر گندوگورو کی چوٹی اور درّہ تھا..اور درّے پر حیرت انگیز طور پر برف کے ڈھیر نہیں تھے بلکہ خشک چٹانوں کے اوپر برف کی ایک لکیر تھی..اور لیلے بھی تھی..

وہ میرے ساتھ ساتھ چلتی چلتی ہسپاں تک پہنچ گئی تھی اور اب اس پر سایہ فگن ہوتی تھی..

ایک عجیب منظروں والی برفانی بلندیوں کے دامن میں پھیلی ایک انہونی سی دنیا تھی..

جیسے تیس برس پیشتر میں نے ایک ناول کو سوچا تھا کہ ایک کوہ نورد رتی گلی کے درّے کو پار کر کے جب دوسری جانب اُترتا ہے تو وہاں دھند میں ایک شہر آباد دکھائی دیتا ہے..اور شہر موئنجوڈارو کا ہے..وہی گلیاں..وہی حمام اور غلّے کے گودام اور وہی لوگ..پانچ ہزار برس پہلے کے وہی لوگ جنہوں نے آریائی حملہ آوروں سے فرار ہو کر ان دور افتادہ برفانی وادیوں میں آ کر پھر سے اپنا شہر اسی شکل میں تعمیر کر لیا تھا اور نہیں جانتے تھے کہ پانچ ہزار برس گزر چکے ہیں اور باہر کی دنیا بدل چکی ہے اور یہ کوہ نورد اس شہر میں اُتر کر انہیں بتاتا ہے کہ باہر کی دنیا کچھ اور ہو چکی ہے..

لاہور کے شیزان ریستوران میں..ذوالفقار تابش کی موجودگی میں..میں نے اس ناول کی آؤٹ لائن اپنے پسندیدہ مصنف ابن انشاء کو سنائی..ڈرتے ڈرتے کہ یہ کچھ عجیب سی آؤٹ لائن تھی..اور مجھے اب تک یاد ہے کہ ابن انشاء نے اپنے موٹے شیشوں کی عینک اتار کر مجھے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تھا اور کہا تھا..تارڑ تم سب کام کاج چھوڑ دو..دنیا ترک کر دو لیکن یہ ناول ضرور لکھو..یہ تمہارا بہترین کام ہوگا..اور میں نے کہا تھا کہ سر ابھی مجھ میں ابھی اتنی تخلیقی سکت نہیں اور یہ آئیڈیا بھی عجیب اور انہونا سا ہے..تو ابن انشاء نے کہا تھا..کبھی نہ کبھی تم میں یہ سکت پیدا ہو جائے گی..اس آئیڈیے کو فراموش نہ کرنا..یہ تمہارا بہترین کام ہوگا..

تیس برس گزر گئے ہیں لیکن مجھ میں ابھی وہ سکت پیدا نہیں ہوئی..

ہسپاں کو..عجیب منظروں والی برفانی بلندیوں کے دامن میں پھیلے ہسپاں کو دیکھ کر مجھے ایک عرصے کے بعد ابن انشاء کا خیال آیا..اس لیے کہ گمشدہ موئنجوڈارو ایک ایسی ہی بلند اور نامعلوم وادی میں ہو سکتا تھا..

لیکن اس پورے منظر میں ایک اور منظر تھا..

ایک..اس منظر سے پرے ایک اور الگ منظر تھا جس نے مجھے تباہ کر دیا..

شعلہ جس نے مجھے پھونکا بس اسی الگ منظر سے اٹھا تھا..

اس وسیع پُرہجوم خیمہ گاہ سے پرے..درّہ گندوگورو کی جانب جو وادی تھی..وہاں برف پانیوں کے پھیلاؤ کے کناروں پر..ایک مکمل تنہائی میں..جہاں..اور کوئی نہ تھا وہاں سب سے جدا چار خیمے ایستادہ تھے..

اور ایسے خوش نظر لگتے تھے جیسے یہ پورا منظر..درّہ گندوگورو کے دامن میں یہ منظر صرف

انہی چار خیموں کے لیے تخلیق کیا گیا تھا..

وہاں "رائٹس آف ایڈیشن ریزروڈ" کی تختی تب تک لگی رہی تھی جب تک کہ یہ چار خیمے وہاں نہ پہنچے اور اپنا رائٹ کلیم نہ کیا..

وہ چار خیمے خوابناک لگتے تھے..

ہسپاں کی خیمہ گاہ کی بھیڑ اور مخلوق سے بہت پرے.. گندوگورو کی وادی میں.. پانیوں کے کنارے چار خیمے.. خوابناک لگتے تھے..

اور میں نے انہیں دیکھتے ہوئے سوچا.. کہ یہ جن کوہ نوردوں کے بھی خیمے ہیں وہ کتنے لکی باسٹرڈز ہیں..

کاش کہ میں ان لکی باسٹرڈز میں شامل ہوتا..

میں نے گونگا پہلوان کو رشوت کے طور پر تین چار ٹافیاں پیش کیں اور اشارے سے کہا کہ بابا باریش اب تم بے شک مت رکو.. میرا انتظار نہ کرو... بے دریغ چلتے جاؤ کہ میں نے منزل دیکھ لی ہے.. تم چلو میں پہنچ جاؤں گا..

مجھے اس بلند خیمہ گاہ تک پہنچنے اور اس میں اُترنے میں بیس منٹ لگے.. اور جب اُترا ہوں.. تو وہاں بلند برفانی کھلکھلاتی شفاف ہوائیں نہ تھیں.. ایک بُو تھی..

اپنی کوہ نوردی کی آخری منزل میں اُترا ہوں تو خیمہ بستی میں ایستادہ غیر ملکی ٹیموں کے رنگ رنگ خیمے.. آرام دہ خیمے.. کچن ٹینٹ اور ڈائننگ ٹینٹ اپنی جگہ... لیلے پیک کا بے مثال عکس اپنی جگہ جو ان خیموں کے برابر میں ٹھہرے ہوئے پانیوں میں ٹھہرا ہوا تھا.. اور پندرہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہسپاں میں پہنچ جانے کی چلبلی کھلکھلاتی ہوئی بے پایاں مسرت اپنی جگہ لیکن وہاں ایک بُو تھی..

اور یہ انسانی فضلے کی ناقابلِ برداشت بُو تھی.. جہاں کہیں پتھروں کی اوٹ تھی وہاں میں نے استعمال شدہ ٹائلٹ پیپر بھی سرسراتے ہوئے اور آلودہ دیکھے..

عامر نے کیا خوب کہا تھا کہ تارڑ صاحب.. ہم اگرچہ اپنے آپ کو اشرف المخلوقات گردانتے ہیں لیکن ایک معاملے میں جانوروں سے مار کھا جاتے ہیں.. یعنی ان کی بِٹ ہمیں ڈسٹرب نہیں کرتی.. گاؤں میں بھینسوں کے گوبر سے اُپلے تھاپے جاتے ہیں اور کچھ ناگواری نہیں ہوتی.. بکریوں اور بھیڑوں کی مینگنیاں ہماری طبیعت کو اُکتاتی نہیں اور ہم ان کی نزدیکی سہہ سکتے

ہیں۔ ان پر خیمے لگا سکتے ہیں.... پرندوں کی بیٹ اور ریچھوں کا گوبر ہمیں بالکل اپ سیٹ نہیں کرتا لیکن حضرت انسان کا نظامِ ہضم کچھ ایسا ہے کہ اگر آپ کے آس پاس صرف ایک انسان کی بِٹ ہو تو وہ برداشت سے مکمل طور پر باہر ہو جاتی ہے.. اس کی بُو کو سہارنا ممکن نہیں ہوتا..

پائیو میں بھی یہی پرابلم تھی..

اور ہسپاں کی خیمہ گاہ میں بھی جو برفیلی سرد ہوا تھی، اس میں بھی اسی انسانی "کمال" کی بُو تیرتی تھی اور برداشت سے باہر ہوتی تھی..

ہسپانوی میڈم بھی اسی بُو سے نالاں ہو کر مجھ سے شکایت کرتی تھی..

میں جب اپنے قدم.. اور ان قدموں میں جو بُوٹ تھے، انہیں گھسیٹتا اس خیمہ گاہ میں اُترا.. درّہ گندوگورو کے بیس کیمپ ہسپاں میں اُترا.. اس میں داخل ہوا.. بُو کو بڑی مشکل سے درگزر کرتا اس میں داخل ہوا تو دائیں جانب ایک ریتلے میدان میں ان سینکڑوں کوہ نوردوں کے خیمے پُر ہجوم تھے جو آج سویر کے لُو سے واپس پر گندوگورو کا درّہ عبور کر کے.. ان میں سے کچھ اس کی چوٹی سر کر کے یہاں اُترے تھے..

اور ان پانیوں کے کنارے تھے جن میں لیلے پیک کی لیلے اور لیلے برفیں عکس ہوتی جاتی تھیں اور ان پانیوں کے کنارے میں نے ایک سُرخ.. تیز آتشی سُرخ بالوں والی کوہ نورد لڑکی کو بالوں میں کنگھی کرتے دیکھا..

قدرتی سُرخ بالوں والی لڑکیاں یورپ میں بھی کم کم ہوتی ہیں..

اور جن کے بال کسی عام رنگ کے ہوتے ہیں وہ بھی اس امر سے آگاہ ہوتی ہیں کہ محض بالوں کی رنگت کی وجہ سے انہیں جنسی شدت کی علامت سمجھا جائے گا، وہ اپنے بالوں کو سُرخی میں رنگتی ہیں..

شاک ہوم کی ایک رات میں.. ایک ایسی ہی قدرتی سُرخ بالوں والی بھری بھری لڑکی تھی جس نے ریستوران کے ڈانس فلور پر مجھ سے مکمل بے اعتنائی برتی تھی اور پھر مجبور اکہ اس کے فلیٹ کو.. رات کے اس سے کوئی ٹرام یا بس نہ جاتی تھی میرا ساتھ دیا تھا..

اور اس نے مجھے آگاہ کیا تھا کہ محض بالوں کی سُرخی کی وجہ سے کسی لڑکی کو آسان اور جذباتی سمجھ لینا حماقت ہے..

تو یہ سُرخ بالوں والی لڑکی لیلے پیک کے عکس کے سامنے اپنے بال سنوارتی تھی.. ان

میں کنگھی کرتی تھی..

ہسپاں کی خیمہ گاہ میں دائیں ہاتھ پر تو خیموں کی دنیا تھی اور بائیں جانب پہاڑ کی اوٹ میں متعدد پتھریلی چار دیواریاں تھیں جن میں ان غیر ملکی کوہ نوردوں کے ہمراہ آئے ہوئے پورٹر قیام کرتے تھے اور اگلے روز شائی چوہنچ جانے کی آرزو کرتے تھے جہاں ان کو پورے ٹریک کی مزدوری مل جاتی تھی.. اور انہوں نے متمول ہو کر اپنے گھروں کو.. اپنی ایک یا دو بیویوں کے پاس لوٹ جانا تھا..

میں اس خیمہ بستی میں داخل ہوا تو وہاں کوئی ہیجان پیدا نہ ہوا..

کسی نے پروا نہ کی کہ کون آیا ہے..

کسی بھی غیر ملکی کوہ نورد نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا..

صرف چند ایک پورٹروں نے مجھے حیرت سے دیکھا.. اس لیے دیکھا کہ میں یہاں تک پہنچنے والا پہلا پاکستانی تھا..

البتہ ایک وحشی داڑھی والے گائیڈ نے مجھے جانے کیسے اس حلیے اور حالت میں پہچان لیا اور چائے کی ایک پُرخلوص دعوت دی..

ایک اور پورٹر جو نہایت بلند قامت تھا اور جس کی مسیں ابھی بھیگی نہ تھیں میرے استقبال کے لیے آگے آیا اور ذرا جھجکتے ہوئے بولا۔ "صاحب میں نے آپ کو پہچان لیا ہے.. آپ تارڑ صاحب ہوناں!"

"کیسے پہچان لیا ہے؟" میں نے اپنی اس خوش نصیبی پر نازاں ہو کر سوال کیا.. جی ہاں.. یہ کم از کم میرے ایسے لوگوں کے لیے تو ایک بہت بڑی خوش نصیبی ہوتی ہے کہ آپ پہاڑوں کے اندر ایک درّے کے دامن میں اترتے ہیں اور وہاں آپ پہچانے جاتے ہیں..

"سر میں شمشال کا رہنے والا ہوں.. دو برس پیشتر جب آپ ہماری وادی میں اترے تھے تو آپ نے یہی نیلی جیکٹ اور سفید چترالی ٹوپی پہنی ہوئی تھی.. میں نے آپ کو شکل سے نہیں لباس سے پہچانا ہے.."

"تم یہاں.. اپنی وادی سے اتنی دور... یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں ادھر روزگار کے لیے آیا ہوں.. بوجھ اٹھاتا ہوں.. پورٹر ہوں.. میں نے آپ کا کتاب "شمشال بے مثال" پڑھا ہے.. شمشال کے سب لوگوں نے پڑھا ہے.. اردو میں ہمارے

علاقے کے بارے میں پہلا کتاب ہے سر.. اور اب کچھ لوگ یہ کتاب پڑھ کر ہمارا وادی میں بھی آنے لگے ہیں سر.."

یہ کیسی خوش بختی ہے کہ آپ کوہ نوردی کی داستانیں اپنے جنون کی تسلی کے لیے لکھتے ہیں.. کسی اعلیٰ اور ارفع جذبے کے تحت نہیں لکھتے.. کسی مقصد کے لیے نہیں تحریر کرتے اور پھر بھی کچھ غیر معروف وادیاں.. ان کی وجہ سے معروف ہو جاتی ہیں..

کبھی کوئی فیری میڈو.. کبھی ترشنگ اور کبھی شمشال!

وحشی داڑھی والے.. فرینڈلی گائیڈ نے مجھے ایک مرتبہ پھر اپنے ڈائننگ ٹینٹ میں چائے کی دعوت دی لیکن میں اس بیس کیمپ میں اترتے ہی عیش و عشرت میں مبتلا نہیں ہو جانا چاہتا تھا.. پہلے اپنے ان پورٹروں کو تلاش کرنا چاہتا تھا جو مجھے اور گونگے پہلوان کو کراس کر کے آگے نکل گئے تھے اور اب اس وسیع دنیا میں کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے..

پتھریلی آماجگاہوں میں چہلیں کرتے ہر پورٹر کے چہرے کو میں غور سے دیکھتا تھا کہ کہیں یہ وہ تو نہیں.. اور یہ.. کوئی اور ہوتے تھے.. میرے پورٹر نہیں ہوتے تھے..

میں ایک لاوارث گمشدہ بچے کی مانند ہسپاں کے اس میلے میں شناسا چہرے تلاش کرتا تھا.. اور وہ کہیں بھی نظر نہیں آتے تھے..

تب میں نے اس بستی سے پرے.. شوریلی ندیا کے پار ڈھلوان پر جو پتھریلی آماجگاہیں معلق تھیں اور وہاں جیسے ڈرم تھے، وہاں اپنے گونگے پہلوان کو اشارہ کرتے دیکھا کہ ادھر آ جاؤ.. ادھر آ جاؤ..

اُدھر جانا اتنا آسان نہ تھا..

اُس ڈھلوان اور خیمہ بستی کے درمیان شوریلی ندیا جو بڑلی تھی.. گھنی اور ابدی برفوں میں سے جنم لیتی.. پگھلتی.. بلندی کی برفوں کی دھند میں سے ظاہر ہوتی نیچے آ رہی تھی.. لیکن اس کے پانیوں میں چند پتھر ایسے اُبھرتے تھے جن پر احتیاط سے قدم جما کر دوسری جانب جایا جا سکتا تھا.. دوسری جانب تھوڑی سی چڑھائی تھی جس کے اوپر کچھ کوٹھڑیاں اور غاریں سی تھیں جن میں پورٹر مزے کر رہے تھے اور مختلف مہموں کے سامان کے نیچے ڈرم قطار اندر قطار سجے تھے.. میں اپنے گونگے پہلوان کے پاس پہنچا اور اس سے دریافت کیا کہ.. جیسے ایک گونگا دوسرے گونگے سے دریافت کرتا ہے کہ اے گونگے ہمارے پورٹر کہاں مر گئے ہیں.. خیمہ بستی میں تو نہیں ہیں.. اور کمبخت

تو ادھر کیا کر رہا ہے.. بتائے گا تو تاؤنی روں گا..

اور تب گونگے پہلوان نے غوں غاں کر کے گندوگورو کی وادی کے نشیب کی جانب اشارہ.. درّے سے نیچے آنے والی پگڈنڈی کے دامن میں، ندیوں اور گھاس کے میدانوں کے کنارے جو خوابناک منظر والے چار شہزادے خیمے راج کرتے تھے، ان کی جانب اشارہ کیا..

میرا دم رُک گیا.. وہ ہمارے خیمے تھے..

وہ شاندار رنگ برنگے.. ہسپاں کی بھیڑ اور بو سے پرے.. پانیوں کے برابر میں عظیم برفانی چوٹیوں کے آمنے سامنے سب سے الگ تھلگ جو چار خیمے تھے، جنہیں میں نے گلیشیر سے اُترتے ہوئے دیکھا تھا اور حسد کیا تھا، ان باسٹرڈز کی قسمت پر جن کے وہ خیمے تھے.. اور وہ تو ہمارے تھے..

ہمارے کسی پورٹر نے پہلی بار ذوقِ جمال کا مظاہرہ کیا تھا..

میں نے رشک کیا تھا کہ وہ کون سے لکی باسٹرڈز ہیں جن کے یہ خیمے ہیں.. تو اب یہ کھلا کہ یہ ہم تھے.. شرمندگی بھی ہوئی کہ خواہ مخواہ بے احتیاطی کی اور اپنے آپ کو یہ کیا کہہ دیا..

میں نے خوش ہو کر گونگے پہلوان کو انعام کے طور پر متعدد ٹافیاں پیش کر دیں..

ہم دوسری جانب اپنے خیموں کی طرف اُترنے لگے..

خیموں کے آگے ٹھہرے ہوئے پانیوں اور ندیوں کی ایک وسیع گزرگاہ تھی جس کے پار پتھروں کا ایک میدان تھا اور ان کے اوپر برفیلی چوٹیاں جھکی ہوئی تھیں..

دائیں جانب وہی ہسپاں کی وسیع خیمہ گاہ دکھائی دے رہی تھی اور پہلے لیلے پیک وہاں تھی اور اب میرے ساتھ چلتی چلتی خیموں کے تقریباً سامنے آ کھڑی ہوئی تھی..

بائیں ہاتھ پر ایک مختصر وادی وہاں تک چلی جاتی تھی جہاں درّہ گندوگورو کی چٹانیں اور برفیں اس کا راستہ روک کر بلند ہو جاتی تھیں اور وہاں دھند تھی..

میں نے اپنا چھوٹا رک سیک کندھے سے اُتارا.. واٹنگ سنگ گھاس پر پھینکی اور زمین پر لیٹ گیا.. زمین میں ہلکی نمی اور ٹھنڈک تھی..

''ہسپاں کی شام.. پکوڑے اور لیلے او لیلے..''

اسحٰق نے مالٹے کے رنگ کا زرد شربت بنا کر مجھے پیش کیا اور اس کے متعدد گھونٹ چڑھ جانے کے بعد قدرے مخمور ہوا اور اس تنہائی سے لطف اندوز ہونے لگا جس میں ابھی تک میرا کوئی ساتھی شریک نہیں تھا..

تھوڑی دیر بعد مجھے خیال آیا کہ مجھے اپنے ساتھیوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے واپس خیمہ بستی میں جانا چاہیے جہاں انہوں نے اُترنا تھا.. انہوں نے اُتر کر وہیں بھٹکتے رہنا تھا کہ ان کے گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ہمارے خیمے ادھر ہیں.. میں واپس ہوا.. ڈھلان پر چڑھ کر نالے تک گیا اور پہلی بار اوپر دیکھا جہاں سے نالہ اُتر رہا تھا.. اوپر ایک یکتا خوبصورتی کی ہری بھری برف بھری لینڈ سکیپ تھی جس پر دھند اُترتی تھی اور اس لمحے اس دھند میں سے ایک غیر ملکی کوہ نورد اُتر رہا تھا جو شاید آج صبح کہیں اوپر گیا تھا اور اب شام ڈھلے ہسپاں واپس آ رہا تھا..

خیموں سے آگے میں اس مقام پر جا کھڑا ہوا جہاں سے میں ابھی ابھی اُترا تھا.. پھر میرے ساتھی ایک ایک کر کے گلیشیر پر نمودار ہوئے اور آہستہ آہستہ نیچے آنے لگے.. میں آگے بڑھ کر انہیں خوش آمدید کہتا اور پھر ایک بچے کی طرح ان سے پوچھتا کہ ذرا ایک نظر اس درّے کے وسیع دامن پر ڈالیے اور ذرا اندازہ لگایئے کہ ہمارے خیمے کہاں ہو سکتے ہیں..

وہ غیر ملکیوں کے خیموں کے انبار میں اپنے خیمے تلاش کرنے لگتے اور جب وہ کہیں نظر نہ آتے.. ان کا سراغ نہ ملتا تو میری طرف دیکھتے ناراض نظروں سے کہ وہ تھکے ہوئے تھے اور میں ایک چوڑی مسکراہٹ کے ساتھ درّہ گندوگورو کی وادی کی جانب اشارہ کرتا.. اس مقام کی جانب جو ان کے گمان میں بھی نہ تھا.

مجھے خاص طور پر حسن کا انتظار تھا.. اور جب وہ برمانی کی زیر نگرانی خیمہ گاہ میں داخل ہوا تو ہم سب نے تالیاں بجا کر اس کا استقبال کیا کہ وہ آج کا "ہیرو" تھا.. بیماری اور نقاہت کے باوجود وہ یہاں تک پہنچ گیا تھا.. اس کے حوصلے اور ہمت کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی.. اور اس کے چہرے پر تازگی تھی..

ہم سب ایک قافلے کی صورت خیمہ بستی میں سے گزر کر.. نالے کے پار ہو کر.. اپنے خیموں تک چلے گئے..

اور جب پہنچے تو سب کی تھکاوٹ اور پژمردگی دور ہو گئی.. اور ہر کوئی چہکنے لگا.. حسن ایسے بیمار کا بھی حال اچھا تھا۔ اس کے منہ پر رونق آ گئی تھی..

"کیوں سلمان.. کیسا منظر ہے اور کیا مقام ہے۔" میں نے اسے داد طلب نظروں سے دیکھا..

"اوئے ہوئے.. اعلیٰ سر جی.."

"اور چلو میں تم کہتے تھے کہ سر جی یہیں ہوٹل میں چند روز گزار کر واپس چلتے ہیں، آگے جا کر کیا کرنا ہے۔"

"آپ بھی تو کہتے تھے سر جی.. میں نے تو جھک ماری تھی آپ بھی اقرار کر لیجیے۔" وہ اتنا پُرمسرت ہو رہا تھا کہ اس نے فوراً کھڑے ہو کر اپنی ہتھیلیاں نیچے کرتے ہوئے اپنا بدن شیک کیا۔ "سر جی بھالو بن کر دکھاؤں؟"

حسن تو ٹھیک ہو چکا تھا لیکن برمانی کی حالت کچھ غیر ہو رہی تھی... کبھی وہ کان میں کھجلی کرتا تھا، کبھی بدن کو کھجانے لگتا.. اور کبھی اپنی گھنی مجرمانہ بھنویں سنوارنے لگتا.. اٹھتا اور ٹہلتا پھر بیٹھ جاتا.. کبھی خیمے کے آگے بیٹھ کر لیلے پیک کو تکنے لگتا اور کبھی سامنے بہتی ندیوں کو چھلانگتا ان کے درمیان کسی پتھر پر جا بیٹھتا اور ہنری مور کے مجسمے "دے تھنکر" کا پوز بنا کر.. سوچ بچار میں گم ہو جاتا..

میاں صاحب بھی اس منظر میں پہنچ کر اتنے راضی ہوئے کہ انہوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہد کے کندھے پر ایک دھپ لگا کر کہا "خاں صاحب آج آپ بے شک میرے خیمے میں سو جاؤ.. اور بے شک خراٹے پر خراٹا مارو تمہیں ڈر کس کا ہے.. آہو.. اجازت ہے۔"

"ہاں بھئی سلمان.. تم یہاں گُڈی نہیں اڑاؤ گے.. یہ درّہ گندوگورو کا بیس کیمپ ہے.."

سلمان وہ ورلڈ چیمپئن گُڈی باز ہے جس نے "سنولیک" پر جا کر بھی گُڈی اُڑانے کی کوشش کی تھی.. کہتے ہیں چور چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے نہیں جاتا.. اسی طور ایک لاہوریا بے شک امریکہ اور آسٹریلیا ہو آئے جو کہ سلمان ہو آیا تھا لیکن گُڈی اُڑانے سے باز نہیں آتا۔ اس بار وہ دیسی گُڈی کی بجائے ایک ریڈی میڈ امریکی کائٹ لے کر آیا تھا جو اس نے شائی چو میں اُڑائی تھی.. یہ کائٹ سے سکس اور کے سیون کی برفوں کے آس پاس تادیر اڑتی رہی لیکن اس میں لاہوری گُڈی والا تھرل نہ تھا.. نہ یہ کنّی کھاتی تھی نہ بدمعاشی سے کندھے مارتی تھی اور نہ شرلاٹے بھرتی تھی۔ بس ایک شریف بی بی کی مانند جسم ہلائے بغیر اُڑتی چلی جاتی تھی.. شاہد صاحب نے بھی اس کی سادہ ڈوری ہاتھ میں لے کر اسے مزید بلند کرنے کی کوشش کی.. اور اس دوران جب ایک جرمن کوہ نورد خاتون قریب سے گزری تو اس نے نہایت حیرت سے اس کائٹ کی اُڑان کو دیکھا تو شاہد صاحب نے فوراً پیشکش کر دی۔ "فلائی کائٹ.. ویلکم لیڈی۔" لیکن لیڈی نے یہ آفر قبول نہ کی بلکہ جواب دینا بھی گوارا نہ کیا اور ایک چڑھی ہوئی تیوری کے ساتھ اپنے خیمے کی جانب چلی گئی..

"تم نے ضرور بے عزت ہونا ہوتا ہے خاں صاحب۔" میاں صاحب اس روز جلال میں تھے۔ "وہ کیا سمجھے گی کہ پاکستانی ایسے ہوتے ہیں۔"

"اور کیسے ہوتے ہیں میاں صاحب۔" شاہد صاحب ترنگ میں تھے اور ابھی نہیں جانتے تھے کہ آج شام انہیں خیمے سے باہر نکال دیا جائے گا۔ "دیکھیں ناں یہ ہمیں ہماری مہمان ہیں اور مہمان نوازی کے کچھ آداب ہوتے ہیں.. میں نے اُنہی آداب کے تحت کائٹ اُڑانے کی پیشکش کی تو انہی آداب کے تحت کی.. وہ نہیں مانی تو کیا فرق پڑتا ہے.."

"ہاں بے عزتی بے شک ہو جائے کیا فرق پڑتا ہے۔" میاں صاحب بُڑبُڑائے..

اس دوران ایک اور خاتون اُدھر سے گزریں تو شاہد صاحب نے پھر صلح مار دی۔ "گُڈ کائٹ میڈم.. فلائی کائٹ.. پاکستانی سسٹم۔"

یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ اس خاتون نے بھی..

تو اب یہاں گندوگورو کے بیس کیمپ میں بھی ضروری تھا کہ فلائی کائٹ کی جائے اور کم از کم اس لیلے کو تو "بو" کر کے خود ہی لوٹ لیا جائے.. تو میرے اس استفسار پر کہ سلمان یہاں درّہ گندوگورو کے بیس کیمپ میں گُڈی نہیں اڑاؤ گے.. اس نے نہایت متانت سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں سر جی۔"

"کیوں؟"

"یہ بدتمیزی ہوگی سر.. یہ ایسا منظر نہیں جسے بوکاٹا کیا جائے.. اس میں خلل ڈالا جائے۔" یہ ایک شاندار بھالو فلاسفی تھی..

ہم اپنے خیموں کے آگے میٹرس ڈالے کبھی بیٹھے کبھی لیٹے.. آس پاس کے سفید حُسن کو آنکھوں میں اُتارتے.. بدن پر برف محسوس کرتے نہایت ہائی سپرٹس میں تھے.. اور چونکہ ہم یہاں چدرہ ہزار فٹ ہائی تھے، اس لیے سپرٹس بہت ہی ہائی تھیں..

ہم اتنے سیانے تو تھے کہ ہم خوب جانتے تھے کہ یہاں سے مزید آگے جانا.. کل ہائی کیمپ تک پہنچنا اور پرسوں گندوگورو کی چوٹی سر کرنا ہمارے بس سے باہر تھا۔ اس کے باوجود نہایت سنجیدگی سے چوٹی کو فتح کرنے کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوا اور منصوبہ بندی کی گئی..

اور ہاں ہسپاں کے راستے میں مَیں نے دونوں حسینوں میں سے جو اچھا اور مددگار حسین تھا اور کاندے کا تھا، اس کے ساتھ میں نے ایک سازش کی تھی۔ "حسین تم بھی جان چکے ہو گے کہ آج میں گھوڑا ہو چکا ہوں، اس لیے امکان یہی ہے کہ میں اپنے ساتھیوں سے بہت پہلے ہیں کیمپ پہنچ جاؤں گا تو آپ بتاؤ کہ وہاں سے وہ ہائی کیمپ کتنا دور ہے جہاں سے گندوگورو کی چوٹی سر کرنے کے لیے نکلتے ہیں اور اس ہائی کیمپ سے بھی پہاڑوں کی سلطنت کی چند خوبصورت ملکائیں دکھائی دیتی ہیں۔"

"صاحب ہسپاں سے صرف تین گھنٹے کا سفر ہے اور واپسی صرف ایک گھنٹے میں ہو جاتی ہے.."

"تو پھر حسین میں اور تم کچھ دیر آرام کر کے آگے چلیں گے.. کیا خیال ہے؟"

"چلیں گے سر.."

"کیا خیال ہے میں پہنچ جاؤں گا؟"

"آپ کہتا ہے کہ آپ گھوڑا ہو گیا ہے تو گھوڑے کے لیے تو کوئی مشکل نہیں.."

چنانچہ یہ سازش ہو چکی تھی لیکن ہسپاں پہنچ کر اس سازش کے غبارے میں سے ہوا نکل گئی..

کیونکہ یہاں ہم ایسے منظر میں داخل ہو گئے تھے کہ اسے فوراً چھوڑ کر اوپر چلے جانا... کسی ہائی کیمپ کی جانب.. جو جانے کتنا ہائی تھا اور گھوڑا ہو جانے کے باوجود.. جانے کتنا ہائی تھا..

ایک کفرانِ نعمت تھا..

اور آپس کی بات ہے اور سچی بات ہے کہ میرا گھوڑا پن... میں جو اسپ تیز رفتار ہوا تھا.. فلائنگ ہارس ہو گیا تھا تو یکدم ہسپاں میں پہنچ کر میری تمام تر ہارس پاور زیرو ہو گئی.. یعنی میری بیٹریاں ڈاؤن ہو گئیں بلکہ ڈاؤن اینڈ آؤٹ ہو گئیں.. پنڈلیوں میں ٹیسیں اُٹھنے لگیں.. پاؤں من من کے ہو گئے اور مجھ میں قطعی طور پر اتنی سکت نہ رہی کہ پھر سے رک سیک اٹھا کر اس ہائی ہائی کیمپ کی جانب چڑھنے لگوں..

"صاحب ہائی کیمپ نہیں چلے گا؟" حسین نے گویا نمک پاشی کی..

"نہیں چلے گا.."

"ہم جانتا تھا کہ نہیں چلے گا۔"

بہرحال گندوگورو کی چوٹی فتح کرنے کے بارے میں نہایت سنجیدگی سے غور و غوض ہوا.. یہ منصوبہ بندی بالکل ایسے تھی جیسے ایک سپاہی اپنے ہتھیار ڈال کر.. وردی اتار کر ایک نیکر میں ملبوس لیٹا ہوا اور فوری طور پر میدان جنگ میں اترنے کی منصوبہ بندی کرنے میں مشغول ہو..

"پہلے تو ہمیں کل ہائی کیمپ تک پہنچنا ہوگا.. پھر پرسوں سویرے بارہ ایک بجے رات کے لگ بھگ گندوگورو گلیشیر کی برفوں پر چڑھتے ہوئے چوٹی کے دامن میں پہنچنا ہوگا.. اور وہاں شنید ہے کہ سامنے ایک برف کی دیوار ہے جیسا کہ سکردو میں ہمیں بتایا گیا تھا.. اس دیوار کے نیچے ہوشے کے چند ہائی پورٹرز جنہیں RESCUE کہا جاتا ہے، ہم جیسے ناعاقبت اندیش اور عمر رسیدہ کوہ نوردوں کے منتظر ہوں گے.. وہ ہم سے تین سو روپے فی کس کے حساب سے چارج کریں گے کیونکہ انہوں نے اوپر چڑھنے کے لیے چوٹی تک رسے لگا رکھے ہیں.. اگرچہ وہ ہماری مدد کریں گے لیکن ان رسّوں کو تھامنا اور ان پر چڑھنا ہمارا ذاتی فعل ہوگا.. اور یاد رہے ایسی برف دیواروں پر چڑھنے کے لیے بوٹوں تلے کرامپون باندھنے ضروری ہیں اور وہ ہمارے پاس ہیں نہیں.. بلکہ میاں صاحب کے پاس تو بوٹ ہی نہیں ہیں بقول شاہ.. بھاٹی گیٹ کے کسی موچی کے چمڑے کی کترنیں ہیں.. بلندی بھی اٹھارہ ہزار فٹ سے زائد ہوگی اور ہم نے آج تک زیادہ سے زیادہ سپر درّے کی سترہ ہزار فٹ بلندی سر کی تھی اور مرتے مرتے بچے تھے.. تو پھر ان رسّوں کی مدد سے ہم بالآخر چوٹی پر پہنچ جائیں گے.. اگر پھسل کر نیچے گہرائی میں گرنے سے بچ جاتے ہیں تو.. تو وہاں چوٹی سے صبح سویرے زبردست نظارہ ہوگا.. ہم تصویریں اُتاریں گے اور پھر رسّوں کی مدد سے لنگوروں کی مانند

نیچے آئیں گے..اگر نیچے آئیں گے تو..''

''دفع کریں جی گندوگورو کی چوٹی کو..میں نے تو پہلے دن کہہ دیا تھا کہ اس کا نام بھی بڑا فحش لگ رہا ہے..وہاں جا کر کیا کرنا ہے..مرنا ہے؟..یہیں ٹھہرتے ہیں اور پکوڑے کھاتے ہیں..''

''پکوڑے؟''

''ہاں جی..''میاں صاحب نے مونچھوں کو ہلکا سا تاؤ دیا۔''میں نے ابھی ابھی حسین سے بات کی ہے کہ ہمارے پاس بیسن ہے..نمک مرچ ہے..بلکہ ہری مرچ ہے..پیاز اور آلو ہیں تو کیا تم پکوڑے بنالوگے..تو وہ کہتا ہے کہ بنائیں گے۔میں لاہور کے کشمی چوک میں پکوڑے ہی تو بناتا تھا..تو جناب عالی اس نے کڑھائی چڑھادی ہے اور تیل چٹانے مار رہا ہے تو ابھی تھوڑی دیر میں ادھر ہسپاں میں آپ کو گرما گرم پکوڑے ملیں گے..کاش کہ ہمارے پاس صرف ایک بینگن ہوتا..بینگن کے پکوڑے تو بادشاہو شاہی پکوڑے ہوتے ہیں..''

''میاں صاحب..''میں نے موسم اور منظر کا مزا لیتے ہوئے انہیں چھیڑا..''ہم اس سے ایک ایسے بلند مقام پر براجمان ہیں..جس کے پاس کنکورڈیا کے برف زار ہیں..اپنی شاہ گوری ہے..چوگو لیزا اور مترے پیک ہے..مشابرم ہے..اور یہ سامنے ہماری لیلے او لیلے ہے..پندرہ ہزار فٹ بلندی پر ایک تنہائی ہے جو ساری کی ساری ہماری ہے اور آپ..پکوڑوں کی بات کرتے ہیں..حد ہے..''

''کیوں حد ہے..''میاں صاحب چمک کر بولے۔''جناب عالی مجھے پتہ ہے کہ آپ اپنا رانجھا راضی کر رہے ہیں..جانتے ہیں کہ گندوگورو چوٹی پر چڑھنا آپ کے بس کی بات نہیں اور پھر بھی ٹائم ضائع کر رہے ہیں..منصوبہ بندی کیے جا رہے ہیں..''

''میاں جی..میری تو ساری عمر ہی رانجھے راضی کرتے گزری ہے..کوئی ایک رانجھا راضی ہو جاتا ہے تو میرا ہاتھ تھام کر سنولیک تک لے جاتا ہے..یاک سرائے دکھا دیتا ہے اور اگر کوئی بھی رانجھا راضی نہیں ہوتا تو میں اپنے گھر میں قید ہو جاتا ہوں..تو آپ مجھے اپنا رانجھا راضی کرنے دیں، آپ کا کیا جاتا ہے..''

''کچھ بھی نہیں جاتا..''

''ویسے وہ اوپر والا رانجھا راضی ہو جائے تو سب کچھ ہو جاتا ہے..ہم گندوگورو کی چوٹی پر بھی پہنچ سکتے ہیں..وہ اپنی ونجلی پر ہمیں ایک میٹھی تان سنا دے تو ہم اس کی دُھن پر جھومتے ہوئے..گندوگورو تو کیا کے ٹو پر بھی چڑھ جائیں..کیا خیال ہے..''

''سر جی..''سلمان نے دخل در نامعقولات کیا۔''کچھ تجریدی سی..رومانی سی گفتگو شروع ہو گئی ہے..آپ رانجھے کو چھوڑیں کسی ہیر کو راضی کریں..''

''رانجھا تو بے پروا ہے..وہی بے پروا جس کے ساتھ دل لگ جاتا ہے..ہیر کو راضی کرنا البتہ مشکل ہے۔''

میاں صاحب بور ہو گئے۔''آپ نے جس کو بھی راضی کرنا ہے کریں..میں پکوڑوں کا نمک مرچ چیک کر کے آتا ہوں۔''

اور تھوڑی دیر کے بعد جب سردی پندرہ ہزار فٹ بلند ہسپاں پر اُتر تی تھی..ہمارے سانسوں کو سفید کرتی تھی تو ایک طشت میں سجے گرما گرم..بھاپ دیتے..درہ گندوگورو کے دامن میں..اس کی وادی میں..لیلے پیک کے آمنے سامنے..پکوڑے آئے..ٹماٹو کیچپ کے ساتھ تو ہم سب کچھ منظر و نظر بھول گئے کہ ان پکوڑوں کا ذائقہ جنت کے میووں ایسا تھا..اور ان میں خوبی یہ تھی کہ میٹھے نہ تھے، نمکین اور چٹ پٹے تھے..

حسن صاحب حسب معمول اپنی صحت کے بارے میں احتیاط پسند..تشویش میں مبتلا فوراً اپنی منرل واٹر کی بوتل خیمے سے نکال لائے۔''سر جی یہ پورٹر جو پانی ہمیں پلا رہے ہیں، کہتے تو یہی ہیں کہ چشمے کا ہے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ یہ سامنے والے گدلے تالاب میں سے بھر بھر کر لا رہے ہیں..اس میں مٹی کے علاوہ پتہ نہیں کیا کیا ہے تو احتیاط کیجیے۔''

''حسن صاحب میں نے کبھی کسی معاملے میں احتیاط نہیں کی..برالدو اور شیوک کا پانی پیا ہے..بچپن میں گکھڑ منڈی کے جوہڑوں میں نہاتے ہوئے اُن کا پانی بھی حلق سے اُترا ہے، مجھے کچھ نہیں ہوتا..''

''تب کچھ نہیں ہوتا تھا..اب تو اپنی عمر کا خیال کریں..احتیاط کریں۔''

''کیسے احتیاط کریں؟''

''صرف یہ منرل واٹر پئیں جو میں لاہور سے اتنی احتیاط سے اور سنبھال کے لایا ہوں..مان جائیں۔''

چنانچہ میں مان گیا اور احتیاط کی..

پورٹروں کے فراہم کردہ گدلے پانی سے اجتناب کیا اور صرف منرل واٹر کے سفید

گھونٹ بھرے اور پکوڑے کھائے.. بلکہ بقول میاں صاحب پکورے کھائے..

یہ ایک عجیب سرمست مدھری کیفیت تھی..

ہسپاں کی آلودہ بھیڑ بھری خیمہ بستی سے ہمارا کوئی واسطہ نہ تھا.. ہم گندو گورو کی وادی کے واحد مہمان تھے.. ندیوں کے کناروں پر.. برفیلی اُبھار والی چوٹیوں کے سامنے ہم بیٹھے تھے اور.. پکورے کھا رہے تھے۔

ہر ٹریک کے دوران کم از کم ایک ایسی شام آ جاتی ہے جو ساری مشقتیں اور کلفتیں بھلا دیتی ہے اور کہتی ہے کہ.. کیا میں تمہاری پوری زندگی کے لیے کافی نہیں ہوں.. تمہیں اور کیا چاہیے.. میں.. یہ شام پیرس کے قدیمی نائٹ کلب مالن روژ میں.. روم کے ویا وینیٹو میں.. سٹاک ہوم کے کنگز گارڈن.. لندن کے پکاڈلی سرکس.. وینس کے گنڈولوں اور لاہور کی مال روڈ پر بھی نہیں اُتری.. صرف اس لمحے پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر درہ گندو گورو کے دامن میں.. لیلے پیک کے سامنے صرف تم پر اُترتی ہوں تو تمہیں اور کیا چاہیے..

اور کم از کم مجھے تو کچھ اور نہیں چاہیے تھا..

یکدم شام گہری ہو گئی..

نالے کے پار ہسپاں کی پُرہجوم بستی کے خیمے تاریکی میں چلے گئے اور وہاں کچھ لالٹینیں روشن ہو گئیں..

شام گہری ہوئی تو بے حد سرد بھی ہو گئی..

اس کی سردی ہمیں بے آرام کرنے لگی..

ہم ٹھٹھرنے لگے..

ہم بدستور پکوڑے کھاتے جاتے تھے اور ٹھٹھرتے جاتے تھے..

نالے کے پار ہسپاں کی خیمہ گاہ میں کچھ اور لالٹینیں روشن ہونے لگیں..

ان کے عکس ان پانیوں پر تھے جن میں لیلے پیک کی برفیں اُتری ہوئی تھیں.. اور جب ہمارے بدنوں نے دوہائی دے کر ہمیں خبردار کیا کہ اگر تم مزید اسی شام میں.. اور اتنی بلند شام میں یونہی پکوڑے کھاتے رہو گے تو پچھتاؤ گے.. یونہی حنوط ہو جاؤ گے.. ایسی حالت میں اگلی سویر دریافت ہو گے کہ تمہارے ایک ہاتھ میں پکوڑا ہو گا اور دوسرے ہاتھ میں کچھ بھی نہ ہو گا.. تو ہم اُٹھے اور بمشکل اُٹھے.. سردی سے کڑکڑاتے بدنوں کو سنبھالتے اٹھے اور اپنے خیموں میں چلے گئے.. اور

جب ایک بار خیموں میں چلے گئے تو پھر دوبارہ باہر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چاہے باہر بیر اپنے رانگلے پلنگ پر لیلیٰ آمادۂ وصال ہی کیوں نہ ہو..

اتنی سردی میں وصال کی خواہش بھی سکڑ جاتی ہے..

ہم نے اپنے خیموں میں ہی رات کھانا کھایا.. سویٹر اور جیکٹیں پہن کر اپنے سلیپنگ بیگز میں سٹ کر.. کپکپاتے ٹھٹھرتے نیند میں جانے کی کوشش کرنے لگے..

"ہسپاں کی رات..اور لیلیٰ پر ستارے گرتے تھے"

اس شب میں بے حد خوفزدہ ہوا..

میں اگرچہ درزو ہیپر کی ٹاپ پر رات گزار چکا تھا جو ہسپاں سے دو ہزار فٹ زیادہ بلند تھا لیکن وہ گئے زمانوں کے قصے تھے..

میں خوفزدہ صرف اس خیال سے ہوا کہ کہیں اس بلندی پر دل کے راستے میں کوئی اٹک نہ آ جائے..کسی شریان میں کوئی رکاوٹ نہ آ جائے کہ سانس بھی رکاوٹ سے اٹک اٹک کر آتا تھا..رُکتا تھا اور اسے کھینچنا پڑتا تھا..اور میں پوری شب اپنے آپ کو تسلی دیتا رہا کہ نہیں..جو کچھ ہونا ہے اس بلندی پر..ایک نامعلوم درّے کی وادی میں تو نہیں ہونا..اگر دل نے رکنا ہے..کچھ نہ کچھ ہونا ہے تو براہِ کرم تھوڑا انتظار کرے..ذرا مہلت دے اور لاہور واپس پہنچنے پر جو دل کے دل میں آئے بے شک کرے..

مجھے نہیں معلوم تھا کہ برمانی بھی اسی کیفیت میں مبتلا ہے اور پوری شب خیمے سے باہر ٹہلتا رہا ہے..ورنہ کچھ تسلی ہو جاتی کہ جو میرا حال ہے وہ سب کا حال ہے..

ویسے بلندی پر اگر بے چینی اور بے اطمینانی کی کیفیت ہو تو لیٹے رہنا مناسب نہیں ہوتا..اُٹھ کر بیٹھ جائیں یا اس سے بہتر ہے کہ خیمے سے باہر نکل کر ٹہلنے لگیں تو قدرے افاقہ ہو جاتا ہے..طبیعت سنبھل جاتی ہے..

میں نے وہ شب شدید ڈر اور موت کی قربت کے خوف میں گزاری..

ایک اور خدشہ تھا..

نہایت عامیانہ اور انسانی خدشہ..کہیں اس منجمد رات میں مجھے مجبوراً خیمے سے باہر نہ نکلنا

پڑے..کہیں مثانے پر اتنا دباؤ نہ پڑ جائے کہ میں رہ نہ سکوں۔اپنے آپ پر کنٹرول کرنا ممکن نہ ہو اور خیمے سے باہر جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ ہو..

اور یہی ہوا..

اگرچہ میں نے پیش بندی تو بہت کی تھی..چائے نہیں پی تھی..خیمے میں جانے سے پیشتر اپنے آپ کو فارغ کیا تھا لیکن اس سردمہری کی شب میں ایک لمحہ آ ہی گیا جب تمام تر ضبط کے باوجود اس بے اختیاری نے مجھے بے اختیار کر دیا اور میں اپنے سلیپنگ بیگ میں سے سرکتا ہوا حسن اور سلمان کے درمیان میں سے جھکتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا..

باہر آ کر میں نے ذرا دور جانے کا تردد نہ کیا..

کہ باہر ایک شدید سردمہری تھی..ایک چپ منجمد برفانی سکوت تھا..

وہ طشتری ابھی تک گھاس پر پڑی تھی اور اس میں بچے ہوئے چند پکوڑے سردی سے پتھر ہو رہے تھے..

میں نے دور جانے کا تردد نہ کیا اور ٹھٹھرتے ہوئے اس پریشر سے نجات حاصل کی جس نے مجھے باہر آنے پر مجبور کر دیا تھا..

خیمے کے اندر واپس جانے سے پیشتر جونہی میں نے آس پاس نگاہ کی..تو میں سردی سے نہیں حیرت سے منجمد ہو گیا..مجھے احساس ہوا کہ رانجھا مجھ سے راضی ہو گیا تھا اور اسی نے پریشر کا یہ بہانہ میرے لیے تخلیق کیا تھا تاکہ میں خیمے سے باہر آؤں اور اس سرد رات میں اس کی سفید قدرت کا مشاہدہ کروں..جو کچھ اس نے تخلیق کیا تھا۔اسے دکھانے کے لیے اس نے مجھے اپنے خیمے سے باہر نکالا تھا..

اس لیے کہ اس نے..میرے رانجھے نے وہ سب کچھ..وہ بلندیاں، برفیں، سکوت..

لیلے..ندیاں اور یہ رات صرف میرے لیے بنائی تھیں..

میرے لیے بنائی تھیں تو وہ کیسے مجھے نہ دکھاتا..

ہسپاں کی خیمہ گاہ کی سب لالٹینیں گھپ اندھیرے میں بجھ چکی تھیں۔

لیلے پیک پر ایک نابینا تاریکی کا راج تھا اور اس اندھیرے راج میں ستارے اُترتے تھے اور ٹوٹتے تھے..

اور سامنے برفیلی چوٹیوں پر جو آسمان تھا،اس میں ابھی ابھی چند ستاروں نے جنم لیا تھا،

روشنی حاصل کی تھی اور ابھی ابھی ٹوٹتے گم ہوتے تھے..

برفیں بلند سیاہ رات میں مجھے گھیرے ہوئے اور اُن پر ابھی ابھی جنم لینے والے ستاروں کی روشنی..

سرد.. بلند.. ستاروں سے اَٹی رات.. جو سردی کے باوجود بجھتے نہ تھے، بھڑکتے تھے اور ان میں سے کوئی ایک ٹوٹتا تھا اور راکھ ہوتا تھا..

یہ درست کہ میں ہائی کیمپ تک نہیں جا سکا تھا.. گندوگورو کی چوٹی پر نہیں پہنچ سکا تھا لیکن یہ بھی تو درست کہ آسمانوں میں اتنے ستارے دیکھنا اور ان میں سے کچھ کو لیلیٰ پیک پر گرتے دیکھنا.. اس کی برفوں میں گم ہوتے دیکھنا.. ایک خوش بختی ہے..

لیلیٰ پیک کے عین اوپر ایک ستارہ بکھرا ایک روشن لکیر تاریک آسمان میں چھیدتا راکھ ہو گیا..

میں نے اس رات میں خیمے کے باہر کھڑے ہسپاں کی رات میں اپنے آپ کو اس ستارے میں محسوس کیا.. کہ میں اگرچہ آسمانوں میں چھید نہیں کر پایا تھا لیکن دڑہ گندوگورو کی اس رات کے حُسن کی تاب نہ لا کر... بہر طور راکھ ہو گیا تھا.. اور اس راکھ کو میں نے ایک عمر کریدنا تھا.. کہ کہیں اس میں ایک چنگاری لیلیٰ کی مل جائے..

میں نے ایک عمر اس راکھ کو کُریدنا تھا..

لیلیٰ پیک کے اوپر ستارے یوں گرنے لگے جیسے پروانے بھسم ہو کر گرتے ہیں..

میں ابھی ایک ستارہ تھا اور ابھی وہ پروانہ تھا جو لیلیٰ پر گرتا راکھ ہوتا تھا..

"لاہور کی سویر.. اور باقی رہ گیا ایک.. میں!"

ویگن فیروز پور روڈ کے شور میں تھی..

لاہور کی نہر میں گرمی کے مارے ہوئے ننگ دھڑنگ بچے چھلانگیں لگا رہے تھے..

برمائی گم تھا..

اُس کے ذہن میں جانے کونسی فلم چل رہی تھی.. وہ اپنی سیاہ آنکھیں اور مجرمانہ بھویں اگرچہ لاہور کی بے ہنگم ٹریفک پر رکھتا تھا لیکن وہ اسے دیکھ نہیں رہا تھا.. اپنے ذہن کے پردے پر جو فلم چل رہی تھی، اُسے دیکھ رہا تھا..

ہم بھی جو ویگن میں رہ گئے تھے، ویگن میں نہیں تھے کہیں اور تھے.. ہمارے ذہن کی سکرین پر بھی دڑہ گندوگورو کے سفر کی ایک ڈاکومنٹری چل رہی تھی..

کلمہ چوک میں ایک پتھریلا ہاتھ اٹھا ہوا تھا.. اسے کسی مُغنیہ کے ہاتھ سے تشبیہ دی جاتی تھی.. ہمیں اس میں سے لیلیٰ پیک اُبھرتی دکھائی دینے لگی..

برمائی لاہور کی نہر میں بہتا تھا اور بہتا جاتا لیلیٰ کے گلے جا لگتا تھا.. ہم سب کی آنکھیں کھلی تھیں اور جو کچھ سامنے تھا، اسے نہیں دیکھ رہی تھیں، دل کے بھیتر میں جو فلم چل رہی تھی، اسے دیکھ رہی تھیں.. بلند چٹان پر براجمان سُرخ جوڑے میں ملبوس ایک جل پری..

شائد وہ خود بھی پتھر کی تھی لیکن اس کا سُرخ پیراہن ہوا میں پھڑ پھڑاتا جا رہا تھا..

شائی چُوکی رات.. رات میں رقص..

دل سنگ پا کے ستارے.. مشابرم سے باتیں..

ملتان جانے والی بس کی روانگی میں ابھی کچھ دیر تھی..

''تارڑ صاحب.. برمانی کو میرے ہاں ڈراپ کر دیں.. یہ کچھ تازہ دم ہولے.. ذرا نارمل ہو جائے تو پھر میں اسے یہاں چھوڑ دوں گا..''

عامر کے گھر کے آگے بلند بوتل پام کے درختوں کے عقب میں سے کچھ گن مین اور پہریدار نکلے اور عامر اور برمانی کا سامان ویگن میں سے اُتارنے لگے..

شاہد بھی اپنے گھر کے گیٹ کے سامنے خاموشی سے اُتر گیا..

باقی رہ گیا ایک..

وہی ایک جو اس سارے فساد کی جڑ تھا... میں!

''گندوگورو کے میراثی.. ہائے اوئے!''

وہ بھی ایک عجیب سویر تھی..

ہسپاں میں وزہ گندوگورو کی وادی میں جو سویر تھی.. عجیب تھی..

میں اس سویر کو دیکھ نہیں رہا تھا، اپنے خیمے میں سلیپنگ بیگ میں لیٹا اس سویر کو سُن رہا تھا.. ایک سویر کیسے بول سکتی ہے؟

اگر سویر نہیں تو اسے دیکھنے والے تو بول سکتے ہیں..

اور وہ بول رہے تھے..

سب سے بلند بولی سلمان کی تھی.. ہائے اوئے...

اور یاد رہے کہ جیسے مسٹر بگس والا یوسف کسی منظر یا چہرے کو دیکھ کر بے قرار ہو کر ''یہ تو غدر ہے'' کا نعرہ لگاتا تھا، اسی طور سلمان ایسے موقعوں پر دل پر ہاتھ رکھ کر ایک شدید لاہوری ''ہائے اوئے'' کرتا تھا..

چنانچہ یہ اس سویر میں سلمان کی پہلی ''ہائے اوئے'' تھی..

''اوئے بھالو.. کیوں شور مچا رہے ہو؟'' میں سلیپنگ بیگ کی بغل میں سے بولا..

''تارڑ صاحب ہائے اوئے.. لیلے پیک پر ابھی ابھی سورج کی کرنیں اُتری ہیں اور اس پر سویر کے سنہرے پن کا اثر ہو رہا ہے.. سرخی سستی اور نامردی کو ترک کر کے باہر آ کر تو دیکھیں کر لیلے کیسے ہولے ہولے سنہری ہو رہی ہے.. ہائے اوئے..''

''بچے تم اپنی رننگ کومنٹری جاری رکھو..'' میں نے اپنے سلیپنگ بیگ میں مزید سکڑتے ہوئے پکارا کہ سردی ابھی پورے جوبن پر تھی.. بیگ میں سے ہاتھ نکالتا تھا تو برف ہو جاتا تھا.. ''میں سُن رہا ہوں..''

''سر جی.. میں کیمرے کے لینز کو لیلے پیک پر زوم ان کرتا ہوں تو یوں لگتا ہے کہ یہ لینز لیلے کا بوسہ لینے کو ہے.. ہائے اوئے..''

''بیان جاری رہے..''

''سر جی آپ نے نور جہاں کا وہ گیت تو سنا ہوگا کہ.. سونے دی تویتڑی..... جے میں ہوندی ڈھولنا ہوندی ڈھولنا سونے دی تویتڑی.. تو سر جی میرا دل بھی یہی چاہ رہا ہے کہ میں اگر یہ زوم لینز ہوتا تو لیلے پیک کی سنہری ہوتی برفوں کے بوسے لے رہا ہوتا بقلم خود..''

''بے چاری لیلے پیک''

''ہائے اوئے..''

میاں صاحب کے چہکنے کی آوازیں بھی مجھ تک آ رہی تھیں.. یقیناً وہ اُسی اُدھار شدہ وڈیو کیمرے کو گندوگورو کی سویر کے منظر پر بے دریغ گھما رہے تھے اور اس کے ساتھ آہیں بھی بھرتے جاتے تھے۔ ''ہائے ہائے تارڑ صاحب باہر بڑا نامہ نیم منظر ہے.. نظارہ کرنا ہے تو آ جاؤ..''

شاہد کی آواز بہت دیر بعد آئی کیونکہ وہ اپنے کیمرے کا اپرچر اور سپیڈ سیٹ کرنے میں جتنی دیر لگاتا تھا اتنی دیر میں وہ منظر اکتاہٹ سے پہلو بدلنے لگتا تھا کہ میاں اب تصویر اُتار بھی چکو مجھے دنیا میں کچھ اور کام بھی ہیں.. تو اس کی آواز دیر آید نادرست آید ''مائی لیڈر.. رب سوہنے کی شان دیکھنی ہے تو باہر قدم رنجہ فرمائیں..''

البتہ برماتی کی آواز نہیں آ رہی تھی.. شاید وہ بھی میری طرح پچھلی شب کی بے خوابی کی کسر نکال رہا تھا..

لیکن وہ وہاں تھا..

یہ اطلاع پھر سلمان کی جانب سے آئی۔ ''ڈاکٹر جی آپ.. آپ بھی تو کچھ بولو..''

تو ہا آخر وہ بولا۔ ''ہم کیا بولیں سائیں.. ہم تو مرشد کے آگے گونگے ہو کر بیٹھتے ہیں.. محبوب کے سامنے کلام کرنے کی جرأت نہیں رکھتے.. لیلے سامنے ہے تو گفتار کیسے کریں..''

''ہائے اوئے..'' سلمان نے پھر نعرہ لگایا..

''اب کیا ہائے اوئے؟'' یہ سب لوگ مجھے ہی باہر نکالنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں..

''سر جی کم از کم اپنے خیمے کی چلمن اٹھا کر ایک نظر لیلے پر ہی ڈال لو.. وڑہ گندوگورو کی اس برف پٹی کو ہی دیکھ لو جس پر سے کچھ کوہ نورد رسّوں سے لٹکتے نیچے آ رہے ہوں گے.. یاد ہے

سکردو میں ہمیں بتایا گیا تھا کہ صبح سویرے اگر آپ کے پاس دوربین ہو تو یہاں سے ان خوش نصیبوں کو دیکھا جا سکتا ہے جو گندوگورو چوٹی سر کر کے نیچے آ رہے ہوتے ہیں.. رسّوں سے لٹکتے.. ایک جھاتی باہر بھی مار لو سر جی.. ہائے اوئے!''

میں نے اپنے برابر میں نیم خوابیدہ حسن صاحب کے کھلے منہ کو دیکھا اور چونکہ ان کی آنکھیں ابھی نہیں کھلی تھیں، اس لیے ان کے منہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''حسن صاحب.. شاہ جی..''

''ہاں جی..'' وہ نیند میں ہی مسکراتے ہوئے معصومیت سے بولے..

''سید بادشاہ باہر حشر برپا ہے.. ہسپاں میں سویر ہو رہی ہے اور برف بلندیاں آہستہ آہستہ سنہری ہو رہی ہیں.. اور جتنے بھی بین الاقوامی شہرت کے حامل فوٹوگرافر حضرات ہیں، وہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دھڑا دھڑ تصویریں اُتار رہے ہیں آپ بھی تو ایک نئے نکور کیمرے کے مالک ہیں.. باہر نکلیے اور تصویریں اتاریے..''

''میں لاہور پہنچ کر شاہد کی کھینچی ہوئی تصویریں دیکھ لوں گا..'' انہوں نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔ ''سونے دیں سر..''

''شاہد کی کھینچی ہوئی تصویروں کا کچھ پتہ نہیں چلتا.. جب تک کہ وہ خود نشاندہی نہ کریں کہ جناب یہ پہاڑ ہے اور یہ برف ہے کچھ پتہ نہیں چلتا.. آپ یہ رسک نہ لیں باہر جائیں۔''

''تو پھر میں سلمان کی تصویریں دیکھ لوں گا اس سویر کی.. وہ تو آسٹریلیا سے کیمرہ لے کر آیا ہے..'' ایک طویل جمائی ان کے کھلے منہ سے برآمد ہوتی گئی..

''شاہ جی آسٹریلیا میں صرف کنگرو اور کوالا ریچھ ہوتے ہیں یا پھر فضول سے آسٹریلین ہوتے ہیں جن کے آباؤ اجداد مجرم تھے تو وہ کیمرہ کرافٹ کیا جانیں.. آپ خود باہر نکلیں۔''

حسن اونگھ رہے تھے ''.. میں جی.. میں.. میاں صاحب کی اُتاری ہوئی مووی دیکھ لوں گا.. سونے دیں۔''

''وہ تو پہلی بار ایک مووی کیمرہ آپریٹ کر رہے ہیں.. کیا پتہ کیا نتائج برآمد ہوں..''

''آپ چپ کیوں نہیں کرتے چودھری صاحب..'' حسن صاحب اس ٹریک میں پہلی بار ذرا تاؤ میں آ کر بولے اور ایک آنکھ کھول کر بولے۔ ''آپ مجھے ہلاشیری دیئے چلے جاتے ہیں کہ باہر جاؤ، باہر جاؤ.. خود کیوں نہیں جاتے..''

''دراصل..'' میں نے کھسیانے ہو کر کہا۔ ''مجھے تو سلمان اور دیگر تصویر کش حضرات

پر اعتبار ہے..''

''کیا مطلب؟''

''ایک کافر ادا اور فنِ موسیقی میں تاک مغنیہ گاتی چلی جاتی تھی اور ایک میرا جیسا کور ذوق سامنے بیٹھا اونگھتا جاتا تھا تو مغنیہ نے اسے جھنجوڑ کر نہایت غصے سے کہا۔'' چوہدری صاحب میں غزل گا رہی ہوں اور آپ سو رہے ہیں..'' تو چوہدری صاحب نے ایک طویل جمائی لے کر کہا۔

''بی بی تم گاتی رہو.. مجھے تم پر اعتبار ہے۔''

''یقیناً یہ چوہدری صاحب آپ ہی تھے..'' حسن نے بیزار ہو کر کہا.'' اب چپ کر کے لیٹے رہیں یا باہر نکل جائیں، مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔''

''ہائے اوئے..'' سلمان کا ایک اور نعرہ ہائے اوئے بلند ہوا..

اس کے بعد میں اور حسن صاحب مشترکہ طور پر میراثی ہو گئے اور اونگھتے اونگھتے سو گئے اور جب بیدار ہوئے..اور تب بیدار ہوئے جب ہیں کیمپ وزو گندوگورو پر تیز دھوپ اُتر چکی تھی.. بچپن میں..گاؤں میں گزارے ہوئے بچپن میں..جب ہم دیر تک..دن چڑھے تک چھت پر سوتے رہتے تھے تو میری امی ہمیشہ ڈانٹتی تھیں کہ مستنصر کیا میراثیوں کی طرح دھوپ چڑھنے تک سوتے رہتے ہو..کیونکہ ان زمانوں میں گاؤں کے کوٹھوں پر..اپنے کچے گھروں کی چھتوں پر سونے والے کسان منہ اندھیرے اُٹھ کر ہل جوتنے کے لیے کھیتوں کو چلے جاتے تھے اور پورے گاؤں میں صرف میراثیوں کے دو چار کوٹھے ایسے ہوتے تھے جن پر بچھی چارپائیوں پر یہ فنکار حضرات اور ان کے خاندان دھوپ چڑھنے کے باوجود کھیس اوڑھے مزے سے سو رہے ہوتے تھے..اس لیے کہ انہوں نے کہیں نہیں جانا ہوتا تھا..اپنا رزق محض باتوں سے کمانا ہوتا تھا..

یہ الگ بات کہ ایک ایسا زمانہ آیا جب میرے جیسے نجیب الطرفین کسان اور چوہدری حضرات ٹیلی ویژن پر اداکاری اور میزبانی کرتے کرتے کسی حد تک میراثی ہو گئے اور اپنا رزق باتوں سے کمانے لگے..

تو جناب میں اور حسن صاحب بھی اس سویر میراثی ہو گئے..دیر تک سوتے رہے اور بھری دھوپ میں اُٹھے..

ویسے گندوگورو کے مناظر میں اگر انسان سیّد اور چوہدری سے میراثی ہو جائے تو بھی یہ گھاٹے کا سودا نہ تھا..

''پندرہ ہزار فٹ بلند برفانی کارواں سرائے سے کُوچ''

ہم خیموں سے باہر آئے تو ہمارے اوپر ڈھلوان پر جو پگڈنڈی تھی اس پر سے پورٹر اُتر رہے تھے..

یہ پورٹر ان کوہ نوردوں کی ایک واپس پارٹی تھے جو چوٹی سر کرنے کے بعد نیچے ہسپاں میں آ رہے تھے..

ان پورٹروں کو دیکھ کر ایک مرتبہ پھر ہم میں یہ خواہش بیدار ہوئی کہ ہم یہیں ہسپاں میں ٹھہر جائیں..آج واپس جانے کی بجائے ہائی کیمپ تک پہنچیں اور کل اپنی جان کی بازی لگا کر چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کریں..

لیکن ہم سب کی مجموعی صحت اس لائق نہ تھی..ہم جان کی بازی لگانے سے بھی جھجکتے تھے اور خپلو میں جس ویگن کو چھوڑ آئے تھے، اُس کے میٹر پر ڈھائی ہزار روپے روزانہ کا کرایہ بڑھتا جاتا تھا..چنانچہ اقتصادی پابندیاں بھی عائد تھیں..ویسے بھی یہ ایک برفانی خودکشی ہوتی..

''سر جی اب باہر آئے ہو تو کیا فائدہ..'' سلمان کچھ خفا سا تھا۔'' یہ سامنے والی ندی میں جو سنہری سائے تھے وہ تو دھوپ اُترنے سے بہہ گئے..سویرے سویرے یہ سامنے والی ساری کی ساری برف پوش چوٹیاں شرمیلی سنہری ہو رہی تھیں اور اب عیاں اور برہنہ ہو گئی ہیں..کیا فائدہ؟ آپ دونوں حضرات اب خیموں کی ٹک آفر کریں، ہم ان ندیوں کے پار جو پتھروں کا علاقہ ہے وہاں کوئی پائی پیس تلاش کرتے ہیں کیونکہ پریشر بڑھ رہا ہے۔''

ناشتے کے دوران..ڈھیلے اور چربیلے پراٹھوں کے ساتھ فرائی انڈوں کا ناشتہ کرتے ہوئے..آج کہاں پہنچنا ہے..واپسی پر رات کہاں کریں گے..کے بارے میں گفتگو ہونے لگی..

اصولی طور پر تو دل سنگ پا.. اور کہاں..

لیکن سلمان نے ایک آئیڈیا پیش کیا.. "تمام گائیڈ بُکس یہ کہتی ہیں کہ ہسپاں سے واپسی پر چونکہ اُترائی ہے، اس لیے آسانی سے دو منزلیں طے کی جا سکتی ہیں یعنی دل سنگ پا سے گزر کر آگے شائی چُو میں پہنچا جا سکتا ہے.."

"اس مارا ماری مسافت کا فائدہ؟"

"ایک تو یہ کہ ویگن کا ایک دن کا کرایہ مبلغ ڈھائی ہزار روپے بچ جائے گا اور دوسرے یہ کہ ہم ایک روز پہلے اپنے اپنے گھروں میں پہنچ جائیں گے.."

"ہم میں جو شادی شدہ ہیں، اُنہیں اپنے اپنے گھروں میں ایک روز پہلے پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں.." یہ سب کے دل کی آواز تھی..

"اگر ہم ایک روز پہلے پہنچ جاتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ میں اپنے چھوٹے بھائی کو خدا حافظ کہہ سکوں جو امریکہ جا رہا ہے.. کوشش کر دیکھتے ہیں ورنہ دل سنگ پا سے آگے بھی تو ایک کیمپ سائٹ ہے، وہاں رات گزار لیں گے اور کل ہوتے پہنچ جائیں گے.."

"پابندی کوئی نہیں ہے.." یہ میاں صاحب نے کہا۔ "ہسپاں سے سیدھا شائی چُو جانا تو قتل و غارت ہے... دیکھتے ہیں کہ کہاں تک پہنچتے ہیں۔"

چونکہ میں کل ایک گھوڑا تھا، اس لیے آج بھی مجھے توقع تھی کہ میں گھوڑا ہی رہوں گا.. چنانچہ مجھے کوئی اعتراض نہ تھا..

تب سلمان نے خطرے کا ایک بگل بجایا۔ "سر جی.. دل سنگ پا سے آگے جو پہلے چڑھائی تھی اور اب اُترائی ہوگی تو وہاں سے بھی تو اُترنا ہوگا۔"

"اُتر جائیں گے۔" حسن صاحب نے سر ہلایا..

"اور آج ذرا آسمان پر نظر کیجیے کہ ہلکے ہلکے بادل ہیں تو وہاں اس اُترائی کے دوران اگر بارش ہوگی تو ہم کیسے نیچے اُتریں گے.. لڑھکتے ہوئے پتھروں کے شکار ہو جائیں گے.. ہم پر حدود آرڈیننس لگ جائے گا اور سنگسار ہو جائیں گے.. وہاں سے نکلیں گے تو گندوگورو گلیشیئر کے کناروں پر جو راستہ ہے.. جس کے اوپر مٹی میں پھنسی سینکڑوں چٹانیں ہیں وہ بھی تو بارش کی وجہ سے ڈی لوکیٹ ہو سکتی ہیں.. ہم پر گر سکتی ہیں.. اگر بارش ہوگئی تو کیا یہ بہتر نہیں کہ وہ اُترائی اور وہ راستہ آج ہی سمیٹ دیا جائے.."

سلمان کسی بے راہ رو قوم کو فنا کی خبریں سنانے والا پیغامبر لگتا تھا..

چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ ٹھیک ہے سفر کا آغاز کرتے ہیں.. اور جب دل سنگ پا پہنچیں گے تب یہ فیصلہ کریں گے کہ ہم میں مزید آگے جانے کی سکت ہے یا نہیں..

ایک ایک کر کے جب ہمارے خیمے ایک پیراشوٹ کی مانند زمین پر گرے تو ہمیں بے حد قلق ہوا..

ایک قلق تو یہی ہوا کہ یہ ہماری کوہ نوردی کی آخری منزل تھی اور اب ہمیں الٹے پاؤں انہی راستوں پر چل کر واپس ہونا تھا جہاں سے ہم آئے تھے.. وہی منظر.. وہی بلندیاں.. وہی پتھر.. دوبارہ نظروں کے سامنے آئیں گے.. ان میں کوئی اجنبیت والی سحر کوئی سسپنس نہیں ہوگا..

اگرچہ واپسی پر ہمیشہ منظر بدلتے ہیں.. جن کی جانب آپ کی پُشت ہوتی ہے، آتے ہوئے تو وہ سامنے ہوتے ہیں جاتے ہوئے.. لیکن سب کچھ جانا پہچانا ہوتا ہے.. اس میں کوئی تھرل نہیں ہوتا..

لیکن زیادہ قلق اس بات پر ہوا کہ... ہائے اوئے ہم یہ سپاٹ.. گندوگورو کی یہ وادی اور لیلے پیک کا آمنا سامنا آج خالی کر دیں گے تو آج شام یا کل کوئی اور ہوگا جو یہاں خیمہ زن ہو جائے گا.. جیسے ایک صحرا نورد ادیب کے بارے میں اس کے حاسدوں نے.. ادبی مافیا نے یہ روایت گھڑ رکھی تھی کہ ایک قومی اعزاز ملنے پر اس نے کہا تھا کہ مجھے یہ اعزاز ملنے پر بے حد مسرت ہوئی ہے لیکن مجھے یہ دکھ ہے کہ اگلے برس یہی اعزاز کسی اور کو مل جائے گا..

اور یہ ایسے حاسد اور بانجھ ادیب ہیں جو ہر برس کوئی نہ کوئی اعزاز حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں اور حکام بالا کے تلوے چاٹ چاٹ کر انہیں رام کر لیتے ہیں.. ایسے گدھ جو دوسروں کا رزق کھا جاتے ہیں..

ڈھلوان پر پتھریلی آماجگاہوں کے آس پاس جو نیلے ڈرم سجے تھے، اب وہ وہاں نہیں تھے..

ہسپاں کی خیمہ بستی میں جو خیموں کی رونق تھی، وہ اُجڑ چکی تھی اور اس کی ریت پر ان کی کچھ نشانیاں تھیں.. خالی ڈبے.. پیکٹ.. آلودہ ٹائلٹ پیپر.. پلاسٹک کے لفافے.. ٹین.. کوئی ایک میخ کسی خیمے کی.. بستی ویران ہو چکی تھی..

یقیناً سُرخ بالوں والی لڑکی بھی کوچ کر گئی ہوگی..

جس جھیل میں لیلے عکس ہوتی تھی، اُس کے پانیوں میں کوئی سرخ بال نہ تھے..

ہمارے پورٹر کندھوں پر ہمارا سامان بوجھ کئے.. اس الگ تھلگ وادی میں سے نکلنے لگے..

ہم مڑ کر دیکھتے تھے.. اور بار بار اس سپاٹ کو تکتے تھے جس پر ابھی ابھی ہماری حکومت تھی.. اور جسے دور سے جو کوئی بھی دیکھتا تھا تو یہی کہتا تھا کہ یہ کیسے کمی باسٹرڈ ہیں جن کے خیمے ان برفانی منظروں میں تنہا لگے ہیں.. ہم نے وہاں سے سب کچھ سمیٹ لیا.. اپنے خیمے، سامان، طشت میں اکڑے چند پکوڑے.. کچھ لفافے.. فلم کی خالی ریلیں.. سب کچھ سمیٹ لیا لیکن ہم اپنی ایک شب کی موجودگی کو نہ سمیٹ سکے..

جہاں ہمارے خیمے نصب تھے.. اور جہاں جہاں ہم اُن کے آگے چلے تھے وہاں ہمارے بوٹوں کے نشان گیلی زمین پر ثبت تھے جو ہم نہ سمیٹ سکے.. یہاں تک کہ لیلے پیک کے برف چہرے پر بھی ہماری حریص نظروں کے نشان باقی تھے..

یہ سب نشان.. دھیرے دھیرے.. وقت کے گزرنے سے.. موسموں کے بدلنے سے.. برفوں کے پڑنے سے.. ہواؤں کے چلنے سے.. یکسر معدوم ہو جائیں گے.. مٹ جائیں گے.. اور پھر آنے والے زمانوں میں کسی کو خبر نہ ہوگی کہ یہاں اس ہسپاں کی پندرہ ہزار فٹ بلند برفانی کارواں سرائے میں کچھ مسافر آئے تھے.. آئے تھے اور ایک شب گزار کر چلے گئے تھے.. لیکن.. اپنی لیلے کو ساتھ لے کر چلے گئے تھے.. اپنے بدنوں اور روحوں میں اُتار کر ساتھ لے گئے تھے.. اور اب یہ جو لیلے پیک نظر آتی ہے تو یہ موجود نہیں.. یہ محض ایک دکھاوا ہے.. دھوکا ہے.. اصل لیلے جو تھی اسے تو اس کے مجنوں لے گئے تھے..

"پہاڑوں کی رات میں بھٹکتے اندھے فقیر"

آج میں نے پھر ہنہنانے کی سعی تو کھسیا کر رہ گیا.. تیز چلنے کی کوشش کی تو ٹانگوں نے جواب دے دیا.. اپنی ہمت کو مجتمع کرنے کا چارہ کیا تو بدن نے دوہائی دی کہ میاں اس بوسیدگی کی عمر میں مَیں تمہاری حرص کا ساتھ نہیں دے سکتا..

چنانچہ کُھلا کہ میں آج گھوڑا نہیں تھا بلکہ پھر سے مستنصر حسین تارڑ ہو چکا تھا.. اور یہ بھی کھلا کہ روزانہ گھوڑا نہیں ہوا جا سکتا.. یہ محض ایک فلوک تھا جو کل لگ گیا تھا.. میں محض ایک دن کا گھوڑا تھا..

ہم انہی راستوں پر.. گزرے تھے ہم جہاں سے.. وہاں سے سر جھکائے چلتے ہانپتے چلتے رہے.. البتہ بلندی کم ہوتی جا رہی تھی اس لیے سانس اتنا بے ربط نہیں ہوتا تھا..

جب ہم ہسپاں کو جانے والے سفید گلیشیئر اور اونچی نیچی پہاڑیوں پر اونچے ہو کر اور نیچے ہو کر بالا خرگندو گورو گلیشیئر پر اُترے.. اسی مقام پر اُترے جہاں ایک بڑی دراڑ تھی اور برف کا کنواں تھا اور پھر اس کی برفیں ناپتے ہوئے اس کی مسافت تمام کر کے اس سے جدا ہونے کے لیے اس کے بلند کنارے پر چڑھے تو وہاں ایک سانحہ ہو گیا..

لیلے پیک ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گئی..

"سائیں ادھر دوبارہ آنا ہے اور پھر لیلے کے دامن میں.. اس کے بیس کیمپ تک جانا ہے.. اس کے چرن چھونے.." یہ برمانی نے کہا..

اور یہ سائیں نے کہا.. "ڈاکٹر یہ تمنا کہ ہم دوبارہ یہاں آئیں گے، کبھی پوری ہونے والی نہیں ہے.. آپ کبھی برالدو کے پار اس گاؤں میں نہیں جاتے.. جو آپ پر سحر طاری کر دیتا

ہے.. جیسپر گلیشیئر کی بلندی پر اس سرسبز قطعے تک نہیں جاتے جہاں آپ کو خبر ملتی ہے کہ ایسے ہرن ہیں جنہوں نے آج تک انسانی شکل نہیں دیکھی اور وہ آپ کو بھی اپنے جیسا سمجھ کر تھوتھنیاں اُٹھائے آپ کے قریب آ جاتے ہیں۔ بیافو کی چٹانوں میں کُھدے شکاری جھونپڑے میں رات بسر نہیں کرتے.. تو ایسی خواہشیں کبھی پوری نہیں ہوتیں.. لیلے پیک کے دامن میں پہنچنے والی خواہش بھی ایسی ہے.. اسے تم آخری بار دیکھ چکے.. دوبارہ یہاں کون آئے گا.. کس نے آنا ہے۔''

''نہیں بھی آنا سائیں تو ایک مجنوں کا دل رکھنے کی خاطر کہہ دیں کہ ہاں ہم آئیں گے.. اس جدائی کے پہلے لمحے میں کچھ تو ڈھارس بندھائیں.. دو بول اُمید کے بول دیں۔'' برمانی واقعی اس برفانی لیلے کا اسیر ہو چکا تھا..

''میں تو اپنے لیے کہہ رہا تھا کہ میں تو نہیں کہ میرے پاس عمر کی جو گھڑی ہے، اُس میں گنجائش کم رہ گئی ہے.. مسلسل تنگ کر رہی ہے اور سانسیں کم کر رہی ہے.. سانس نقارہ کوچ کا باجت ہے دن رین.. اور کسی روز گھڑیال منادی کر دے گا.. اور پھر لوگ پوچھیں گے FOR WHOM THE BELL TOLLS.. لیکن تم دوبارہ آؤ گے، مجھے یقین ہے۔ تم میں جو بلوچ ہٹ ہے وہ تمہیں یہاں لے آئے گی اور تم اس کے دامن میں پہنچ کر اس کے وصال سے سرشار ہوتے ہوئے تب مجھے یاد کرو گے.. کہ پہلی بار تارڑ مجھے لیلے تک لایا تھا۔''

تقریباً دو بج رہے تھے جب ہم دل سنگ پا کی ویرانی میں اُترے..

دل سنگ پا خالی اور بے روح تھا.. تیز دھوپ اس کے رنگ نچوڑ چکی تھی.. جھیل کے پانیوں تلے اس کی کیچڑ بھری تہہ دکھائی دے رہی تھی.. اس میں مشابرم کا کوئی عکس نہ تھا..

ہم نے دھوپ میں چلتے ہوئے کچھ بدمزہ قسم کی چیزیں خوراک کے طور پر نگلیں اور فیصلہ کیا کہ ابھی کچھ وقت ہے، کچھ ہمت ہے اس لیے سفر جاری رکھا جائے.. اگر ممکن ہو تو شائی چو تک ورنہ راستے میں رات بسر کریں گے.. اگر ہمت نہ بھی ہوتی تو بھی ہم دل سنگ پا کی نامہربان ویران دھوپ میں نہ ٹھہرتے.. اور سلمان کی دلی آرزو بھی یہی تھی کہ ہم آج ہی اس ہولناک اُترائی کا کشٹ کاٹ لیں.. اس ایک بڑے ڈر کا سامنا کر کے اس سے فارغ ہو جائیں۔

''سر جی کچھ پتہ نہیں کب بارش آ جائے۔'' حالانکہ آسمان بالکل خالی پڑا تھا۔ بادلوں کا شائبہ بھی نہ تھا۔ ''بارش آ گئی تو وہاں پھسلن ہو جائے گی.. پتھر گرنے لگیں گے، آج ہی اُس سے نپٹ لیں۔''

دل سنگ پا سے ہم شتابی سے نکلے.. گندوگورو کے بلند کناروں پر چلتے.. پھولوں کے سوکھے ہوئے کھیتوں میں سے چلتے.. خشک ہو چکی ندیوں کے نشانوں پر سے گزرتے جب ہم وہاں پہنچے جہاں جھانکنے سے وہ اُترائی نظر آتی تھی تو جھانکا ہے تو ٹھٹک گئے.. اگرچہ ہم ذہنی طور پر اس اُترائی کے لیے کل سے اپنے آپ کو تیار کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود اس کی پاتال گہرائی اور ناممکن گہرائی کو دیکھ کر ٹھٹک گئے کہ ہم اس کے لیے تو قطعی طور پر تیار نہ تھے..

اور اس پر طرّہ یہ کہ جانے کہاں سے ایک گھنا بادل نمودار ہوا.. خالی آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ٹپ ٹپ بارش اُترنے لگی.. یہ صرف سلمان کا ڈر تھا جس نے بارش برسائی تھی.. ورنہ تو کوئی امکان نہ تھا..

سب لوگ سراسیمہ ہو گئے اور سلمان کا رنگ تو باقاعدہ فق ہو گیا.. ہم چونکہ اپنے رنگ نہ دیکھتے تھے.. اگر دیکھتے تو بھی وہ فق تھے کہ اب کیا ہو گا..

بارش باقاعدہ نہیں ہوئی تھی.. بس کبھی کبھار ایک آدھ بوند گرتی لیکن وہ ایک آدھ بوند بھی ہمارا خون آدھا کر دیتی..

پورٹروں نے ہمیں اس بلندی سے ایسے نیچے دھکیلا جیسے اناڑی پیراٹروپرز کو پہلی بار زبردستی جہاز سے دھکیلا جاتا ہے..

اور ایک ایک کر کے دھکیلا..

ان چند بوندوں نے بھی اپنا کام دکھایا اور خشک مٹی کو پھسلن میں بدل دیا..

مجھے دو پورٹر نیچے لے جا رہے تھے.. مجھے کسی بھی تعین پر اختیار نہیں.. اس اُترائی کے دوران یہ نہیں کہ ہم اُترے اور اُترتے ہی چلے گئے.. بلکہ متعدد مقامات پر میرا سانس پیچھے رہ جاتا اور میں آگے نکل جاتا اور آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں گے کہ سانس کے بغیر جینے میں کچھ دشواری ہوتی ہے۔ چنانچہ میں ایک حالت مردنی میں کہیں کوئی بھاری پتھر تھام کر پیچھے رہ جانے والے سانس کا انتظار کرتا اور جب وہ مجھ تک پہنچ جاتا تو پھر پورٹروں کی باہوں میں جھولتا نیچے جانے لگتا..

ہم باری باری نیچے آ رہے تھے..

سلمان بھی لڑھکتا ہوا نیچے آیا اور ایک ڈری ڈری سی.. ''ہائے اوئے'' کر کے کہنے لگا۔

''لو سر جی یہاں سے بچ گئے ہیں ناں تو اب ان شاء اللہ لاہور تک ہمیں سات کی سات خیریں ہیں..''

یہ پنجابی کے محاورے "سنے خیراں" کا ترجمہ تھا..

آگے وہی بکری اُترائی والا راستہ تھا اور راستے کے بعد نالہ تھا اور نالے کے بعد گندوگورو کے برابر میں وہ پگڈنڈی تھی جس کے عین اوپر مٹی میں پھنسی سینکڑوں چٹانیں ہم پر جھانکتی تھیں کہ اس پر گریں یا اس پر گریں لیکن ہم کچھ زیادہ فکرمند نہ ہوئے کہ اگر مرنا ہوتا تو وہ اُترائی اس کام کے لیے بے حد آئیڈیل تھی.. یہاں سے بچ نکلیں گے..

اس پگڈنڈی کے اختتام پر اوپر کنارے کی بالائی سطح پر پہنچنے کے لیے ایک وہی آسمانی چڑھائی جو آتے ہوئے پاتال اُترائی تھی..اور جب آپ پھسلتے لڑھکنے سے بال بال بچتے..سانس سنبھالتے..اپنے پورے بدن میں پسینے کے فوارے چھوٹتے محسوس کرتے...بے سکت ٹانگوں کو گھسیٹتے بالآخر اوپر پہنچتے ہیں..آپ کا سر بلند ہوتا ہے تو اس پر لگی ہوئی دو آنکھیں یکدم اپنے سامنے ایک وسیع گھاس بھرا میدان دیکھتی ہیں اور جب آپ دونوں ہاتھوں سے پتھروں کو تھامتے اوپر اُٹھ کر اس میدان کے کنارے پر دھڑام سے جا گرتے ہیں تو آپ کے کچھ سابق ساتھی وہاں پہنچ چکے ہیں اور گھاس پر لیٹے پتھروں سے ٹیک لگائے استراحت فرما رہے ہیں اور استراحت فرماتے ہوئے آپ کے دھڑام سے اوندھے گرتے ہی دانت نکال کر کہتے ہیں "ہاں جی..لیڈر صاحب..پہنچ گئے ہو۔"

اور آپ میں جواب دینے کے لیے ایک سانس بھی نہیں ہوتا..منہ کھلا ہوا ہے..ٹانگیں لرزش میں ہیں جہاں گرے ہیں وہاں بس گرے ہیں اور اس حالت میں وہ مسخرے سوال کرتے ہیں..پہنچ گئے ہو..اگر بولنے کی سکت ہوتی تو میں انہیں ایسی بامعنی اور مردانہ گالیوں سے نوازتا کہ سکھ حضرات بھی شرم سے سرخ ہو جاتے اور اگر ذرا سی بھی ہمت باقی ہوتی تو گھسٹتا ہوا ان تک جاتا اور ان کے ٹینٹوے دبا دیتا..

لیکن بیان کا قصور نہ تھا..

رسم دنیا یہی تھی..

میں بھی جب ایک پتھر سے ٹیک لگا کر سانس بحال کر چکا..اتنی طاقت آ گئی کہ گھاس پر ہاتھ پھیر کر اس کی ہریاول سے لطف اندوز ہونے لگا تو نیچے سے ہمارے ایک اور ساتھی کا سر نمودار ہوا تو سب سے پہلے میں نے ہی دانت نکال کر پوچھا "ہاں جی پہنچ گئے ہو.."

اور اگر وہ سر..سلمان کا تھا تو اس نے صرف اتنا کہا "ہائے اوئے" اور ڈھیر ہو گیا..

یہاں سے چلے ہیں تو کچھ دیر میں اس وسیع میدان کے کناروں پر جو نہایت اونچی اور گھمبیر چٹانیں آسمانوں میں تھیں، اُن کے سائے میں ایک خیمہ گاہ نظر آنے لگی..اور وہاں ڈھلتی دوپہر میں چٹانوں کے بڑھتے سائے میں بہت رونق تھی..بہت سے خیمے لگے تھے اور ان کے قریب چٹانوں میں سے اُترتے ایک چشمے میں ان خیموں کے غیر ملکی مکین اشنان کرتے تھے، چھینٹے اڑاتے تھے..ہم نے انہیں اس لیے بھی حسرت سے دیکھا کہ ان میں کچھ ایسی خواتین بھی تھیں جو کچھ زیادہ حیادار نہیں تھیں۔ طالبان کے فلسفے سے بالکل مخالف کنارے پر تھیں اور بے دریغ تھیں..انہیں دیکھ کر کچھ ساتھیوں کے ایمان ڈولے کہ سرجی یہیں ٹینٹ لگا لیتے ہیں لیکن فیصلہ یہی ہوا کہ شائی چُو زیادہ دور نہیں..تھوڑی سی ہمت کریں تو وہاں تک پہنچ سکتے ہیں..

اور کم از کم میں نہیں جانتا تھا کہ شائی چُو ابھی بہت ہی دور ہے....

ہمیں اصولی طور پر وہیں اسی خیمہ گاہ میں رک جانا چاہیے تھا...لیکن ہم اپنی اس انا کے اسیر ہو چکے تھے جو یہ کہتی تھی کہ اگر فلاں گائیڈ بک میں یہ درج ہے کہ یہاں سے شائی چُو تک دو منزلیں طے کی جا سکتی ہیں تو ہم بھی کریں گے...ورنہ یہ نئی خیمہ گاہ ہمارے لیے ایک اور منظر ہوتی..ایک نیا تجربہ ہوتی..ان چٹانوں تلے جو رات ہوتی، وہ پتہ نہیں کیسی نادر کیفیت کی ہوتی..

ہماری انا نے ہمیں ایک احمقانہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا اور ہم آگے بڑھ گئے..

یہاں تک تو ہم سب تقریباً اپنے حواس میں رہے....اور پھر شدید تھکاوٹ اور درماندگی نے ہمیں بدحواس کر دیا....ہم سب ایک عجیب دیوانگی اور بیگانگی میں الگ الگ ہو گئے، بھٹکنے لگے...کسی کو کوئی خیال نہ رہا کہ کون کہاں ہے....کس حال میں ہے...زندہ بھی ہے یا مر گیا ہے....ہر ایک کا سفر الگ تھا...تنہا اور دوسروں سے کٹا ہوا تھا...پھر میں اس نالے کے کناروں سے اُترا...جس کے دوسرے کنارے پر میں تادیر بھٹکا تھا جسے عبور کرنے سے جھجکتا اور جان کے ڈر سے ٹھٹکتا تھا...اسے بھی میں نے ایک عجیب لاتعلقی اور بیزاری سے بے پروا ہو کر عبور کیا کہ مجھ میں تھکاوٹ ایسی تھی جو کہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا...میں اس میں ڈوب جاؤں گا....بہتا ہوا ہوشے پہنچ جاؤں گا تو کیا ہوگا...

گندوگورو کا میدان شروع ہوا تو وہ ختم ہونے کو نہ آتا تھا..

کبھی پتھروں کی دنیا میں لاچارگی اور بے بسی کی تھکن بدن کو مسمار کرنے لگتی اور کبھی ریتلے علاقوں کی وسعت ایک صحرائے گوبی ہو جاتی جس کا کوئی انت دکھائی نہ دیتا..

ہم نے حماقت کی تھی... ہمیں اُسی خیمہ گاہ میں ٹھہر جانا چاہیے تھا... ہم وہاں اُس بڑی چٹان کے سائے میں اپنے خیموں کے سامنے میٹرس پر آرام کرتے چکن کارن سوپ پی رہے ہوتے... اور اس سے پیشتر ہم غیر ملکی گوری مخلوق کے ہمراہ ایک اشنان کر چکے ہوتے... ہم نے حماقت کی تھی لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا..

اور شائی چُو کہاں تھا؟..

اللہ جانے کہاں تھا..

کہیں تھا بھی یا نہیں..

لیکن پورٹر ڈھارس بندھاتے تھے کہ اس گندو گورو میدان کے پار.. دور افق کے آس پاس جو سبزہ ہے، اس کے دامن میں وُہیں کہیں ہے..

اور سورج بھی طوطا چشم ہوتا اپنی روشن آنکھ بند کر رہا تھا اور شام ہوتی تھی..

اس طویل.. اور انسانی برداشت سے باہر.. یعنی میری برداشت سے باہر کے سفر کا بیان طولانی ہے اور اس پر آسانی سے ایک الگ کتاب تحریر کی جا سکتی ہے لیکن یہ قصہ مختصر کر دوں تو بہتر ہے..

تو مختصر یہ کہ جب بالآخر گندو گورو کے گوبی صحرا کے پار ہم گلیشیر کے اونچے کناروں کے آس پاس اور دامن میں جھاڑیوں اور درختوں کے اندر پہنچے تو شام رخصت ہو کر رات کی سیاہ چادر میں روپوش ہو رہی تھی... راستے کے پتھر معدوم ہوتے جاتے تھے.. جھاڑیاں شجر تاریکی میں گھلتے جاتے تھے.. نظر کام کرنے سے انکار کرتی تھی۔ پاؤں تو کب کے اٹھنے سے انکاری ہو چکے تھے لیکن جانے کیسے اٹھتے جاتے تھے..

ہمارے ساتھی آگے نکل چکے تھے..

صرف میں.. حسن اور شاہد پیچھے رہ گئے تھے..

ہم تینوں اندھے فقیر ہو چکے تھے... اپنی واکنگ سٹکس ٹیکتے.. کبھی اس پتھر سے ٹھوکر کھاتے.. کبھی اس جھاڑی میں گرتے اپنے بدن زخمی کرتے.. راستہ ٹٹولتے اپنی قسمت کو کوستے ٹھپ.. ٹھپ.. چلتے جاتے تھے..

جب تاریکی بڑی ہو گئی.. نابینائی کی سلطنت وسیع ہو گئی.. سوائے اندھیروں کے اور کوئی ساتھی نہ رہا تو کہیں نیچے سے دو پورٹر اوپر چڑھتے آئے اور ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں..

اُنہیں ہمارے ساتھیوں نے شائی چُو پہنچ کر ہماری مدد کے لیے بھیجا تھا..

وہ ہماری رہنمائی کرنا چاہتے تھے.. ہمیں راستہ دکھانا چاہتے تھے لیکن ہمیں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا.. وہ بھی نظر نہ آتے تھے..

ایک ہاتھ میں اُن کی عطا کردہ ٹارچ اور دوسرے میں واکنگ سٹک اور اندھیرے اور خوف کی غار میں اُترتے جانا.. ٹارچوں کی ناکافی روشنی میں.. راستے کا تعین کرتے کہ کہیں اس بلند کنارے سے نیچے گندو گورو گلیشیر میں ہی نہ جا گریں۔ کہیں راستے سے ہٹ کر کسی درخت کی ٹہنیوں میں اُلجھ کر اپنے آپ کو زخمی نہ کر لیں.. ہم لاچار، غریب الدیار اُترتے رہے..

شائی چُو ایسا مقام لعنت تھا جو آتا ہی نہ تھا..

بدن اور ہمت نے مجھے جواب دے دیا تھا..

کئی کوہ پیما کے ٹو یا ایورسٹ کی چوٹی تک پہنچنے کے لیے پوری زندگی منصوبہ بندی کرتے ہیں.. وہاں تک پہنچ جانے کی آس میں جیتے ہیں.. ان کے لیے وہاں تک پہنچ جانا خدا تک پہنچ جانے کے برابر ہوتا ہے اور پھر جب وہ اس چوٹی سے دس بیس میٹر دور ہوتے ہیں تو یکدم ان کا بدن اور ہمت بھی جواب دے جاتے ہیں.. جانتے ہیں کہ دوبارہ یہ موقع نہیں آ سکے گا۔ اس کے باوجود ان میں سکت نہیں ہوتی، ایک اور قدم اُٹھانے کی..

مجھے یہ جواب دو مرتبہ پہلے بھی ملا تھا..

مجھ پر یہ بیچارگی اور لاچارگی پہلی بار تب وارد ہوئی تھی جب ہم ورگوتھ کی مرگ ندیاں پار کر کے ایک گھنے جنگل میں اُترے تھے اور پھر رات گئے خیمہ گاہ میں پہنچے تھے.. اور دوسری بار جب میں بُرجی لا درّے سے اُتر کر اپنی منزل شتونگ تک پہنچنے کی خواہش میں دن کے بعد رات کر بیٹھا تھا اور ہمارے آس پاس ریچھوں کے وہم اندھیروں میں سے نمودار ہوتے تھے اور بھوک بدن کو بے جان اور لاغر کرتی تھی اور یہ بھی یقین نہ تھا کہ ہمارا رُخ شتونگ کی جانب ہے یا ہم دیوسائی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور میں اپنی مدد کے لیے آنے والے پورٹر عباس سے کہنے والا تھا کہ تم مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا لو جب شتونگ میں روشن ایک لالٹین دکھائی دی تھی..

کاش آج بھی میرے ہمراہ عباس ہوتا.. ہم نے سکردو میں اس کا کھوج لگایا تھا لیکن وہ کسی اور مہم کے ساتھ جا چکا تھا..

ٹارچ کی روشنی میں بھی مجھے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا

چھار ہا تھا..

میرے برابر میں.. مجھے سہارا دینے کی کوشش میں ایک پورٹر نے ہاتھ آگے کیا..

''صاحب میں آپ کا ہاتھ پکڑتا ہوں۔''

''نہیں..'' میں نے اُسے جھڑک دیا.. کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر اس نے مجھے ہاتھ لگایا.. یا کسی درخت کی ٹہنی نے بھی میرے بدن کو چھو لیا تو میں مسمار ہو جاؤں گا.. ایک مرتبہ گر گیا تو اُٹھ نہ پاؤں گا..

ایک اور قصہ مختصر..

ہم نیچے شائی نُو میں پہنچ گئے..

ٹارچ کی روشنی میں راستے میں پڑتی ندیوں کے پانی چمکتے تھے اور میں کبھی انہیں پھلانگ کر پار جاتا تھا اور کبھی نقاہت کے عالم میں اپنے بوٹ بھگوتا ان میں چلتا ہوا دوسری جانب پہنچتا تھا.. ایک بے جان پُتلے کی مانند چلتا جاتا تھا..

ہمارے خیمے اندھیرے میں کہیں تھے.... وہیں تھے جہاں ہم نے آج سے کچھ ماہ پیشتر لگائے تھے.. یا چند ہفتے پہلے لگائے تھے.. پتہ نہیں کب لگائے تھے لیکن وہی مقام تھا.. ہم تینوں کی آمد پر کسی نے تالیاں نہیں بجائیں، ہمارا استقبال کرتے ہوئے شاباش نہیں دی کیونکہ جو ہم سے پہلے پہنچ گئے تھے، ان میں بھی زندگی کی رمق کم کم تھی.. بُرمانی خیمے کے باہر اپنی میٹرس پر تقریباً مردہ پڑا تھا اور لاکھ جھنجھوڑنے پر بھی بیدار نہ ہوتا تھا..

اس نے اگلی سویر بتایا کہ تارڑ سائیں مجھے بھی راستے میں شام ہو گئی اور میں اکیلا تھا. تھکاوٹ اور بدن کی لاچارگی اتنی تھی کہ میں ٹھوکریں کھاتا گرتا تھا اور سنبھل جاتا تھا.. تب میں نے ایک بار اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے ایک درخت کے تنے کا سہارا لیا، اسے دونوں بازوؤں میں تھام کر اس پر سر رکھا تو مجھے درخت کے تنے میں سے ایک صدا آئی.. بھاگ جاؤ.. یہاں سے بھاگ جاؤ ورنہ مر جاؤ گے.. مر جاؤ گے.. تو سائیں میں وہاں سے جو اندھا دھند بھاگا ہوں.. کچھ یاد نہیں کہ کس سمت میں کس راستے پر بھاگا ہوں.. میں آسانی سے گلیشیر میں بھی اُتر کر گم ہو سکتا تھا لیکن کسی نہ کسی ہاتھ نے میری مدد کی.. مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں ندیاں پھلانگ رہا ہوں.. اور آخر میں کوئی مقام ہے جہاں ایک لالٹین روشن ہے..

مجھے اس سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی کہ کیا واقعی درخت کے تنے میں سے آواز آئی

تھی کیونکہ مجھے پورا یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا.. تھکن اور بے بسی کی وہ کیفیت ایسی تھی جس میں درخت ہی آپ کو راستہ دکھاتے ہیں اور خبردار کرتے ہیں کہ بھاگ جاؤ ورنہ مر جاؤ گے..

میں نے کے ٹو کے عکس اور کے سیون کی برفوں کی جانب ایک نگاہ بھی نہ کی کہ میری نگاہ میں تو صرف میرا خیمہ تھا جس کی جانب میں لڑکھڑاتا ہوا بڑھتا تھا..

میں اپنے سلیپنگ بیگ پر جہاں گرا.. اگلی سویر تک وہیں گرا رہا..

''وادیٔ ہوشے پر بچھا گندم کی بالیوں کا تخت''

ہم ہوشے کے قریب ہوئے تو سامنے ایک عجیب نظارہ تھا ہوشے کے باغ میں..

شائی چو سے ہم صبح سویرے نہیں بھری دوپہر میں چلے.. کہ ہمارے مُردہ بدن سویر تک اس قابل نہ ہوئے کہ انہیں ہلایا جُلایا جا سکے.. جب ذرا دھوپ پھیلی تو ان میں بھی زندگی کی کچھ حرارت پیدا ہوئی..

اور جب ہم دو بجے کے قریب ہوشے کے سامنے پہنچے تو وہاں ایک عجیب نظارہ تھا.. جو ہم نے پہلے نہیں دیکھا تھا..

ہم سے دور کھیتوں کے پار ایک بلند سطح پر ہوشے کے گھر دکھائی دیتے تھے اور یہ جو کھیت درمیان میں تھے، یہ سراسر سنہری ہو رہے تھے اور پھر تہہ در تہہ بلند ہوتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ چٹانوں کی قربت میں پہنچ کر رک جاتے تھے.. البتہ وہاں تک پہنچ کر وہ سنہری سے ہرے ہو جاتے تھے کیونکہ وہاں ابھی تک گندم پکی تھی..

بلندیوں پر جیسے شالیمار کا ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ تختہ بہ تختہ یہ کھیت بلند ہوتے جاتے تھے اور گندم کی بالیوں کے سنہری پن میں رنگے جاتے تھے..

کسی بھی منزل سے واپسی پر راستے تو یقیناً وہی ہوتے ہیں لیکن منظر سراسر بدل جاتے ہیں..

پہلے آپ اُن سے نکل رہے ہوتے ہیں اور وہ آپ کی پشت پر ہوتے ہیں اور واپسی پر وہ آپ کے سامنے ہوتے ہیں اور آپ ان میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں..

ہم بھی اپنے راستے سے اُتر کر کھیتوں میں چلے جاتے تھے اور گندم کی بالیوں سے لپٹے

مٹر کے پودے تلاش کرتے تھے اور اُن کی پھلیاں توڑ کر انہیں ناخنوں سے اُدھیڑ کر انہیں کھول کر ان میں سے ہرے بھرے دانے نکال کر اپنے منہ میں رکھتے تھے اور اس تازہ سبز ذائقے کے انوکھے مزے لیتے تھے..

بچوں میں ٹافیاں تقسیم کرتے جب ہم اوپر ہوشے کے پہلے گھر تک گئے اور پھر گاؤں میں داخل ہوئے تو یہاں بھی ہمیں دیکھ کر کسی نے تالیاں نہ بجائیں.. ہمیں خوش آمدید نہ کہا.. کہ اہلِ ہوشے کے لیے یہ ایک روزانہ کا معمول تھا کہ اوپر درّہ گندوگورو سے ایسے پریشان حال کوہ نورد اُترتے ہی رہتے ہیں..

سلمان نے ستانے کی بجائے فوری طور پر کاندے جانے والی کسی جیپ کا بندوبست کیا اور یہ وہی حوالدار کی جیپ تھی.. پھر وہ سامان جو ٹریک سے نکلنے سے پیشتر یہاں سے کرائے پر حاصل کیا گیا تھا.. کچن ترپال، کچھ دیگچے.. اُسے واپس کیا گیا اور پھر اشرف کی خیمہ گاہ میں پورٹروں کا حساب کتاب کیا گیا.. حسین، اسحاق اور علی موسیٰ جو ہمارے خیر خواہ نکلے تھے، انہیں ان کی مہربانی کے عوض میں اُن کی اجرت میں کچھ اضافہ کیا گیا.. کچھ خوراک تقسیم کی گئی..

اور پھر روانگی سے پیشتر ایک پیالی چائے کے لیے.. جو نہایت دھواں دار تھی، ہم اشرف کی خیمہ گاہ کے ڈائننگ روم میں چلے گئے..

اور یہاں پر یوسف سے ملاقات ہوگئی۔

جی ہاں ''سنولیک'' کے مفرور.. حرامی.. گائیڈ.. یوسف اوئے یوسف سے.. جو نہ گائیڈ تھا اور نہ کُک تھا.. بس یوسف اوئے یوسف تھا..

انسانی خصلت میں شامل ہے کہ بے شک ایک اور انسان اُسے تقریباً مار ڈالنے کا باعث بنا ہو لیکن وہ اس کو دوبارہ ملنا چاہتا ہے.. چنانچہ ہم نے بھی ایک بار سکردو میں اس کا کھوج لگانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ دو برطانوی کوہ پیماؤں کو جھانسا دے کر سنولیک پر لے گیا تھا جہاں ایک کوہ پیما ایک دراڑ میں گر کر ہلاک ہو گیا تھا اور اُس کی لاش کو سنولیک پر چھوڑ کر یوسف سکردو واپس آ گیا تھا.. اور ان دنوں وہی کوہ پیما یوسف کے خوابوں میں آتا تھا اور کہتا تھا.. جوزف تم نے مروا دیا.. چنانچہ جوزف یعنی یوسف کو خوف کے مارے بخار ہو گیا تھا اور وہ بستر میں پڑا تھا..

ہوشے میں معلوم ہوا کہ یوسف دراصل سکردو کے ہسپتال میں چوکیدار ہے اور وہاں کے ایک ڈاکٹر صاحب نے لاہور سے آنے والے تین نوجوانوں کو اس کے ہمراہ کر دیا تھا تاکہ وہ

انہیں مشابرم بیس کیمپ تک لے جائے..

یوسف اور وہ تین مبتدی کوہ نورد مشابرم کے بیس کیمپ سے واپس آ کر اب اشرف کے سوکی ڈائننگ روم میں آنکھیں جھپکتے تھے اور سب کے سب باریش تھے اور یہیں پر ان سے ملاقات ہوگئی..

سب سے پہلے تو میں نے اور سلمان نے ان تین نوجوانوں کو مبارکباد دی کہ وہ یوسف کی رہنمائی کے باوجود زندہ سلامت لوٹ آئے ہیں اور پھر یوسف سے چہلیں شروع ہوگئیں..

”یوسف..“ سلمان نے سنولیک سٹائل میں ذرا لٹک کر کہا۔ ”اوئے یوسف..“

”جی صاحب..“ وہ ہمیں دیکھ کر اگرچہ خوش بھی ہوا تھا لیکن کچھ شرمندہ سا بھی نظر آتا تھا..

”یوسف تم تو چاول بھی نہیں اُبال سکتے تھے اور پھر بھی کُک تھے اور نملا سے آگے بھی نہیں گئے تھے اور پھر بھی گائیڈ تھے.. تو کیا اب بیافو ہسپر کراس کیا ہے ہمارے بعد؟“

”بیافو ہسپر تو میں نے چھ سات بار کراس کیا ہے صاحب۔“ یوسف اپنی اناڑی ٹیم کے سامنے اپنی عزت نفس کا دفاع کرنا چاہتا تھا۔ ”بہت مرتبہ گیا ہے۔“

سلمان، یوسف کے پول کھولنے پر تُلا ہوا تھا۔ ”اور جب گیا ہے تو کتنے کوہ نوردوں کو درازوں میں دھکیلا ہے یوسف.. یاد ہے تم تارڑ صاحب کو ایک بلندی پر سہارا دے کر لے جا رہے تھے اور پھسل گئے تھے اور تم نے جواباً تارڑ صاحب کو جپھا مار لیا تھا اور ان کو بھی لے ڈوبے گئے تھے۔“

”نہیں صاحب..“ وہ بغلیں جھانکنے لگا..

”جھوٹ مت بولو یوسف..“ سلمان لٹکنے لگا..

”نہیں نہیں.. وہ تو گرتا تھا تو صاحب کو پکڑ لیا تھا..“

”اور یوسف تم نے دوسرا شادی بنایا؟“

یوسف نے رب کا شکر کیا کہ موضوع بدلا ہے۔ ”ہاں صاحب.. بنالیا ہے۔“

سنولیک کے دوران یوسف دوسری شادی کے لیے پر تول رہا تھا لیکن عباس کی موجودگی میں یہ تول مول خفیہ رکھتا تھا کیونکہ وہ اس کا سُسر تھا..

اس کی داڑھی کے بہت سے بال سفید ہو چکے تھے لیکن وہ اب بھی سگریٹ کو ایک کش میں آدھا کر دیتا تھا..

اُن نوخیز کوہ نوردوں نے بتایا کہ مشابرم کا بیس کیمپ بچوں کا ادل پذیر نہ تھا اور راستے میں جو دو چار سخت مقام آئے وہاں پر یوسف انہیں ڈھارس دیتا تھا کہ ہم تو تارڑ صاحب کا ٹیم کو دنیا کے طویل ترین برفانی راستے کے پار لے گیا تھا، یہ تو بچہ لوگ کا کھیل ہے.. بہرحال یوسف جیسا بھی تھا، ایک ہمدم دیرین تھا اور مجھے اور سلمان کو جو سنولیک کے ویٹرن تھے، اُسے ہوشے میں دیکھ کر پرانی رفاقت کا ایک خوشگوار احساس ہوا تھا..

اسی سوکی ڈائننگ روم میں ایک سخت اور مشقتی چہرے والا باریش پورٹر عجیب نظروں سے مجھے دیکھے چلا جا رہا تھا.. پھر وہ اپنی نشست سے اٹھا اور کہنے لگا۔ ”صاحب آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔“

”نہیں..“

جیسے ایک عام فوجی کی شکل ایک ہی سانچے میں ڈھلی عام سی ہوتی ہے، اسی طور بیشتر پورٹر بھی کوئی خاص انفرادیت نہیں رکھتے.. وقت سے پہلے بوڑھے ہوتے ہوئے مشقت کی جھریوں سے بھرے چہرے.. دو چار دانت گرے ہوئے.. کندھے جھکے ہوئے اور آنکھوں میں غربت کی دھندلاہٹ..

”جب آپ اُدھر ہوشے میں پہنچے تو اوپر جانے کے لیے.. تو میں نے تب بھی آپ کو پہچان کر سلام کیا تھا.. میرا نام یحییٰ ہے سر..“

”یحییٰ؟“

”جی صاحب۔ آپ.. دس برس پہلے کی بات ہے آپ اس سیزن میں کنکورڈیا گئے تھے.. جب بہت کم پاکستانی اُدھر کو جاتا تھا.. آپ کا کک غلام محمد تھا.. جسے ڈائریا ہو گیا تھا.. اور آپ کو آرمی کا ہیلی کاپٹر اٹھانے آیا تھا اور آپ ہمیں چھوڑ کر اس میں چلا گیا تھا..“

”بالکل صحیح..“

”تو میں آپ کا پورٹر تھا سر.. آپ کے ساتھ گیا تھا..“

اس کا چہرہ شناسا لگنے لگا.. لیکن اس چہرے پر دس برس کی مشقت اور مزدوری کا بوجھ تھا.. تنگدستی کی جھریاں اور روزی کے حصول کی دربدری کی دھول تھی.. وہ محض اس لیے شناسا لگنے لگا کہ اس نے خود بتایا تھا کہ وہ کنکورڈیا مہم میں میرے ساتھ گیا تھا ورنہ میں اب بھی اسے پہچان

نہیں پا رہا تھا..

اسی طور سنولیک کے سفر کے دوران اشکولے سے چلتے ہوئے وحید پورٹر بھی میرے سامنے آ گیا تھا.. اسے میں نے پہچان لیا تھا کہ وہ کے ٹو کہانی کے دوران مسلسل میرے ساتھ رہا تھا اور مددگار رہا تھا..

شمال بہت بڑا ہے اور بہت مختصر بھی.. اتنا مختصر کہ گئے برسوں کے چہرے کہیں نہ کہیں سامنے آ جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ''صاحب آپ نے مجھے پہچانا؟''

اشرف کی کیمپنگ سائٹ کے پھاٹک کے باہر ہوشے کی گلی میں حوالدار کی جیپ پر ہمارے رُک سیک اور دیگر سامان لوڈ ہو رہا تھا..

ہمیں اصولی طور پر تو آج کی شب یہیں ہوشے میں قیام کرنا چاہیے تھا.. لیکن ٹیم کے ہر فرد کو اب کوئی نہ کوئی انتہائی ایمرجنسی والا کام یاد آ رہا تھا جو اس نے فوری طور پر لاہور پہنچتے ہی سرانجام دینا تھا.. ایسے انتہائی اہم کام ہمیشہ کوہ نوردی سے واپسی کے آخری دن ہی یاد آتے ہیں.. سلمان نے ہسپاں میں کہا تھا کہ اس کا بھائی امریکہ جا رہا ہے اور اسے لاہور ایئرپورٹ پر خدا حافظ کہنا بے حد ضروری تھا ورنہ بھائیوں میں دراڑ پڑ سکتی تھی.. میاں صاحب اپنی بیگم کی صحت کے بارے میں فکرمند تھے.. حسن صاحب اپنی بیگم کے لیے فکرمند نہیں بلکہ اداس ہو گئے تھے اور وہ خوبانی چہرے والی مچلو کی خاتون کو یکسر بھول گئے تھے.. بریانی کو پہلی بار احساس ہوا کہ وہ ڈاکٹر بھی ہے اور چوٹی زیریں کے علی کلینک میں داخل چند مریض جانے کس حال میں ہیں.. عامر کو بھی کوئی بزنس میٹنگ یاد آ گئی تھی.. شاہد صاحب کو بھی یقیناً کچھ یاد آ رہا تھا لیکن وہ اقرار نہ کرتے تھے..

اور مجھے... مجھے گھر یاد آ رہا تھا... پورے کا پورا... یہاں تک کہ فوارے کے کائی زدہ پانیوں میں بڑے گلپھڑوں والا وہ بوڑھا مینڈک بھی یاد آ رہا تھا جو ساری رات ٹراٹرا کر کے میری نیند برباد کرتا تھا... اپنے بچوں کے دمکتے روشن چہرے یاد آ رہے تھے جو پہاڑوں کی یاترا سے واپسی پر مجھے دیکھ کر مزید دمکتے تھے، مزید روشن اور سونے ہوتے تھے... وہ اگرچہ اب اتنے بچے بھی نہ تھے اور مجھ سے قد میں نکلتے تھے لیکن اس کے باوجود مجھے دیکھ کر وہ بندر ہو جاتے تھے... میرے گرد اچھلتے کودتے نعرے لگاتے تھے کہ ابو آ گئے... ابو آ گئے... اور تو اور میری واپسی پر میمونہ کے چہرے پر بھی زندگی میں ایک بار نمودار ہونے والی مسکراہٹ کھیلنے لگتی تھی...

چنانچہ ہم ہوشے میں ٹھہرنا نہیں چاہتے تھے... یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے اور کسی نہ کسی طور آج شب خپلو پہنچ جانا چاہتے تھے...

بڑے ڈیل ڈول کے مالک حوالدار کی پرانی جیپ ڈھلتی دوپہر میں ہوشے کی گلیوں میں سے نکل کر یکدم اترائی پر ہمیں بے قابو ہوتے ہوئے محسوس ہوئی لیکن حوالدار فل کنٹرول میں تھا کیونکہ وہ صرف آج بارہ سو پھیرے کے حساب سے کاندے سے ہوشے اور ہوشے سے واپس کاندے کے گیارہ چکر لگا چکا تھا... یہ اس کا بارھواں پھیرا تھا... اس راستے کو وہ اپنی ہتھیلی کی لکیروں کی طرح جانتا تھا اور آنکھیں بند کر کے بھی اس پر جیپ چلا سکتا تھا... اور دراصل وہ آنکھیں بند کر کے ہی اس راستے پر جیپ چلاتا تھا... کیونکہ وہ روڈ کی جانب کم ہی نگاہ کرتا تھا... مجھ سے ایک خاص لاتعلقی سے باتیں کرتا جاتا تھا... آس پاس کی لینڈ سکیپ کو دیکھتے ہوئے خود سے باتیں کرتا جاتا تھا اور سٹیئرنگ گھماتا جاتا تھا... اتنے وسیع تجربے کے بعد اس کی آنکھیں دراصل سٹیئرنگ میں منتقل ہو چکی تھیں...

اترائی کے خاتمے پر وہی پل آیا جہاں سے ہوشے کا علاقہ ختم ہوتا تھا اور کاندے والوں کی زمین شروع ہو جاتی تھی...

کاندے تک تو پہنچنے کا بندوبست ہو گیا تھا تو اب وہاں سے آگے خپلو تک کسی جیپ کے ملنے یا نہ ملنے کی تشویش شروع ہو گئی...

''صاحب آپ چکر لگا آیا؟'' حوالدار نے اسی لاتعلقی سے پوچھا...

''ہاں....''

''کدھر تک گیا؟''

''درّہ گنڈوگورو کے بیس کیمپ تک..''

''اچھا.'' اس کا منہ کھل گیا۔ ''پیدل گیا ہے؟''

''تو اور کیا حوالدار صاحب.. ادھر جیپ تو نہیں جاتا..''

''بہت ہمت کیا ہے صاحب اس عمر میں..''

''آپ تو ادھر گیا ہوگا؟''

''نہیں سر.. اسی تے ہوشے دے اگے کدی نئیں گئے سوہنیو..''

''ہیں؟'' میں اس کی ٹھیٹھ پنجابی سن کر ٹھٹھک گیا۔ پھر یاد آیا کہ ادھر آتے ہوئے اس نے بتایا تھا کہ اس کی ملازمت کا ایک بڑا حصہ پنجاب میں گزرا ہے۔ ''کیوں نہیں گئے حوالدار جی..''

"ساڈھا کوئی دماغ خراب اے.." وہ ہنسنے لگا..

"نہ تے ساڈھا دماغ خراب اے حوالدار جی؟"

"آہو.." اس نے سر ہلایا اور قہقہہ مار کر ہنسنے لگا.. "پنجاب چھوڑ کر ادھر آتے ہو تو دماغ خراب ہے ناں سوہنیو.."

روڈ ہموار ہو گئی۔

بائیں جانب ہم سے دور ہوتے نالے کے پار جو چٹانیں تھیں، وہ ڈھلتی دھوپ میں رنگ بدلتی تھیں..ان کے اندر عجیب سرمئی سی وادیاں نظر آتیں جن پر سفید پانیوں کی خاموش آبشاریں اُتر رہی تھیں..

کچھ اور فاصلہ طے ہوا..

ہم نے بدن کو اپنی ہمت سے بہت پرے تک دھکیلا تھا..کل صبح سے رات تک ایک دن میں دو منزلیں طے کی تھیں اور آج بھی مارو مار کرتے چلے جا رہے تھے..مجھے جیپ کے آس پاس جو منظر گزرتے جاتے تھے، اُن میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور میں نے جو کچھ دیکھنا تھا، دیکھ لیا تھا..یہ میرا خیال تھا کہ میں نے جو کچھ دیکھنا تھا، دیکھ لیا ہے..ابھی چند لمحوں میں اس منظر نے نمودار ہونا تھا جو اب تک دیکھے گئے تمام منظروں پر بھاری ہونے والا تھا..چند لمحوں میں..

بائیں ہاتھ پر کاندے کے سیلاب زدہ گھرانوں کی وہ نئی پتھریلی بستی نظر آنے لگی جو انہوں نے اس بے آب و گیاہ ویرانے میں آبسائی تھی..اور پھر جیپ کی کھڑکی میں سے بستی کے آخر میں ایک بلند تانبے رنگ کی چٹان بلند ہونے لگی..

"چٹان پر ایک لڑکی...اب وہاں نہیں تھی"

چٹان پر ایک لڑکی..

چٹان بلند ہوتی جا رہی ہے اور جب چوٹی پر پہنچتی ہے تو وہاں ایک لڑکی..

چٹان کی چوٹی پر ایک لڑکی..براجمان!

اور چٹان..جیسے جیسے جیپ حرکت کرتی تھی ویسے وہ بھی حرکت کرتی جاتی تھی اور اس پر براجمان لڑکی بھی حرکت کرتی جاتی تھی..جیسے میں ایک تیز رفتار ہیلی کاپٹر میں بیٹھا اس کے قریب سے گزر رہا ہوں..

چٹان پر اطمینان سے بیٹھی لڑکی سُرخ لباس میں تھی..

وہ ایک جل پری کی مانند چوٹی پر ٹانگیں سمیٹے بیٹھی تھی..

کاندے کی "لٹل مرمیڈ" اپنی چٹان پر شاید پیاسی بیٹھی تھی کہ اس نئی بستی میں پانی نہ تھا اور وہ دور بہتے دریائے شیوک کے پانیوں کو حسرت سے تک رہی تھی اور صرف انہیں دیکھنے کے لیے اتنی بلندی پر..اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر..آ بیٹھی تھی..

یا شاید..وہ کسی کی منتظر تھی!

اُس کا چہرہ اگر میری جانب ہوتا تو میں اس پر لکھی عبارت پڑھ لیتا اور جان جاتا کہ وہ کس کی منتظر ہے اور کتنے برسوں سے منتظر ہے کہ ہر چہرے پر اپنے عشق خاص کے انتظار کی تحریریں ہوتی ہیں..وہ پڑھی جا سکتی ہیں اور اگر انتظار طویل ہو جائے تو یہ تحریریں جھریوں میں بدل جاتی ہیں..

چٹان پر بیٹھی لڑکی ایک ہیلی کاپٹر سے فلم بند کیے جانے والے منظر کی مانند تیزی سے

گزرتی تھی.. اور اس کے پس منظر میں جو نیلا آسمان تھا وہ بھی اتنی ہی تیزی سے جیپ کی کھڑکی کے فریم میں سے گزرتا جاتا تھا..

یہ وہی سکہ تھا جو زمانے اور منظروں کی ٹکسال میں ڈھل گیا تھا اور اس پر اس چٹانی جل پری کی شبیہ.. کسی سکندر.. اشوک یا مندر کی مانند ثبت ہو چکی تھی اور اس سکے نے جب ہزاروں برس بعد کسی کھنڈر میں سے برآمد ہونا تھا تب بھی کھرا رہنا تھا کہ دھنک شام کے سونے میں ڈھلنے والا ایسا سکہ کبھی زنگ آلود نہیں ہوتا.. ہاں اس نادر سکے کو ڈھلتے دیکھنے والی میری بھوری آنکھیں خاک اندر خاک ہو جاتی تھیں.. لیکن اسی خاک میں سے تو یہ سکہ دستیاب ہونا تھا ہزاروں برس بعد!

وہ چٹان.. اس پر براجمان سرخ پیراہن والی وہ لڑکی لمحوں میں گزر گئی لیکن اس کی شبیہ وہیں موجود رہی.. کھڑکی کے فریم میں جڑی رہی..

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ کوہ نوردی کی اُس برس کی ہائیکل میں اگرچہ شائی چو.. دل سنگ پا.. ہسپاں اور لیلے پیک ایسے مقدس مقام آتے ہیں لیکن جب یادوں کی ٹکسال میں کوئی ایک سکہ ڈھلتا ہے تو اس پر چٹان پر براجمان ایک سُرخ پیراہن والی جل پری کی شبیہ ابھرتی ہے..

چٹان کی چوٹی پر کوئی نہ تھا؟

چٹان خالی پڑی تھی اور جیپ کی کھڑکی میں سے گزر گئی تھی..

تو میں نے اسے کب دیکھا تھا؟

ہوشے کی جانب جاتے ہوئے یا اپنی کوہ نوردی سے لوٹتے ہوئے؟

دیکھا بھی تھا یا نہیں؟

بس یہی عجیب بات تھی..

اور یہ بھی تو کیسی عجیب بات ہے کہ ہم ہوشے سے کاندے پہنچے ہیں.. کاندے کے نالے پر رکھے ان شہتیروں پر سے بے خطر پار جاتے ہیں جن پر ہماری ٹانگیں اور حواس جواب دیتے تھے اور اس کے پار ہمیں فوراً ایک نئی نویلی آرام دہ جیپ مل جاتی ہے جو ہمیں رات اُترنے سے پہلے خپلو لے جاتی ہے.. اور ہم ایک مرتبہ پھر اس کے شاندار شالیمار طرز کے ہوٹل میں موج کرتے ہیں.. ابھی سے شائی چو اور ہسپاں کے لیے اداس ہو کر ان کا تذکرہ کرتے ہیں.. اس شالیمار میں ہم شاہ جہاں ہو جاتے ہیں.. لیکن کسی ممتاز محل کے بغیر.. لیکن ہمیں اس کی خواہش نہیں تھی کیونکہ ہمارے پاس لیلے پیک تھی جو خود ایک برفانی تاج محل تھی..

اگلی سویر ہم سکردو پہنچتے ہیں..

پھر شام تک گلگت میں ہوتے ہیں..

پھر بشام، مانسہرہ، ایبٹ آباد، حسن ابدال، راولپنڈی.. اور موٹروے پر.. کلر کہار.. بھیرہ.. یعنی وہی ایکشن ری پلے چلتا جاتا ہے..

اور آخرکار ہم موٹروے کو چھوڑ کر کالا شاہ کاکو میں اُتر کر جی ٹی روڈ پر آ جاتے ہیں..

اور لاہور میں داخل ہو جاتے ہیں۔

''میں کیا جانوں میں کون ہوں..دروازہ کھولو''

اور تب ایک عجیب سی وحشت مجھے گرفت میں لے لیتی ہے..

میں نے آج تک..پچھلے تیس برسوں میں شمال کے جتنے بھی سفر کیے تھے..اپنی سالانہ کوہ نوردی سے جب بھی گھر لوٹا تھا..تو گھر میں..ہمیشہ میرے تینوں بچے میرے منتظر ہوتے تھے..میں پتھروں اور برفوں کا مارا ہوا مرجھایا ہوا ان کے چہرے دیکھ کر کھل جاتا تھا..میرے تن بدن میں موسم کے اور بغیر موسم کے جتنے بھی پھول شمار ہو سکتے ہیں، وہ سب کے سب انہیں دیکھ کر کھل جاتے تھے..کہیں ہارسنگھار مہک دیتا تھا..کہیں نرگس اور فریزیا..کہیں پٹونیا..زینیا اور کہیں کیکر کے زرد پھول..سب کے سب یکبار کھل جاتے تھے..

لیکن جی ٹی روڈ پر اترتے ہی..ٹریفک کی بھیڑ میں جب ہماری ویگن داخل ہوئی تو مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا..یہ احساس ایک دھماکے کی طرح پھٹا کہ اس برس تو وہ وہاں نہیں ہیں۔

سلجوق نہیں ہے..فارن سروس میں ہے..پاکستان کونسلیٹ جدہ میں وائس کونسل کے عہدے پر اپنے سفارتی فرائض سرانجام دے رہا ہے..عینی..قرۃ العین..نہیں ہے..کنگ ایڈورڈز کالج سے متعدد گولڈ میڈل حاصل کرتی، اب باقاعدہ ڈاکٹر ہو چکی ہے..شادی شدہ ہو چکی ہے اور پاکستان میں نہیں ہے..فلوریڈا کے شہر آرلینڈو میں اپنے بلال کے ساتھ خوش و خرم ہے..

یہ پرندے تو اُڑ چکے ہیں..

گھونسلا تقریباً ویران ہو چکا ہے..

وہ دن گئے جب وہ اپنی چونچیں کھولے میرا انتظار کرتے تھے..

صرف سمیر ہے اور وہ بھی اُڑنے کی تیاری کر رہا ہے..سول سروس اکیڈمی میں ایک

زیرِ تربیت بیوروکریٹ ہے..اس کی پوسٹنگ جانے کہاں ہوتی ہے..میں ابھی تک اس خیال سے غافل رہا تھا..

اور اب..موٹروے سے اُتر کر کالا شاہ کاکو میں داخل ہوتے ہوئے ٹریفک کی بے پناہ بھیڑ میں داخل ہوتے ہوئے مجھے پہلی بار یہ خیال آیا کہ پرندے تو گھونسلا چھوڑ چکے ہیں...ایک شدید ڈیپریشن نے مجھے شکار کر لیا..میں اب ویگن میں تنہا تھا..

حکیم بے چین تھا کہ کب یہ صاحب بھی اُترے اور میں اپنے گھر جاؤں..

فردوس مارکیٹ..گلبرگ نمبر تین..بائیس بے..

ویگن میرے گھر کے سامنے رُک گئی..میں نے اپنا سامان۔رُک سیک۔اتارا..مونگیائی رنگ کا آہنی گیٹ بند تھا جسے میں نے دھکیلا تو اندر خاموشی تھی..

کوئی بھی نہیں تھا..

ہاں پورچ کے اوپر وہ بیل تھی جو ان موسموں میں پورچ کے اوپر بندھی رسیوں پر پھیلتی انہیں اپنی گرفت میں لیتی، دن رات پتے نکالتی بڑھتی جاتی تھی..اور ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آیا تھا کہ جب میں کوہ نوردی کے لیے گھر سے نکلتا تھا تو اس بیل کے گھنے اور سرسبز ہونے کے دن ہوتے تھے..ہر بارش کے بعد یہ راتوں رات دوگنی گھنی ہو جاتی تھی اور پورچ کے فرش پر دھوپ کم سے کم ہوتی سائے میں بدل جاتی تھی..اور پھر ہمیشہ یہ بھی ایسا ہوتا تھا کہ میں گھر لوٹتا تھا تو جس بیل کو میں سبز پتوں میں رسیوں میں لپٹا چھوڑ کر گیا تھا، اب اس میں سے تیز گلابی رنگ کے پھولوں کی لڑیاں لٹکتی تھیں..پھولوں کی لڑیاں جن کا پتوں میں سے لٹکنے کا انداز چینی لالٹینوں کی طرح تھا..املتاس کے پھولوں کی مانند تھا..صرف یہ کہ وہ زرد لالٹینیں تھیں اور یہ آتشی گلابی..ہمیشہ!

ان لڑیوں میں سے گرتے چھوٹے چھوٹے گلابی شگوفے پورچ کے سُرخ فرش پر پڑے ہوئے تھے..کار کی چھت پر گرے ہوئے تھے..

سمیر بھی موجود نہ تھا..اسے علم نہ تھا کہ میں شیڈول سے ایک روز پہلے پہنچ جاؤں گا اور وہ سول سروس اکیڈمی کے چند دوستوں کے ہمراہ کسی پکنک پر جا چکا تھا تو اندر خاموشی تھی..پھولوں سے ڈھکی بیل تھی..گلابی لڑیاں لٹکتی تھیں اور شگوفے گرتے تھے تسبیح کے دانوں کی طرح..اور اُن کی آواز نہیں تھی گرنے کی اس لیے اندر خاموشی تھی..

پنک شگوفے..چھوٹے چھوٹے پِن سائز کے..پورچ کے فرش پر گرتے تھے..

ان میں سے کوئی ایک شگوفہ ہوشے کی گلیوں کا تھا..
کسی پرشائی مچو کی شب رقص کرتی تھی..
کہیں دل سنگ پا کی برفیں اتنی سفید ہوتی تھیں کہ شگوفے کی گلابی رنگت بھی ہلکی ہوتی تھی.. کسی پر ہسپاں کی پندرہ ہزار فٹ بلندی سانس لیتی تھی..
ہر شگوفے پر کوئی ایک مقام نقش تھا..

لیکن ایک ایسا مقام تھا جسے کوئی ایک شگوفہ سنبھال نہ سکتا تھا. جا بجا ایسے شگوفے بکھرے تھے جو اپنی رنگت کھو چکے تھے اور ان پر لیلے پیک کی سفیدی راج کرتی تھی..
لعل میرمیڈ کا سرخ لباس ایک شگوفے پر بکھرا اُس کے رنگ سے میچ کرتا تھا..

ان سب میں گارڈن لائٹ کے قدموں میں پڑا البتہ ایک شگوفہ ایسا تھا جس پر کوئی مقام تصویر نہ ہوتا تھا. صرف ایک سوالیہ نشان تھا جو سرگوشی کرتا تھا.. اگلے برس تم کہاں جاؤ گے؟.. کہاں جاؤ گے؟..

اگلے برس؟... کل کس نے دیکھا ہے.. ہاں اگر زندگی رہی، ہمت رہی تو کہیں نہ کہیں تو جاؤں گا.. شائد ہراموش کی وادی میں.. شائد بتورہ گلیشیر کے پار.. شائد ایک مرتبہ پھر رتّی گلی کی جھیلوں کو تلاش کرنے کے لیے.. اگر زندگی رہی اور ہمت رہی.. اور اگر میرا رانجھا مجھ سے راضی رہا تو.. جاؤں گا!

میں نے اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کو اُنگلیوں کی پوروں سے محسوس کیا.. بُوٹوں کو ایک نظر دیکھا کہ ابھی انہوں نے ایک برس کے لیے رک سیک کے کُنج تنہائی میں چلے جانا تھا اور سفید دروازے سے لٹکے ہوئے شیر ببر کے مہاندرے والے ناکر کو اٹھا کر دستک دی..

"کون ہے؟" اندر سے میمونہ کی آواز آئی..

"میں ہوں.."

"میں کون؟"

"میں کیا جانوں، میں کون ہوں.. دروازہ کھولو۔"